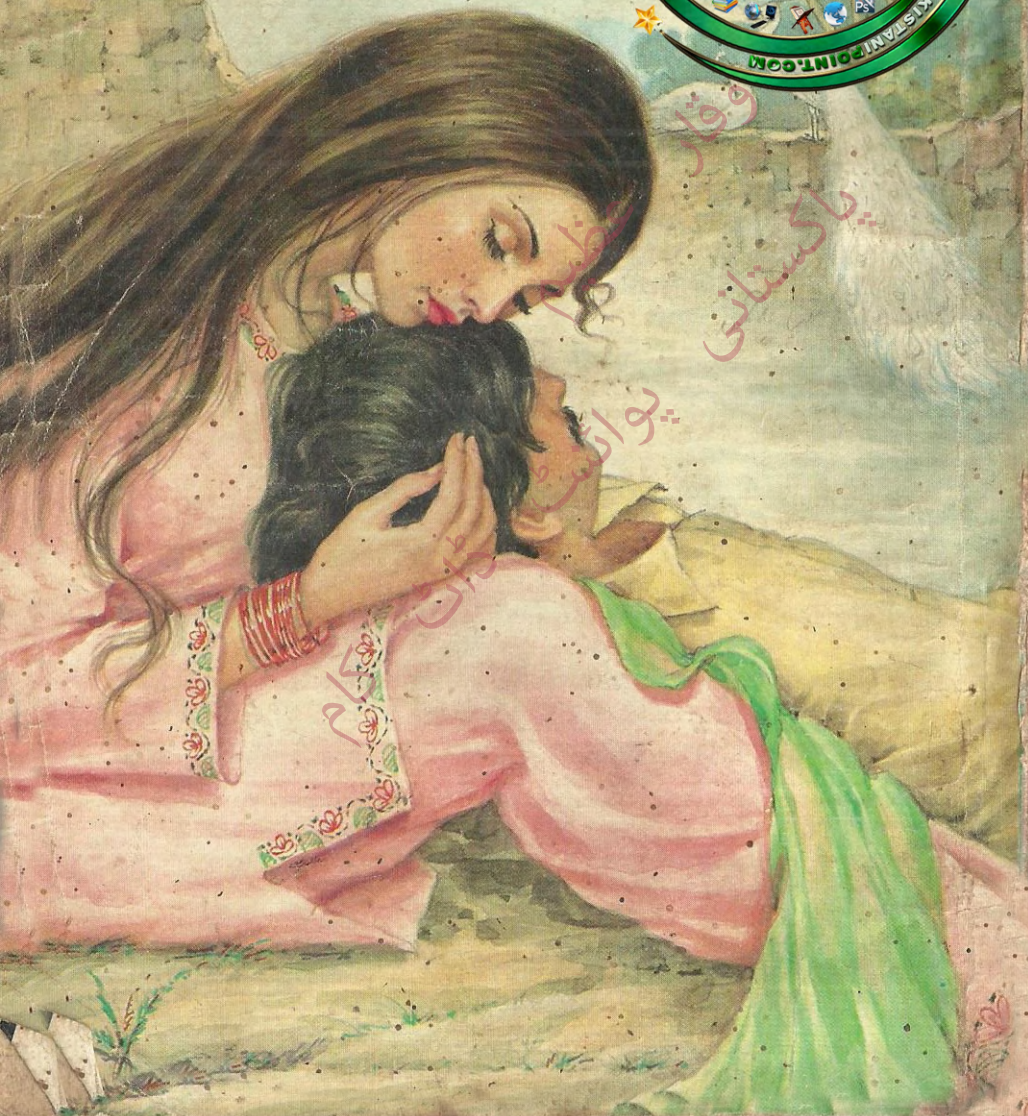


دنیای بہترین
کہانیوں کا انتخاب
ڈائجسٹ
سب رنگ



م

م



سب رنگ کی نقب کا بنیال کو ادب کا طوفان۔
اس شے کے لیے کوئی کوئی بڑی کتاب نہیں
کرتی بلکہ کرشمے سے ایک ایک سارا ہوا ہے
ایک گزیا کی کہانی جسے بڑے ہاتھوں میں لے کر لیا تھا

کئی کے ہاؤس کا رستہ ہے ایک نئی کہانی
بہت سے ہاؤس والی ایک ٹوٹن والی اور
ایک بڑی بڑی کہانت
وہ کہانیاں جو صرف محنت سے لکھی جاتی ہیں

اردو کی دوسری منتخب کہانی
اردو کے ماہرین کا ادب
قلمی اور لکھی ہوئی کہانیاں
ایک عورت کی داستان
وہ اپنا جہت از خود اٹھائے ہوئے قلمی

پاکستان، اچھا بیٹا
خیال ہاؤس کے سین کے کہانیا
کے انہماک پاکستان کے لڑکے ہیں
بچہ کا کہی ناظم اپنے شہر کا
پنت

۳۰-۴۰ پرکس کی بڑائی کی پڑی گزرا کر لکھی
ذہنی سے نہ خفتن
طبعیت اؤس کر گزرا پریشاں

جلد ۹۱

مارچ اپریل

۳۰-۳۱

۴۰-۴۱

۵۰-۵۱

۶۰-۶۱

۷۰-۷۱

۸۰-۸۱

۹۰-۹۱

۱۰۰-۱۰۱

۱۱۰-۱۱۱

۱۲۰-۱۲۱

۱۳۰-۱۳۱

۱۴۰-۱۴۱



سید سلیمان کے دریافت ابھی تو میں جوان ہوں

نوبل انعام یافتہ نوسونو کے قہقہوں سے بھرپور

کاشف لمیٹڈ ریلیز فون-۷۰۸۰۱

نجمی نے ہاتھ دیکھ کے کہا، 'اے شخص! تیری عمر دراز اور تیرا اقبال بلند ہے۔ تو نرزا بیگانہ کو جوان و کامراں دیکھے گا۔ ایک عہد تیرے سامنے کھڑا ہوگا، ایک تاریخ تیرے آگے انجوائی یعنی گزرنے کی تیری گیر متھم اور بے عیب ہے، نجمی نے اسے دراز عمری کی بشارت دی اور شخص بکھر آنے والے دلوں کے خواب دیکھتا ہوا اپنی راہ لگا۔ نجمی روز ایسی نشانیں عام کرتے ہیں مگر ہرگز زندگی کو اعداد سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب کہ اصل بات ترکیت جمع کیفیت کی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کس کے نصیب میں کتنے دن، کتنی راتیں بھی ہیں۔ کتنی روشن راتیں، کتنے بے نور دن۔ کوئی لگا بندھا حساب تو نہیں لیکن آدمی زندگی کے نصف ہی سے میر کام ہوتا ہے۔ بعضوں کو اس سے بھی کم ملتا ہے اور بعضوں کو ملتا ہی نہیں۔ ایک تودہ غر زشتہ ہے، پر ایک وہ بھی ہے جو آدمی خود رقم کرتا ہے۔ خال خال ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے زندگی سے لمحہ لمحہ وصول کیا اور اسے ادا بھی کیا ہو؟ آدمی سے بڑا کھلی اور بند آنکھیں، سوتے اور جاگتے سواس نہیں ہیں۔ یہ بیماریاں خوابیدگی زندگی کا لازمہ اور زندگی میں شامل ہے۔ خوابیدگی زندگی سے منہا نہیں کی جا سکتی مگر کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں اور بیدار سواس کی بے ذریعہ سمعی اور بے حسی دغرابیدگی کا شمار کس میں ہو؟ ایسے لمحے بے مدد حساب ہیں جن کا مانگنا اور سونا برابر ہے۔ کھلی آنکھوں کے معنی دیکھنا ہی نہیں اور کھلے کانوں کا مطلب سنا ہی نہیں ہے۔ کیا دیکھا اور کیا سنا! دیکھنے اور سننے کے اس اسلاف کا خمیازہ لگایا جائے تو گھانا ہی گھانا نظر آئے گا، زبان ہی زبانیں کہیں نصت سے زیادہ اور کہیں صرف چند ساعتیں ہی مائل نکلیں گی۔ نفس کے لچھے، اعصاب کے جھٹکے، خون کی مہل، آدمی ہاتھ پر کشیدہ بکھر ضرور پڑی کر دیتا ہے مگر یوم خسرت سے پہلے ایک عرصہ عشرطے کر کے لمحے چپکے سے گزر جاتے ہیں، پتہ نہیں چلتا۔ شاید بھی آدمی کو کوشش کے دیکھنے کی فرصت ہو تو بے شمار لمحوں کے ضیاع و زباں کا پاس نہاتا ہوگا۔ جانگے میں سونے کا زبانیں ہیں۔ دیوار جس شخص کی باتیں کی گئیں، جس کی خود گیری کی گئی اور فیصلہ صادر کیے گئے، ان ساعتوں کا زبانیں کس کے چبھی بھری، کس کے تنکا چھوہا، کس کی زبان جوبن حرام قرار دی گئی۔ کس کے کردار پر داغ پھینکے گئے۔ کسے بدگیا ہی سے دیکھنے کا زبان کیا، کسے جھوٹ سمجھا، کسے غلط گردانا، کس کے گھر ساز و سامان آنے پر غون کھولایا گیا۔ یہاں کیا کیا گیا! وہاں کیا کیا گیا! کون تھا، کون تھا! کون کیا کر رہا ہے؟ کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے۔ جہاں کے دیکھ، جہاں کے دیکھ! ہر شخص کوئی پر، ہر شخص مورد الزام، ہر ملامت، نامعتبر، گردن زدنی، کوئی کن سوائیل سے رہا ہے کوئی گواہی دے رہا ہے۔ فیصلہ کرنے والوں کو خبر نہیں کہ دیوار کے پار ان کے بارے میں بھی کچھ لوگ ایسے ہی حکم لگا رہے ہیں اور وہ بھی زندگی نصف کر رہے ہیں، یہ بھی زندگی آدمی، یہ بھی ایسا سوچا ہے۔ نجمی نے یہ نہیں بتایا نا!

۵۰۰ روپے سے

مکمل انٹرکنڈیشنڈ تجارتی مرکز

کریمنٹینٹر

میں مالکانہ حقوق کے ساتھ
دکان حاصل کیجئے...

کراچی کے سب سے اہم تجارتی علاقے صدر میں
مہر و فخر ترین سڑکوں، زیب النساء اسٹریٹ، عید اللہ ہارون روڈ
اور کینٹیل لین کے درمیان۔

وسیع، بلند، جدید، مرکزی طور پر انٹرکنڈیشنڈ، خود کار تینے
تیز رفتار لفٹس، کمار کو لفٹس، کار پارکنگ اور دیگر بے شمار خصوصیات
گراؤنڈ فلور سے پانچویں منزل تک ہر منزل پر علیحدہ علیحدہ
سامان کی دکانیں۔

گراؤنڈ فلور کی دکانیں کھل چکی ہیں — فرسٹ فلور کی
دکانیں عنقریب کھلنے والی ہیں۔

— اور اب دوسرے فلور سے پانچویں فلور تک کی بلنگ

”پہلے آئے، پہلے حاصل کیجئے“ کی بنیاد پر تیزی سے جاری ہے۔

دکانوں کی قیمت کی ادائیگی آسان قسطوں میں اور اس کے ساتھ

۳۰ فیصد قرضے کی سہولت اور دیگر سہولتیں بھی۔

آج ہی کریمنٹینٹر میں مالکانہ حقوق کے ساتھ دکان حاصل کیجئے۔

تخصیص یافتہ اور ایکسٹرنل

اشرف شمیم ان اینڈ کمپنی

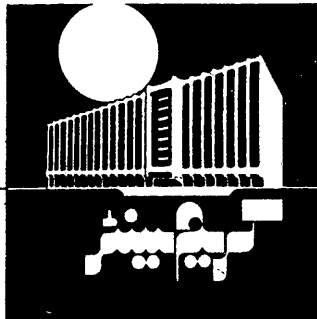
کریمنٹینٹر کینٹیل لین

صدر کراچی۔

کوئٹہ اسٹریٹ، ایکسٹرنل

کریمنٹینٹر، زیب النساء اسٹریٹ

صدر کراچی۔



Argus **PA** KC-10-78

چلے آئے قلم مٹے شہر و خانہ چل، قلندہ صفت چل فقیرانہ چل۔ لالہ رنوں کی بستیوں میں جا بسن کر بس کی گھنٹیں کا گرج کر صدائیں لگاتا، مچھوئیں چلتا ہوا چل، تیرا چلتا، آگ لگتا ہوا چل۔ جو تیرے پاس ہے، جتنی آوازیں، جتنے ڈانے، جتنی سبھیں، جتنے آسمان، آج سب کچھ تمام کر دے۔ چلے ہیں قلم، مڑاؤں کو گڑاؤں، ماہ پاؤں کو ایک اور جوہر سے مشفق کر، سوزِ دروں کے جوہر سے سبکی کو شگفتگی کی کو فیدہ دے اور شگفتگی کو درود عطا کر۔ ہاتھوں کو سوزِ نبی، تپاک بیچ کر، نیم باز کو مسمیٰ دے، زلفِ مغرب کو شکن و شکن کر دے۔ زمیں کو آدمی سے آشنا کر، آدمی میں زمیں کا عرصہ یاد کر، دھنا ہو کبھی نہ مٹنا لگا۔ وہ بنا جو بھی نہ بنایا، جوہر کے ترس چراغ لے کے چل، ہاتھوں میں چاند بن کے دروازہ دروں میں قیامت کی طرح ہر پڑا ہو، خوشبو خوشال انھاس میں گھل جا اور لہو مانند جزو جان بن جا چٹا چٹا گھٹاں سے جتنا چھین لے۔ سنگ لیزوں پہ چھوئیں مارا اور انھیں تخلیق کے شعور سے ہو مژدہ کر، ساکے کانٹے اپنے بدن میں بھر لے۔ تمام خیر اپنے سینے میں آگالے۔ ایسا راگ الاپ جو لبش سے نرم، پچھڑی سے لطیف ہو اور ساری فاک اور شیر کشیم، چھل چھل ہو جائے، شمشاد قدوں کی آغوش تیری بنا، عزتِ لبوں کے جا تیری فدا اور گنگنا کی گلاب تیری قبا چھیریں نقشِ بنا، نقشِ شا، رنگ کھیل ہر آن ایک انشا کر۔ انگلیاں خون دیں ڈبلے، مقلعہ زنجیر توڑ دے۔ دایہ طرزِ فغان ایجاد کر کہ شش شش جات عالم میں چھو کر آواز نہ بچکے۔ زمیں سے غذا آغا لے اور تپا کر، گلابیں گلابی، ہنرِ شانی میں تیرے قریے قریے کر پے کر پے ایک جاں تیری دید کر تیرے، کسی کو تیرے نفاکے کی تاب ہو نہ تیرے جمال کا پلار۔ سمندر دس پر زقں کر اور بادل بن جا۔

یا پھر ایسی آگ جلا کر سب راگ ہو جائے، ایک ایسا نغمہ ستا د بند کر کہ تیش تھر تھرائیں، ہوا کی باگ پیو یا خود ہوا بن جا اور ایک طوفان اٹھا کر سمندر دس کو نہ تامل یا خود اس کا ٹوپ دھارے، ساری زمیں پر قبضہ کر لے۔ وقت کی طما میں کھینچ لے، جو دروازہ دریاں ہو، دھیری آہٹ سے پاش ہو۔ کہ ساری تیری چالیں کی دھک سے اپنے بدن چرائیں، ساکے مفید کر سیاہ، ساکے سیاہ کو مفید کرے، تیرے اٹالے تو بھیریں تیرے اٹالے فطرت کر دیں۔ کبھی جان شیریں، کبھی تیشہ تر، فراہ بن جا کہ وہاں سے چلے آؤ اور گنگناؤں سے جوئے فخر خواں کی طرح گزور۔ نعرہ زماں، زقں کماں چل چل مرے گھوڑے ٹھٹک خوں چل مرے خانے، بسم اللہ۔ اے اللہ! اللہ! اللہ!۔

کچھ کیسے خیال، ہزاروں خیال ہزاروں بیڑے، قلم کو نہاں کے انکار کی سکت سے نہ اپنے دھت مفر پر، افتاد سب دہان ہے۔ اگر ادا ہے میں طلب کا کوئی صدق مضر ہے تو اسباب بھی نکل آئیں گے، سنا ہے نیت کی نا آلودگی پہلی شرط ہے، سو کچھ ایسی کا افتاد ملے ہے۔ سب رنگ بھی تیشہ احساس میں نگار خانہ خیال ہے۔ ہم کیا، ہماری طما، ماضی کا ایک جہل، طورِ ترقیب، طاقت پر داز میں کرنا ہی، ہر قسم سے محروقت، ارادہ کوئی نقص نہیں ہے۔ ایک ایسی اعتبار پر زور دین کہ شاید لین گئی کی شکستیں کسی ستم جانیں اور کوئی نعمت نظر آجائے۔ خبر ماہِ ذی قعدت، مجھے مجھے جھوپ اور اندھ مارے گزور دیا ہے، بچو تاہم اضطراب بھی سوا ہے۔ اڑا دے میں ایک مرشادی فردن، محسوس ہوتی ہے، شور مچانے کو کچھ کرتا ہے اور دل چاہتا ہے، بس خیال کے تانے بانے جتنے دریں، اضماع تراشتے رہیں، معامین کو لے اٹھا رکھ دیں۔ سنے پچھنے خیال، ساز بہ ساز، جملہ بہ جملہ، مغز بہ مغز، طمس بہ طمس، غم بہ غم کی شریک، فکر کو بیڑوں سے آزاد کر، ایک گھر، ایک چار دیواری اور ایک شخص ہی سے واسطہ رکھ لے، اپنے آپ کو پھیلا نہیں، ساکے گھوں کے ہمدار توڑ دیں، ساکے چوڑے سے نفا میں کھنچ لیا اور ان سے کہیں لوم آگئے، ہمیں بچاؤ، ہمیں بیلار اور اپنے سینے میں پھیلاؤ، ہم مسافر ہیں، غم کشتہ منزل، بس اب ہر منزل ہماری ہے، چند لمے سائیں، استوار کر کے پھر کہیں چل پڑیں گے۔

دھو، مکمل طور پر پورا نہیں ہوا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ پہلے کی نسبت دوری میں کچھ کی ہو گئی۔ ہم از کم آدھے وقت کو منانا ہے۔ دو ایک جتنوں میں اور سن جائے گا۔ وقت ہی بائیں ایک بڑا ترقیب ہے کسی دن اس کا پتھر بھی چل جائے گا، اس ناز و ذات میں نہیں کبھی کسی مخصوص تحریر کا ذکر نہیں کیا کہ سب رنگ کی ساری تحریریں گھر کے افواہ کا دوجہ رکھتی ہیں، پہلے بائیں پہلے کا ذکر کرنے کو طبیعت نہجکتی ہے۔ اب ہر پہلے سے مجھے بھی ایسا ہی شغف ہے، مینا دروں کو، ہاتھوں کا صبح، اندازہ لگنے ان شکایت ناموں ہی سے ہوا جو صبح دشام چلے آتے ہیں، ابتدا میں انھیں غفلت کر، غمناک شروع کیا تھا، بعد میں گتی پائیں رہی، چند ایک کے سوا بھی نہ تھوکر کیا ہے کہ یہ کیا غضب کیا، اس کشش عمل پر پردہ کیوں ڈال دیا، پارل، پارل بھندی عارضی ہے، بے شک فطارت کھل رہا لیکن سفید پوشی کے ہر دم پہ آج آری حق، کوئی فرد ہے، داغ نہیں شمس ہاں میں ملتا ہوا ایک دن دھتے جا کے آئے تو مجھ پر کسی گزری ہوئی، اپنے بھرے ہوئے سرے فوجہ روا ہیں۔ آرزو ہے کہ کسی دن سب کو رنگ کر دوں۔ مجھے احساس ہے کہ کوئی آپ سے اس طرح اجازت لینے کی جرأت نہ کرنا اور نہ آپ اس سرگرائی کے منتقل ہوتے لیکن آپ سے درخواست کسی اور نے نہیں کی تھی، میں نے کی تھی، اس ناز پر زور دے اور نیاز بیٹھ لے، اب میری سیل کے پیچھے کچھ کرنا ہی انھیں ہے، میں بن، ایک ذرا سانس کا وقفہ دیجیے، پھر عرض جائیں گے۔

جو میں بار بار کہتا ہوں اور بار بار کہتا رہوں گا کہ بس ایک اہل سے دست کش نہ کیجیے۔ میرا نام انجمنی لوگوں میں قائم رکھیے جن سے آپ شاد دہاں اور ناشاد ہوتے ہیں میں پر آپ کو غصہ اور پیار آتا ہے، آپ جن سے رنجھے اور دُور گزرتے آئے ہیں جو آپ کو کتا نے اور مانتے ہیں، ان لوگوں میں میں جو آپ سے اور آپ ان سے کچھ کہتے سنتے نہیں، مروت چہرے کی شناسائی مقصود نہیں، کچھ اور بھی مطلوب ہے، میں اپنے اس حق کے لیے آپ سے سدا جھگڑا رہوں گا۔ فکار انگلیوں کا حق، خوں پچکاں خاسے کا صندھ، کسی کا گریباں چاک ہے، آئینہ تو سانسے سے پھر چھپانے میں کیا جھجک ہے۔



انڈیہ کے جیواؤں سالہ آفساتہ نگار آندوہ خواجہ نے اسے کا ترجمہ کیا ہے۔
ایکے آدمی کے قتلہ جیسے ایک دن اپنے آپ سے سچ بولا تھا

کرسکا تھا۔ رویا کوئی خوب صورت لڑکی نہیں تھی۔ پروفیسر کو اپنی
کلاس میں بے شمار لڑکیوں سے سالہ کے پروفیسر کا تھنا میں سے کئی
جوانی کے خمار سے بے حد خوب صورت نظر آتی تھیں مگر پروفیسر نے
ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے ان کے حق کو
ایک خوب دولت سمجھتے یا ایک حسین تصویر کی طرح سراہا ضرور ہوگا
لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھا البتہ رویا اس کی نظریں پر اسرار
طریقہ اور اس کے لڑکوں سے مختلف تھی۔

پڑھانے بڑھانے پروفیسر نے ایک دفعہ رویا کی طرف
دیکھا تو اس نے بچے کی ایک کرسی پر بیٹھ لی۔ بچہ دول سے وہ خود بخود
پچھے پیچھے تھی مگر حالانکہ آگے کی بہت سی کرسیاں خالی رہتی
تھیں۔ اس کے گھٹنے اسٹ سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس کے ٹھیکس گول اور
صحت مند تھیں لیکن اتنی دل کش نہیں تھیں کسی مرد کو کچل کر وہ
مردوں کو تڑپ کر کے والا بھر گیا۔ اس میں کوئی شے، خصوصاً پروفیسر
ہوس کی کلاس میں نہایت عام لباس پہن کر آتی تھی۔ اس کا سر ایک
خاص انداز میں کاٹی ہوا تھا۔ اس کے بال جھولے اور چمکیلے
تھے، انھیں اس نے رنگا نہیں تھا، یہ قدرتی رنگ تھے۔ پروفیسر کی
کلاس میں رویا سے بھی جلدی میوہ سے پالان والی بعض لڑکیاں
آج بھی تھیں لیکن ان کے لیے اس نے اپنے دل میں کوئی تڑپ
محسوس نہیں کی تھی۔ شاید والٹر اسکاٹ کی کسی ہیروئن کا نام بھی
رویا تھا مگر پروفیسر اب چالیس سال کا ہو گیا تھا، وہانی ناموں
میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ رویا میں کوئی خاص
وصف تھا جی پروفیسر کشتاں کشتاں اس کی طرف چلا جا رہا
سب تک

اپنی کلاس میں لکھنے رہا تھا۔ اس کی کلاس قلم
ادب کے موضوع سے متعلق تھی۔ قلم ادب
کا موضوع کالج میں زیادہ مشغول نہیں تھا، طلبہ طالبات کی بری
تعلو اداسی مشغول تھی لہذا قلم ادب کے متعلق اس کی
اور لڑکیوں کو بلا کر کل پچھلپ مٹ تھے۔ اس کی زبان بھی
ہوتی تھیں، اولہ کو میں پچھل لے ہے۔ پروفیسر کی اس بات پر
آوازیں اٹھیں دلستے کے جنم کی تفصیلات بتا رہا تھا۔
اس کے منہ سے اپنے کل بری تھیں جیسے وہ بولے اسے مخاطب رہا۔
پروفیسر ہوس کو قلم ادب پڑھانے کو کہتی ہیں بچے
تھے۔ اب اس نے سارا انصاف اپنی یاد ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی
تنہا میں گزر رہی تھی۔ وہ مدت سے اپنی ذات کے بہتر میں
جل رہا تھا۔ اس کے خیالات دلستے کے بہتر کی طرح سیاہ اور
درد ناک تھے۔ ساج کل کلاس کی ایک لڑکی رویا کی کی کردی
ہی ہوتی تھی۔ رویا سے بھی ان منگل کے بعد اور جمع کو کلاس
میں آتی تھی۔ پروفیسر اس کی دوستی سے عجیب اذیت میں مبتلا
ہو جاتا تھا۔ رویا کی طرف ایک نظر دیکھتے تھے جی اسے بھی
تھی کہ کہیں طلبہ کو اس کے دل کا حال معلوم ہو جائے وہ نہ چاہے
کیا سمجھیں۔ پروفیسر رویا پر اس ایک سرسری نظر ڈال لیا۔ وہ بری
نظر اس کے دلی جذبات کی عکاس نہیں ہوتی تھی۔ بسا اوقات وہ
ایک احساس جرم کے تحت اپنی نظر لاتے ہی اس روک لینا پورے
گھٹتے وہن میں ایک اذیت اور کش کش سی رہتی۔
پروفیسر ہوس رویا کے سلسلے میں اپنے جذبات کا تجربہ نہیں



سید فکرت کے ایک تازہ نثری عشرت
 سے جو کے قلم کا آئینہ



کہ گرد ایک غبار سا پیدا کر رکھا تھا۔ پروفیسر نے سوچا کہ وہ دیوانگی
 کے خیالات کب تک اپنے دماغ میں پالتا رہے گا یا کب گھٹنے
 ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ پروفیسر نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے
 رُخے ہوئے انداز میں کہا: ”اچھا، آج کا سبق ہم یہاں ختم کرتے ہیں۔“
 رُونیا اور دوسرے طلبہ نے تفکر کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
 شرح بالوں والی ایک لڑکی پروفیسر کو دیکھ کے عام انداز میں مسکرائی۔
 کسی طالب علم نے رک کر پروفیسر سے کوئی سوال نہیں کیا۔ غالباً
 گھنٹہ ختم ہونے کے بعد سبھی نے سکھ کی سانس لی تھی۔ کوئی بھی قدیم
 ادب سے گہری دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ طلبہ نے کہا ہیں ”اچھا نہیں“
 کرٹ سنبھالے اور باہر نکل گئے۔ وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ نہیں
 کوئی جلدی نہیں ہے حالانکہ وہ جلد از جلد کلاس سے نکل جانا
 چاہتے تھے۔ سب کے ساتھ رُونیا بھی نکل گئی۔ وہ ان سب کے
 درمیان میں تھی۔ پروفیسر بولس نہ برآئے۔ سے گر گئے ہوئے ان
 کی گفت و شنید۔ وہ دلتے کے بالے میں کوئی بات نہیں کر رہے
 تھے۔ پانچ بجے کا وقت اور جمعے کا دن تھا۔ طلبہ ہفتے کے آخر
 کی سرگرمیوں اور ملاقاتوں پر بات چیت کر رہے تھے۔ شاید ایک
 لڑکا رُونیا سے وعدہ لینے کی کوشش میں تھا۔ رُونیا نے غیر معمولی
 خوب صورت تھی، نہ غیر معمولی مقبول، لیکن کالج میں لڑکوں کی

تھا۔ وقت کی گاڑی پل پل کر کے گزر رہی تھی۔ پروفیسر کا اضطراب
 بھی بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس اضطراب میں ایک مزاج بھی تھا۔
 عجیب وادبیات سا خزا۔ پروفیسر ایک عاشق کی طرح مہنے کے
 ان میں دنوں کا انتظار کرنا سمجھ ہی دن آتے تو اس کی ساری اقدیں
 خاک میں مل جاتیں۔ وہ پہلے سے زیادہ ناآسودہ اور طویل ہوجاتا۔
 رُونیا کی محض موجودی اسے کرب میں مبتلا کرتی۔ پروفیسر کا یہ چاہتا
 کردہ فوراً چل جانے پر جب وہ چل جاتی تو پروفیسر کا کرب دوسرا
 روپ اختیار کر لیتا۔ اسے اپنی ساری شخصیت ٹوٹتی پھوٹی معلوم
 ہوتی۔ رُونیا کے سامنے وہ اپنی پیشانی عرق آلود محسوس کرنا محالاً نہ
 کر وہ خاصا ٹھنڈا ہوتا تھا۔ وہ خود پر قابو پانے کے لیے ٹھنڈی پینے لیا۔
 وہ دلتے کے جہنم کا عذاب پیشینی انداز میں بیان کرنا رہا۔
 اس نے سوچا کہ دانستے جہنم کا بالکل میرے حالات کے مطابق
 پیش کیا ہے۔ شاید میں اپنی ہی اذیت بیان کر رہا ہوں۔ وہ بار بار
 گھڑی دیکھتا۔ وقت اتنے آہستہ گزر رہا تھا جیسے جہنم میں وقت
 نے اہمیت حاصل کر لی ہو۔ دوسرے سوچنے لگا کہ کہیں اس کے لہجے
 اس کے انداز سے اس کا انداز فی کرب تو ظاہر نہیں ہو رہا ہے
 لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ طلبہ طالبات کے سرکاریوں پر جھکے ہوئے
 تھے انھی میں وہ جوہرے بالوں والا سر بھی تھا، اس سر نے رُونیا

تعلو زیادہ تھی اس لیے ایک لڑکی پر کسی کئی لڑکے توجہ دیتے تھے۔
 پروفیسر نے سوچا کہ وہ اب رونا کو پیر سے پہلے نہیں دیکھ
 سکے گا۔ یعنی ہنسنے چلو ٹھیک ہے۔ اتنے وقت کے لیے
 وہ رونا کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے کے مذاب سے بھوٹ
 جائے گا لیکن اس خیال سے اسے اذیت بھی ہو رہی تھی کہ وہ ہنسنے
 گھٹنے اس سے کیسے بچا رہ سکے گا۔

کسی اور سے بغیر اپنے فوری جذبات پر عمل کرنے ہونے
 اس نے جلدی سے اوڑ کوٹ پہنا، بریٹ کیس اور بیٹ اٹھا یا
 اور کمرے سے نکل گیا۔ رونا زخموں سے بچنے صرف ایک نوجوان بلکہ
 دونوں جوانوں کے ساتھ خوش گیلیاں کر رہی تھی۔ حسد کے باعث پروفیسر
 ہولس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ عقیقہ دروازے سے نکل جائے یا وہیں
 رونا کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ابھی وہ اس کش مکش میں تھا کہ دونوں
 نوجوان رونا کو چھوڑ کر روانہ نکل جانے کی طرف بڑھ گئے۔ پروفیسر
 کے دل میں ایک خوش اسیر پیدا ہوئی اور اس نے ایک اسٹیشن
 کے سامنے مرتیلیم غم کر دیا۔

جب تک وہ زینے اترتا، رونا اس سے تفریباً چپاں لٹ
 دوڑ جا چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زور سے آواز لگا کر اسے روکنے
 کے لیے کہے یا دوڑ لگا کے اسے پھرتے لوگ ایک پروفیسر کو ایک
 طالبہ کے پیچھے ہوں بھاگتے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ اس نے اپنے
 آپ کو مجبور کر کے صرف تیز چلنے تک محدود کر لیا لیکن اس کا فہم
 چھوٹا تھا اس لیے وہ فہم نہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لڑکی بھی
 تیز چل رہی تھی۔ سڑک کی سڑو ہوا اس کا اسکرٹ اور کوٹ اڑا رہی
 تھی۔ اس کے چہرے بال بالوں کی صورت میں ادھر ادھر بکھر رہے
 تھے۔ چھوٹی اڑیڑی کے جوتے میں اس کی ٹانگیں زیادہ مضبوط اور
 توانا لگ رہی تھیں۔ اس کی چال زیادہ دل کش اور بدن کی حرکات
 زیادہ دل فریب معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ موٹے چٹنے اور پستے بدن
 کی کوئی بڑھاکر لڑکی نہیں تھی کہ پروفیسر فطری طور پر اس کی طرف
 توجہ دیتا۔ وہ پروفیسر کے اوکیشن سے باہر مختلف لڑکی تھی لیکن
 نہ جانے کیوں وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کیا ایک رونا
 وائیں طرف تڑپتی سا گرہہ پیچھے متحرک دیکھتی تو پروفیسر کو اپنا تعاقب
 کرتے ہوئے دیکھ لیتی لیکن اس نے ادھر ادھر دیکھ بغیر مختصر رنگ
 اور طبیعت کے مقصود کے درمیان والا راستہ اختیار کیا۔ پروفیسر اب
 بھی جرات نہ کر سکا کہ اسے آواز دے کر روک لے۔ رونا ایک
 مختصر راستے کی طرف بڑھی۔ وہاں درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جھنڈ
 کے پیچھے باقی اسٹریٹ تھی۔ اکثر لڑکے چکر لگا کر جانا نہیں چاہتے
 تھے اس لیے درختوں کے جھنڈ والا مختصر راستہ اختیار کرتے تھے۔

شاید رونا ہوش واپس ہونے سے قبل جھلت میں کچھ چیزیں خریدا
 چاہتی تھی اسی لیے اس نے یہ مختصر گروسنان راستہ نمانا اختیار کیا تھا۔
 پروفیسر نے سوچا کہ وہ اسے بڑھ کر رات کے کھانے کی دعوت
 دے سکتا ہے یہ ایک مقبول طریقہ ہے۔ شاید رونا ہوش کا ایک ہی طرح
 کا کھانا کھاتے کھاتے کھانا کھاتی ہوگی اور اس کی دعوت قبل کر لے
 گی۔ پروفیسر کو معلوم تھا کہ اکثر طلبہ باہر کے کھانے کا خرچ برداشت
 نہیں کر سکتے۔ رونا جیسے ہی جھنڈ میں داخل ہوئی، سڑکی دھندلے
 اسے گھیر لیا اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن راستہ صاف
 نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی بڑا جنگل نہیں تھا۔ کالج کی انتظامیہ منتقل میں
 اسے پھیلا کر ایک چھوٹا سا جنگل بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ پروفیسر
 نے دوڑ لگائی اور دونوں کے قریب پہنچ کر جبار میں اس پر غصہ کرتے
 چپا۔ مرس رونا واپس روٹا۔

رونا انتہائی تیزی سے سڑکی پر پروفیسر نے اندازہ لگایا کہ شاید
 اس کی آواز نے لڑکی کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ اس نے فوراً معافی
 مانگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ڈرا دیا۔

رونا نے اپنی دل کش آواز میں جواب دیا۔ میں خوف زدہ
 نہیں ہوں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے یہ جملہ پروفیسر کو نہیں اپنے
 آپ کو تعجب دلانے کے لیے کہا ہے۔

میں نے تجھ سے مختصر راستہ اختیار کرتے دیکھا یا شاید یہ
 سمجھا کہ یہ تم ہوتا افاق سے میں خود بھی اسی طرف آ رہا تھا۔ یہ جگہ
 دروازے پر اس لیے میں نے سوچا کہ تمہارا ساتھ ہے۔ دن
 اس کا بوجھ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔ رونا آنکھیں نکالے
 اسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے یقین ہو کہ پروفیسر نے جان بوجھ کر
 اس کا تعاقب کیا ہے اور کلاس سے نکلنے کے بعد سیدھا اس کے
 پیچھے آیا ہے۔

دونوں غلوں سے ان کی پھول نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا کہیں
 وہ ایک خاموش اور پراں جھنڈ میں کھڑے تھے۔ ہائی اسٹریٹ
 کا رول اور لوگوں سے کچھ کچھ ہری ہوگی لیکن وہاں کا شور بیاں
 تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ ان کے عقب میں کمیونس پر بھی خاموشی
 طاری تھی۔ دن کی کلاسیں ختم ہو گئی تھیں۔ شام کی کلاسیں شروع
 ہونے میں ابھی بہت وقت تھا۔ درختوں سے پرندوں کی پرکار
 بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس سکرٹ اور رونا کی موجودگی نے
 پروفیسر کے غم کی گروسٹن تیز کر دی تھی۔ اس کے دماغ میں وہ
 باتیں گڑبڑ ہو گئیں جو وہ رونا سے کہنے کے لیے اکثر سوچتا تھا،
 وہ رونا کو کھانے کی دعوت دینا بھی معمول لگایا۔

رونا بولی۔ میں جلدی میں ہوں۔ یہ کہہ کے اس نے اپنی
 سب گنگ

جگہ سے حرکت نہیں کی یا وہ حرکت کر ہی نہ سکی۔ ساحل کی غلامی
سے اُس کی رنگت اور زرد ہو گئی تھی۔ اُس کا چہرہ خوف ناک حد
تک سفید دکھائی دینے لگا جیسے کسی بے جان چیز کا چہرہ ہو۔ پرفیسر
کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہوا کہ وہ رسمی باتیں چھوڑ دے اور سیدھے
سیدھے اپنے دل کی بات کہہ ڈالے۔ ”میں رو دنیا، اب مجھی میں
تم سے گفتگو کی کوشش کرنا ہوں تم جلدی میں موتی ہو۔ یہ پتا
اُس نے کیسے کہہ دی۔ وہ اپنی برکت پر حیران رہ گیا۔

”معلم نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“
”میں نے تم سے بار بار کہا کسی روز میرے دفتر آ کر مجھ سے
بات کرو۔ تم نے کئی دفعہ وقت بھی مقرر کیا لیکن آئیں نہیں میں
انتظار ہی کرنا رہ گیا۔ یہ بعد میں ہم نے یہ ہانا دیا کہ تم بھول گئی
تھیں۔ پھر تم نے دوبارہ وقت مقرر کیا لیکن تم پھر بھول گئیں۔
راہ داری میں بھی تم مجھ سے کڑا کر بھل جانے کی کوشش کرتی ہو۔ میں
نے کئی بار تمہیں بھلا بھی دیا لیکن تم نے ایسا ظہر کیا جیسے سنا نہ ہو۔ اچھی
لوک، ایک پروفیسر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلبہ سے
ذاتی ملاقاتیں کرے۔ اسی طریقے سے استاد یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اُس
کے شاگرد کیا پڑھ رہے ہیں کتنا آگے بڑھ رہے ہیں۔ تم بہت
حساس لوگ ہو۔ مجھے یقین ہے تمہیں ان ملاقاتوں سے بے حد
فائدہ ہوگا۔ میں اپنے طلبہ کی ترقی چاہتا ہوں۔ وہ خاموش ہو گیا
یہ ساری باتیں کتنی بھونٹی اور منافقانہ تھیں۔

رو دنیا اب ذہین لوگ تھی۔ پروفیسر جھوٹ بول کے اُسے
نااہل نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے حال ہے۔ وہ بولی لیکن اپنی جگہ سے
ہل نہیں۔ شاید وہ ڈر رہی تھی کہ پروفیسر اُسے جانے سے روک دے گا۔

”سنو رو دنیا! پروفیسر انتہا کے انداز میں برا بھلا تم مجھ سے بات
کیوں نہیں کرئیں؟ مجھے سے دور دور کیوں رہتی ہو؟ ہمیشہ کوئی نہ
کوئی بہانہ کیوں بنا دیتی ہو؟“ وہ اُس کے قدموں میں بچھا جا رہا
تھا لیکن اُسے کسی سبکی کا نہ احساس تھا، نہ پرہیز تھی۔ تم سے کم اتنا
تو تھا کہ آج وہ پہلی دفعہ اپنے دل کی گہرائی سے ایک بات کہہ رہا تھا۔
رو دنیا فی میں سر ہلانے لگی۔ آپ میرے استاد ہیں، ایک
پروفیسر ہیں اور میں....“

”اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا نوجوان طلبہ کو تم گفتگو
کا زیادہ حق حاصل ہے؟ اگر میں ایک طالب علم ہوتا اور تمہارے
برابر بیٹھا تبھی کیا تم مجھ سے بات چیت کرتیں؟ دیکھو میں بھی ایک
انسان ہوں اور تم ایک دل کش لوگ ہو۔ میں ایک باعزت اور غیر
شادی شدہ آدمی....“
”آپ بڑے ہیں۔“

سب نگ

رو دنیا کے منہ سے یہ الفاظ پروفیسر کو ایسے معلوم ہوئے جیسے
بڈھا ہوا ایک غلط بیع اور نفرت انگیز کالی ہو۔ یہ ایک نوجوان
طیحا تھا۔ یہ اُس کی چٹک تھی۔ کیا وہ اسی سلوک کا متحمل تھا؟ اُس
نے آہستہ سے کہا۔ میری عمر اسی سال ہے۔ یہ ایک چھوٹا
سا جھوٹا تھا۔ اُس کی عمر اسی سال تھی۔ میں کوئی امیر یا وجیبہ
آدمی نہیں ہوں۔ یہ بات بتاتے ہوئے اُسے خود سے نفرت ہونے
لگتی تھی مگر کتنا بے کئی نوجوان دوست بھی امیر یا وجیبہ نہیں ہیں۔
اُن کی لیاقت بھی مجھ سے کم ہے۔ میں اُن سے زیادہ علم رکھتا
ہوں۔ میں نے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں۔ میری علمیت کا اندازہ
میرے لیکچر میں سے نہ لگاؤ۔ وہ تو مجھے خود معلوم ہے۔ غیر دلچسپ
اور محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے نصاب کے مطابق پڑھنا پڑھنا ہے۔
کلاس سے باہر میں بہت دلچسپ اور ذہانت کی باتیں کر سکتا ہوں
بشرطیکہ مجھے یہ معلوم ہو کہ تم میری باتیں غور سے سنو گی رو دنیا تم مجھے
تحریک دے سکتی ہو میرے خیالات کو جلا بخش سکتی ہو کیونکہ میں
تم سے محبت کرتا ہوں۔“

رو دنیا نے بھانگنے کی کوشش کی۔ پروفیسر بولس نے اُس
کی کلائی پکڑ لی۔ وہ اُس کی گرفت میں پکڑ پکڑا لیکن خود کو کھینچا
نہ سکی۔ پروفیسر پہلی دفعہ اپنی مڑاؤ طاقت کا احساس ہوا، اِس
طاقت کے آگے ایک لوگ بے بس تھی۔

”مرا مجھے چھوڑ دیجیے۔ جانے دیجیے مجھے۔“ رو دنیا نے التجا کی۔
خوف سے اُس کی آواز بھاری اور بھتیجی ہو گئی تھی۔ اگر آپ نے
مجھے چھوڑ دیا تو میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ آپ نکر نہ کیجیے۔“

”تم کسی کو بتاؤ گی؟ کسے بتاؤ گی؟ پروفیسر نے اُسے کھینچ کر اپنے
قرب کر لیا اور اُس کے چہرے پر جھک کے کہنے لگا۔ میں تمہارے
ساتھ کون سی خطر ناک بات کر رہا ہوں۔ جب تم لوگوں کے ساتھ
جاتی ہو تو وہ تمہیں مجھ سے زیادہ کھینچتے ہوں گے۔ اُن پر تمہیں کوئی
اعتراض نہیں ہوتا ہوگا پھر مجھ سے یہ غلط سلوک قبول کر رہی ہو؟
رو دنیا نے چپچپے کی کوشش کی لیکن اُس کی آواز گلے میں
گھٹ کے رہ گئی۔ اُس نے منہ کھولا کھینچنے کی غواہش آنکھوں
میں چمکے گی۔ اِس جھکے پروفیسر بولس کو خوف زدہ کر دیا۔ معاً
اُس کے ہاتھ لوگ کے گلے کی طرف بڑھے۔ نا کہ وہ اُس کی جھج روک
دے۔ اُس نے شدت اور نفرت سے لوگ کی گردن دانی۔ لوگ
گر پڑی۔ ساتھ ہی پروفیسر بھی گر لیا لیکن اُس نے لوگ کی گردن پر
گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اُس کے داغ میں ایک خیال صرف ایک
خیال تھا کہ لوگ نسوانی چٹک سن کر دوڑتے ہوئے آئیں گے اور
انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک پروفیسر کو ایک طالبہ نے کس طرح

دھکا کر دیا۔ بہتر ہے کہ لوہی کی چیخ کو باہر نکلنے کا موقع نہ دیا جائے۔
اُس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ لوہی کا چہرہ پیلا اور سفید پڑا تا کہ ایک
یہاں ہمک کا منہ ہو گیا اور کلا بڑھ گیا۔

رونیائے خامی دیکھ کر کوئی مداخلت نہیں کی کوئی حش
نہیں کی۔ آخر پروفیسر پولس آہستہ سے کھڑا ہوا۔ لوہی زمین پر
بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اُس کا رنگ ارد گرد کے سایوں سے
زیادہ سیاہ ہو گیا تھا۔ پروفیسر چند لمحوں تک ساکت و صامت کھڑا رہا
تاکہ سانس معمول پر آجائے۔ اُس کا ذہنی انتشار تیزی سے دور
ہونے لگا۔ اُسے ایک نئی حقیقت کا احساس ہوا۔ اُس نے یعنی
پروفیسر پولس سے ایک معقول آدمی نے قتل کر دیا ہے۔ وہ قاتل
ہن گیا ہے۔ اُسے یہ نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ لوہی مر
گئی ہے۔ وہ مر چکی تھی اور دو خون کے مڑوہ قتل پر اُس کے پرش
کے پاس پڑی تھی۔ وہ اُس کی ناہنجس جھکتی ہوئی دیکھ سکتا تھا۔ اُس
کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور اُسے گھور رہی تھیں۔
اُس کے ہاتھ سے کتاب گر گئی تھی اور زمین پر کھلی پڑی تھی۔ پروفیسر
نے سرگوشی کرتے ہوئے بڑا فحش بے رویہ کہا: "میں یہ نہیں چاہتا تھا۔
اب تو دنیا کے لیے وہ اپنے دل میں محبت بھی محسوس نہیں کر رہا
تھا۔ اُس کی آخری سانس کے ساتھ پروفیسر کی محبت بھی اڑ گئی تھی۔
جس پر پوسے پروفیسر نے محنت کی تھی وہ سب کچھ ہوا گیا تھا۔ دنیا
کے ساتھ دنیا ہو گیا تھا۔ ایک مردہ بدن سے کون محبت کر سکتا ہے۔
پروفیسر سے ایک خوف ناک مخالفت سرزد ہو گئی تھی۔ اب اس کا
ازالہ نہیں ہو سکتا تھا۔ دنیا میری تھی، اُس کی کوئی مدد نہیں کی جا
سکتی تھی، اُسے دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن پروفیسر تو
زندہ تھا اور اُسے زندہ رہنا تھا۔ خود کر جانے کی قیام جہلی خواہش
اُس کے دماغ کو پیغامات بھیج رہی تھی۔ کیا اُسے کسی نے لوہی کے
پیچھے جھنڈ میں داخل ہونے دیکھا تھا؟ نہیں؟ شاید کسی نے نہیں
دیکھا تھا۔ سارا کہیں ویران پڑا تھا۔ اگر کسی نے اُسے دیکھا بھی ہو
گا تو کیا وہ اُسے اس کم رونق بی بی پہچان سکتا ہے؟ اگر اُس کی
میاں موجودی ثابت بھی ہو جائے تو کیا اُسے اس جہم میں ٹوٹ کر کیا
جا سکتا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ ممکن یہ ممکن ہے جی کہ وہ متحمل
کا آٹا دے۔ آج اُس سے اُس کا ناقص کیا تھا۔ آج سے پہلے کئی
بار وہ راہ داری میں اور زینوں پر اُسے رک کر اپنے دفتری اُنے
کا وقت مقرر کر چکا تھا۔ ممکن ہے مرنے والی نے اُس کے پڑوس
رہنے کا ذکر اپنی کسی سہیلی یا کسی دوست سے کیا ہو۔ اس صورت میں
اُس پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔

واردات کی جگہ سے غیر حاضری؟ وہ اپنی غیر حاضری ثابت

نہیں کر سکتا۔ اگر اُس نے لوہی کو راؤڈ قتل کیا ہوتا تو کوئی منصوبہ نہاتا
لیکن یہ تو ایک قطعی غیر ارادی جذباتی اور جذباتی قتل ہے۔ اُسے تو
کوئی جہنم نہیں، وہ ایک صبح الدماغ آدمی ہے۔ اُس نے لوہی کی
چیخ رکنے کا فیصلہ بڑے منطقی انداز میں کیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ
لوہی کی چیخ اُس کی عزت اور نوکری دونوں کو خطرے میں ڈال سکتی
ہے۔ فرض کیا کہ وہ ایک جونی قاتل ہے جو اُس لوہی کو کنا بلو میں
کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتا ہو، وہ ایک سفاک شکاری
ہے جس سے اُس کا شکار چھین لیا گیا ہو، وہ ایک پاگل آدمی ہے جو
تشنہ دار انتقام سے اپنے نا آسودہ جذبات کی تسکین کر رہا ہو۔ ایسا
آدمی کیا کرے گا؟ کس طرح قتل کرے گا؟ یہ قتل کس طرح واقع
ہونا چاہیے۔ یہ واردات ایک پروفیسر کی واردات نہیں لگتی چاہیے
بلکہ ایک سفاک دمنے کی دردنگی معلوم ہونی چاہیے۔

وہ نہایت سکون سے ایک نیچے پر بیٹھا۔ اپنی جیس ٹوٹل
کے اُس نے ایک چھوٹا سا رنگ آلود چاقو نکالا۔ اس سے وہ اپنے
پاشپ میں جی ہوتی گندگی صاف کرنا تھا۔ آج اُسے اس چاقو سے
دو سال کا کام لیا تھا۔ وہ اس ہول ناک کام کے لیے تیار نہیں تھا لیکن
مجبوری تھی۔ اُس نے جھک کے چاقو کھولا تھا تو کھنکھارے اور اس
مقصود کے لیے نہیں بنا تھا چھری چھ کام چل گیا۔ اُس نے لاش پر
کئی زخم لگائے، زخم کرے نہیں تھے لیکن خون نکلنے لگا۔ یہی اہم
بات تھی۔ اُس نے رو دنیا کی پشانی زرخشا گردن اور ناہنجس چھری
ڈالیں پھر سوچا کہ اتنا کافی ہے اب فاما خون نکل گیا ہے۔ وہ
کھڑا ہو گیا۔ اپنی دانت میں وہ اچھی کھ خطبے میں تھا۔ اُسے
چاقو اپنے ساتھ لے جانا تھا، اگر وہ اُسے ادھر ادھر پھینک دیتا
تو لوگ پہچان لیتے کہ یہ کس کا چاقو ہے۔ اُس نے چاقو ڈال میں
پہنٹ کے اپنے بریقٹ میں رکھ لیا۔ اُس کا رومال اور ہاتھ
خون سے لٹھر ڈھنگے تھے، کپڑوں پر کئی جگہ خون کے دھبے پڑ گئے
تھے۔ اُس نے سوچا کہ اُسے اپنے پیرے صاف کرنے ہوں گے اور
انھیں ضائع کرنا ہوگا۔ یہ کام کرنے کے لیے اُس کے پاس بہت
وقت تھا۔ اُس نے پلٹ کر کیمپس کا راستہ لیا۔ یہ ایک صبح فیصلہ
تھا کیونکہ کیمپس ویران اور خاموش تھا۔ لاہری بیٹھے تھے کسی
نے اُسے نہیں دیکھا۔ وہاں سے وہ سیدھا پورڈنگ ہاؤس کی طرف
گیا۔ رات کے کھانے پر وہ ناہنجس سے نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔
لاش اسی شام دیکھی گئی۔ دوسرے دن اخبار نے ٹبری
بڑی سرخیاں لگائیں۔ ہوس نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا، دیر تک سوتا
رہا۔ سید پر کو دیر تک سوتا اُس کا دستور تھا لیکن آج دراصل وہ سو
نہیں رہا تھا بلکہ لیٹا ہوا نیچے سے آنے والی آواز میں سن رہا تھا۔
سب تک

فوراً حل ہو جائے
تازہ دودھ بن جائے



عمدہ ہے
لِطَامِلِک
اُعلیٰ ہے
لِطَامِلِک

لِطَامِلِک



ہا لینڈ کا مشہور عالم

انسٹنٹ مِلک

آب ہر جگہ دستیاب ہے

REPCOM

تھی۔ اس کے شوہر سرفینچ ایک پیکر تھے۔ سرفینچ کہہ ہی تھی۔ ہاں
بے چاری لوگوں! آہ، اس کے ساتھ کیسا ہلناک واقعہ پیش آیا۔
تو سب نے فرمایا۔

”او کیسی جوان تھی۔ ایک کنواری عورت مس جانسن نے
افسوس سے کہا۔ اس عورت کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے
باسے میں مشہور تھا کہ وہ جوانی کے اصولوں کی پرستار ہے۔ وہ ناٹب
لائبریرین تھی۔“

رومانی کے لیکچرر ٹمبل نے مغفل کے متعلق کہا۔ وہ ایک
نفیس لڑکی تھی۔ ٹمبل بیک دوشی کی عمر کو بچہ چکا تھا۔ اس
کی آنکھیں رمانی کے ہندسے پڑھنے پڑھتے خاص کر دہری گئی تھیں۔
اس نے مونے مونے ٹیٹیشنوں کی عینک لگا رکھی تھی۔

”سرفینچ نے پوچھا۔ مشر ٹمبل آیا آپ اسے جانتے تھے؟“
”ہاں کچھ کچھ۔“
”میں نے بال بولے تھے۔“ ہولس نے نصیحت کی۔

”اوہ ہاں۔“ ٹمبل بولا۔ میں بھول گیا تھا۔“

نفسیات کے استاد جہولس کا چہرہ جب اٹھا۔ یہ گرسہ رنگ
اور گلہ ہرے کا ایک میانہ قد جوان تھا۔ اس کی طبیعت میں تیزی
طراری تھی۔ چٹنے کے پیچھے اس کی آنکھیں بے چین رہتی تھیں۔
اس نے ہولس سے پوچھا۔ وہ لڑکی کنواری کلاس میں تھی یا بوسن؟
”ہاں میری کلاس میں تھی۔“ ہولس نے جواب دیا۔

”تو پھر تم کوہیں نہیں بولتے کچھ؟“ سرفینچ نے کہا۔ وہیں تباہ
کہ وہ کیسی لڑکی تھی؟“

”بس ہم سنی لڑکی تھی جیسی دوسری لڑکیاں ہوتی ہیں۔“

”دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔“ نفسیات کے استاد

جہولس نے کہا۔ اسی لیے تو میرے مضمون نفسیات ایک دلچسپ علم ہے۔

”واقعہ یہ ہولس نے خوش دل سے کہا۔ تمہارا مضمون بے حد

دلچسپ ہے۔“

”ہاں۔“ جہولس نے فرسے کہا۔ مجھے لڑکی سے اتنی دلچسپی

نہیں۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی، جیسا تم نے ابھی کہا۔ بیس سال

کی ایک نوجوان اور پرسنٹس لڑکی، مردوں میں زیادہ دلچسپی لینے

والی لیکن مجھے جس شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، وہ قاتل کی

شخصیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں، وہ ایک خاص طرح کا آدمی ہے۔“

”کس طرح کا آدمی؟“ ہولس نے تعجب سے پوچھا۔

”کوئی باگل ہوگا۔“ سرفینچ نے رائے ظاہر کی۔

”کوئی بھوت پریت؟“ ناٹب لائبریرین مس جانسن بولی۔

”ہاں کسی حد تک کہہ سکتے ہیں۔“ جہولس نے کہا۔ لیکن ایک

سبب تک

لوگ اخباری خبر پر بحث کر رہے تھے۔ پروفیسر اٹینان سے اٹھا
اور کڑے بدل کے پیچھے پہنچا۔ سب لوگ کیمپس جانے کے لیے
نیا تھے۔ پروفیسر بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گیا تاکہ کسی کو اس پر
ٹھک نہ ہو۔

کیمپس میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اساتذہ طلبہ اور شہری جمع
تھے۔ سب لوگ گھاس والے قطعہ اور درختوں کے چھند میں چلے
ہوئے تھے۔ پروفیسر نے اٹینان کی سانس لی۔ قد میں وہ غور کر لٹا تھا
ہجوم نے گڈ مڈ کر دیے تھے۔ لاش بہت دیر پہلے لے جانی جا چکی
تھی۔ قتل کے باسے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔
کچھ لوگوں نے کہا کہ لاش مر رہی تھی اور اس پر جنسی تشدد کے نشانات
تھے۔ لوگ لاش کے ٹکڑوں کی وجہ سے قاتل کے لیے نفرت
اور غصے سے اٹیں کر رہے تھے۔ ایک نکتے پر سبھی متفق تھے کہ
قتل کسی پاگل کسی جنونی نے کیا ہے۔ ہجوم میں ایک طرح کا لذیذ
خوف دوڑ رہا تھا۔

ہولس مطمئن رہا۔ اس نے آہستہ آہستہ پولیس کے سامنے یہ شبہ
ظاہر نہیں کیا تھا کہ ردینا کو پروفیسر ہولس نے قتل کیا ہے۔ ہولس
کو یقین تھا کہ تفتیش کے دوران پولیس اس سے بھی پوچھ گچھ
کرے گی۔ پولیس ہراس آدمی سے پوچھ گچھ کرے گی جو ردینا سے
واقف تھا۔ اس نے سوچا کہ اب تک اس نے اپنے آپ کو
اچھی طرح محفوظ رکھا ہے۔ رات کسی نے اسے ہوش میں ڈال
ہوئے تیس دیکھا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور دروازہ
منقل کر کے اس نے کپڑوں کا غور سے معائنہ کیا۔ خوش قسمتی سے
اس کے کپڑوں پر خون کے بہت کم چھینٹے لگے تھے۔ اس نے
صاف اور بانی سے کپڑوں، جوتوں، رد مال اور برلیف کپس کا سارا
خون دھو ڈالا۔ اب اس کے کپڑوں پر کوئی دھبہ نظر نہیں آتا
تھا لیکن اس نے سوچا کہ وہ بار بار کپڑوں کا جائزہ لے گا، ایسا نہ
ہو کہ کوئی داغ رہ جائے۔ وہ رد مال مریخ ہو چکا تھا جس میں اس
نے چاقو لپیٹا تھا۔ رد مال جلا کے اس نے راکھ تلنے میں بہا
دی۔ چاقو کو وجہ سے وہ پریشان تھا۔ نیا چاقو دیکھ کر شاید کسی کو
ٹھک ہو جائے لہذا اس نے چاقو خوب دھو کر صاف کر لیا۔ اب یہ
چاقو کیمیائی تجزیے کے بعد بھی صاف نکلے گا۔

”دوبارہ کے کھانے پر بھی لوگوں میں قتل کے متعلق بحث ہو
رہی تھی۔ سب لوگ کیمپس ہو آئے تھے۔ اس لیے ذرا ٹھک کر اس
موضوع پر بات کر رہے تھے۔ ہوش کی ہنرمیں سرفینچ نے بحث میں
بڑھ چڑھ کر حقد لیا۔ ہر شخص اس کی بات تو جبر سے سن رہا تھا۔ وہ
چھاپس سال کی ایک خوش مزاج سمجھ دار صحت مند اور مہنتی عورت

فائل عام طور پر ایک غیر معمولی آدمی ہوتا ہے۔ ہم سب کبھی نہ کبھی پہنچتے ہیں کہ کسی کو قتل کریں لیکن ہم میں سے اکثر اتنی برکت پیدا نہیں کر سکتے یا ہمارے جذبات اتنے مشتعل نہیں ہوتے کہ جو شخص میں آکر قتل کر دیں لیکن قتل کرنے کے لیے حوصلہ اور جذباتی اشتعال اگر معمول کے مطابق نہیں ہوتا پھر بھی اسے آپ غیر معمولی کیفیت نہیں کہہ سکتے۔ یہ معتدل حالت ہوتی ہے مگر دونا کے قاتل نے جس طرح چاقو سے لاش بگاڑی ہے اس سے ایک غیر معمولی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔“

”کس طرح کی غیر معمولی کیفیت؟“ پولس نے یہ سوچ کے سوال کیا کہ شاید پولیس کا مابہر نفسیات بھی جیولس کی طرح کوئی نقطہ قائم کرے۔“

”یہ بات میں کسی منہ کے بغیر کہہ رہا ہوں۔“ جیولس کو اپنی علیحدت کی نمائش کا بہت شوق تھا، اس کے لیے اسے یہ موقع بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک عام آدمی کو پیچھے ڈھکیں کیا کہ اس کے پاس قتل کرنے کا معتدل حواس ہے، وہ ایک دلیر آدمی ہے یا مشہور جذبات کا مالک ہے قتل کا فعل اور قتل کی تباہی اس کے جذبات کو تسکین دیتی ہے۔ مثال کے طور پر میری ایک بیوی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ بے وفاء ہے۔ اس صورت میں اسے قتل کرنے کا عمل اور یہ حقیقت کہ وہ مر چکی ہے میرے حواس زیادہ مضبوط بناتا ہے۔ جذبات کو تسکین دینے کے لیے کافی ہے۔ میں اس کی لاش چھڑا گا، پھاڑوں گا نہیں۔ پیر نے پھاڑنے کا عمل کس بات کی غمازی کرتا ہے؟ اس بات کی کہ قاتل یقیناً ذہنی پرگندگی میں مبتلا ہے لیکن یہ پرگندگی کس نوعیت کی ہے؟ کلا گھوٹ کر جان لینے سے اسے تسکین نہیں پہنچی۔ یہ حقیقت اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں کر سکتی کہ وہ پناہ چکی ہے۔ قاتل بچہ اور بھی چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دنیا کی لاش بگاڑ دی۔“

”واہ جیولس! ہم واقعی ایک زیرک شخص ہو۔“ مسر فریج نے اس کی تعریف کی۔

”یہ نہ صرف سرسری تجزیہ ہے مسر فریج! اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں۔“ جیولس نے فریج سے کہا۔

”کیا باتیں ہیں؟“ مسر جانسن انھیں نکال کر لوپو چنے لگی۔

”سوال یہ ہے کہ کیا قاتل کو لاش بگاڑنے کے بعد کوئی تسکین حاصل ہو سکتی ہے؟“

”سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر ٹریبل نے دریافت کیا: اس سوال سے تمہارا کیا مطلب ہے جیولس؟“

بگنگ

جیولس نے ان کے سر میں کے اوپر دیکھتے ہوئے کہا: میرا تجزیہ ہے کہ قاتل ایک تنہا آدمی ہے۔ اس نوع کے واقعات میں تنہائی ضرور ایک عنصر ہوتی ہے۔ یہ تنہائی صرف چند لحظات کی باعاضی حالات کی نہیں ہے بلکہ قاتل مزاج کے اعتبار سے ایک تنہا فرد ہے اور بچپن کے خراب حالات کی وجہ سے ابھی تک بچپن کی حدود سے تھیں نکلا ہے۔ مجتہد عمر تک پہنچ کر بھی اسے کوئی تعامل حاصل نہیں ہوا، میرا مطلب ہے کوئی ایسا تعامل جس کی وجہ سے وہ مشہور و معروف ہو جائے اور ہم محض اس کی عزت و توقیر نہیں۔

اب یہ واقعہ بھی اس کی ناکا میں میں شامل کر لینا چاہیے مگر قاتل نے ضرور اس کی محبت ٹھکرا دی ہوگی۔ یہ قاتل یقیناً ایک کنواری اور گوشہ نشین آدمی ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی غار وغیرہ میں رہتا ہوگا۔ وہ لوگوں سے ملنا ملتا ہے لیکن کسی مرد یا عورت سے اس کی دوستی نہیں ہے نہ کوئی اس کا راز دار ہے۔ وہ ایک خوف ناک تنہائی کا شکار ہے۔ اسے ہمیشہ رونا لپٹا ہے اسے ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور اسے ہمیشہ کما لے کر لکھا گیا ہے۔ فرض کیجئے اگر آپ اس حالت میں ہوں تو کیا آپ کے دل میں انسانوں کے لیے کوئی محبت باقی رہ سکتی ہے؟“

حاضرین میں سے صرف مسر فریج شادی شدہ تھی۔ نائب لاہیرین مسر جانسن، پولس اور جیولس سب کنوالے تھے۔ مسر جانسن اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر غمناک سی



خواتین کے لیے بطور خاص ایک بار پھر

سایہ ری تیل بنانے والوں کی جانب سے چہرے کی خوب صورتی اور حفاظت کے اسرار پر مشتمل کتابچہ بطور تحفہ روانہ کیا جا رہا ہے۔

اگر آپ نے ابھی تک یہ کتابچہ نہیں منگوا یا ہے تو ازراہ رقم ذیل کے پتہ پر خط لکھیے۔ آپ کا خط طے ہی یہ خوب صورت کتابچہ آپ کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے گا۔

مینجر: صابر پروڈکٹس
پوسٹ بکس ۱۸۰۳۲، کراچی (پاکستان)

پولیس چیف کیگل نے اس واقعے کی تفتیش اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ کسریٰ جسم کا ایک گنجا آدمی تھا۔ اس کی بے ذمہ داری سے بھانپتی ہوئی کالی آنکھیں بہت تیزی سے گمراہی میں مبتلا جاتی تھیں۔ وہ انتہائی ذہانت سے ہر بات کا جائزہ لیتا تھا۔ کوئی چیز اس کی آنکھوں سے زیادہ دیرا دھل نہیں رہتی تھی۔

اس نے دوسرے کئی پروفیسر کے علاوہ مقتولہ کے استاد پروفیسر ہولس سے بھی پوچھ گچھ کی سوالات بے فروز قسم کے تھے لیکن ہولس کی کیگل کے انداز سے اور ہو گیا۔ کیگل نے اس سے یہ نہیں کہا کہ وہ قتل کے وقت جیسے قتل سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرے کیگل نے کوئی اور بات بھی براہ راست نہیں پوچھی۔ بس یہ گزارش کی کہ پروفیسر ہولس! آپ لوگ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے قانون سے تعاون کیجیے۔ ہولس کو شک ہوا کہ کیگل اس کے جوابات سننے کے بجائے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ ہولس انتظار کرنے لگا کہ کشتی تلوار کب گرے گی۔ وہ کیگل سے اس سوال کی توقع کر رہا تھا کہ پروفیسر ہولس! سنائے آپ اس لوگ میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے؟ لیکن یہ سوال نہیں کیا گیا۔ ہولس نے سوچا، ممکن ہے کہ کیگل بہت سی ایسی باتیں جانتا ہو مگر اسے بتانا نہ چاہتا ہو۔ بہر حال پوچھ گچھ ختم ہونے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی۔

پھر ایک دوسری بات سے اس کی پریشانی دوبارہ شروع ہو گئی۔ اخباری اطلاع کے مطابق ایک باہر ڈاکٹر نے مقتولہ کی لاش کا ٹروہ بن سے معائنہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ لاش پر زخم ایک کنڈ جاقو سے لگائے گئے تھے۔ یہ خاصی محبتس کی بات تھی۔ اگر قاتل اپنے لشکار کی لاشیں بگاڑنے کا منصوبہ پہلے سے بنا کر آتا تو اپنے ساتھ تیز جاؤ لاتا زخمیوں میں پائے جانے والے مواد کا کیمیاں تجربہ کیا گیا۔ چہ جلا کہ وہ تمباکو کا جلا ہو یا لٹھا جو بائپ کے منہ میں ہوتا ہے۔ قاتل بائپ پیٹنے والا آدمی تھا اور اس نے وہ جاؤ استعمال کیا تھا جس سے وہ بائپ کا پیل کھینچ کر نکالنا تھا۔ پیمپس میں بائپ پیٹنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ورنہ پروفیسر اس کت میں مبتلا تھے۔ لوگ بھی تفتیش کے طور پر بائپ پانی لیتے تھے، ان کے علاوہ سیکرٹریوں ہزاروں شہریوں کو بائپ پیٹنے کا شوق تھا۔ پولیس کس کس کو پکڑتی یہ کوئی مفید سرچ نہیں تھا اس لیے ہولس نے بریٹان ہونا چھوڑ دیا۔

اس دوران جہولس نے ایک اخباری نمائندہ سے ملازمت لے لیا۔ انٹرویو میں بھی اس نے وہی باتیں دہرائیں جو ہولس سن چکا تھا۔ جہولس نے پھر زور سے کر کہا تھا کہ جس پاگل شخص نے

حقی ٹرمبل اپنے تھکے ہوئے داغ کے ساتھ پیمپس بھیس کاٹا رہا۔ پروفیسر ہولس اس بات پر خوشن تھا کہ اس نے کامیابی سے ایک پاگل کا ردپ دھار لیا ہے لیکن جب جہولس نے اپنے جزیے کی مزید تشریح کی تو اسے ذرا پریشانی ہوئی۔ جہولس کہہ رہا تھا کہ دنیا کے قتل کے سلسلے میں دو امکانات ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ قاتل اسے جانتا تھا اور روپے قاتل کو ٹھکر دیا ہو گا دوسرا امکان یہ ہے کہ قاتل اس لوگ کے لیے انتہائی نفیسا لیکن اسے لوگ کو نما انسانوں کی نمائندہ سمجھ کر اس سے انتقام لے لیا۔

استدلال کا یہ طریقہ ہولس کے حق میں جانتا تھا۔ گویا کوئی بھی شخص۔ دنیا کا قاتل ہو سکتا ہے جو دنیا سے ذاتی طور پر واقف نہ ہو۔ جہولس نے گفتگو جاری رکھی لیکن میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ کیا وہ قاتل انسانوں کے اس فخر خلافت ہے کہ قتل کے بعد اسے لاش بگاڑنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے؟ یا اس کے بعد بھی اسے تسکین حاصل نہیں ہوتی؟ اور اسے... وہ ڈرامائی انداز سے لگ گیا۔ وہ بارہوی پونا تانہ عملہ کرنا پڑے گا؟

یہ بات بعد از قیاس ہے۔ پروفیسر ہولس نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔

جہولس نے سر دنگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ ہولس تبھی اس بات کا لیے یقین ہے؟

ہولس کو ایسا عسوس ہوا جیسے وہ توازن کھونے لگا ہو یہی حالت رات کو درختوں کے جھنڈ میں قتل کے ازکاب کے بعد ہوتی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، سب اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ برابر مطلب یہ ہے کہ وہ انکا ایک آدمی کتابچی دنیا کے خلافت ہوا انسانوں سے کتنا ہی متنفر ہو، اس کے انتقامی منصوبے کو تسکین دینے کے لیے ایک قتل کافی ہے۔

لاش بگاڑنے کے بارے میں تھا کہ کیا خیال ہے؟

اس سے قاتل کو مزید تسکین پہنچی ہوگی؟

یہ بھی تو ممکن ہے کہ قاتل کی جھوک اور تیز ہو گئی ہو؟

ہولس پر کچھ عماری ہو گئی۔ خود پر تباہی پانا اسے مشکل معلوم ہونے لگا۔ میرا خیال ہے کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ اس نے ہلکاتے ہوئے کہا۔

”دیکھتے ہیں کون غلط کہہ رہا ہے۔“ جہولس نے اپنی باتوں سے جوسنی پیدا کر دی تھی، اس سے وہ بہت محفوظ ہو رہا تھا۔ اس نے مزے لینے کے لیے مس جانسن کو مخاطب کیا اور بہت راز داری سے سرگوشی میں بولا کہ اگر میں ایک عورت ہوتا تو جب تک قاتل پکڑ نہ لیا جاتا، میں بہت مختار رہتا۔ مس جانسن ہلکی



”ایک کنرا شادی کے باسے میں کب ہو چکا ہے؟“

”جی ہاں کی سوچ جواب نے جاتی ہے۔“

”جیسے کیا اپنی بڑی کو قطعاً سچ کے لیے ساتھ لے جاتے ہیں۔“

”جی نہیں، میں شادی شدہ عورتوں کے ساتھ تفریح کا قائل نہیں ہوں۔“

”جیسے شادی کے موقع پر برومیسیٹی کا اہتمام کیوں کیا جائے؟“

”دو لاکھ پچاس ہزار دلائے کے لیے کہ یہ عروسی کا موقع ہے۔“

”جیسے ہماری ہر شے تر فلموں کا انجام شادی پر کیوں ہوتا ہے؟“

”ہم سب فلمیں غریب یعنی کامیڈی کے مقابلے میں ایسے ہی ٹریجڈی زیادہ پسند کرتے ہیں۔“

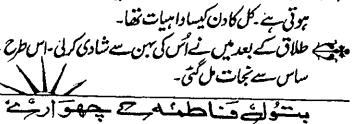
”جیسے مجھے شادی کے لیے ہزاروں بار درخواستیں ملی گئیں“

”کس نے کس؟“

”میرے والدین نے“

”جیسے ہماری شادی کو وہ سال ہو گئے ہیں لیکن یہ کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کل کا دن کیسا دواہیات تھا۔“

”جیسے طلاق کے بعد میں نے اُس کی بہن سے شادی کر لی۔ اس طرح مجھے نئی ساس سے نجات مل گئی۔“



”تھی مگر جیوس یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ یہ حالات“

”منتقل رہیں گے۔ اُس نے کہا وہ آدمی ابھی چھپا ہوا ہے کیونکہ“

”ابھی دوسری واردات کا موقع نہیں ہے۔ یہ قلعہ بندی ہمیشہ نہیں“

”ہے کہ عورتیں رفتہ رفتہ احتیاط چھوڑ دیں گی۔ اور آخراً لاوا تھ“

”بھول جائیں گی۔ انسان کا حافظہ نہایت کمزور ہوتا ہے“

”میں بھی بے احتیاطی نہیں کروں گی، نہ یہ واقعہ بھولوں“

”گی، میں جانن بولی۔“

”دوسرے بھول جائیں گے اور آخر قاتل کو بچھڑنے ملے گا۔“

”وہ شاید کسی اور جگہ چلا جائے، بولس نے کہا، ہو سکتا“

”ہے وہ کوئی مسافر ہو گا۔“

”شاید“ جیوس نے اتفاق کیا۔ بولس نے غصوں کیا کہ اگر“

”جیوس کا لفظ یہ سچ ثابت نہ ہو سکا یعنی رو دنیا کے قاتل نے دوسرا“

”نقل نہ کیا تو جیوس کو بہت رنج ہو گا۔“

”جیوس کی پیشین گوئی درست نکلی۔ ایک جوان لڑکی کے“

”ہنگامہ فز فز میں بھی لوگوں کی دلچسپی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ گر جا“

”ہیں منتظر کے لیے ایک تعزیتی جلسہ ہوا، اس کی مغفیت کو دعا“

”مانگی گئی اور لاش تجویز و کھپن کے لیے اُس کے پیدائشی شہر بھیج دی“

”گئی چند روز بعد خوف کی لہر چھٹ گئی، لڑکیاں ایک عمارت سے“

”دوسری عمارت تک اکلی جاتی تھیں مگر دزدانوں کے جھنڈ کی طرف“

”رو دنیا کو ہلاک کیا تھا، وہ شاید دوبارہ ایسی واردات کرے کہ بولس“

”کا یہ بیان نفسیاتی طور پر صحیح ہو جائے ہو لیکن صحافتی اعتبار سے“

”ایک کامیاب بیان تھا۔ اخبار نے اسے نمایاں شائع کیا۔ شہر بھر“

”کے لوگ ڈر گئے، خصوصاً عورتیں بے حد خوف زدہ ہو گئیں۔“

”بولس جہاں بھی گیا، اُس نے جیوس کے انٹرویو کا اثر دیکھا۔ اب“

”کوئی لڑکی کیمپس میں اکیل گھومتی نظر نہیں آتی تھی۔ شہر میں بھی“

”بہت کم عورتیں دکھائی دیتی تھیں، اکثر عورتیں زیادہ تر گھروں“

”میں رہتیں، بہت ضروری اشیا خریدنے باہر نکلتیں۔ بولس کو“

”یہ سب کچھ بالکل بریکار معلوم ہوتا تھا۔ اس کا دل چاہتا، لوگوں کو“

”بتانے کہ رو دنیا کا قاتل اب کسی کو ہلاک نہیں کرے گا۔ ویسے“

”اُس نے غصوں کیا کہ جیوس کے خیالات اُس کی کامیابی کی دلیل“

”ہیں۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ رو دنیا کا قاتل ایک پڑھے لکھے صحیح آواز“

”آدمی کی قلعی کے بجائے کسی پاگل کا لشتہ معلوم ہو۔ جیوس نے“

”یہی بات چارلس طرف پھیلا دی تھی۔ اب سراسر رساں کو یہ“

”معلوم کرنے میں بہت دقت ہوئی کہ ایک پاگل آدمی نے لاش“

”پہرے چھانڈنے کے لیے بائیں کا کندھا چڑھ کر کیوں استعمال کیا؟“

”بولس کو اکتاہٹ تھی کہ پولیس بھی جیوس کے خیالات قبول کر لے“

”گی۔ جیوس نے تشریح و توضیح سے اپنے خیالات کو ایک باقاعدہ“

”شکل دے دی تھی۔ وہ منتقل یہی کہہ رہا تھا کہ قاتل دوبارہ قتل“

”کرے گا۔ وہ رو دنیا کی ہلاکت کے سلسلے میں اس کے سوا کوئی بات“

”نہیں کرنا تھا۔“

”ایک دن بولس نے کھانے کی میز پر جیوس سے کہا۔“

”جیوس! مجھے اب بھی تھکادی رائے سے اختلاف ہے میرا“

”خیال ہے ایک وجہ ایسی ہے کہ رو دنیا کا پاگل قاتل دوبارہ کسی“

”کو ہلاک نہیں کرے گا؟“

”کیا مطلب؟“ جیوس نے پوچھا۔“

”میرے دوبارہ موقع ہی نہیں ملے گا۔“

”کیوں نہیں ملے گا موقع؟“

”اب کوئی لڑکی اور عورت اکیل گھومتی نظر نہیں آتی۔“

”ہر عورت کے ساتھ کوئی نہ کوئی مرد ضرور ہوتا ہے۔“

”جیوس کو یہ بات نامی پڑی، جس جانن ہی کی مثال“

”ماننے تھی اُسے کیمپس سے گزرنے کے لیے بوڑھے ٹرمبل کو“

”ساتھ جانا پڑتا تھا، کبھی ٹرمبل یا کوئی اور ساتھی نہ ملتا تو جس جانن“

”طلحہ کی رشوت دیتی کہ وہ اُسے پہنچا آئیں، اس خدمت کے“

”عوض وہ ان کے لیے لٹا نہیں اور وہ ملحقہ جتنی مواد فراہم کرنے“

”کا وعدہ کرتی، جس جانن ایک اعلا درجے کی ڈرپوک عورت“

اب بھی کوئی لوک اکیل نہیں جاتی تھی۔ رات کے وقت نو کوئی مرد بھی اُدھر جاتا نظر نہیں آتا تھا۔ پولیس چھپ کیلگ نے رٹا کاؤس کا ایک دستہ بنالیا تھا۔ یہ دسترات کے اندھیرے میں جھنڈ کے ارد گرد کوئی نظر رکھتا تھا۔ شاید بیکل بھی پولیس کی بات کا قائل ہو گیا تھا کہ قاتل دو بارہ کسی پر حملہ کرے گا۔ رضا کار مہتیاؤں سے لیس ہو کے بدل گشت کرتے تھے۔ اُن کے علاوہ بعض مقامات پر بارودی اور بعض مقامات پر سادہ لباس والے سپاہیوں کا بھی پھرا رہا تھا۔

پولس اکثر کمپس اور اُس کے گرد و نواح میں ٹھہرا۔ وہ اس بات پر حیران ہوتا کہ اُس کے ہاتھوں نے کیسی سنسنی پیدا کر دی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر اُسے خوشی ہوتی کہ ان لوگوں کی سادی اُٹھنا، سادی تلاش ہے کا ثابت ہوگی۔ اُس کے ٹھنڈے پرسے نے اُترتی نہیں کیا کیونکہ وہ ایک مرد تھا جس نے یہ کبھی نہیں کیا تھا۔ قاتل کسی مرد پر حملہ کرے گا۔ لوگ اب دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے تھے۔

قریباً تین بجتے بعد کا ذکر ہے۔ پولس معمول کے مطابق نکل رہا تھا۔ اُس نے ایک عجیب بات دیکھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ عام حالات سے قطع نظر، دو بجائے قتل کے بعد سے یہ وقت تاریک جھنڈ کی طرف جانے کے لیے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اُس رات بادل گھرے ہوئے تھے، موسم بھیگا بھیگا اور سرد تھا اور کسی جگہ دھند کے مرغلے اُڑ رہے تھے، اُن کی وجہ سے ٹرلوں کی دُشیاں دھندلا گئی تھیں۔ اس ماحول میں پولس نے ایک لوک کو دیکھا۔ ایک لمبے کے لیے اُسے یہ دہم ہوا کہ وہ روٹا ہے۔ دُشنت سے پولس کی سانس اُڑنے لگی۔ لوک بجلی کے کچھ کے پیچھے سے گزری۔ اس مردی میں بھی اُس کا سر کھلا ہوا تھا مگر اُس کے چہرے پر ال چمک رہے تھے۔ وہ ایک بھاری کوٹ میں لپٹی ہوئی تھی، اُس کا قد روٹیا کے قد کے برابر تھا مگر پولس نے خود کو یقین دلایا کہ یہ روٹیا نہیں ہو سکتی، اُس نے روٹیا کا نابوت اپنی آنکھوں سے ریل میں چڑھ دیکھا تھا۔ اُسے حیرت ہوئی کہ اس وقت سے یہ بے وقوف لوک یہاں کیا کر رہی ہے؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ یہاں ایک قتل ہو چکا ہے؟ وہ کوئی طالبہ تھی اُس کے بازو میں کتابیں دبی ہوئی تھیں۔ آخر یہ لوک دوسری لوکیوں سے زیادہ دلیری کا مظاہرہ کیوں کر کر رہی ہے؟ پولس کو لوک کی یہ ہواکتا چھی نہیں لگی۔ ایک بے فائدہ پوچس کے تحت اُس نے لوک کا تعاقب کیا۔ لوک انجینئرنگ کی عمارت سے نکل کر طبیعت کی عمارت کی طرف بڑھی۔ پولس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا یہی راستہ روٹیا نے اختیار کیا تھا۔ پولس لوک

کے پیچھے چلتا رہا۔ اُس کا تجسس بڑھتا گیا۔ لوک زیادہ تیز نہیں چل رہی تھی۔ پولس کو اپنی رفتار کم کرنے کی ہمتی نہ تھی۔ اُس نے چلتے چلتے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ اُس نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور مختصر رستے کی طرف موڑ لی۔ راستہ تاریک جھنڈ سے گزرتا تھا۔ روٹیا میں نہیں نکل ہوئی تھی۔ پولس نے سوچا کہ یہ تو سرمرعہ تھا ہے۔ چند لمحوں بعد لوک اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُسے تاریکی نے ٹھپ کر لیا۔ صرف اُس کے چہرے بالوں کا کچھ اُچھوڑا۔ پولس جھولتا رہا۔ پولس پتھر سے آگے بڑھا مگر چہرے بالوں والی لوک غائب ہو چکی تھی۔ اب شاید وہ جھنڈ میں ہوگی۔ وہ اُسے پکارنا چاہتا تھا، پکارنے کے لیے اُس کا منہ کھلا بھی لیکن بدوقت اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ ایک فاصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی کہہ سکتی تھی کہ پروفیسر پولس نے اُسے اس جگہ سے آواز دی تھی جہاں روٹیا کا قتل ہوا تھا۔ اگر وہ لوک کو سمجھا بھی دیتا کہ اُس نے اُسے صرف خطرے کے پیش نظر پکارا تھا تب بھی بات بدقسمتی۔ اپنی طرف لوگوں کی توجہ مبذل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

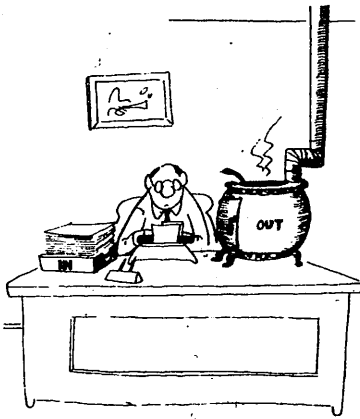
وہ لائبریری پہنچ گیا۔ یہاں آکے نہ جانے کس جذبے نے اُسے پسینے میں خراب کر دیا۔ لائبریری میں کچھ وقت گزار کر کوچے کے قریب اُس نے من جانن کو اُس کے گھر تک پہنچایا اور برآمدے میں بیٹھ کر جیولس کا انتظار کرنے لگا۔ اس اثنا میں ستر فچ نے اُسے چائے پلائی۔ جیولس ساڑھے دس بجے آیا۔ پولس نے فوراً اُس سے کہا۔ جیولس! میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ "کیوں؟ کیا پریشانی ہے تمھیں؟" جیولس تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا مگر پولس کی بات سننے کے لیے تیار ہو گیا۔

"آج میں نے ایک لوک کو اندھیرا ہونے کے بعد تنہا گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔" اُس نے جیولس کو یہ نہیں بتایا کہ لوک درختوں کے جھنڈ میں چلی گئی تھی، اس طرح یہ بات کھل جاتی کہ اُس نے لوک کا تعاقب کیا ہے۔

"دیکھ لیا میں نے کیا کیا تھا؟" جیولس مسکرایا۔ مجھے معلوم تھا کہ لوکیاں رفتہ رفتہ خیر غمخوار ہو رہی ہیں۔

"لیکن کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اس معاملے میں آدمی کو اتنا غیر محتاط نہیں ہونا چاہیے تمھیں۔ یاد ہے تم نے کہا تھا کہ اب ایک دوسرا قتل ہو گا؟"

"ہاں میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔" جیولس نے زور سے کہہ دیا۔ "تم خود کرو؟" جیولس ٹھٹھکا۔ "میں خود پریشان ہوں، ابھی صرف ایک لوک اکیل گھومتی ہے، کچھ دنوں بعد دوسری لوکیاں بھی گھومنا شروع کر دیں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ اس طرح قاتل کو دوسرا موقع مل جائے گا۔"



”موقع مل بھی گیا تو اب وہ دوسرا قتل نہیں کرے گا۔“ ہولس نے یقین سے کہا۔ اب وہ یہ برأت نہیں کر سکتا۔ اُسے معلوم ہے کہ پولیس اُس کی تلاش میں ہے۔“

جہولس نے نفی میں سر ہلایا۔ اُس کے متعلق تھا اس حسن ظن لٹا ہے۔ وہ جنت نہیں مارے گا۔ اُسے خطرات مول لینے کی عادت ہے۔ دُنیا کو قتل کرتے وقت بھی اُس نے خطرہ مول لیا تھا، اب جھلا کیوں پس پیش کرے گا۔ دیے بھی اُس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ آدمی مجبور ہوتا ہے تو آزاد نہیں رہتا۔ وہ مجبوری کا غلام ہو جاتا ہے۔“

”مجبوری؟“ ہولس نے پکلیں چھپکائیں۔

”ہاں، وہ دوسرا قتل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ دوسرا قتل اُس کا مقدر ہو چکا ہے۔“

ہولس کھڑا ہو گیا۔ ”یہ وہ بات بات ہے۔ وہ جھٹ پڑا۔“ ہولس ایسا بالکل منطقی بات ہے۔ پہلا قتل انتقام کی تسکین کے لیے کیا گیا تھا۔ جہولس نے دیکھے انداز میں گفتگو شروع کی۔

”فرد رفتہ اُس کی آواز ہولس کے دل میں اترنی گئی تھی یہ انتقام معاشرے کے خلاف ہو سکتا ہے کیونکہ معاشرے نے اُس شخص کو زد کر دیا تھا۔ کیا یہ حالات بدل گئے ہیں؟ کیا گورنمنٹ وہ جھوٹوں میں اُسے دُست مل گئے ہیں؟ کیا اُس کے حالات خوش گوار ہو گئے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ اداں ہے۔ معاشرے نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ قتل کا ارتکاب کرے۔ اب وہ مذمت محسوس کر رہا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ وہ دوبارہ ایک مقتول انسان نہیں بن سکتا۔ اُس نے ایک انسانی جان ضائع کر دی ہے، اُس کے ہاتھ خون آلود ہیں۔ یہ تمام چیزیں بھی معاشرے کی غلطی سے رونما ہوئیں۔ کیا تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اب اُس آدمی کے دل میں انسانوں کے خلاف پہلے سے زیادہ عصبہ بھرا ہوا ہے۔ اُس کی مجبوری اب پہلے سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ اس مجبوری پر قابو نہیں پاسکتا۔ میں اپنے آپ کو اس آئینے کا ایک تماشا بنی سمجھتا ہوں۔ ایک قتل نہیں نے دیکھ لیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اگر کبھی قتل اور ہوں گے۔ یہ بات ایسی ناگزیر ہے جیسے مل صبح سورج نکلنا۔“

ہولس نے بے اختیار کہا۔ جہولس اُنم نے اپنے دلائل بہت منطقی انداز میں پیش کیے ہیں۔ میں قائل ہو گیا ہوں مجھے قائل ہونا پڑا ہے۔“

جہولس نے سر ہلایا کہ اُس کی تعریف قبول کی۔ ایسے موقعوں میں سوچنا ہوں کاش میں کسی اور پیشے میں ہوتا کہ مجھے انسانی

نفیات کے بارے میں اتنی معلومات نہ ہوتیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اچھا ہولس! شب بخیر۔“

ہولس اپنے بستر پر اُٹھا، ہوا لیتا تھا۔ اُسے نیند نہیں آرہی تھی، اُس کے خیالات پر آگندہ اور جذبات غلط ملط تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جہولس کی سوچ تو منطقی ہے لیکن اُس نے آغاز غلط جگہ سے کیا ہے۔ روینا کو کسی پاگل نے قتل نہیں کیا تھا، میں نے کیا تھا۔ البتہ میری احتیاطی تدابیر کی وجہ سے یہ قتل کسی پاگل کا کام سمجھا گیا۔ جہولس اس سخت سے بے خبر ہے، بھی بے خبر ہیں اس لیے کوئی بھی جہولس کو غلط خطوط پر سوچنے سے نہیں روک سکتا اور اسی طرح میں بھی شریک عزتوں کو خوف زدہ ہونے سے روک نہیں سکتا۔ تمام کی تمام عذریں خوف زدہ ہیں مگر وہ مجبورے بالوں مللی لوکی؟ اُس نے وہی مختصر راستہ اختیار کیا تھا جس پر چل کے روینا موت کے مزے میں پہنچ گئی تھی۔ وہ لوکی دیوانی معلوم ہوتی ہے۔ جہولس کے اندازے کے مطابق اگر پہلا قاتل واقعی طور پر غیر متوازن ہوتا اور اپنا پہلا قتل کسی مجبوری کے زیر اثر کرتا تو یقیناً وہ دوسرا قتل بھی کرتا۔ اُس کی پُر تشدد و انتقامی کارروائی قابل فہم ہوتی، اگر اُس کا کچھ خراب گزرا ہوتا، اگر اُس نے فنانی کے دکھ اٹھائے ہوتے، اگر تو جوانی میں اُسے بے درپے ناکامیوں سے سابقہ پڑا ہوتا پھر پوری طرح جوان ہو کر بھی اُس کی خواہشات ناآسودہ رہتیں اور اُسے اُس کے ساتھیوں نے برابری کی بنیاد پر قبول نہ کیا ہوتا ایسا آدمی ضرور قاتل ہو سکتا ہے۔

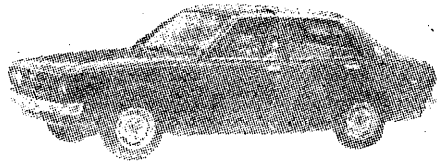
ہولس یادوں کے سمندر میں غوطہ کھانے لگا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کوئی شخص اُس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے خود

سے اعتراض کیا کہ وہ اپنی مال کا لاڈلا تھا، اُس نے اپنی ماں کی پرستش کی تھی لیکن کیوں کی تھی؟ یہ اُسے معلوم نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت نحیف و زار تھا، اُس سے وہ کانپیں ہر ہاتے تھے جو اُس کا باپ چاہتا تھا یا اس کی صرف وجہ یہ ہو گی کہ اُسے اپنی ماں زیادہ پسند تھی، وہ اپنے لیے جھورے بالوں کے باعث اسے بہت خوب صورت لگتی تھی مگر اُس کے جھورے بالوں کا رُوپنا کہ جھولے بالوں سے کوئی تعلق نہیں۔ رُوپنا اُس کی ماں سے متشابہ نہیں تھی۔ رُوپنا تو اُس کے باپ کی طرح ایک مضبوط بدن کی لوکی تھی۔ جھورے بال تو بعض اُتھاتی تھے پھر اسے خیال آیا کہ جب اُس کا باپ مر گیا تھا تو وہ اپنی ماں کو دلا سے دیتا تھا پھر بھی اُس کی ماں اُسے جھوڑے چلی گئی تھی۔ کاش وہ اپنی ماں کے سامنے جوفانی کی عمر کو پہنچا لیکن وہ تو کچھ اور چاہتی تھی کیونکہ وہ جوان تھی، حسین تھی اور پناہیں ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، پہلے اُسے صرف ایک مرد کی ضرورت تھی پھر اُس کی ضرورت بڑھ کر کئی مردوں تک پہنچ گئی۔ طرح طرح کے اسینڈل بننے لگے، آفر بولس اپنی ایک چھوٹی سی باس جا کر رہنے لگا۔ اسکول ادا کالج میں اُس نے جو لوکیاں پسند کیں، وہ سب جھورے بالوں والی تھیں۔ اُن سب کے نام تو اُسے یاد نہیں تھے۔ بہر حال ایک لمبی نصرت تھی۔ وہ کسی طرح بھی ایک شرمیلا تو ظن نہیں تھا۔ اُس نے تقریباً ایک دو تین جھورے بالوں والی لوکیوں کو شادی کی پیش کش کی تھی سوچتے سوچتے اُس کے جسم میں گھٹنیاں سی بجھ گئیں۔ انگلیوں کے پریں تک ایک سنسنی پھیل گئی۔ اُس کی یادداشت بالکل حافظ تھی اُس نے جب بھی شادی کی سہش کش کی، اُسے ٹھکرا دیا گیا۔ وہ اندھیرے میں لیٹا کا پتلا ریم تختہ جیولس نے اندھیرے میں تیر چلا دیا تھا۔ اُس نے جس فائل کا نقشہ کھینچا تھا، جیولس کا معاملہ اُس سے قطعاً مختلف تھا۔ رُوپنا کا لگا گھونستہ وقت اُس نے صرف رُوپنا کو مارا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کو یا اُن لوکیوں کو نہیں مارا تھا جنہوں نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ نہ تھا، نہ ناخوش کیا وہ وہی کام نہیں کر رہا تھا جو اُسے سب سے زیادہ پسند تھا۔ میٹروک اپنی پیشے سے اتنے مطمئن نہیں ہوتے جتنا وہ تھا۔ وہ اپنی محنت و دوسروں تک پہنچانا چاہتا تھا اسی لیے اُس نے ایک استاد کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ پیشہ اُس نے والد سے منتخب کیا تھا اور یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ استاد کی تنخواہ قلیل ہوتی ہے اور ایک بیوی کے اخراجات اس تنخواہ میں برداشت کرنا مشکل ہے اچھا یہ ہوا کہ جھورے بالوں والی لوکیوں نے اُس سے شادی نہیں کی۔

تمنا؟ یہ تمنا ہی سے چھٹکارا پانا ایک کنوارے کے لیے ناگزیر

ہے۔ اُس کے بہت سے ساتھی پروفیسروں نے غربت کا خطہ مل لیتے ہوئے دس پندرہ سال پہلے شادیاں کر لی تھیں۔ شادی شدہ اور کنولے مردوں میں کوئی بات مشترک نہیں رہتی اس لیے اُن کے درمیان صلح وسیع ہوتی گئی۔ دیوار بلند ہوتی گئی، دیوے کی دلچسپیوں کا مرکز اُس کے طالب علم تھے۔ اُس نے اُن کے جوان اور نازہ دماغوں کو بنانے سوارانے کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ سالہا سال سے اُن کے ترو نازہ ہمرے قطار در قطار دیکھتا اور خاموشی سے کہتا۔ یہیں آپ لوگوں سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی اسی کام میں صرف کر دی ہے۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں، طالب علم اور اتنا ایک دوسرے کے دشمن نہیں بننا اُن میں دوستی کا رشتہ ہوتا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھے اپنا دوست کیجیے۔ مجھے سے بات کیجیے۔ مجھے پوشا بہت سیکھیے کہ آپ لوگ مجھے زندہ سمجھتے ہیں یہی بھی گوشت پوست کا ایک آدمی ہوں، میں بھی جذبات رکھتا ہوں۔ مجھے تسلیم کیجیے میں بولس ہوں ایک آدمی ہوں۔ مجھے بچان کیجیے بس میری یہی خواہش ہے۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ سے بات کیجیے۔

لیکن رُوپنا نے اُس سے بات نہیں کی تھی، اُسے ٹھکرا دیا تھا اسی لیے اُس نے اُسے ہلاک کر دیا۔ وہ اسی سلوک کی منتظر تھی۔ بولس اب سمجھا کہ اُس نے رُوپنا کو بوس تھل کیا تھا۔ اگر اسے موقع ملا تو وہ یہ قدم دوبارہ اٹھائے گا۔ رُوپنا دوسری لوکیوں سے مختلف نہیں تھی پھر اُس نے رُوپنا ہی کو بوس منتخب کیا تھا؟ کیا محض اس لیے کہ وہ جھورے بالوں والی لوکی تھی؟ یہ تو کوئی معقول وجہ نہیں ہے اگرچہ اُسے رُوپنا سے محبت نہیں تھی پھر بھی اُس نے جھنڈ میں اُس سے محبت کا اقرار کیا تھا۔ کیا اُس اقرار میں کوئی سچائی تھی؟ وہ اُس سے محبت کرتا تھا لیکن وہی محبت نہیں جیسی وہ سمجھتی تھی۔ اُس کی محبت محض رومان نہیں تھی کیونکہ وہ رومان کی عمر سے گزر چکا تھا۔ اُسے سبھی آسودگی کی خواہش بھی نہیں تھی سبھی خواہش کا تو وہ جوانی میں بھی غلام نہیں تھا۔ رُوپنا سے اُس کی محبت ایک پدرانہ شفقت سمجھی جائے یہ ایک پیشہ وارد محبت تھی۔ ایسی محبت وہ اپنے تمام طلبہ کے لیے محسوس کرتا تھا لیکن اُن سب نے اُسے نظر انداز کیا۔ ہمیشہ نظر انداز کیا یہی وجہ ہے کہ وہ صرف رُوپنا سے نفرت نہیں کرنا تھا بلکہ اُسے بھی سے نفرت تھی، تمام کے تمام طلبہ۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا دیکھتا تھا۔ اُس کی ٹھکیاں بند ہو رہی تھی اور ٹھکل رہی تھیں۔ وہ ایک نئے اور عجیب جذبے سے دوچار تھا۔ جذبہ اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اُس وقت بھی محسوس سب تک



”کاروں کی دنیا میں انقلاب“

جاپان کی مکمل ریکینڈیشنڈ کاریں میسرز ڈائو انٹر نیشنل کارپوریشن
ٹوکیو جاپان کی مشہور زمانہ ریکینڈیشنڈ کاریں



گفٹ بیج اسکیم کے تحت (بیرون ملک پاکستانیوں کے لیے) منگوائیں
ہم صرف کاریں ہی بک نہیں کرتے بلکہ آپ کو کھڑکی سہولتیں بھی فراہم کرتے ہیں۔

با و تار نام ● با اعمتاد لوگ

مزید تفصیلات نیز بکنگ کے لیے اپنی پہلی فرصت میں ہم سے رجوع کریں

سول ایجنٹ برائے پاکستان

حسنین حسینی اینڈ کمپنی

جی پی او بکس نمبر ۳۸ || کیمبل ایڈریس - آزاد وطن
کراچی ۷ || فون نمبر - ۲۱۸۲۲۵

میں کیا تھا جب اس نے رونیکا کی گون دبوچی تھی۔ یہ کوئی جذبہ تھا یا مجبوری تھی؟

جھنڈ کی طرف جانے والی ببار لوٹکی کی ایک خاص چال تھی۔ پولس نے اس پر نظر رکھی مگر اس کے زیادہ قریب نہیں گیا۔ قریب جانا تو اسے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ اسے جانتا ہے یا نہیں اور اس نے اسے کہیں دیکھا ہے یا نہیں؟ وہ یہ جانتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ لوٹکی اس کے لیے ہالوم لے پئے، شرائط لمبات میں سے ایک۔ وہ اسے دھڑ دھڑ سے دیکھتا رہا۔ لوٹکی رنڈا رنڈا کرتی گئی۔ لاٹری سے نکل گئی تھی۔ لاٹری میں شاید وہ کوئی تحقیقی کام کر رہی ہوگی، ممکن ہے کوئی مقابلہ کھڑی ہو۔ وہ بیشتر تھما تھی اور وہی مختصر راستہ اختیار کرتی، جھنڈ کا خطرناک راستہ۔ پولس نین راتوں تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔ برات وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس سے قریب ہوتا جاتا۔ تیسری رات وہ اس کے پیچھے پیچھے جھنڈ تک گیا۔

جھنڈ سے کوٹ کے اس نے پولس سے ملاقات کی۔ اسے خاصا احتیاط کرنا پڑا۔ پولس ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ پولس نے نے جانے پتے ذلت اس سے کہا۔ پولس، ممکن ہے رونیکا کا قاتل خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ پتھارا کیا خیال ہے؟“ پولس نے ابرو میڑھے کیے اور دیکھا کہ اسے دیکھا۔

”لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا؟“
”فرق کذا اگر وہی مجبوری جس کا تم نے ذکر کیا تھا، اسے دوبارہ محسوس ہوئی یعنی قتل کرنے کی خواہش پھر ابھری اور فرق کو، اس کی شخصیت کا ایک دوسرا حصہ بہتر حصہ جو قتل کرنا نہیں چاہتا، اس کی قاتلانہ خواہش سے بروز آواز ہو گیا تو اس کے دل و دماغ میں ایک کش مکش شروع ہو جائے گی۔ بہتر حصہ غراب حصے کو قتل سے روکنے کے لیے قاتل کو پولیس کے حوالے کرے گا۔“

پولس نے نفی میں سر ہلایا۔ بھلا وہ اپنے آپ کو اس معاشرے کے حوالے کیوں کرے گا جس سے اسے شدید نفرت ہے۔“
”اس لیے تاکہ دوسری زندگی کا چراغ نہ بجھے۔“

”لیکن وہ دوسری زندگی کو کیوں بچانا چاہے گا؟ دوسری زندگی اسے اتنی عزیز کیوں ہوگی؟“
”یہ مجھے نہیں معلوم۔“

پولس قہقہہ مندی کے احساس سے سکرایا۔ واقعی تھیں نہیں معلوم اس لیے کہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دوسری زندگی

کو بچانے کی خواہش یا ترحم کا جذبہ اس جنونی قاتل کے لیے طغنا اجلی ہے۔ اپنا پہلا قتل بھی اس نے نفرت کی وجہ سے کیا تھا۔ کیا وہ نفرت ختم ہو چکی ہے؟ اب کیا وہ اپنے دل میں ترحم محسوس کر کے کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے؟ یہ بات بعید از قیاس ہے۔ میرے دوست، اتم ذرا اس کی موجودہ حالت کا تجزیہ کرو۔ رونیکا کی موت سے اسے فزکے تسکین ضرور ہوئی ہے لیکن اس کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا، اسے مکمل تسکین حاصل نہیں ہوئی۔ دوسری طرف وہ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا ہے اس لیے پولس کسی نتیجے پر نہیں پہنچی ہے۔ اس نے پولس جیٹ کیگنل سے بات چیت کی تھی۔ وہ واپس ہو گیا ہے۔ رونیکا کے قاتل کو معلوم ہے کہ وہ انتقام لے سکتا ہے اور جج بھی سکتا ہے۔ بھلا اس موقع پر وہ کیوں رک جائے جب کہ وہ ہیبت رہا ہے۔ وہ اپنا کام ختم کیوں نہ کرے؟ ابھی اس نے اپنا کام پوری طرح کماں ختم کیا ہے۔ اس لیے ابھی وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔“

پولس نے اعتراض کیا۔ تم بالکل صحیح کہہ رہے ہیں پولس! پولس چائے کا آخری گھونٹ پی کے کھڑا ہو گیا۔ پولس پیارے اتم اپنی دنیا میں رہو، افسانے اور شاعری کی فرخی دنیا میں حقیقی زندگی کے مسائل ماہرین کے لیے چھوڑ دو۔“
”ٹھیک ہے۔“ پولس نے اتفاق کیا۔ اب میں کس موضوع پر بحث نہیں کروں گا۔“

جج نے رات ایک ٹھٹھرتی ہوئی سرزات تھی۔ لوگ گھر میں بند تھے۔ شہر میں کسی قاتل کا خوف ہو یا نہ ہو ایسی شدید سردی میں کون گھر سے باہر نہ نکلتا ہے۔ نہایت ٹھنڈی برساتوں کے درمیان سے سبیاں بھاتی اور ننڈ ننڈ درختوں کی شاخیں جھکا جاتی اور ٹوٹ کر گزرتی تھی۔ پولس لاٹری سے باہر گھپ اندھیرے میں کھڑا احتیاط کر رہا تھا۔ اسے سرد ہوا کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر بھی نہیں اٹھائے تھے۔ اس کے میٹ کا چھچھکا ہوا جھٹکا تاکہ چہرہ نذر آئے۔ اس احتیاط کے علاوہ ویرانی بھی بہت تھی۔ شاید ہی کسی نے اسے دیکھا ہو آج اس کے پاس اس کا ساتھی، اس کا نشان بلیٹ کیس بھی نہیں تھا۔ یلیف کیس اس کے راستے میں غواہ خواہ رکاوٹ پیدا کرنا اور خون آلود ہو جانا۔ جن کے چھینٹیں کاسہ محل کرنے کے لیے آج اس نے ایک نیا منصوبہ سوچا تھا۔ البتہ حال تو آج بھی ٹھکانا تھا۔ گزشتہ دفعہ وہ غرن کے دھنل سمیت سیدھا سمنجھ کے کرے میں پھنچ گیا تھا۔ آج اس نے دلیں نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج اس کے پاس ایک ناقابل

ان نعمت کو بڑھاتا، اس سے وہ اپنے ہاتھ اور جاتو پونچھ کر اُسے مانے واردات ہی پر پھینک دینے کا ارادہ رکھتا تھا کیڑے سے کسی کو اس کا سرخار میں مل سکتا تھا۔

جھولے بالوں والی لڑکی مغزورہ وقت پر بہت سی کتا ہیں بٹل میں دہانے لائبریری سے بھلی اور ہولس کے سامنے سے گزری۔ وہ ہولس سے کوئی تیس فٹ دُور ہوگی۔ ہوا سے پھنکے کے لیے اس نے سر ہکا دکھا تھا۔ کھجے کی مدھم رشتی میں اس کے جھولے بال جھٹکتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ہولس کو اس کا چہرہ صرف ایک آنچ سے نظر آیا مگر اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اُسے میں جانتا۔ اس بات سے اُسے خوشی ہوئی۔ ایک اجنبی کو قتل کرنے کا خیال بہت بڑھک تھا اس نے ایک جھٹک سے بعض دوسری کئی بالوں کا بھی اندازہ لگا لیا۔ لڑکی کی ٹانگیں پر کشتش نہیں تھیں نہ اس کی پال میں خوب مہر تھی۔ اس بات سے ہولس کو ذرا اطمینان ہوا۔ وہ صرف خوب صورت لڑکیوں سے نفرت نہیں کرتا تھا بلکہ اُسے بد صورت لڑکیاں بھی بری لگتی تھیں۔ شاید یہ لڑکی اپنی بد صورتی ہی کے سبب رات کو تنہا گھومنے کی جرأت کر لیتی ہے۔ گویا اس نے بد صورتی کو ڈھال بچھ لیا ہے۔ ہولس نے اُسے آگے جانے دیا۔ وہ نمبوں کی عمارات سے آگے نکل گئی اور لمبے لمبے دُک بھرنے لگی جب وہ جھنڈے کے پاس پہنچی تو ہولس اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا لیکن لڑکی کو پتہ نہیں چلا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ پتہ نہ چلنے کا سبب ہوا کا شور تھا۔ سٹاؤن، کیمپس کے فمٹوں اور دُک کی شیشوں سے کچھ بچھ رشتی جھنڈ تک پہنچ رہی تھی بے حد مدھم لڑکی کا سر لڑکی کی طرح نکلا ہوا تھا۔ ہولس کو کوئی جلدی نہیں تھی، اُس نے انتظار کیا۔ جب لڑکی اور ہولس جھنڈ میں بالکل گھر گئے تو ہولس نے درمیانی فاصلہ کم کر دیا اور ایک دم لڑکی کے سر پر پہنچ گیا اس نے فاصلہ ناپ کر لڑکی پر چھلانگ لگائی اور اُس کے اوپر جا کر ارباب اس کے ہاتھ اس کی گردن میں تھے۔ اگرچہ اس کی گرفت اتنی مضبوط نہیں تھی جتنی وہ جانتا تھا پھر بھی یہ گرفت لڑکی کی چٹخ حلق میں روک سکتی تھی۔ اُس نے اپنی پورا زور لگایا اور لڑکی کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر لیا اب لڑکی کیچے تھی، ہولس آدھریں لڑکی نے بہت جلدی سے اُس کا منہ ابھرا لیا۔ وہ خاصی طاقتور دُنگلی ہولس کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ جب کسی کو کاٹھونٹ کرنا مقصود نہ ہو تو نیچے سے حملہ نہیں کرنا چاہیے نیز ترخے پر انگلیاں نہیں بلکہ انگوٹھا رکھنا چاہیے۔ ہولس نے ایک لمحے کے لیے گرفت کو چھلی کی ناک دوسری جگہ سے گرفت مضبوط کر لے لیکن یہ اس کی دوسری غلطی تھی لڑکی نے کوشش کی کہ اپنا پرس کھولے۔ اُس کے پاس

ایک چیرمٹی سیٹی ہولس نے گھبرا کر دوسری گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی، وہ لڑکی کا ترخا دبانے لگا لیکن ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ اس کے شکار کے منہ سے ایک لفظ نکلا، صرف ایک لفظ یہ کوئی اونچا اور خطرناک لفظ نہیں تھا لیکن اس ایک لفظ سے ہولس پر سارا معاملہ عکس شفاف ہو گیا۔ ”بکاؤ“ یہ کسی عورت کی آواز نہیں تھی بلکہ پرفیسر جیولس کی آواز تھی۔ جیولس نے بالوں کی ٹوپی پہن کر اور مردی سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو ایک لڑکی کے روپ میں ڈھال لیا تھا۔ اُسے اپنے تجزیے پر اتنا یقین تھا کہ اُس نے خود کو چالے کے طور پر قاتل کے سامنے ڈال دیا۔ ہولس نے جھٹک کر نفرت سے اُسے دیکھا۔ جیولس یہ قدم اٹھانے پر مجھے تم نے غور کیا۔ مجھے اپنی باتوں سے ہلا کر تم نے قتل پر آمادہ کیا تم ایک ایک بدنصیب آدمی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ آج تم موت کی نیند سو جاؤ گے۔ تم اسی سلوک کے مستحق ہو، مجھے خوشی ہے کہ تم بڑا۔

معا ایک دھماکا ہوا۔ دھماکے کی آواز بند بند سی تھی شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ان دونوں کے جسم بے حد قریب تھے۔ ہولس نے اپنے بازو میں درد کی ایک تیز لہر محسوس کی۔ جیولس کے پاس پستول تھا لیکن پستول سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ ہولس کا ہاتھ اس کے ترخے پر دبتا گیا۔ پستول سے دوسری گولی نہیں چل سکی۔ آخر ہولس نے جیولس کو چھوڑ دیا، اب اُسے مزید گرفت میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اچانک سڑک سے لوگوں کی آوازیں اُٹھ لگیں۔ گولی کی آواز سن لی گئی تھی۔ لوگ اسی طرف آسے تھے۔ آؤ، آؤ، اب کیا ہو سکتا ہے، وہ پستول کے زخم کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکے گا۔

ہولس نصیبات کے پروفیسر کے لاش سے لڑھک کر دودی طوف ہو گیا۔ اس نے اپنی جیب سے چاتو نکالا۔ چاتو اگرچہ تیز نہیں تھا لیکن ہولس نے اپنی کلائی کے پاس سے خون کی رگ کاٹ ہی لی پھر وہ رشتا ہوا ایک راستے پر بروکے بھاڑیوں میں لیٹ گیا۔ اب آنے والے اُسے بروقت تلاش نہیں کر سکیں گے، وہ زندہ نہیں پڑا جا سکے گا۔ وہ دہن لیٹا رہا اور اپنے جسم سے زندگی نکلتی ہوئی محسوس کرتا رہا میری زندگی؟ جیولس غلطی پر تھا۔ کیا وہ میری زندگی کے متعلق کچھ جانتا تھا؟ میری زندگی تو بہت بہت خوش حال گزری ہے۔



وہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک کھانا بن کر رہ گیا۔
ایک کڑیا کے کھانا بن کر رہ گیا۔
کھانا بن کر رہ گیا۔

وہ بولا: ”جی۔ دیکھئے نا۔ لوگ سچائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ زمانا بھر
کہہ دیا گیا کہ عظیم ہے۔ دفتر کے بڑے بابو بھی کہتے ہیں اور پھر میں محرم
تھیں۔ جو کہتے ہیں، اسی طرح کرتا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ
میں نے یہ فعل شیعہ اپنی زبان میں ادا کرنے کے لیے ایک سو فخرے یاد
کر رکھے ہیں۔ دفتر کے بڑے بابو کہتے ہیں کہ سچائی عیاں صوت میں کبھی
پیش نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیشہ لباس پہنا کر“
میں نے کہا: ”مگر ذکر تو کوئی کرنا ہو رہا تھا“
وہ بولا: ”جی نہیں۔ ذکر اُس کے چچا کا ہو رہا تھا جس نے اُس پر
ہاتھ صاف یعنی میرا مطلب ہے“

میں نے جلدی سے کہا: ”میں سمجھ گیا۔ آگے چلو“
”تو وہ اپنے چچا کے گھر سے بھاگ نکلی اور اپنی موسیٰ کے گھر آگئی
یہاں موسیٰ نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی، اُسے اچھے کپڑے پہنا دیے
چار اپنے یوز کال کر اُسے دیے۔ اُس کی آنکھوں میں کابل لگا یا اُسے
اپنے سینے سے لگایا کیوں جی جب عورت عورت کو سینے سے لگاتی ہے
تو اس سے عرابی تو بدلتا رہتی ہے“

میں نے کہا: ”معلوم ہوتا ہے بڑے بابو نے کسی غلط ترجمے پر
تھیں ڈانٹ پلائی ہے۔ بہر حال خیر، آگے بڑھو“
”تو صاحبہ وہ بولا: ”لڑکی بالکل نوجوان تھی اور اُس کی موسیٰ
کا خاوند ذرا آں..... میرا مطلب ہے کہ ذرا وہ تھا چنانچہ وہ بھی لڑکی
پر عاشق ہو گیا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ موسیٰ کا خاوند اور موسیٰ کا بیٹا
دونوں اُس پر عاشق ہو گئے۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت....“
”چھڑا ہوا؟“

”ہو نہ کیا۔ موسیٰ نے وہاں لگا کر لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔
اب وہ اپنے پھوپھا کے گھر پہنچی۔ پھوپھا ذرا شریف قسم کا بدعاش تھا۔
یعنی اُسے بڑے دم دالے سے کرپ کر گھر رکھا۔ اکیلا تھا وہ آپ کی طرح
چنانچہ جہاں اور لوگ کامیاب ہوئے وہ کامیاب ہو گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد
اُس نے لڑکی کو پیش کرنے پر مجبور کر دیا۔“
”پیش کرنے پر؟“

”جی ہاں۔ آپ کو اس کا مطلب سمجھاؤں؟ یعنی اُس لڑکی کو
مجبور کر دیا گیا کہ وہ چند دن پہلے کیوں کے عوض اپنی عصمت و عفت اپنی

وع کہنے لگا: ”تو کرتو نہیں البتہ ایک نوکرانی کا ضرور بندہ نہایت
کر سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آئندہ شامیری معرفت کھیل کر لیں“
میں نے کہا: ”تم تو مذاق کرتے ہو“
وہ بولا: ”جی نہیں۔ مذاق اور آپ سے! سچ کہتا ہوں مجھے کمیشن
ملا ہے۔ سٹے باز جو رقم داؤ پر لگاتے ہیں اُس پر مجھے پانچ فی صد کمیشن ملتا
ہے۔ اس دفتر کے سب ملازم میری ہی معرفت سٹا کھیلنے میں درنہ آپ
ہی تباہی کر جو تنخواہ مجھے یہاں ملتی ہے اُس میں کسی بھلے ماش کا گزرا
کیسے ہو سکتا ہے“

میں نے پوچھا: ”اُس کی عمر کتنی؟..... کیا..... کے....؟“
بیس برس کے تجربہ کرنے مجھے پوچھا دیا۔
وہ مسکرا کر بولا: ”جی نہیں کوئی چودہ پندرہ برس کی ہوگی۔ رنگت
گندیں، نہ سالو لیس پانچ کا رنگ جیسے فاختہ کے سینے کا ہوتا ہے۔
بس آپ اُسے ایک فاختہ ہی سمجھیے“
”میں نے کہا: ”میں شکا سی نہیں ہوں۔ مجھے تو نوکر چاہیے“
وہ بولا: ”کھانا پکانا، سینا پر ناسب جانتی ہے، چھوڑ کر اکیلے بی
وہ آپ کے گھر کا سب کام نبھال لے گی“
”مگر بھئی نوکرانی، لوگ کیا کہیں گے“

وہ ہنسا: ”آپ کی آزاد خیالی تو دفتر بھر میں مشہور ہے۔ اور آپ
تو لوگوں کو اخلاق کا سبق دیتے ہیں اور اسٹا کی ناپسند کرتے ہیں دیکھئے نا
اگر اب آپ بھی؟..... اور پھر وہ بے چاری یتیم ہے“
”یتیم ہے؟“ میں نے ترس لھاتے ہوئے پوچھا۔
”جی ہاں، اُس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ وہ اب
نیک اپنے چچا کے پاس تھی۔ جب وہ تیرہ برس کی ہوئی تو چچا نے اُس پر
ہاتھ صاف کرنا چاہا“

”تھارا مطلب ہے۔ اُس کے دامن عصمت؟“
”جی ہاں اس کا دامن عصمت بارہ بارہ کرنا چاہا۔ اُس کی تنگی
کی متاع عزیز ٹوٹ لینی چاہی۔ اُس کی خوشی کی مصیبت اپنی زندگی
ہوس ناکی کی شکار بنانی چاہی۔ اُس کی بارہ رُج کی مقدس عفت اپنی
سمیت و شہینت...“
میں نے کہا: ”یہ جو اس ختم کرو میں تمھارا مطلب سمجھ گیا“

کچھ رنگ کے منتخب کھانا بن کر رہ گیا۔
ایک کھانا بن کر رہ گیا۔



شرم ناک بیماری لافقی ہو گئی۔ گویری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کے لیے شرم ناک کہا جائے۔ اُس لڑکی کے لیے یا اُس شریف سماج کے لیے، جو اُس سے دن رات پیشہ کرتا ہے؟
میں نے کہا: ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے یہ وعظ سننا پڑے گا...“
وہ بولا: ”معاف کیجیے گا۔“ دافنی میں بہت باتونی ہوں بھلکتی ہوں۔ مختصر بیان کرتا ہوں۔ تو صاحب! اب وہ لڑکی وہاں جھاک نکلی۔ پھوپھا اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی جینینہ لگی۔ اتفاق سے میں سڑک سے گزرا ہاتھا۔ ادھر دفتر آنا تھا۔ نعل میں فائل ڈالے.....“

”ہیرو ہو گئے تم؟“ میں نے طنز کیا۔
”جی نہیں،“ اُس نے کہا۔ ”بھلا دفتر کا مترجم کبھی ہیرو ہو سکتا ہے۔ بھلا چالیس روپے تنخواہ پانے والا کبھی ہیرو ہو سکتا ہے؟ ہاں تو صاحب! میں نے اُس کے پھوپھا سے پھوپھا کر اپنے گھر لایا۔ یہاں میں اپنے بڑے بھائی اور بھائی اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں رہتا ہوں۔ وہ لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بھائی نے میری شرافت کو سراہا اور اُس لڑکی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا لیکن صاحب! اُس لڑکی کی قسمت ہی بُری ہے۔ میں اگر اُس لڑکی سے در باتیں بھی کروں تو بھائی خفا ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ لڑکی بھی میرا مترجم ٹھیک کرے تو آگ بگولا ہو جاتی ہیں۔ اب گھر میں ہر وقت چپ چ رہتی ہے۔ یہ کون تباہ ہو گیا ہے۔ لڑکی

تقدس ماب چارپور روڈ شیرگی یعنی اپنی سماع عزیز خیریت حیات....“
”خدا کے لیے۔“ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”مجھے تمھارے ترجے سے کوئی سڑکار نہیں“
وہ مسکرایا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ آپ عرباں پسند ہوتے جا رہے ہیں خیر، مجھے آپ کی عرباں پسندی سے کیا سڑکار۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اُس شریف بدعاش چھوپھانے اُس بد قسمت لڑکی کو بازار کی فحش بن جانے پر مجبور کر دیا۔ چند بیٹے اسی طرح گرنے پھر وہ بیمار ہو گئی۔ سوزاک“

”سوزاک؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔
وہ چڑ کر بولا: ”آپ بد کہتے کیوں ہیں، کس شرمیں، کس گلی میں، ہندوستان کے کس گاؤں میں آپ نے اس کا نام نہیں سنا؟ زندگی کے کس نکتہ پر آپ نے اس منحوس بیماری کا نام نہیں سنا؟ کیا بوتر کے آنکھیں بند کرنے سے باز حمل نہیں کرتا؟ کیا وہ اشتہار آپ نے نہیں دیکھے، پیپ مجنوں میں بند، وہ کون سا مکان ہے، کون سا شہر ہے، کون سا گاؤں ہے؟ مندر سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک وہ کون سی دیوا ہے جہاں اس خوف ناک بیماری کی پیپ اور جن دو دن میں بند کر دینے کا ذکر نہ ہو، وہ کون سا شریف گھر ہے؟“
میں نے کہا: ”اب تم گالی دینے پر اُتر آئے ہو“
”چلیے نہ سہی سوزاک نہ سہی۔ یہ سمجھ لیجیے! اُسے ایک خوف ناک

وہ بولی ”یہ دعوت نظارہ کیا ہوتا ہے؟“
 میں ہنسا کچھ نہیں۔ میں ذرا تعجب کر رہا تھا۔ اب تم کہیں میں جا
 کر مرتن صاف کر دو صبح بچھے دوادنے نیم بڑشت اور ایک گلاس دودھ
 کا چاہیے۔ دیر ہو کر کھانا جس میں ٹماٹر اور کدو اور شام بھی شامل نہ ہو
 سہ پہر کی جائے میں دفتر ہی میں بیوں گا۔ شام کے کھانے میں جاول ضرور
 ہونے چاہئیں۔ سو وقت میرے گئے سہ سڑیوں و خرم بادام کی مالش
 تمہیں کرنی ہوگی۔ اس کے بعد تم اپنے کمرے میں سو سکتی ہو۔ ہاں، اندر

رات کو وہ میرے گننے سر پر روغن بادام کی مالش کر رہی تھی، کہنے
سب ننگ

لگی۔ کیا آج رات مجھے یہاں سونا ہوگا؟“

میں گہرا کراٹھ بیٹھا کیوں؟ کیوں کیا بات ہے؟ میں نے تم سے؟.....“

وہ کنگنی نے آج صبح آپ نے مجھے زندہ رہے جو دیے تھے۔ میں کانپنے لگا۔ وہ بولی ”پھوپھو مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستروں سوچا کے لیے مجبور کرتے تھے اور پھر مجھ سے سب بدلے بھی چھین لیا کرتے تھے۔ آپ بھی اگر مجھ سے رہے چھیننا چاہتے ہو تو ابھی واپس لے لو“

میں نے کہا ”تمہیں یہ شہ کیسے ہوا ہے؟“ وہ بولی ”لو آپ رہے مجھ سے واپس نہیں لیں گے؟“ اور اور مجھے..... اس نے اشارہ کر کے کہا ”یہاں بھی نہ سلائیں گے؟“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تم کیوں اس طرح.....؟“ وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ اُس کی انھیں حیران تھیں۔

ایک دن وہ جن میں بھی شیش سا سننے لکھے بالوں میں لنگھی کر رہی تھی اور ایک گیت گار رہی تھی کچھ عجیب سا گیت تھا فحش، بازاری لیکن اُس میں بھی عورت نے مرد کے خلاف اور سماج کے خلاف جو مرکا سماج ہے، اپنا غم بیان کیا تھا۔ ایک عجیب سا گیت تھا جس کے الفاظ اجازت نہیں دیتے کہ اسے یوں ادب کی زبان میں بیان کیا جائے۔ اُس گیت کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ وہ گیت تھا ”ایک بازاری عورت کی گالی بھی تھی جو اس نے جل کر مردوں کے خلاف کی تھی اور چاند لے آہستہ آہستہ نفرت کے احساس سے متاثر ہو کر گار رہی تھی۔ یہ گیت رات کے اندھیرے میں پیدا ہوا تھا، یہ گیت تھوڑے خانی کے غلام فضا میں اگا رہا تھا، یہ گیت صدیوں کے ظلم و ستم، جبر و استبداد کے خلاف عورت کی سسکی، کجلی، زخمی رُوح کا احتجاج تھا۔ ایک موٹی، مسلسل سی گالی لیکن احتجاج کی رُوح تو پاک صاف تھی۔ اُس کا غم اور غصہ تو شعلے کی طرح کندن تھا، گیت اچھا تھا لیکن ماحول نے اسے ایک غلیظ سانس عطا کی تھی۔ اُس غم و ناراد و دشمنی کی طرح جو اپنی معصومیت گندے چھپٹروں میں چھپاتے ہوئے ہو چاند کیا گار رہی ہو؟“ میں نے شرارت سے پوچھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ چاند“ وہ بولی ”جی کچھ نہیں۔“

اُس کے چہرے پر سرکراہٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ اوپر کالاب اندر بھینچا ہوا تھا اور پچلا اب ذرا آگے جھک کر کانپ رہا تھا اور دانتوں کی لڑی بیچ میں جھلک رہی تھی، مجھے اس وقت وہ اس لیے بس ہرنی کی طرح نظر آئی جو چاروں طرف سے نا اُمید ہو کر لیک کئے میں اگر کھرٹی ہوئی ہو، باغری ملافت کے لیے۔

میں نے کہا ”تمہیں معلوم ہے، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

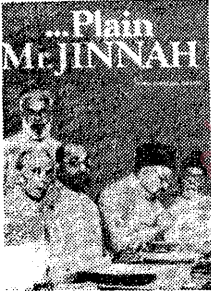
آج کل وہ تھامے لیے بہت سٹاکھیلتا ہے۔ شاید اُس کی نعمت پھر جائے اور وہ تھامے لیے ایک گھر لے سکے۔“

وہ کہنے لگی ”پھوپھو کے ہاں ہر مذہبی کمار تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا؟ اُس نے آئینہ اُٹا کر دیا اور کنگنی بھی زمین پر رکھ دی۔

اُس درختیے کے پر لٹے اور مرحوں کا اپنا اور کھن مہتر خان پر تھا اور ہم لوگ کھا رہے تھے۔ میں اور چاند اور وہ۔ چاند کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی اور گالوں پر لٹی سی سرخی آگئی تھی، جیسے پکتے ہوئے آٹے کی حلد ملائم ہو چکی ہو۔ جسم کم لایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کی خیر چمک بھی اس قدر ادا اس نہ تھی پھر بھی یوں پر سرکراہٹ نہیں آتی تھی مجھے ایسا معلوم ہوا، جیسے یہ لڑکی اب بھی سکرا نہیں سکتی، جیسے یہ لڑکی اب بھی عورت نہیں بن سکتی جیسے یہ چاند ہیشہ کے لیے گستا گیا ہے۔ جیسے اس رُوح کو کبھی قرار سکون، اعتماد اور محبت عطا نہیں ہو سکتی، جیسے یہ زندگی کبھی خوشی، مسرت اور سبقت سے محروم نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ حیات اُس مرنے والی کی طرح ہے جس میں لوگوں نے جا بجا سوراخ کر دیے ہوں۔ ادھر پانی ڈالو، ادھر غائب۔ اس خالی گیت کو جو ایک تلخ گالی تھا، اب کوئی خوشی سے محروم نہیں کر سکتا۔ وہ دسترخوان پر بیٹھی تھی پہلی مرتبہ میں نے اسے اپنے

قائد اعظم

کے ارشادات اُن کی بصیرت افروز زندگی اور بے مثال جدوجہد بھی کتبوں میں لکھتے؟



قائد اعظم کے نام اُن کے چھوٹوں، اُن کے بڑوں، ہم عصرین دوستوں اور کارکنوں کے خطوط، اور قائد اعظم کے جوابات

قائد اعظم کے رفیق خاص

سید رشید الحسن نے ان تاریخی اور یادگار خطوط کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا ہے

ناشر: رائل بک کمپنی پوسٹ بکس کراچی ۳ ۷۷۷۷

ساتھ دسترخوان پر شریک کیا تھا کیونکہ وہ بھی موجود تھا لیکن چاند کو اس عزت افزائی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ نہ اسے ساتھ بیٹھنے کی خوشی تھی۔ جیسے کے برائے اور ممکن کی ڈلی اُسے مروت نہیں کر سکی۔ لیکن کنا سے والی دھوٹی اور اونچی اڑی کا سینڈل پسینے کی خوشی بھی نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی کھا کھا رہی تھی اور ہم لوگ لطیف گوئی اور بذلتی سے کام لے کر اُسے ہنسائے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ بالکل غصے بیٹھی تھی۔ خاموش، اداس پڑمڑم۔ بیکایک مجھے احساس ہوا کہ سماج کے عرفیت کا گناہ، عصمت درسی سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اُس کی عصمت چھن جانے کا مجھے اتنا افسوس نہیں تھا۔ ہر عورت کی عصمت ایک ان چھین لی جاتی ہے، اپنے خاوند کے ہاتھوں یا کسی غیر مرد کے ہاتھوں۔ افسوس تو یہ تھا کہ سماج نے اس چوہہ برس کی لڑکی کی سکراہٹ چھین لی تھی، اس کا اعتماد چھین لیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مٹی چھین لی تھی اور جب کسی انسان سے اُس کی ہنسی چھین لی جائے تو اُس سے بڑھ کر ذمت فرو کوئی نہیں ہو سکتا۔

کھانا کھا کر اُسے گرمی نیند آئی جب اُسکے کھانے کو بچے تھے سب سب اچھے غروب نہیں ہوا تھا لیکن دھوپ بالکل ماند پڑ گئی تھی اور اسے گھرے ہو گئے تھے۔ ایک دکان سے چلے آئے تھے۔ میں آہستہ سے اُٹھا کیونکہ اُسے بازاروں کا دلال اچھی ننگ غالی پر چرت لیٹا غزلے لے رہا تھا۔ سونے دو کم بخت کو۔ اُسے کیا معلوم، ہمارے کسے کہتے ہیں کھڑکی کھول کر دیکھا تو شمل سے بادلوں کے پے کے پے صف باندھ کر چلے آئے تھے۔ میں نے اپنے گنے سر پر ہاتھ پیر کر لیا۔ آہ۔ آج بارش ہوگی۔ جب گنے سر پر بارش کی پہلی بوندیں پڑتی ہیں تو رُخ کو وہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے جو گیسے کے چٹھے کھانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر یقین نہ آئے تو سر منڈا کر دیجیے۔

اولوں سے پیچھے لیکن بارش کی بوندیں اپنے سر پر برس جانے دیجیے۔ تراوٹ حاصل ہوتی ہے، بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں نے آہستہ سے روازہ کھولا اور غسل خانے کی طرف جانے لگا۔ غسل خانے کے باہر پتھر کے چوتے پر چاند بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں طشتری تھی اور طشتری میں اُم کی کیری کے قتلے سرخ مرچ اور نمک اور نمبو کے رکن میں پڑے ہوئے تھے وہ مجھے دیکھ کر ایک چوڑی طرح جھپٹی۔ میں نے کہا ”مرنے ارہیں؟“ ”بے حد کھاؤ گے؟“

میں نے سر ہلایا۔ اُس نے ایک قلم دیا۔ ”وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ آہستہ سے کہنے لگی۔“ میں نے پتھر مار کر اس پر بیڑ سے یہ امبیاں توڑی ہیں۔ بے حد مرنے ارہیں نا؟“

”ہوں۔ ہوں۔“ میں نے کھاتے ہوئے کہا ”کیسے پیٹھے اور مرنے دار ہیں؟“

بیکایک وہ مسکرائی۔ یہ سکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اُس کے سائے چہرے پر، سائے جسم پر، ساری فضا پر پھیلتی گئی۔

اُس کا اوپر کا ہونٹ ہوا بند ہونچا ہوا تھا، آہستہ سے نرم پڑا گیا اور اپنی پہلی حالت پر آ گیا۔ اُس کا جسم پڑا نا تھا لیکن اس کی سکراہٹ پرانی نہیں تھی، نئی تھی، نوجوان تھی، خوب صورت تھی، معصوم، اور غیر لوٹ تھی۔ اُس جیبا پر رگی کی طرح جو کھلنا چاہتی تھا اور پھر شرابیہ بڑوں کی ادٹ میں چھپ جانا چاہتی ہو لیکن اب یہ سکراہٹ بھٹکتی گئی۔ گیت نے اپنا غلیظ لباس اتار بھینکا اور اُس کے جسم میں خوشی کا لغم بھر دیا۔ لگا جہم دونوں مینے لگے۔ تقدیر مار کر مینے لگے میں نے کہا یہ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ ایک پتھر اور مارو۔ امبیاں تو بڑی مرے دار ہیں۔“ اُس نے پتھر اٹھایا اور اُس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

”یہ تم نے کیا کیا؟ اُسے اپنے گھر بھیج دیا؟“ میں نے کہا۔ ”میں نے اپنی ماں کو جو کھ دیا ہے کہ چاند میرے ایک عزیز دوست کی نگہ تیرے گھر آئیں۔ وہ چاند کی دل جوئی کریں گی۔“ ”لیکن وہاں خوش روکے کی؟“

میں نے کہا ”میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بن ہیں۔ وہ اب اُس سے کوئی مشق کرنے والا نہیں ہے۔ چاند کو اب عیش کی ضرورت نہیں ہے، اُسے رنگین دھاتیوں اور سینڈلوں کی بھی ضرورت نہیں ہے خوشی قیسے کے پیرا خوں میں بھی نہیں اور دسترخوان پر اپنے ساتھ کھا کر کھلانے میں بھی نہیں اور اُس سے ازراہ ترقیم تشادی کرنے میں بھی نہیں۔ ان چیزوں سے اُس کی سکراہٹ، اُس کی خوشی لوٹ کر نہیں آ سکتی۔“ ”تم کیا کہہ رہے؟“

میں نے اُس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا ”میں گنچا ہوں اور تم اندھے فلسفی ہو اور دنیا نا پاؤں پھوپھاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ ذرا اُسے میری ماں کی اماترا اور شفقت کی چھاؤں میں دم لینے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے معصوم ہمتوں سے اپنے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ اُسے سننے دو اور اُسے بھول جانے دو۔“

بیکایک وہ مجھ کی اور دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر میری گنجی چاند پر چلی کے کر لولا تم کہنے جذباتی ہو میرا شبہ درست نکلا۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری عقلیت کے سپرد وہ جذباتیت ہے۔ کون تھی وہ جس نے تمہیں یہ کرب ناک شویت عطا کی؟ جس نے تمہاری آنکھوں کا نور چھین لیا؟ جس نے تمہارے گھنے بالوں کے جنگل اجاڑ دیے؟ جس نے تمہاری سکراہٹ میں یاس و قنوط کی لمبی جھلکادی؟ کون تھی وہ؟

میں نے کہا زندگی ایک جوا ہے۔ یہ بتاؤ، آج سے تم میں کیا لگے؟

”نوسے دو یا پانچ سے سات؟“



بٹی ماریجہ
میٹروپولیٹن آگریکریٹ

بنانے والوں کے
محو رکھن پیشکش
بٹی ماریجہ

ملکہ آگریکریٹ



گھر دفاتر اور محفلوں کو
روح پرور پختی پختی خوشبو
سے مہرکانے کے لئے

بٹی ماریجہ
ملکہ آگریکریٹ

سیلوفین ایئر ٹائٹ پیکنگ میں
ٹیمپرمیٹر پپ کے ساتھ
ممتاز ڈیلروں سے دستیاب ہے

پوسٹ بک نمبر ۴۸۸ کراچی

میٹروپولیٹن کمپنی
فون:- ۲۹۲۷۳۷

ORIENT

تھے اُردو آفسانوں میں ادب کی مہکتی آواز کے لیے ایک آواز تھے۔ وہ شہسخت مولوی
وہاں اپنے صاحبزادے کے بار بار ہاتھ دے کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر
در تہہ اذات یوں دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر
سکتے تھے شہسخت نے اپنے آواز کو دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر
مکتے ہوئے تھے شہسخت نے اپنے آواز کو دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر



اُردو کے دوسرے منتخب کماٹے

اُردو کے ایک منفرد ممتاز اور مایہ ناز آفسانہ نگار و قلم کار عبد الباقی کے قلم سے

علائے بھر کے نامی نامی کماٹوں اور چھوٹی سی چھوٹی سی فوج بنائی
اور ان کے بازوؤں کے بھرے پر چڑھ کر تھان کاٹوں سے نکلے
اور وطن پور کی جوبلی میں آکر گئے۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی
ہوئی، لیکن کوئی جوبلی میں آواز سے مخاطب کیا حضور! اب بھی
کچھ نہیں بگڑا ہے۔ حکم دیجیے تو جوبلی پر کھیل کر پانچ چڑھا لائیں مگر
سروکار کی جوبلیاں ہم بیگم جوبلی تو جو چور کی سزاؤں میری سزاؤں
تھوڑی دیر تک سناٹا مارا گیا تھا گھر کی پانچ جوبلیوں کی دل
بلائیے والی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ چودھری گلاب رائے
نے دھیرے سے کچھ ادا کرنا تو جواب ملا کہ تم کسی جوبلی پر گئے
لگے ہو چودھری گلاب! خدا کرے میری زندگی میں وہ دن
آئے کہ میں جوبلی کے باہر پانچ جوبلیوں اور مرنے والے کے نام پر
بٹا لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے یہاں جہاں اب جوبلی ہے وطن پور
کا قلعہ تھا، ابھی توں گھاگھر کی جوبلی کی طرح انگریزوں کی توہیں آتی
تھیں، ان سے آگ برسی تھی اور قلعہ جل کر اڑا دیا گیا تو کیا ہم بھاگ
گئے تھے؟ ہم مٹ گئے تھے۔ ہم آج چورمٹ جوبلیاں گئے تھوڑی
گلاب کھڑے پہنے لیکن کے بیچ دان کی گڑ گڑا ہوتی سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ میر محمد علی بیگ مرچکے تھے میر
محمد علی بیگ کی بیوہ پرستوڑن کی نصیبت نازل ہو چکی تھی۔ میر
محمد علی بیگ نے تقدی میں جھوڑا ہی کیا تھا اور انھیں چھوڑنے کی
پڑی بھی کیا تھی ذرا آں نہ اولاد۔ ایک مہیاں بیوی اور انتہی بڑی جائیداد
لیکن نے گئے جاتے ہیں۔ کچھ حکومت کو یقین دلائے کی کوشش کی کہ
میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں فرمائیں ہی گئے ہیں۔ برسوں کی
کھٹ بٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری گلاب الہ آباد
سب گ

۱۹۵۰ء میں جوبلیاں آیا تھا اس نے سینا پور سے
لے کر کھیم پور کھیری تک سارے گاؤں کا علاقہ تھیں تھیں کر کے
رکھ دیا تھا لیکن گھاگھرانے تو کمال ہی کر دیا۔ صدیق کا بیٹا بنا راستہ
چھوڑ کر سات پیل پیل کر آئی اور سرک کر مٹنے والے انجن کی
طرح چھوٹے موٹے دیہات زمین کے برابر کرتی ہوئی وطن پور میں
داخل ہو گئی۔ وطن پور پہلے ہی سے خالی ڈھالی کی طرح تنکا پڑا
تھا۔ سارے گاؤں میں بس جوبلی کھڑی تھی۔ جوبلی کی کھڑکیوں سے
اُکاڑا دکھاؤں آدمیوں کے چہرے نظر آ جاتے تھے جیسے شہد کی
کھیموں کے چھتے لٹک رہے ہوں۔ جوبلی کچی تھی لیکن کوئی سو برس
سے گھنکھور برسائوں کے خلاف سید نے تانے کھڑی تھی۔ اس کی
دوباروں کی چوڑان پر جہازی پلنگ بچھائے جاسکتے تھے مشورہ تھا
کہ ایک نوکیلیا چور وطن پور کے خاندانی چوروں کا مہمان ہوا۔ رات
چپاکی نظروں سے جوبلی دیکھ کر مٹھیلیاں کھمبے لگا اور لکھیموں سے
ہاتھ کی صفائی دکھانے کی اجازت مانگتے لگا کھڑے کو دل لگی تھی
اس نے کچھ انا پتہ بنا کر اسی رات کو روانہ کر دیا۔ مہمان چور ایک لڑک
پر سارے کر جوت گیا۔ کھوڑا دار ہا، یہاں تک کہ سو بار ہو گیا محو دیوار
اسی طرح کھڑی تھی، اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی۔ وہ بے چارا
ناکام واپس ہوا۔

لیکن بنانے والوں نے جوبلی بنائی تھی، جل جھون نہیں
بنایا تھا۔ اوپر سے مٹھیاں کھت برس رات تھا اور نیچے سے بھائی
ہوئی مست چھین کی طرح گھاگھرا چوڑی کر رہی تھی۔ پہلے پھاگ
گرا، پھر دیوان خانہ، جب ڈیڑھی گز گئی اور اندر کے کمی درجے
بٹھ گئے تو چودھری گلاب رائے کی تک حلالی کو غیرت آئی۔

مقدے جو تک کی طرح لگ گئے۔ مالک کا ایک ایک فوطہ پہن لیا۔ اندر سے باہر تک سب آجڑ گیا۔ گائے بیل، اوتھے پاکی، چھٹے، شامیانے، درمی قائلین، کرسی میز اور دیق پیٹے سب باورچی خانہ زور نہ رکھنے کے لیے جل رہے۔

ایک دن وہ نماز پڑھ کر اٹھیں۔ سوچ کی چاری کے پان دان سے گھر کی گتھلیوں کے دوہرے اور نمبا کو کی پچی کی چکی کا پھنکا لگا یا اور کھنڈر کے آس حصے کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کھانا پختا اور بغیر دروازوں کے لیے پوڑے کر کے کوٹنے میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہائیلوں کے مزہ دیکھ جان کے پیٹ کی طرح خالی تھے تو گھٹنوں پر ہتھیلیاں جمار دھڑکھڑے بھٹکتی ہوئی وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ جیسے جاری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کی نگہراتی بوئیں نکا ہیں اُس ویران شانسان ق ووق کھنڈر میں کر دھتی رہیں جس کی چھتیں گر چکی تھیں، دھنیاں چل چکی تھیں اور دروازے کی جڑیاں بک چکی تھیں اور جس کی فضا پر چھائیوں کی طرح چلتے پھرتے پھرنے کے پابند لوگوں جاکروں کے زرت جگوں کو کرس چکی تھی اور ترستے ترستے شاید قواموں کی مچتی تھی۔ ان کی تھوکی آنکھوں سے میلے میلے دوا نسو تک کر بیہوش لگے موٹی

سے پر واند لائے کر سرکار نے مان لیا ہے میر ختم ملی بیک بتران ہی گئے ہیں۔ وہ عجیب رات تھی۔ مالک سادی رات جانا ز پر بیٹھ رہیں سادی رات نکرانے کی نماز پڑھتی رہیں غزیر میں سادی رات بیچ دان نازہ کرتی رہیں، چلیں بھرتی رہیں جو سنگ سنگ کر ملتی رہیں۔ صبح ہونے ہی پڑا دی نے عولی کے پیاہک کے سامنے وگی پیٹ کر زمین واری کے خانے کا اعلان کر دیا۔ پھر زو جیے نفس ہو گئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں بارخ اور درخت سب کھٹیا بنا شے کی طرح ہٹ گئے، آڑ گئے۔ جیسے بند قی کا ناڈ ہونے ہی چڑیوں کے غول اڑ جاتے ہیں مگر مالک نے ہمت نہ ہاری پھر دھری گلاب کو حکم دے کر ان گنت مقدے لڑاتی رہیں۔ حضرت محل نے ۱۸۵۷ء میں فوجیں لڑائی تھیں حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالک بھی مار گئیں لیکن حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالک نے ہار مانی نہیں بخرب تک۔ آہ ایک ایک کر کے آدمی بھرنے لگے، عورتیں نکلتے گئیں۔ آخر چودھری گلاب نے بھی آنا جانا کم دیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے تیرے میرے مقدے لڑانے لگے۔ عید بقر عید اور ہولی دیوالی پر آٹے، سیر دو سیر مٹھائی کا دونا اندر بھیج کر دوزخ داری نبھائے جاتے۔



نے پتا بتا کر کہ کمالا جیسا ہے کہ آپ پاکستان چلی آویں۔
 افضل علی میرا جانی ٹھوڑی ہے رشتے کے چچا کا بیٹا ہے۔
 انھوں نے آپ کو بلایا ہے بلکہ خاں صاحب تو نکلتے تھے
 کہ ان کو پرمٹ بھی کشتہ صاحب نے اسی شرط پر بنوا دیا ہے کہ وہ آپ
 کو اپنے ساتھ ہی لے کر جائیں۔

”مجھے قصیوں علی پو اب ایسا سیری وقت نہیں پڑا ہے کہ
 موئے سپاہی پیادوں کے ساتھ دوسرے ملک میں ماری ماری چھڑیں
 اُس مانی ملے سے کہنا کہ اپنے ہوتوں کو توں کو سمیٹ لے جائے
 اپنے پاکستان کو۔ مجھے تو اب ایک ہی جگہ مانگھا ہے۔ جب
 تک ہم نہیں مروتا تبھی تک بیٹھی ہوں۔“
 ”وہ کہہ رہے تھے۔۔۔“

”گولی مارا چودھری گلاب! کہنا سننا کانہ ہے کا۔“

”جی، بہتر ہے۔“

”ہاں، میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی۔“

”حکم؟“

”میاں رونق پور میں پاکسی اور گاول میں کوئی؟“

”جی میں نے کہا سرکار میں سمجھا نہیں؟“

”کوئی کرنے پہنچا ہے؟“ ہاکن نے ایسی بھڑائی ہوئی چیخ

مارتی ہوئی آواز میں کہا دھیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت

کی خبر سن کر پھٹ پڑی ہو۔

بوڑھا اور مزاج داں چودھری گلاب اس عجیب غریب حال

کی تہہ تک پہنچ چکا تھا کرتے؟

”ہاں، تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب! تم تو اس حویلی کے

تینکے تینکے سے واقف ہو تم تو اس حویلی کی دافی گیری کر چکے ہو اور

دافی سے کیا پیٹ چھپانا۔ آؤ، جن سب چلے گئے۔ موتیں پلنے

گھرا بادی ہو گئیں۔ شے بڑے گھر میں اکیل بیٹھی کتے بڑا با کرتی

ہوں۔ رات تو روتے گور جاتی ہے لیکن دن یہ پہاڑ ایسے دن

چھائی پر سوار رہتے ہیں۔ ٹالے نہیں ملتے ہیں۔ کوئی کرنا کرنا ہو

قریب سے پرونے میں دل اک جلتے۔ حویلی کے بوڑھے راز دار

کی تصور کی آنکھیں جھوک ماکن کہہنا ہوا دیکھ رہی تھیں اور اُس

کے کانوں میں بے آواز سکسکاں زہر کی بوندیں پوکا رہی تھیں۔

”تم کھڑے کھڑے تنہا گئے ہو گے چودھری گلاب؟“

”نہیں مالکن! میں شام کے حاضر ہو جاؤں۔“

”مگر کچھ کسی دھننے جلا ہے کا کرنا نہ لے آنا بیسے پاس۔“

”نہیں مالکن!“

تن زیب کے کیمبل دوپٹے میں کھو گئے پھر انھوں نے ایک جانی
 بو بھی پھیلال آواز عروس کی اور کسی نے ان کے اوپر کندھوں پر
 ہاتھ رکھ دیے۔ وہ کا پینے لگیں لیکن دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے
 سینے سے محروقاتی ہوئی مقدس آواز سنتی رہیں جو محبت کی غلغلت
 پہنچے تھی اور ایسا دست کا پھرن لگائے تھے تو زیب انسا بچم انم ان شیشہ
 زادوں کی اولاد ہو جن کی تلوار نے سلطنتوں کی تغیریں لکھی ہیں تم
 آن درویشوں کی بیٹی ہو جن کے قلم نے نعت و نوح کے فیصلے کیے
 ہیں تم تلوار نہیں اٹھا سکتیں، تم قلم نہیں چلا سکتیں لیکن دونی تو بچو
 سکتی ہو۔ بخارے ہاتھ کے انحر کے پہن کر میں نے چھتر منزل کلب
 کی میوں کے ساتھ ڈر کھا ہے۔ اب کوئی انحر کھے نہیں پہننا
 ”کوئی نہ کوئی کرتے ضرور پہننا ہو گا۔ میں نے کھنڈ سے لٹاؤ کے
 جو کرتے سلائے تھے ان کی سلائی اُس سے زلے میں کیا تھی؟
 پانچ اسیے کی گزنا تم دلیا کرتا میں دن ہی سکتی ہو رہیں اُس
 سے اچھا کرنا دو دن میں ہی سکتی ہو صرف دو دن میں۔“

جب وہ انھیں توان کی بے پناہ بے قراری کو فوراً چکا
 تھا جیسے ایک جھپکا خواب دیکھ کر صاگ انھی ہوں جیسے دن
 بھر کی سخت غزٹ کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں خوب دیر
 تک نہا کر نکلی ہیں۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اٹھا رہی تھیں کر اُس
 طرف سے آواز آئی جہاں کبھی ڈوڑھی ہو کر تھی انھوں نے
 دوپٹا اس طرح بانگرا ڈھاکا پوندراہر اوڑھ، گئے اور کپتے انگن
 میں پٹپٹاں دھیرے دھیرے کھتی ہوئی اُس کپتے کے پاس آکر
 کھڑی ہو گئیں تو بھٹی ڈوڑھی کے لیے چوڑے نقشین دروازے
 کا سہارا تھا۔

”میں ہوں مالکن! گلاب رائے۔“

”اچھے ہو چودھری گلاب؟“

”مالکن کی دعا ہے۔“

”کیسے آگئے؟“

”ایک سندھیا آیا ہے۔“

”کیا؟“

پاکستان سے خاں صاحب آئے ہیں وہ جو بڑی مسجد

کے پچھواڑے رہتے تھے۔

”وہ نئے خاں؟ جن کا ایک بھائی ہمارے ہاں سپاہیوں

میں تھا؟“

”جی ہاں۔ موٹر پر آئے ہیں وہ کھنڈ سے۔ کہتے ہیں کہ آپ

کے بھائی افضل علی صاحب جو سندھ میں بڑے مکشتر ہیں انھوں



”میرا نام نہ لینا کسی سے“

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے مگر کار! میں کوئی آج نوکری ہوں۔“

میں نے اپنا ٹھکانا سوار پور خاں صاحب سے ملے بغیر خاں کاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر دیکھ کر پال کے تنگے کھردے تخت پر بیٹھے سلف چیتے لیے جب شروع سر پر لگا تب پور خاں نے دروازے سے جھانک کر جو کے کے تیار ہونے کے بعد دیوار اٹھتے ہوئے اٹھے۔ آنگن میں نیم کے چھنار درخت کے نیچے بنے ہوئے کچے لوہے کے جوتے یا پھر کھڑے ہو کر چھوٹ موٹ نانے اور سر جھکا کر جو کے پر بیٹھ گئے۔ چودھراں روٹی سینک کر کھتی جا رہی تھی محض مردوں پہلا میوالہ ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ یہ کام کر کھجی مانا ہے؟“

ہاں۔

”تھوڑا بہت تو کھائے لیو۔“

”تمرے پاس جھلا کچھ روپے ہیں؟“

”روپے؟ مولے یاس تو ابک چھدام ناہیں ہے۔ بڑکٹیوں کے

”آدھرے ہیں؟“

ۛ ہن کوئی دس

”لے آؤ“

۱۰۔ اچھس

مبارک

۱۰ پہلے روٹنے کو

پہلے لکھ آؤ
چودھری گلاب نے مارکیٹ کی قبیل سے چاہیس روپے
کے کاغذ نکال کر گئے اور نکال چوم کر کھڑے ہو گئے چودھرائں پہلے
ترا تھکیں بھاڑے وغیرہ رہیں پھر بجے بھگنے لگیں لیکن چودھری
نے اُن کی بھڑاس پوکا نہ دھرے۔ اگلی سے اپنا گناہاں مار کر پینا
دھوق بنا کر باجی، ٹوپی سر پر اور انگوچھا کھدے پر کر کے کراہ بکری
اُسے گھاس کھانے بونے ٹوٹے کے منہ پر لگام چڑھا دی اور ایک کر
سوار ہو گئے جھوکا مٹوا اپنی چال پھر میل رہا تھا لیکن گلاب کے
ذہن میں اتنا مینے والے کسی انجن ایک ساتھ دھڑ دھڑا رہے
تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زلمے میں فشی تھے مگر
جب چوبلی اڑنے لگی اور بڑے چھوٹے دونوں مختار شمسد کی
کھیموں کی طرح دوسرے باغوں کی طرف سدھار گئے تو مارکن

نیا پنے ایک ایک تنکے کی ذمہ داری چودھری کتاب کو سنبھال دیا۔ چودھری اُن لوگوں میں تھے جہاں ریٹ کاٹ کر کئے والے تھے۔ وہ دن کا منہ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ بچا رکھتے ہیں لیکن ان لوگوں کی شادی بیاہ کے بھی بھیلوں میں سب جمع جھپٹا پر لگا کر آڑ لگایا۔ اُن کا بڑا لڑکا تحصیل میں اور چھوٹا مانہ کے محلے میں چل پسی تھا۔ دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مٹل پاس تھے لیکن چودھری کی لاکھ دوڑدھوپ کے باوجود نہ کوئی پٹواری ہو سکا اور نہ پتول مجبوراً انھوں نے چمڑا سبوں میں بھرتی کروا دیا، اور وہ اُسے دن منہ بچھا ڈھے، ہاتھ پیارے اُن کے سامنے کھڑے رہتے۔ چودھری خود بھی لکھکھ پیٹھتے تھے، اُن کا بھرنا کہاں سے بھرتے۔ اس وقت گھر والی کی بات سے وہ چپڑ میں پڑ گئے۔ بڑا بڑا انتہا گرسبت اور گھٹ کر بے ہو گیا۔ کب سے ہو گیا، یہ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہی سب کچھ اایلا سوچتے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزازے کی دکان پر انھوں نے اپنا تورو کا اور اتر کر بکرت بڑھیا والی تن زب کا کٹخان پر کھنے گئے۔ دو کڑوں کا کیرا بعل میں لاد کر وہ سیدھے سوئی پیسے۔ دل ہی دل میں اپنے باپ ششی چودھری شباب رائے کی پڑھائی موٹی فارسی کا سالار اور مخدوم ہل کر مالکن سے مخاطب ہوئے، انھیں یقین دلا کر پوری رازداری کے ساتھ وہ چبت پور کے ٹھاکر گھنٹا شام تکھے سے کڑوں کا کیرا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے اُن کا حلق سوکھ گیا، کانٹے لگ آئے ساری جان پیسنے میں شرا بڑ پر گئی۔ اُن کی منگی میں دبی ہوئی تپسوی پری کی پڑا بھیج گئی مگر یہ سمجھ میں نہ آ رہا کہ وہ کیا کہہ کر کوا کہاں بٹا کر یہ تپسوی پڑے مالکن کا ہاتھ میں پچا دیں۔ آخر وہ ڈار لینے لکڑی کے بیڑوں پر اپنے جسم کا منوں بوجھ گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے نیسے کی دکان پر آ گئے۔ رام پرشاد گدڑی پر بیٹھا کاکوں کو پڑیاں ہٹا رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد انھوں نے مالکن کا حساب مانگا تو بیتہ چلا وہ سو سے اوپر پہنچ چکا ہے اور اسی لیے رام پرشاد نے مالکن کا سوا بند کر دیا ہے اور مالکن کا زد کر چلنا ہوا چلنا چھ گیا ہے۔ وہ رام پرشاد کی دکان کے تختے پر بیٹھ کر تپسوی روپیوں کی پڑیا کو بنانے لے، پیٹھ لے بھر اٹھ کر اپنے نو پر سوار ہو گئے جیسے لڑائی میں باران لی ہو۔

مالکین و زمینداروں کے لئے جھلنے لگھڑلے پرٹھی رہا انھیں پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ کرنا بیٹے کے لیے صرف چنگی کا بمنزاد انھیں کوئی روشنی ہی کی نہیں، سوئی اور ناگے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جتنے پیسوں میں سوئی تاکا آٹا ہے اتنے میں ایک وقت سب تک



کے آلودہ دو وقت کے چنے آجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا
نے اُن کی سُن لی اور اُن کی ناؤں ناخن کاٹے آگئی۔ وہ ہڑبڑاکر
اپنے خیالوں کی کچی میند سے چونک پڑیں اور ناؤں سے ایسے لمبے
میں غلط ہوئیں کہ اس لمحے میں اگر اپنے نہرے دول میں ٹٹا
ہوئی ہوتیں تو وہ سارے رون پر ہیں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈورا
پیٹ آتی۔ اسے لے فادر کی بٹیا!۔
”جی جی جی“

”میرا ایک کام کرے گی اتنے وغت؟“
”بتائیے۔“

”ذرا لمبی ہوئی رام پرشادی دکان چلی جا۔ ایک مین سوئی
اور ایک چھوٹی پیمیک تولے آ لیکن بٹیا اس سے میرا نام لے
لیتا نہیں تو مکا لیا جواب پکڑا لے گا کل میں نے ایک پیسے کا
نک۔۔۔ خیر چھوڑو، تم ذرا لمبی جاؤ۔“

تادر کی روکی اپنی داہنی کینٹی پر لیکھ ٹولتی ہوئی دھوئیں کی
طرح چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی ہوئی آنکھ سے نکل گئی۔ ماکن مٹی
سوختی رہیں معلوم نہیں کیا سوختی ہیں۔ جب ناؤں سوئی تاگا
لے آئی تو اسی سے اُس کی پیٹی منگوا کر کرنا پوتے پیٹھ گئیں۔ نیچری
چلاتے چلاتے خیال آیا کہ چودھری چیت پور کے ٹھاکر کی ناپ اور
لائے ہی نہیں، کرنا کیسے کا نا جائے۔ وہ بچھ کرہ گئیں۔ تھان گوں

اچھا خاصا تین چار میل دور تھا، اب ایسا آدمی اس وقت کہاں
ہو نا جو اسی وقت چودھری کو ٹاکر لانا۔ پھر انھوں نے دیوار پر چڑھتی
ہوئی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل ہے اور ہر منگل اتوار کو
دولن پر ہیں بازار لگتا ہے منمن ہے ٹھاکر بازار کرنے آجائیں۔

اپنے اس وہم پر پھر دوسرے کہ وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے
آئیں۔ بدھتے ہیں گھر سے پانی انڈیا، وضو کیا اور نماز کے لیے
وہ چٹائی بچانی جس میں کپڑے کے پیوند گئے تھے جیسے تیسے نماز
کافروں ادا کیا گھڑی بھر ڈیف پڑھا اور ایک لمبی سی دعا مانگی۔

”اے پاک پروردگار! اپنے محبوب کے صدفے میں چیت پور کے
ٹھاکر گشتیاں منگھ کے دل میں نیلی وال لے کہ وہ خود آکر اپنے
کرنے کی ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل آپ
اُن کا کرنا ہی دوں لے پروردگار عالم! مجھے اپنی طاقت دے
کہ میں ساری رات بیٹھ کر لائیں کی روشنی میں کرنا ہی سکوں۔“

وہ گڑبڑاتے گڑبڑاتے منجھال ہو گئیں اور اسی جانا زپڑ
دہری ہو کر پڑ گئیں تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی۔ ہمیشہ
کی طرح آج بھی متزانی دو وقت کی کمانے آئی تھی۔ وہ سنی امتیہ سے
سب بنگ

”کیا تھی نے ٹیلی فون پر پولیس طلب کی تھی؟“

”نازہ دم ہو کر آٹھیں۔۔۔ بانگے کی ہوا۔“

”جی جی!“

”بانگے بے گھر پ؟“

”میں تو بی بی“

”ذرا جلدی سے جا کے بلا تولا۔ کہیو کوئی کام نہیں ہے۔
بس ایک بات پوچھنا ہے وہ آٹے پیرس چلی گئی۔“

پھر دروازے سے آواز آئی۔ ”سرکار کی مرضی ہو راج
پاٹ بنا رہے۔“

”بانگے!“

”مالک!“

”چیت پور بخاری جمجانی ہے؟“

”ہے سرکار!“

”ٹھاکر گشتیاں منگھ کو جانتے ہو؟“

”اُن کا سرکار کون ناں جانت ہے۔ دور دور تک اُن کا
نام باجنت ہے۔“

”بازار تو آتے ہوں گے؟“

”برابر مالک، برابر۔“

”تو ذرا تم خیال کیے کہ اُن کو میرے پاس بلا لانا۔ مجھے ایک
کام ہے اُن سے۔“

”بہت نیک جورو! ابھیں لیدو آپ۔“

بانگے تو اپنا چڑدھا جو تا عجب اتنا ہوا اور آئی ہوئی دعائیں
دیتا ہوا چلا گیا لیکن ماکن کسی جگہ کھڑی ہوئی اپنی زبان کی دوا کی
پر بچھاتی رہیں اور دعا مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے
پر نہ آئیں بلکہ کسی نوکر کے ہاتھ کرنا بھیج دیں ورنہ میں کس طرح اُن
سے بات کروں گی، کیا کہوں گی۔ یا اللہ! کچھ ایسا کہہ دو کہ مجھ سے والے
کے سامنے میری آنکھیں نہ چلی نہ ہوں۔

ہانے نے اپنے سوپ پیچھے پر باندھے اور اس بھوکے بیٹھے رہا جہاں آدھ کھولے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بھلوں کے گھنگرہ بجانا اور دھول کے بادل اڑانا تھا کرا آدھا آگیا۔ وہ اپنے سوپ سے سنبھال کر اٹھا ہی تھا کہ ایک گلاب پھانڈا اس نے گلاب کو مٹانے کے لیے بڑی تیزی زبان میں بات کی لیکن گلاب نے بیچھا نہ چھوڑا۔ آفریچے گننا ہوا ہانے تھا کہ طرف لپکا۔ تھا کہ آدمیوں کو بھرتے ہوئے رام پر شاہ کی دکان پر پہنچے۔ رام پر شاہ نے دکان کے باہری پتھر سے پردہ سی ڈال دی۔ تھا کہ بٹھ کر تو لیسے اسے اپنا منہ پوچھا "اسی سے پاؤں بھارتے۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے ہانے جھکا ہوا ڈنڈوت کر رہا تھا۔

"کابے رے؟"

"ایک آنچر (عذر) ہے"

"ہاں"

"مالکن آپ کو بلائیں ہیں۔"

"مالکن؟"

"ہاں یہاں کے سرکار کی مالکن"

"اچھا، کابے بلائیں ہیں؟ کچھ انا پتہ ہے بھلا؟"

"بوسہ کار آپ جان سکت ہو ہم تو کچھ کے تابع دار ہیں۔"

تھا کہ تحصیل کے بڑے زمین داروں اور میر خد علی بیگ کے دوستوں میں تھے اور مرنے والے کے ہر فائدے میں شریک ہونے تھے لیکن اس کے بعد جھل کر بھی ڈنڈوتھی کے سامنے سے نہ گزرتے تھے۔ اب آج اس اچانک طلبی پر گھبرا گئے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ چودھری گلاب پر نظر پڑ گئی۔

"سارے چودھری! مالکن کابے بلائیں ہیں ہم کہا؟"

چودھری کا خون خشک ہو گیا۔ ٹوپی کا زاویہ خشک کر کے الفاظ چبانے لگے۔ وہ.... وہ دلائل مالکن نے آپ کو اس لیے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں ان کو میری ضرورت پڑ گئی تھی اور کسی نے ان کو خبر دی تھی کہ آپ کی سولاری نوٹخان گاہوں سے گزرتے ہی.... اس لیے آپ کو۔"

"اچھا! اچھا تو مطلب یہ ہے کہ اب وہاں میرے جانے کی ضرورت نہیں رہی؟"

آپ اب کیا کیجیے کہ تکلیف کر کے۔"

تھا کہ کے ذہن سے بوجھ مل گیا اور چودھری کو ایسا لگا جیسے ریل گاڑی سے گرتے گرتے نہج گئے ہوں۔

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا گڑنا دیکھتی رہیں جو سن لائٹ

صبا میں سے پھینچا گیا تھا اور سن لائٹ صبا میں کی بدبو میں بسا ہوا تھا۔ ٹھنڈیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں چہرے سوچ کر بیٹھ رہیں کہ جب رونے پور پر یہ قیامت بتی ہے تو جیت پور پر بھی کچھ نہ کچھ گزرتا ہی گئی ہوگی۔ پھر وہ گڑنا تڑا خٹنے لگیں۔ جب تک اندھیرا نہ ہو گیا اور ان کو سوسنی نظر آتی رہی وہ اسی طرح بیٹھیں کہ انھیں جھکا اپنی تقدیر کا کھیا پورا کرتی رہیں۔ رونے والے کے خواب بھی نہیں دیتیں۔ مغرب کی نماز کے بعد انھوں نے پتیل کی وہ لالین جلائی جس کی چمبی جگہ جگہ سے لٹی ہوئی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھبک آہستی تھی جیسے مالکن کی بدلتا پر رتے رتے اس کی پچھلیاں بندھ گئی ہوں۔ دھکنے ہوئے سر پر چھینٹے کے پتی باندھے ٹھیکہ انھوں سے پڑا بھڑلے وہ سبکی رہیں۔ جھاک ایسی سفید ترن زیب کے دیر لے میں لکڑیاں بنیتی رہیں دال عینتی رہیں۔ ٹنڈن کے دالوں جیسے گہوں کا اٹھلا اٹھلا گڑنا دھکنے کا ارمان کرتی رہیں پھر پھر چوڑا لگا، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سدھ ہو کر سانس کے جھلنے پر دہری ہو گئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹھیک کے کس میں بھول جیسی سلائی کے سہل کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی، ویسے ویسے ان کے چہرے کی جھڑکیوں کا حال اور گڑنا ہڑنا چلا گیا۔ پھٹری بال ایک دم سے پک گئے جیسے پلانے کے جاول دودھ میں ابال کر پیالے میں چوٹی تک بھر دیے ہیں۔ گھر پر اداسی چھا گئی پیلے خود چودھرائن نے گلاب کو سمجھا پھر لڑکوں کو حلقے سے ہٹا کر اس پولے پر لگا دیا۔ پھر ٹینوں نے مل کر ایک دو پھر گھر کے آنگن میں مہا بھارت چھیڑ دی۔ دھیرے دھیرے بات بڑھتی گئی اور خون گرم ہونا گیا۔ چھوٹے نے جوتاڑی کے ایک ہی کپڑے میں بڑا لگا تھا لڑکوں کو کہا۔

"اے آماں تم کجا جانو۔ بوڑھو اوئی میلمیں سے چپٹا ہے۔"

بوڑھے چودھری گلاب رائے جن کی جوانی ان کے اپنے سر کی طرح بے داغ تھی یہ مہیا تک الزام سن کر دیرانے سے ہو گئے۔

وہ جہاں کھڑے ہوئے پوچھی لڑکے تھے، وہیں دھپ سے زمین پر بٹھ گئے۔ اس طرح گڑے کے کچھڑے سکے چھوٹا لڑکا ثبوت سے اٹھتا۔

"جب بھیا (ریلا ب) آئی ہے تب انھیں تو صبا پر کیوں کے

آوی دماں کا بچا ہے گئے رہیں؟ گئے رہیں کہ ناہیں گئے رہیں

تم اپنے منہ سے بتاؤ آماں!"

چودھری گلاب کی بے نور آنکھوں نے گھر والی کے لپسرے

پر تعین کی پرچھائیں دیکھ لی جیسے شکار نے زخمی جانور پر دوسرا

فائر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی آنکھوں پر اپنی لاش اٹھا کر اٹھے اور



روپ بچھارے۔ جلد سنوارے

خوشگوار تازگی اور حسن کی آب و تاب -
دلکش روپ، نئی دل آدم بزم تک اور
نرم و ملائم جھاگ دن بھر آپ کی جلد کو
تروتازہ رکھتا ہے۔

نیا کپری

صابن



PAL W.I.L.B. 5/77

خوراک دلا دو۔“

اب اُن کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے
میلے میں کھو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے آپ سے ملیں تو دھوپ
آگن میں اُتر آئی تھی۔ رات داغ میں آئے ہوئے جان سے ڈالنے
کے سامنے منہ پوٹے بوڑھی زخمی لالین کی طرح بچھ چکے تھے۔ وہ
باہر نکلی ہی تھیں کہ کمر پر لوگر ادھر سے اور ہاتھ بھر کا گھونٹ نکالے
بانٹنے کی ہو مکا نے آگئی۔

”اے نوجوبت پور جانے گی؟“

”ہاں بی بی!“

”تو ذرا بٹھا کر سے کہہ دینا کہ اگر بازار آدیں تو مجھ سے مل لیں۔“

”بہت اچھا۔“

مالکن باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھی کہ دروازے
پر تیز آوازیں شریر لڑکوں کی طرح اُچکنے پھانسنے لگیں۔ مالکن
کا اشارہ پا کر بانٹنے کی ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک لمبی دُلی
عورت کے ساتھ واپس آئی۔ وہ لال کنا سے کی سفید ساڑی باندھ
ہوئے تھی۔ منترانی نے عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے
کہا: ”ای خنان کاٹل والے چودھری گلاب کی چھوٹی بیوی ہیں لیلہ
دھر کی دھن۔“

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ سوچنے
لگیں کہ اسے کس طرح مخاطب کریں اور کیا خاطر کریں۔ چودھری
گلاب کی چھوٹی بیوی اپنی بغل سے مڑے ہوئے کُترنے نکالے
اور مالکن کے ہاتھ میں بچوڑا کر منڈیل کرتی ہوئی آوازیں منمنائی۔
”ای کُترنے آپ دھر لیو۔“

جلد ختم کرنے ہی وہ تیر کی طرح باہر نکل گئی۔ منترانی
تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر دوسرا گھر کمانے چلی گئی۔ مالکن چھیل
سے کُترے کرنے تھائے اسی طرح آگن میں کھڑی رہیں جیسے
زندگی کی لڑائی میں بار بار لی ہو اور مصیبتوں کی فائغ فوجوں کے
سامنے سفید جھنڈا کھول دیا ہو۔

شام کو ڈوڑھی پر کھڑے ہوئے چوبیت پور کے ٹھاکر
گھنشیام سے مالکن کہہ رہی تھیں: ”اپنے کُترنوں کی تن زہب
آپ بھیجتے رہیں گا۔ فی الحال میرے یہ چاول کُترے جو ابھیجیے۔“

ٹھکے ہوئے دپٹے کا پلہ سمجھا لیا۔ موٹر موٹے زاپروں سے ہلکی ہلکی
جھنکار پیدا کرتی اُن کے پاس نہ کر بیٹھ گئیں اور اُن کے ملل کے
کرتے کی ہلکی آہنیں پر انگشتانوں اور انگوٹھیوں سے سجا
ہوا ہاتھ رکھ دیا۔

”تم اتنے آداس کیوں ہو؟“

”نہ تو تم نے غسل کیا نہ ہاتھ۔ کتنی دیر سے اُسی طرح

چپ چاپ بیٹھے ہو۔“

”ہوں۔“

”ایک بات کہوں؟“

”ہوں۔“

”غصہ تو نہ کرو گے؟“

”اُوں ہوں۔“

”حکیم ڈاکٹر دوا کرتے ہیں، نصیبا نہیں بناتے۔ مجھ کو کھ چلی
کے معتز ہی ہیں اولاد نہیں تو حکیم ڈاکٹر کیا کر لیں گے۔ پیری مانو تو
دوسری شادی۔“

”چپ رہو۔“

وہ اتنے زور سے گرے کہ باورچی خانے میں کام کرتی
عورتوں کے ہاتھ سوکھ گئے۔ کتنی ہی دیر تک وہی ہی پر جلال
غاموشی چھائی رہی پھر ایک عورت سامنے کی طرح چلتی ہوئی
آکر تخت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے اشارے سے پوچھا۔
”چودھری گلاب ڈاڑھی پر کھڑے ہیں۔“

”بلاؤ۔“

والان کے پرے بندھے تھے۔ کمرے کے دروازوں پر
چلنیں پڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اوسط قد کا سوکھا سا کھا
آدمی آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے کُترنے کے مونڈھے پر پوند لگا
تھا۔ دھوئی کُترنے سے زیادہ اُبل تھی۔ دھوئی سے نکلی ہوئی سوکھی
ماری پٹلیاں دھول میں اُٹی ہوئی تھیں۔ نیچے جوتوں میں بند
ہونے کی وجہ سے صاف تھے۔ گھٹے ہوئے سر پر رکھی ہوئی ٹُپڑی
میں میل کی گرٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ سہا ہوا کھڑا تھا اور دونوں
ہاتھوں سے ایک جھولا سمجھا لے ہوئے تھا۔ دوالے آئے؟“

”ہاں سرکار!“ اُس آدمی نے کُتر گڑا کر کہا۔

”شے دوت۔“

اُس نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو اس طرح جھولا
پکڑا دیا جیسے وہ جھولا نہیں بیٹھنے کا بلکہ ہوا اور اُس میں بالاب
عطر بھرا ہو۔ پھر آواز آئی: ”چودھری گلاب کو دوا آنے پیسے اور

سب نگ



دھوم کی تو کو گجر آئے ادبے مکے اُدو کے پریم چند کا دیرمہ حاحلہ ۵

جنگل کے ایک کلب کے نام اُدبے دھوم کی تو کو گجر آئے

ایک حسدینے خود تک کے زمانے جو کے بھٹے شکایت نہایت کے تھے



زیادہ کام کرتی۔ اُسے کام میں دلچسپی لینے کی عادت ہو گئی تھی اُنھی دنوں اُس کا شوہر جل بسا اور دو سالہ لڑکا نظیر بیٹم ہو گیا مگر شمیم کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔

نظیر ایک نوکرانی کا لڑکا تھا۔ بیٹھ عثمان کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ وہ اُن کے لڑکے کے ساتھ کھیلے۔ اگرچہ اب شمیم بھی تنہا تھی اور وہ خود بھی تنہا تھے اور انھیں خود بڑے لڑکوں کی طرح کھیلنے میں اعتراض نہیں تھا۔ حکام، قانون صرف رعایا کے لیے بنائے ہیں اور اپنے لیے راستہ کھلا رکھتے ہیں۔ اسی طرح بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کے لیے قانون بناتے ہیں اور خود کو مستثنیٰ خیال کرتے ہیں۔

عورت کو مرد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ محبت امیر مٹول اور دل فریب اداؤں سے مرد کو بھاسکتی ہے مرد کو عورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اپنی باطنی کائنات سے نکال سکتا ہے لہذا بیٹھ کے اس اعتراض میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی کہ اُن کا لڑکا نظیر کے ساتھ کھیلے۔ کمی آتے آتے اعتراض ہی جا بار بار عینا بات کی بارش ہونے لگی۔ شمیم بے لے نظر کو دے، ہوتے ہوئے بیٹھ صاحب بالکل رشتہ خطی ہو گئے۔ طرح طرح محبت کی بینک بٹھانے لگے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ شمیم ہمیشہ کاتی ہے مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ آج کل زیادہ کانے لگی ہے۔ انھوں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ شمیم کا گانا یا تو نظیر کے لیے ہے یا وہ اپنی خاطر گاتی ہے یہ کیفیت سمجھنے کے باوجود انھوں نے بہت نہ ماری۔ ایک دن شمیم سے بولے یہ شمیم اب میں کیا کروں، جس سے شادی کرنا پڑا وہ میرا ہے، شمیم کوئی جواب دے بغیر کھڑی ہنستی رہی بیٹھ صاحب نے کہا تو راند اور میں رندا ہو گیا ہوں اپنی زندگی

کام کرنے آتی تو اسے وقت کچھ نہ کچھ لنگاتی شمیم رہتی۔ وہ برتن مانگتے وقت گاتی، پوڑے دھوتے وقت گاتی، مکان میں صفائی کرتے وقت گاتی۔ حال ایک جگہ سے دوسری جگہ گزری رکھتے وقت بھی گاتی۔ اُسے آپ کتنا ہی زیادہ کام سپرد کر دیں، کیا حال کہ وہ چہرے سے ناگواری ظاہر ہونے سے لیکن اگر آپ اُسے کانے سے باز رکھیں گے تو وہ کام ضرور کرتی ہے گی مگر اس طرح بصل سنی نظر آئے گی گویا اُس کے جسم سے رُخ علیحدہ کر لی گئی ہو۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ اُس سے کسی کام کو کہا گیا ہو اور اُس نے انکار کر دیا ہو۔ چوہا مر جائے اور اُس سے اُسے چھیننے کو کہا جائے تو وہ بخوشی چھینک دے گی۔ کیسے ہی سوال کا جواب دینا ہو اُس کی شیریں زبان سے پہلا لفظ ”جی“ نکلتا لیکن جب اُس کا دو سالہ لڑکا نظیر اُس کے ہمراہ ہوتا اور نظیر کی دل جوئی نہ کی جاتی تو شمیم منہ سے کچھ نہ کہتی مگر محکم گین اور دل برداشتہ ہو جاتی، کا ناخود بخود بند ہو جاتا۔ بعض آدمی اپنا کام دلچسپ بنانے کے لیے اکثر کانے ہیں، اسی طرح شمیم بھی بہت اہستہ مگر دلکش آواز میں گاتی تھی۔

بیٹھ عثمان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ شمیم اُن کی ملازمت تھی گھر کا تمام کام کا شمیم کو کرنا پڑتا تھا۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ بیٹھ عثمان نے اُس کے ساتھ دل لگی اور خوش غلیوں کا آغاز کیا مگر ابھی بات زیادہ بڑھنے نہ پائی تھی کہ کتنی سیٹھانی آگئیں۔

نئی سیٹھانی بھی دو سالہ لڑکا چھوڑ کر مر گئیں۔ شمیم بدستور ملازمت کرتی رہی۔ وہ چوبیس گھنٹے کام کرتی چھٹی کے روز



مسی تعلیم اُس میں قوت ارادی پیدا کر دیتی ہے۔ جب وہ جوان تھی سیٹھ عثمان اُس کی قربت کے لیے کوشاں تھے۔ کبھی نادانگی میں رخسار بھی چوم لیا ہوگا یا کبھی ٹھیس کے بہانے اُس کے بدن سے دانستہ مس بھی کیا ہوگا۔ شمیم یہ تمام حرکتیں خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتی تھی لیکن شاید اسی سبب سے اُس میں اپنی حفاظت کا اور اُن کے والے واقعات کی نزاکت کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مردوں کے ساتھ کام کرنے والی مزدور پیشہ عورتوں کی طرح ہنس مکھ اور طنز بن گئی تھی۔ لائیو عورتوں کو مردوں کے ساتھ آزادی سے بننے بولنے خود کو محفوظ رکھنے، حد سے تجاوز نہ کرنے اور جس تہذیب سے کام لے کر خردوں کو نہانے میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے شمیم کو بھی یہ مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ مگر سیٹھ نے اُس کی یہ مہارت، رضامندی پر محمول کی اور جب شمیم کا بیاد ہو تو عثمان سیٹھ بے حد خوش ہوئے۔ یہ خوشی اس لیے نہیں تھی کہ شمیم کو اب چہن کی زندگی نصیب ہو گئی ہے یا اُسے اچھا بول گیا ہے۔ سیٹھ کی یہ خوشی فریب کا راندہ اور خود غرضانہ تھی۔ مہاداد سیاہ کار کی کا کوئی خراب بیجو رونما ہو تو فک نہیں، شمیم اب شادی شدہ ہے، سیٹھ کی نیک نامی پر حرف نہیں آئے گا۔ دنیا انکشت نمائی نہ کر سکے گی۔ سماج میں رہ کر وہ باعزت

بھی کوئی زندگی ہے۔“ شمیم نے ہنسا بند کر دیا۔ اُس کی نظر سیٹھ کے چہرے سے گزرتی ہوئی نظر پرجا کر پھری۔ وہ سیٹھ کے انداز تاؤ لگتی تھی اس چہرہ چاڑ کا مطلب اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ سیٹھ چند لمحوں تک اُسے تنکے سے بھر کھینے لگے۔ بلوتی کیوں نہیں شمیم، کیا تجھے پہلی سیٹھانی کا زمانہ یاد آ رہا ہے؟“ پہلی سیٹھانی کے زمانے میں شمیم جوان تھی۔ اُسے سیٹھ کی اُس وقت کی خوش فعلیاں یاد آ گئیں۔ اُس کا چہرہ ہنسا اٹھا سیٹھ نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔ اُنھوں نے فوراً برنی کا ایک ٹکڑا شمیم کی طرف بڑھایا۔

”تھے شمیم! یہ نظیر کو دے دے۔“ شمیم نے برنی کا ٹکڑا اس طرح لیا جیسے شکاری کی اہرٹ یا کھاکر ہرن چوکتے ہو جاتے ہیں۔ سیٹھ کی بدلی ہوئی نظر سے اُسے احساس ہوا کہ جس جگہ ملازمت میں اتنا عرصہ گزارا ہے، اب وہاں ان زمین پاؤں کے نیچے سے نکل جا رہی ہے۔ وہ مستقبل کے خیال سے کانپ اٹھی۔

شمیم جن حالات سے گزر رہی تھی، ان سے گزرنے والا انسان بسا اوقات غیر فانی اخلاقی جرأت کا مالک بن جاتا ہے۔ گویا اتنی

طریقے سے شمیم کے ساتھ خفیہ تعلقات قائم رکھ سکیں گے، یہ شادی اُن کی یہ کاری کی پردہ پوش ہوگی لیکن اُن کی یہ خوشی بے سود ثابت ہوئی۔ شمیم نے کبھی انھیں حد سے تجاوز نہ کرنے دیا۔

شمیم کا منگیت ایک غریب آدمی تھا۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی یعنی شمیم کے بیٹھ سے ساتھ چار سو روپے قرض لے کر شادی کی تھی۔ قرض اس شرط پر تھا کہ جب تک یہ رقم ادھر ہو جائے شمیم شوہر کے ساتھ نہیں سے گی بلکہ بیٹھ کے ہاں رہے گی گویا قرض کی ادائیگی تک شمیم کی شخصیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کڑی شرط کے باعث دونوں میاں بیوی شادی کے باوجود محض خیالی لطف حاصل کر رہے تھے شمیم اور اُس کا شوہر ایک دوسرے سے ملنے کو شوہر کرتا۔ غیر اجابی ہر وقت تجھ میں لگا رہتا ہے۔ تو چاند کی طرح خوب صورت ہے، اس کا تو مجھ کو گمان بھی نہ تھا۔ اگر پہلے معلوم ہوتا تو دو سال پیشتر ہی محنت مزدوری کر کے، پیسہ پیسہ جوڑ کے اتنی رقم جمع کر لیتا مگر اب ہم دونوں مل کر محنت کریں گے اور قرض کے لیے مجھ سے ملکر جائیں گے۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ ہم ایک ساتھ انھیں لے آئیں گے، ایک ساتھ بیٹھیں گے، مزے اُڑائیں گے اور سکھ چین کی زندگی بسر کریں گے۔“

شمیم، عثمان بیٹھ کے گھر ایسی گلیں سے کام کرتی جیسے کسی عظیم مقصد کے لیے جدو جہد کر رہی ہو۔ وہ گاتے ہوئے کام کرتی اور کام کرتے ہوئے گاتی۔ ہر سر ہر قدم وصال کے خوش آمدین کے لیے نہایت ہوتا جاتا۔ وہ امنگ اوروصلے سے کام کرتی مگر بیٹھ کے سامنے تک سے بچتی۔ وہ پانی پانی کا حساب رکھتی مگر رعنائیت کا پیسہ واپس کر دیتی۔ ہر کام میں وہ مستعدی ظاہر کرتی مگر اپنی حفاظت کے لیے اُس نے گویا چاروں طرف پہرے بٹھا دیے تھے۔ بیٹھ عثمان کی ساری امتیں خاک میں مل گئیں۔ شادی سے پہلے بیٹھ کے مذاق پر داشت کرنے والی شمیم آج بھی ایسی ہی ہنس بھڑک اور زندہ دل تھی مگر اب وہ اپنی اس قدر حفاظت کرتی تھی کہ انھیں جرات ہی نہ ہو سکی۔

شمیم کے شوہر نے رات دن ایک کر کے پیسے جمع کیے شمیم نے بیٹھ اور عثمان کے دل موہنے کے ساتھ ساتھ جس قدر ہو سکا، کام کاج کیا۔ اس طرح دونوں نے دو برس میں ساڑھے چار سو روپے ادا کر دیے مگر اتنی شدت کے بعد شمیم کا سہاگ شکل سے تین سال قائم رہا پھر اُس کا شوہر مر گیا۔ شمیم تنہا رہ گئی اور دو سال بچے کی حفاظت کا بار بھی اُس کے سر پر آ گیا۔ شمیم کام کاج کے علاوہ ہوشیاری سے ملازمت قائم رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُسے بیٹھ

سے بچنا تھا اور اُس کے ہاں کام بھی کرنا تھا۔ اسی اثنا میں بیٹھ کی دوسری بیوی دو سال کا ایک بچہ چھوڑ کر انتقال کر گئی۔ مگر میں رنڈا بیٹھ، بیوہ شمیم اور دو چھوٹے چھوٹے بچے، جملہ چار نفرہ گئے تھے۔ شمیم نے بجانب لیا تھا کہ بیٹھ کی وہ بیوی پھر اُٹھ کر آئی ہے جو بیویوں کی زندگی میں دینی ہوتی تھی بیٹھ اب اپنی بیوی کے غلام میں جو ات مذہبی ہوتا جا رہا تھا۔ شمیم کو ملازمت لڑنے کی درخواست اور اپنی حفاظت۔ یہ تینوں کام انعام دینے تھے نیز بیٹھ کے لڑکے کے لیے بھی اُس کے دل میں مامتا پیدا ہو گئی تھی لہذا اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بیٹھ کے ہاں مستقل کام کرتی رہے گی۔ فیصلہ کر کے اُس نے اطمینان تو حاصل کر لیا مگر وہ جہاں ایک قدم ملازم کی حیثیت سے اپنی عصمت سلامت رہنے کی امید کرتی تھی، وہاں بیوی کی فراوانی دیکھ کر اُس کا دل کانپ اٹھتا تھا۔

یہ عصمت نامی اُس نے اپنے دل کے استحکام سے حاصل کی تھی، جب وہ اور اُس کا شوہر شرط کی رو سے الگ الگ رہنے پر مجبور تھے، اُس وقت اُس کا شوہر بیٹھ سے عرصے میں ایک بار اپنے بڑے بھائی کے گھر پہنچا مگر شمیم سے ملنے میں اتنا دلی سے کام نہ لیا، کہ دن بچے کیے بیٹھا رہتا اور پے ادا کر کے چلا جاتا دوسرا بہتر آتا تو دوسری خطا ادا کر جاتا اور تیسرے ہفتے تیسری قسط شوہر کے شریفانہ خلوص اور محنت پرستی نے شمیم کو محنت مزدوری کر کے قرض جلد ادا کرنے کی طرف آمادہ کیا تھا۔ دونوں صدق دل سے کما تے میں سمجھ رہے، رقم ادا کرنے سے پہلے دونوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے میں تعریف کے لائق کامیابی حاصل کر لی تھی۔ محنت و شفقت میں وقتی جذبات سرد ہو گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ایک سچا، ایک نیا جوہن کس تھرا رہا ہو۔ اس طرح وہ

انتظار کی گھڑیاں لطف و کیف سے گزارتے رہے۔ شمیم اس کسوٹی پر کھڑی ثابت ہوئی۔ اُس کی زندگی خاص سونے کے مانند ہو گئی۔ بیٹھ عثمان کا سحر اُن سے نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اس کا سبب محض یہ تھا کہ اُس کے خاندان میں شوہر کے سوا کسی دوسرے کی محبت کی گنجائش ہی نہ تھی کبھی کبھی جھلا کے وہ سوچتی کہ ملازمت بدل دے مگر یہ خیال بے کار تھا، مبادا دوسری جگہ بھی بیٹھ عثمان ہی جیسا بیٹھ لے۔ وہ یہاں سے جتنی تو لطف کی ہوئی کا اسرا بھی نہ لے گا۔ یہاں تو لطف بیٹھ کے لڑکے کے ساتھ کھیلتا اور کھاتا پیتا تھا نہ بیٹھ کا لڑکا بھی شمیم سے مل گیا تھا۔ بچی دھوے پرانی جگہ چھوڑنے کے خیال سے شمیم کا دل کانپ اٹھتا تھا اسے کیا کرنا چاہیے؟ اُس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

اُسے آج خود راج پہنچا رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی شمیم بے بس ہو گئی۔ اُس نے نظیر سے کہا: بیٹا! میری دماغ خیر تر سے ساتھ رہے گی۔ تو خوش و قرم رہ اور مجھے جانے دے۔
”دفان بھی ہو کہیں۔ تجھے روٹی کون نگوڑی ہے؟“ نظیر کی بیوی بول اٹھی۔

نظیر نے بیوی کی پٹائی کے لیے چھڑی اٹھالی لیکن شمیم نے بیچ بچاؤ کر لیا۔ نظیر کی بیوی رونے پٹنے اور چلانے لگی۔ وہاں، مار ڈال مار ڈال تیا کے غلام! اور تجھ سے ہو ہی کیا سکتا ہے؟“

دس کے روز صبح سویرے نظیر کا پتا ہوا عثمان سیٹھ کے پاس پہنچا۔ میری اماں جان آنی ہیں؟“
”وہاں نہیں آئیں۔“

”تو کہیں کہاں؟ رات کو میری بیوی نے کچھ زبان دلاری کی تھی۔ صبح دیکھتا ہوں تو کھٹیا خالی تھی اور اماں جان غائب۔“
”ہیں، عثمان سیٹھ نے حیرت سے کہا: ”کوئی نشان؟“
”کوئی سرخ؟“

”اور تو کچھ نہیں، صرف یہ پُرزہ کاغذ کا کھٹی گئی ہیں؟“
عثمان سیٹھ نے پُرزہ ہاتھ میں لے کے پڑھا۔

”پیارے نظیر! ہو تجھے طعن کرے گی کہ تیری ماں نے کوئی خراب کام کیا ہو گا اس لیے کسی عویز نے ناک کاٹ لی مگر یہ بات نہیں ہے بیٹا! اپنی جوانی اور تیرے بچپن دونوں کی ایک ساتھ حفاظت کے لیے میں نے اپنے ہاتھوں پر کام کیا تھا۔“
سیٹھ نے کوشش کی کہ کاغذ کا مضمون نظیر کو معلوم نہ ہو سکے۔ اُن کے ہاتھ سے کاغذ کا پُرزہ زمین پر گر گیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر صرف سوچنے رہے، کچھ بول نہ سکے مگر نظیر کو ٹھٹھکی باندھ کر بچتے رہے پھر بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا: ”نظیر بیٹے! تیری ماں کہاں گئی؟ شمیم کہاں ہے؟“
نظیر ابک بار اُنھوں سے بے زبان کاغذ کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دنوں بعد ایک مجب حادثہ پیش آیا۔ ایک صبح شمیم کی ناک کٹی ہوئی پائی گئی معلوم ہوا، رات کو کسی رشتے دار نے اگلی دشمنی کی وجہ سے اُس کی ناک کاٹ ڈالی۔ ناک کے ساتھ شمیم کی خوبصورتی بھی رخصت ہو گئی۔ نتیجتاً سیٹھ کی گفتگو میں مزاح کی چاشنی درسی شمیم کے لیے یہ حادثہ مبارک ثابت ہوا وہ سیٹھ کے التفات سے بچ گئی۔
بعد میں وہ جب بھی اسی واقعے کا ذکر کرتی تو مومسے لے لے کے کہتی۔
”مومسے نے مزید کپڑا ٹھوس کر کھیرے کی طرح ناک کاٹ لی۔“
عثمان سیٹھ سُن کر مشتہ وہ شمیم کو پُرائی خادیمہ سمجھ کر مرانی سے نہلاتے رہے مگر نظیر کو اب ہمتھائی دینا انھوں نے موقوف کر دیا۔
اپنے لڑکے کو اُس کے ساتھ کھلتا ہوا دیکھ لیتے تو انھیں بنا کر اُسے منع کر دیتے شمیم بے سبب باتیں دیکھی اُن دیکھی کر دیتی اور لگناتی ہوتی اپنے کاں میں مستعدی سے محو رہتی۔ گا نا اور کام کرنا کام کرنا اور گا نا اُس کے ہی دو مشغلے رہ گئے تھے اگرچہ اب اُس کا گا نا اگلے گانے کا منہ چڑاتا تھا مگر دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس عورت پر بھی کوئی نصیبت نازل ہی نہیں ہوئی کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ اس طرح شمیم نے برسوں گزار دیے جوانی بھی رخصت ہو گئی۔

نظیر کی شادی ہو گئی ہو گھر میں آئی تو فساد کی بنیاد پڑی۔
نظیر کی بیوی میں کوئی عیب نہیں تھا مگر وہ بڑی بڑی بیوی تھی۔ کچھٹی ساس کو دیکھ کر خوب ناک بھوں چڑھاتی۔ یہ امر اُسے اپنی تو بہن معلوم ہوتا تھا کہ جس نے ناک کٹوائی ہو، وہ اُس پر حکم چلائے۔ اُس نے دو چار بار ساس سے دو بد و کہہ بھی دیا کہ ”بڑی بی بی! میں تو جیسی کچھ ہوں، سوہوں مگر میں نے ناک نہیں کٹائی، شمیم کو یہ طعن نہایت ناگوار گزرتا مگر کیا کرتی؟ نظیر سے کہتی تو ممکن تھا وہ غصے میں آکر ہو کر اٹھتا۔ اس لیے شمیم غامضی سے سب کچھ دشت کرتی۔ جب زیادہ تنگ آتی تو کاتی ہوئی کام پر چل جاتی بیٹیتیں میکروں ٹھیں مگر لا علاج تھیں لہذا ایک ہی پُرانا اور تیرہ ہدف علاج تھا یعنی جب حد سے زیادہ دُکھ پہنچتا تو وہ کاتی ہوئی کام میں مشغول ہو جاتی۔

ایک روز نظیر اچانک گھر آگیا۔ اُس کی بیوی نے کھر کو پائی کا میدان بنا رکھا تھا۔ شمیم خاموش کھڑی تھی اُس کی نظریں ساس کی اور اُنھوں سے سیل انک رواں تھا۔ شمیم نے گھر چھوڑ دینے کے لیے اپنی کٹھی باندھ کر تیار رکھی تھی مگر نظیر کو دیکھ کر ماتا سے دل گھل گیا، جسے بچپن سے جان کی طرح سنبھال کر جمانا کیا ہے،

سب بنگ





ایک حکمت مند تادیب کے بعد
 دھوکہ دینے والے کے دینے والے واقعہ پیش ہے۔

ایک حکمت مند تادیب کے بعد واقعہ پیش ہے۔

چاندی کے ٹمنوں سے سجا ہوا تھا۔ اعضا مضبوط و متناسب تھے۔
 اس کی سچ جھج کے دے رہی تھی کہ بڑے بڑے شہر زور اس کی
 ہمت و طاقت کے آگے تابع دارلہ سجدے کرتے ہیں۔ مومن خاں
 کے خوش نمابوں پر ایک دل فریب مسکراہٹ زلفاں تھی، ہموار
 پیشانی اور جھکی ہوئی آنکھیں اس کی بلند خیالی و شریف انقباض
 کی غماز تھیں۔ بھرے بھرے بازو ہاڑوں کو ہلا دینے کے دعوے دار
 دکھائی دے رہے تھے۔ حسین روپا، مومن خاں کو اس وقت تک
 متاثر نہ بھیجتی رہی جب تک اس کی سواری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوئی۔
 وہ اپنے آپ سے غافل ہے جس وعظت خاموش کھڑی تھی بصورت کی
 آنکھیں اسے نہ معلوم کیا کیا دکھا رہی تھیں۔

روپا کی محویت اس کے والد نے آنکھوں سے روپا؛ کیا دیکھ
 رہی ہو پٹیا؟

روپا کا نپ گئی جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے جاگ بڑا
 نے جلدی سے خود کو سمجھالا۔ کچھ نہیں ناجی؟ پھر اس نے خود کلامی
 کے انداز میں اپنے پیسے پوچھا۔ یہ نواب مومن خاں کی سواری تھی یا؟
 ”ہاں بیٹی! ابھی کی سواری تھی۔ اس کے پتالے کما۔ مگر
 بہت اچھے حاکم ہیں۔ وہ امیر غریب چھوٹے بڑے اور بہت رو
 مسلمان سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ کاش آن کا جون نرسال
 سے زیادہ ہو ایسے دیا لو ایسے ایک منٹ سنار میں روز نہیں گزرتے۔
 روپا معمول کے خلاف آدھی رات تک پلنگ پر کمرہ میں
 بلی رہی۔ پھر اس کی آنکھ لگی تو اسے باغ و بہار خواب نظر آنے
 لگے۔ شہر کام دیو کے ماتھوں نے ایک ہر تھا ایک رشک خود کو
 پراچا بھی خطا نہ ہونے والا تیر چلا دیا۔

صبح روپا اٹھی تو مبین پردوں سے سورج دینے لے اس لمحے
 غمخیز گاہوں اور نشیں بالوں کی ملی جلی و پیلی روشنی سے نملا دیا۔
 رات بھر میں روپا کا معصوم پرسکون دل ایک بڑے انقلاب سے
 گزر چکا تھا۔

دوسرے دن روپا نے کسی سے سنا کہ نواب مومن خان شکار
 کھیلنے کے لیے جنگل کی طرف نکل گئے ہیں۔ روپا کے دگ پلے
 میں بے زاری و دلچسپی، آنکھوں کی شمعیں جلنے بجھنے لگیں۔ چاند
 سب تک

مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے کا ذکر ہے۔ پنجاب
 کے صوبے کا نائب سردار خان بہادر کے سپرد تھا۔ خان بہادر
 کا نائب نواب مومن خاں تھا۔ مومن خاں کی بہادری و جلالہندی
 واداری اور فائدانی شرافت دور دور مشہور تھی۔ لاہور کی تاریخ کا
 سنہرے باب اسی کے دور پر مشتمل ہے۔

ایک بار دیوالی کا تہوار دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔
 سورج کی آخری کرنیں فلک برس عمارتوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی
 آہستہ آہستہ چھپتی چھپتی تھیں۔ ہندو دھرم کا ہر چھوٹا بڑا فرد
 اپنی حالت و حیثیت کے مطابق دیوالی کے دیے جلائے میں
 مگن تھا۔ سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ جگہوں اور
 بازاروں میں انسانی رونق تھی۔ جو مند و بین تھے، وہ بھی اپنے
 ہم وطنوں اپنے پڑوسیوں کی خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ بڑوں
 کھڑے، مٹھیاں پھیل پھیل پھیل رہیں، پھل اور طرح طرح کی چیزیں بک
 رہی تھیں۔ خواجوں اور خلیوں کے درگاہوں پر کچھ لگی تھی، ایک
 میلے کا سماں تھا۔

ایک ایک ڈبی بازار میں نقاسے کی پڑ بہیت آواز سنائی دی۔
 ہر شخص خبردار ہو گیا۔ نواب مومن خاں کی سواری آ رہی تھی۔ ڈبی
 بازار کی ایک پڑ کھوہ اور عالیشان عمارت میں دوسری منزل کا ایک
 در کھلا ہوا تھا۔ دیپچے سے شہر کے ایک معزز رئیس کی شہرہ سالہ
 پری جلال لڑکی روپا کا چہرہ چاند کی طرح جھاک رہا تھا۔ روپا
 بازار کی رونقوں کا نظارہ کر رہی تھی۔ نقارہ کی آواز سننے کے اس کی آنکھیں
 روشن ہو گئیں۔ اس نے مومن خاں کی بہادری، ایک کی غریب
 پردی انصاف پسندی اور مردانہ دجاہت کے بہت چہرے سنے

تھے۔ وہ مدت سے خواہش رکھتی تھی کہ مومن خاں کو ایک نظر دیکھ
 لے۔ آج اتفاق سے مومن خاں کی سواری خود اس کے گھر کے
 سامنے سے گزر رہی تھی۔ روپا بہت توجہ ہو گئی۔ آخر مومن خاں کی
 سواری نمودار ہوئی۔ روپا کی نظریں ایک خوش وضع، خوب رو
 اور تشکیل و عصبہ شخص پر چلے شیر گئیں۔ وہ شخص اپنی میکے غماز
 کالی گھوڑی پر سوار تھا، اس کے مرنے و سفید چہرے پر شامانہ و غماز
 تھا اور کر کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کا کشادہ سینہ سونے



دورازنگ

ماہنامہ خلیفہ

خواجه پیر محمد حاجی

رُپاکے ماں باپ بھائی بہن پریشان تھے کہ آخر سے کیا ہو گیا ہے۔ نہ مسکراتا، نہ منہ منہ کے باتیں کرنا، نہ کسی سہیلی سے ملنا۔ نہ کھانے کا خیال نہ بیٹنے کی فکر۔ وہ لوگ سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچے کہ لوگ جوان ہو گئی ہے اب اس کے ہاتھ پیلے کرینے چاہئیں۔ وہ رُپاکے باہ کی دھن میں لگ گئے۔

وقت تیزی سے آڑٹا چلا جا رہا تھا۔ دیوالی پھر آگئی۔ رُپا کی نگاہوں میں گرگشتہ دیوالی کا ناقابل فراموش نقارہ گھوم گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دل میں ایک ایسا درد اٹھا کہ اسے دہانا مشکل ہو گیا۔ رُپا بے چینی سے مومن خاں کی سواری کا انتظار کرنے لگی۔ لمبے پھیر پھیر کے ٹھٹھ گھٹھ کے گزرتے رہے۔ آخر دن ڈھلا اور شام ہوئی۔ لوگ خوشی سے دیے جلائے گئے، چراغ پر چراغ روشن ہوتا گیا۔ دیکھتے دیکھتے چاروں طرف ایک دلکش نقارہ پھیل گیا۔ مومن خاں کی آمد کے نہ اتار تھے، نہ اتھتی مگر رُپا کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ وہ بڑے ارمان سے اس کا انتظار کرتی رہی۔ آخر اس کی ملاوٹ آئی۔ دل کی کلی کھل گئی۔ نقارے کی آواز نے فضا میں رس گھول دیا۔ رُپا نے آنکھیں مل مل کے دیکھ دہ وافی مومن خاں کی سواری تھی۔ رُپا بارہ بیسے سے من مندر کے اس دیوتا کی پوجا کر رہی تھی۔ دیوتا کو دیکھ کر پجاریں کی عجیب حالت ہوئی۔ مومن خاں اس میں بہت خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ دیوالی کی خوشی میں وہ بھی برابر کا شریک تھا۔ رُپا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں اٹھا بھگا بھیکا بھیکارہ بننے لگا۔ دل میں وہ رہ رہ کر دُعا کرتا رہتا تھا۔ دن مومن خاں شہر سے باہر رہا۔ رُپا کھ والوں سے چھپ چھپ کر بھگوان کی عورتی کے سامنے اس کی خیر دعا نیت کی۔ اتنا کرتی رہی کہ کفر چند روز بعد رُپاکے چھوٹے بھائی نے اسے خبر دی کہ مومن خاں صبح سلامت واپس آ گیا ہے۔ رُپا کا دل خوشی سے نہ پھٹنے لگا۔ اس نے دیوالی سے دوڑ کر اپنے چھوٹے بھائی کا دست چوم لیا۔ چاند نکلا تو ہم نے خوشی میں جس کو دیکھا، اسی کو چوم لیا۔ وقت نہ گزرتا گیا۔ دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ رُپا نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح مومن خاں کو بھول جائے اور اس کا خیال دل سے نکال دے مگر بھولنے کی کوشش میں اس کی یاد اور زیادہ تازہ ہو گئی۔ یہ روگ اب رُپاکے لہجہ نہیں رہا تھا۔ جب بھی مومن خاں کی سواری ڈٹی بازار سے گزرتی، رُپاکے دل کی چنگاری شعلیں کر بھڑک اٹھتی۔ وہ چاہتی کہ کسی طرح آڑ کر مومن خاں تک پہنچ جائے مگر بازو بس پھر پھڑک رہے جلتے۔ اس کے آپٹل کر چھوڑی ہے صبا۔ ولس قیمت کہ میں صبا نہ ہوا۔ دوسری طرف مومن خاں نے ایک دفعہ بھی آنکھ اٹھا کر اوپر نہیں دیکھا تھا۔ اس کی اس بے نیازی نے ملتی پر نیش کا کام کر رہا تھا۔ اس سے بے نیازی کا گلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مومن خاں کو کیا معلوم کہ کسی جگہ دیکھنے میں کوئی نوجوان لڑکی اس کے لیے اپنے دل کا دروازہ کھولے کھڑی ہے۔

بہنگ

وہ جذبات کے بے پناہ طوفان میں ایک ناجائز تکیے کے مانند بہہ گئی۔ دل کے بیڑے شعلوں نے بلند ہو کر اس کی دماغی قوت پر بھروسہ کر کے رکھ دی۔ دل میں ایک عجیب ہلکا اٹھی، روپا کے ہر پرک دبانہ سکی، خیالات و احساسات ایک بے شمار اثرات میں ایک بنے قابو و عین میں تبدیل ہو گئے۔ عجزت و بلائی کی حد تک پہنچ گئی، عزت و زکات، نیک نامی و رسوائی کی دیرپائی و دیوار محوٹے ہو گئی۔ تنگ و ناموس کا طالع بے خودی کی شدت پر قربان ہو کر رک گیا۔ میرضہ کا پیادہ لبریز ہوا اور چھلک پڑا۔ شرم و حیا نے بے حجابی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

مرک پروردیہ کھڑے ہوئے لوگوں نے ایک عجیب مغرور دیکھا ایک نوجوان لڑکی کی طرح دوڑتی ہوئی، عفاقتی دستہ چرتی ہوئی زلاب مومن خاں کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحے کیلئے مومن خاں کی آنکھیں خیر ہو گئیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے ملت بیڑکنا سوچ اپنا ایک اس کے عین سامنے آ گیا ہو، جسے اس کے خدا نے اس کا امتحان لینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ روپا کے لیے سیاہ بال اس کے رساواں اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مومن خاں کھوٹے سے اُتر گیا۔ اُسے پسند نہیں تھا کہ وہ خود کھوٹے پر سوار ہے اور بات کرنے والا نیچے کھڑا ہو۔ اس نے نرم لہجے میں لڑکی سے سوال کیا۔ "نایاب! آپ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" مومن خاں کسی کو تو کہہ کر مخاطب نہیں کرنا تھا، ہمیشہ آپ جناب سے بات کرتا تھا۔

روپا نے اس طرح اس کی طرف دیکھی جیسے اپنا دعا آنکھوں آنکھوں میں بیان کر دینا چاہتی ہو۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ سامنے لوگ بھلن اور خاموش کھڑے تھے۔ روپا نے خیالی میں اپنا پچھلے انگلیوں پر پٹینے لگی چہرے پر ترتیب و آواز میں بولنے لگنا اچھا ہو، اگر اس پر دیکھے آپ کی صورت اور آپ کی سیرت کا ایک لڑکا آپ ہی کی پیٹھ سے عطا کرے۔ نہ جلنے کس طاقت و رعبے نے اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا کر دیا ہے۔ اُسے شاید یہ احساس ہوگا کہ کیا یہ، بوٹا کا سامنا چہرے ہونے پر وقت بھی کم ہے، جو کتنا ہے ابھی کہہ دینا چاہیے۔ اس کا حین چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ خوب صورت ترکیب آنکھیں ہندی لہجے پر ہیں میں کھلب گئیں۔

اودہ ہم سمجھ گئے یہ کچھ شناس مومن خاں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے اطمینان سے کہا: بی بی! آپ کے رواج اور دل میں ہر ایک رسوم اور آپ ہر مند و دین ہم مسلمان اس لیے ہماری شادی نہ کیا کی نظر

میں ایک نامناسب بات ہوگی۔ کچھ نہیں ہوگی۔ ہوس پرست قزاقی گے۔ حاسد نہ آپ کو یہ نہیں لینے دیں گے، نہ ہمیں، روپا کے باوجود قوتی ہونٹوں میں جیش پیدا نہیں ہوئی۔ مومن خاں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں مگر یہ بھی تو سوچیے، اگر آپ اودہ کو دنیا کی پردہ کے بغیر شادی کر لیں تو ہوسکتا ہے، ہمارے ماں اور اداوی نہ ہو۔ اگر ہمیں تو اس کی ضمانت کون دے سکتا ہے کہ وہ لڑکا ہوگا، لڑکی نہ ہوگی، خیر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہمارے ماں لڑکا ہی ہوگا تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ صورت و سیرت میں آپ کی آرزو کے مطابق ہو، مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

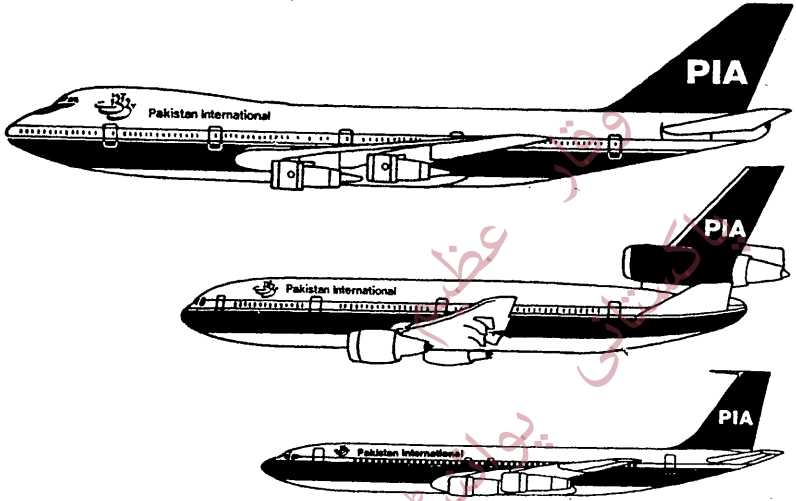
روپا اس استدلال کا کیا جواب دیتی۔ لرزیدہ آواز میں کہنے لگی۔ میں سبکدوش سے پرارتنا۔۔۔

مومن خاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ آپ کی پڑھنا ضائع نہ ہوگی۔ دل سے نکلی ہوئی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور آپ کو مژدہ دیتا ہوں کہ آپ کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ روپا نے سیت بڑے نفوس سے اس کی طرف دیکھا۔ مومن خاں بولا۔ اودہ دیکھیے، آپ کو ہمارے مبرا لڑکا چاہیے نا؟ ہم اپنی تلوار کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آج سے آپ ہماری ماں ہیں۔ اس نے اپنے بازو میں نکلی ہوئی آپ وار مشیر چھو کر کہا: اب ہم آپ کو نا کہہ کر چکا کر لیں گے۔ اس کا لہجہ مرتبے کے لحاظ سے بدل گیا۔ اور آپ کی عزت کی اپنی حقیقی ماں کی طرح کریں گے۔ آج سے آپ ہیں اپنا لڑکا سمجھیں۔ مومن خاں نے اپنی بات پر سچائی کی حرکت کرنے میں دیر نہیں کی۔ بے شمار ماضی کی تبتیس نکا ہونے ایک حیران کن واقعہ دیکھا۔ نواب مومن خاں اپنے عہدے اور شان کا خیال کیے بغیر اپنی منہ بولی ماں روپا کے قبول پر ہٹکا ہوا تھا۔

اس کے بعد مومن خاں ننگے پاؤں روپا کے گھر گیا اور تاریخ کو؟ ہے کہ وہ جب تک زندہ رہا، حقیقی والد کی طرح روپا کی عزت کرتا رہا۔ روپا نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ مومن خاں دھڑلے ہنسٹ راکھی بندھن ویسا کھی اور بولی و دیوہ کے ننداروں پر اس کے گھر میں تحفے لے جاتا اور اس کے پاؤں چھوٹا۔ نواب میر مومن خاں تجاری نسل کا سید تھا۔ اس کا مقبرہ لاہور کے بھائی دروازے کے باہر دانا کے مزار کی مغربی سمت آج بھی پڑتی یادیں تازہ کر رہا ہے۔



پاکستان انٹرنیشنل



جو دیکھتے ہی دیکھتے لیگ کی صفِ اول کی ایئر لائنز میں شمار کی جانے لگی۔
اس مختصر مدت میں ایسی شاندار ترقی نے دُنیا کو محو حیرت کر دیا ہے۔
چنانچہ گزشتہ برس دُنیا کے ۷۵ مختلف شہروں سے ۲۲ لاکھ مسافروں نے
پنی آئی اے سے سفر کیا۔

پنی آئی اے کا فضائی بیڑا جدید ترین بوئنگ ۷۴۷ ڈی سی ۱۰ اور بوئنگ ۷۰۷ قسم کے
طیاروں پر مشتمل ہے جن کا دائرہ پرواز دُنیا کے چار برابر اعظم پر پھیلا ہوا ہے۔

مزید معلومات کے لئے کنیڈا اکو کم اپنے سٹیول ایجینٹ یا پنی آئی اے
بنگ آفس سے رابطہ قائم کیجئے۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل
بکمال لوگ - لاجب پرواز



دانش مندوں سے رجوع کیا مسئلہ واقعی اہم تھا۔ لہذا ہر توبہ ایک انفرادی آفادہ تھی مگر اس کی طرف توجہ نہ دی جاتی تو یہ دانش مندوں کے دوسرے شہری بھی ایسے مندوں سے دوچار ہو سکتے تھے لہذا معاملے کی تکنیکی کے پیش نظر سارے دانش مندوں کو ہوائی قلعے کی ساتھیوں منزل پر سر جوڑ کے بیٹھنا پڑا۔ وہ گری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، اُن کے ذہنوں میں صرف ایک مسئلہ سر اُٹھتا تھا۔ بے جوڑ جڑیوں کا مسئلہ۔

اچانک گردہ کے سب سے کم عمر دانش مند نے دوسروں کو متوجہ کر کے بتایا کہ کمرے میں ایک چڑیا گھس آئی ہے۔ سب چونک بیٹھے۔ فیضی نا قابل یقین بات تھی کیونکہ جب دانش مند سمجھتے تھے کسی کو اُن کے انماک میں غلغلہ ہونے کی جہت نہیں ہوتی تھی۔ جہاں ذی شعور انسانوں کا یہ حال ہو کہ بچوں کے بل چلنا شروع کریں، وہاں ایک معمولی سا پرندہ کیسے یہ حرارت کر سکتا ہے۔ نوجوان دانش مند نے نام اہل دانش سے مخاطب ہو کر کہا: کیا آپ میں سے کسی نے اس چڑیا کو مدعو کیا ہے؟

”نہیں!“ ایک دانش مند نے جواب دیا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں کوئی ایسا واقعہ ظور پزیر بھی ہو سکتا ہے۔“
”یہ بیان کر کیا رہی ہے؟“ دوسرے دانش مند نے پوچھی۔
”سوال کیا یہ ہے بلانی ممان کس طرح چلی آئی؟“

چند دانش مندوں نے چڑیا کو ہاتھ سے اٹھا لیا کہ وہ جلد از جلد کمرے سے رخصت ہو جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ سختی اور فطرت کا یہ سلوک چڑیا کو خود کو جھوڑنے پر مجبور کرے گا پھر دانش مند اطمینان دیکر سمجھنے لگے اپنے اہم ترین مسئلے پر غور و غوض شروع کر دیں گے۔ فٹوڑی دیر بعد نوجوان دانش مند نے گردن اٹھائی۔ گردن اٹھانے کی ایک وجہ تھی۔ اُسے اب اس عرصے پر اٹھا کر چڑیا اچھی تک کرے ہیں جو جو ہے۔ گردن اٹھاتے ہی وہ چیخا: چڑیا ابھی تک جھوڑا ہے، غصے کے ماتے اُس کا زوال تھا۔ یہ کس قدر بد اخلاق چڑیا ہے! اُس نے چڑیا کو فطرت سے ایک بار پھر چڑیا کا افسانہ کیا کہ وہ کمرے سے رخصت ہو جائے مگر چڑیا نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں سب رنگ

دانش مندوں کے ملک میں ایک نہایت بلند بالا عمارت تھی۔ وہ عمارت آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ اُس کا نام تھا، ہوائی قلعہ۔ ہوائی قلعہ خصوصی طور پر دانش مندوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ دانش مندوں کو جب بھی کسی اہم اور سنجیدہ مسئلے پر غور و غوض کرنا ہوتا، وہ ہوائی قلعے کی سب سے اوپری منزل پر اپنی بیٹھک جاتے مسئلہ کو معمولی نوعیت کا ہوتا تو وہ اُس پر سوچ بچار کے لیے کسی غلی منزل کا انتخاب کرتے۔ منزل کا انتخاب ہمیشہ مسئلے کی نوعیت اور اہمیت کے مطابق ہوتا۔

آج کا اجلاس بلند بالا ہوائی قلعے کی ساتھیوں منزل پر ہوا رہا تھا۔ یہ سب سے بلند اور سب سے آخری منزل تھی شہر کے تمام دانش مند صبح تڑکے سے بیٹھے ایک مسئلے کی گتھیاں سمجھانے میں مشغول تھے۔ اُن کے اجتماع کی شہر کے پچھلے کوہِ خضرت شریف اور کچھ دانشمندیوں کے بل جمل رہے تھے اور وہ بھی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ سارا شہر گزشتہ دنوں کا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ اعتباری تباہی اس لیے اختیار کی گئی تھی کہ دانش مندوں کے کام میں خلل نہ پڑے اور وہ پوری یک سوئی اور طمانیت سے اپنا کام انجام دے سکیں۔

زیر غور شدہ انتہائی اہم تھا۔ ایک دانش مند نے اہم کان سے جوقول کی دو جوڑیاں خریدیں۔ ایک جوڑی سیاہ، دوسری تریخ۔ ایک دن وہ اپنے دفتر پہنچا تو لوگ اُس کے پیروں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اُس نے بھی اپنے پیروں پر نظر کی ہمت نہ کر سکا۔ ہوا۔ وہ دراصل غلط جوتے پہنے ہوئے تھا۔ ایک پیر میں سیاہ، دوسرے میں تریخ۔ وہ دوڑا دوڑا گھر گیا۔ گھر پہنچ کر اُسے اور پریشانی ہوئی اُس کے لیے کہ وہاں بھی ایک غلط جوڑی پڑی تھی۔ ایک جوتا سیاہ، ایک تریخ۔ دانش مند کا ہاتھ ٹھنکا۔ اُس نے سوچا، ہونہ بڑی کوئی بہت بڑی سازش ہے۔ ورنہ بیک وقت دونوں جوڑیاں غلط جوتوں میں کس طرح تبدیل ہو سکتی تھیں؟ اُس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔

مدیوں کی روایت کے مطابق اُس نے اپنے شہر کے



تیسرا رنگ

سلوک کا انحصار اس بات پر تھا کہ دانش مندوں کا متفقہ فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ متفقہ فیصلے تک پہنچنے کے لیے غور و فکر اور بحث و تمجیس کی ضرورت تھی۔ وہ فوراً غور و فکر اور بحث و تمجیس کرنے لگے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک دانش مند نے کہا: مکمل اس کھڑکی سے ایک گل دان نیچے گر گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے سینکڑوں بکڑے ہو گئے۔ اس چڑیا نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے، کیسی رقم کی تشفی نہیں ہے۔ اسے بھی گل دان کی طرح کھڑکی سے نیچے پھینک دینا چاہیے۔ یہ دیکھتے دیکھتے سینکڑوں بکڑوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ پھر ہمیں کبھی اذیت نہ پہنچا سکے گی۔

نوجوان دانش مند چڑیا کو مٹھی میں مضبوطی سے دبوچ کر اٹھا کھڑکی کی کھول کے اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور چڑیا سے مخاطب ہو کر بولا: چڑیا! ہم تیرے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے انتہائی مضموم ہیں لیکن تیری مزاحیہ ہے۔ یہ تیرے لیے ایک ناقابل فراموش سبق ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بندیں اور مسخری کھول دی۔

یہ کارنامہ انجام دے کر نوجوان دانش مند نے اپنا ہاتھ اس طرح صاف کیا جیسے کوئی کپڑوں سے گرد بھاڑتا ہے۔ پھر وہ دوسرے دانش مندوں کے حلقے میں آکر بیٹھ گیا۔ دانش مند دوبارہ غور و خوض میں غوطے کھینچے۔ اپنے اہم ترین مسئلے کا حل وہ ایک ہی حکم دریافت نہیں کر سکتے تھے پھر بھی ان کے چہرے پر سکون و طمانیت کا کچھاد

دی، نہایت مصیبت سے اُسے دیکھتی رہی پھر اُڑ کر گروہ کے سب سے دانش مند انسان کے گتھے سر پہ جا کر براجمان ہو گئی یہ دانش مند اپنی ذہانت اور بزرگی کے سبب صدارتی کوئی پوچھا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر چڑیا کو پکڑنے کی کوشش کی۔ چڑیا اُڑ کر کمرے کی کھیت پر جا بیٹھی۔ یہ ہماری تذلیل کیوں کر رہی ہے؟“ صدر دانش مند نے غصے سے سریع ہو کر پوچھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا اور زبان لودھڑا رہی تھی۔ اسے ایسا سبق دینا چاہیے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کر سکے اور اس کی سلیس جھال دیا۔ جو اس سبق یاد رکھیں۔“

دانش مند غور و خوض کا اہم اور مقدس کام چھوڑ کے بے ہلاقی دھماکا پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے بہت جھگ دوڑ کی لیکن چڑیا بہر حال چڑیا تھی۔ جیسے ہی کوئی اس کے قریب پہنچتا، وہ پھر سے اڑ جاتی۔ دانش مند کرسیوں پر چڑھ گئے مگر چڑیا ہاتھ نہ آئی۔ تمام دانش مند ایک دوسرے کی مٹی پر سوار ہو گئے تاکہ ایک بار صرف ایک بار چڑیا ان کی گرفت میں آجائے مگر چڑیا اطمینان کے ساتھ ایک کونے سے دوسرے کونے اڑ جاتی۔ اس کی اس گستاخی پر دانش مندوں کا غصہ بڑھتا چلا گیا۔ ساتھ ہی ان کی نگاہ دوں میں بھی مستعدی اور تیزی آ گئی۔ آخر انھوں نے کسی نہ کسی طرح چڑیا کو پکڑ لیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ چڑیا کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

سب رنگ

تھا اور آنکھوں میں دانش مندی کا جمال۔ اب اُن کے کام میں مداخلت کرنے والا کوئی نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک دانش مند نے اپنے گئے سر پر کوئی تیز اور نکیل چیز چبھتی ہوئی محسوس کی۔ اُس نے اپنا سر کھپا یا کچھ اطمینان ہو گیا لیکن ذرا ہی دیر بعد اُسے پھر سر پر شدید کھلی محسوس ہوئی۔ اُس نے دوبارہ سر کھپا یا اور دیر سے دیر سے نفس اڑا چکا تھا۔ نظر اُن پر لڑنے لگے۔ وہ ایک دم چونک پڑا۔ یہ اُس کا دم نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی۔ وہی چڑیا اُس کے سر کا طواف کر رہی تھی دانش مندی اور مردوباری میں چلی دان کا ساتھ بڑا ہے اس لیے کہنے دانش مند نے اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ اس طرح بیٹھ رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دوسرے دانش مند نے یہ معاملہ جانپ لیا، وہ غصے سے بے تاب ہو گئے۔ اُن کی نگاہیں جھنجھکیں اور جس سے غور و جلال چمکنے لگا۔ وہ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے اور چڑیا کو پکڑنے کے لیے بے تحاشا دوڑنے لگے۔ اس کوشش میں ایک دانش مند گر پڑا، اُسے شدید چوٹ آئی۔ اُس کے ساتھی دانش مند چڑیا کو پکڑنے کے لیے بڑی طرح پکے۔ اُن کی محکومے کتابیں کی الماریاں گر پڑیں۔ پورے کمرے میں کتابیں ہی کتابیں بکھریں۔ دانش مندوں نے ہر دامن کی۔ وہ چڑیا کو پکڑنے کی نگاہ کوشش کرتے رہے۔ نتیجتاً کمرے کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ دانش مندوں کی ناچیں کنسیان سر اور ہاتھ زخمی ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر اُن کی غمت اُنکا نہیں گئی۔ انھوں نے چڑیا کو پکھر گرفت کر لیا۔

نوجوان دانش مند نے چڑیا کو اپنی گرفت میں لے لکھا تھا۔ چڑیا غانا لٹا چھتے پر جا کر ٹپک گئی ہوگی اسی لیے کرنے سے بچ گئی۔ گر جاتی تو اس کا کھڑے ہو جائے یقینی تھا مگر غیر اب کے یہ ہیں بے وقوف نہیں بنا سکے گی۔ اُس نے اپنا ہاتھ لمبا کر کے چڑیا کو کھڑک کے ذریعے چھتے سے پرے پھینک دیا۔ چند منٹ بعد چڑیا پھر لوٹ آئی۔ دانش مندوں کے غصے کا پارہ انتہائی لمبی سی پینچ کیا انھوں نے پڑمروہ اور غرزدہ بے میں کہا یہ ذرا سی چڑیا عمارت خوار ہی ہے۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ ہم اس مملکت کے دانش مند لوگ ہیں دانش مند ترین لوگ۔ یہ آفراب ہم مرکبوں نہیں سکی؟ گل دان بلند عمارت سے نیچے گر کر سینکڑوں محکڑوں میں تقیم ہو سکتا ہے تو یہ چڑیا پڑے پڑے کیوں نہیں ہرستی؟

”یہ عقدہ کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔“ نوجوان دانش مند

نے اپنے بے ریش چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ گل دان گر کے بیدھا زمین سے جا کر نکلا یا تھا مگر یہ چڑیا چارے ساتھ کوئی زبردست چالاکی کر رہی ہے، سمجھے اس کا پورا یقین ہے۔ یہ بیدھی زمین سے جا کر نہیں نکلتی بلکہ آدھے راستے ہی میں کہیں ٹک جاتی ہے۔ آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ اپنی اس چالاکی کے باوجود یہ محکڑوں میں تبدیل ہو جائے گی؟

”ہم سمجھ گئے، سمجھ گئے۔ کئی دانش مندوں نے ایک ننگا کہا۔“ یہ چڑیا ہمیں مسلسل بے وقوف بنا رہی ہے کہ بے وقوف بنا رہی ہے؟ ہمیں یعنی اس مملکت کے دانش مند زین آدمیوں کو کہنے افسوس اور لڑج کا مقام ہے۔ ایک تھوڑی مٹی آواز گئی۔ ”فکر نہ کیجیے۔“ نوجوان دانش مند نے کہا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں چڑیا اب کے ہرگز واپس نہیں آئے گی۔ وہ چسپاں ہو گرفت میں لے کر کھڑکی کی طرف گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے کھڑکی پر دی طرح کھول دی اور کھڑکی کی راہ سے چھتے پر اُتر گیا۔ چھتے پر اُترنے کے اُس نے چڑیا پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی۔ چڑیا پریشان اور بھول بھالی نفوس سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ دانش مند چڑیا سے غافل ہو کر چڑیا اُترتے ہیں بہت بے وقوف بنایا مگر افسوس یہ تیری آخری چالاکی تھی۔ اب میں تیرے ساتھ خود بھی چھلانگ لگاؤں گا، تاکہ دیکھوں کہ تو بیدھی پیچھے کی طرف کیوں نہیں جاتی۔ یقیناً تو اس بار بیدھی پیچھے جانے کی اور تیرے سینکڑوں محکڑے ہو جائیں گے۔ یہ بے حد افسوس ناک بات پر کی مگر تو اسی سزا کی مستحق ہے۔ اُس نے چڑیا کو مٹی میں بند کر لیا تاکہ وہ پھسل نہ جائے پھر اس نوجوان دانش مند نے ساتھیوں منزل کے چھتے سے چھلانگ لگا دی۔



ببند ہضمی؟

یقینی
آرام کے لئے
صرف
ایک چمچہ

اینو
'فروٹ سالٹ'



B-E-1-77

Asiatic

حسرت کشید گمان جو ہے اپنے ہمت کے راز
انگریزوں کے لیے ایک تدم و فتنہ کے گمان ہے
ایک آدمی کا فتنہ جو خود اپنے ہمت کے راز کے ساتھ ساتھ
ایک تحریر میں ہے سوئے ہے اپنے ہمت کے ساتھ ساتھ



باقی تھی۔ ڈیوڈ اور ہربرٹ کے لیے ایک کوہِ مکہ ہو چکا تھا۔ دونوں ایک خطرناک اور نفیہ آپریشن کے لیے جا رہے تھے۔ آپریشن کی فتنے داری مشورہ رجن ڈاکٹر فلیکبر نے کی تھی۔ ہربرٹ سوچ رہا تھا کہ یہ سودا ایک لاکھ ڈالر میں بھی سستا ہے۔ کیوں کہ اس نازک آپریشن میں اموات کی شرح ستر فی صد ہے لیکن بہر حال وہ سودا کر چکا تھا اور اب اس میں سرفے سے منہ پھرتے ہوئے کی جرأت نہیں تھی۔

ڈیوڈ کو حسین و جمل مار یا سے شدید محنت تھی۔ وہ پانچ سال کے اس کی محنت میں گرفتار تھا۔ مار یا سے اس کی پہلی ملاقات تالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس مختصر عمر میں وہ ایک بہت بڑی کمپنی کا نائب صدر بن چکا تھا۔ کمپنی اس کی ذہانت اور محنت کے باعث نہایت کامیابی سے چل رہی تھی مگر مار یا کے معاملے میں اس کی ذہانت اور محنت زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ ہربرٹ کو شش ماہ پانچ سال سے وہ پابندی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل رہے تھے لیکن ڈیوڈ ابھی تک کنوارا تھا۔ مار یا اس سے شادی پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ کچھ عرصے سے ڈیوڈ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ مار یا میں اب پہلے والی گرم ہوشی نہیں ہے۔ وہ سوچتا کہ شاید اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی لیکن کیوں؟ اس کیوں کا جواب تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مار یا ایک بھرپور عورت ہے جس کا دل نعمان اپنے ہی جیسے کسی بھرپور مرد کی طرف چوکا تھا۔ شاید اسی لیے تم مجھ سے کھینچتی جا رہی ہو؟ آخر ایک روز ڈیوڈ نے مار یا سے پوچھ ہی لیا۔ اس روز وہ آخری مرتبہ مار یا کے فلیٹ گیا تھا۔ وہ مار یا کو کھلبے جانا چاہتا تھا لیکن مار یا آٹا کافی کر رہی تھی۔ ڈیوڈ دل گرفتہ تھے۔ وہ بولا: "ماں تم بھلا میرے ساتھ کیوں جانے لگیں بیلر تو بڑھو جا رہے۔ تم تو کسی دلازدار مرد کے ساتھ رقص کرنا چاہتی ہو؟"

"یہ کوئی بنیادی وجہ نہیں ہے۔ مار یا نے کہا۔

"نہن نے نہ ہو لیکن ایک بات سن لو۔ اگر میں ٹھکانا ہوں تو تم بھی اتنی حسین نہیں ہو۔ ماں!"

"ہرگز نہیں۔ کیا تم مجھے اتنا لالچی سمجھتے ہو؟ بھلا محض ہندو سزار ڈالر کے لیے میں ایک جانوں گا؟ اپنی زندگی داؤ پر لگا دوں گا؟ ہربرٹ نے کہا: "اے بڑے کام کے لیے اتنی سی رقم؟ تمہیں شرم آنی چاہیے ڈیوڈ؟" ڈیوڈ نے اپنے اصحاب سے اپنے اودا ہنگی سے کہا: "اچھا بیس ہزار ڈالر؟"

"کام کی نوعیت کے لحاظ سے یہ بھی کم ہیں۔ ہربرٹ نے مضبوط سے کہا۔

"اودا اگر میں تجھیں ہزار کی پیش کش کروں؟"

ہربرٹ چند لمحوں تک ڈیوڈ کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ ڈیوڈ کا پورا بوجھ ایک ٹانگ پر تھا۔ ہربرٹ نے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ میں آگلی گھونپنی ایک لاکھ ڈالر کیا سمجھے؟

"ایک لاکھ؟" ڈیوڈ ہلکا گیا۔ یہ ناممکن ہے۔ میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔

"نہیں دے سکتے تو مت دو میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ ہربرٹ نے اس کا گلجا ہاتھ اپنی آنکھیں گرفت میں لے کے ایک جھٹکے سے صاف کیا اور دوازے کی طرف بڑھ گیا۔

"مجھ و ہربرٹ! ڈیوڈ نے درخواست کی۔ ہربرٹ دوازے کے قریب ایک کے مڑا اور سکرانی ہوئی آنکھوں سے ڈیوڈ کو دیکھنے لگا۔ ڈیوڈ نے دوازہ پر ہربرٹ پر اوپر سے نیچے تک ایک نظر ڈالی اور بے بسی سے بولا: "بہتر ہے، میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح ایک لاکھ ڈالر لائے کروں چاہے مجھے اپنے اشاک جینے پڑیں، تمہیں ایک لاکھ ڈالر مل جائیں گے۔" اس نے کچھ دک کے کہا: "تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو۔ اب تمہیں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ ہماری تئاریاں بھی سب مکمل ہیں۔"

"میں بھی تیار ہوں۔ ہربرٹ کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔

ہربرٹ ایک پرائیویٹ اسپتال کی راہ داری میں ڈیوڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے چل رہا تھا۔ راہ داری اسپتال کی طرف



موجودہ

جیکے ہنرے بالہ کے * شاہدہ شاہ

بنالیا جائے۔ اس چیز تو محبت ہے، اُس نے مارا یا کا ہاتھ اپنے دھڑکنے ہوئے دل پر رکھ لیا۔ مارا یا کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ ڈیوڈ لڑاؤ ڈیوڈ میری طرف دیکھو کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟
- کیوں نہیں ڈیوڈ! کیوں نہیں۔ مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔
- تو پھر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟
- مارا یا فائش رہی۔ ڈیوڈ نے اصرار کیا: جواب دو؟

”ہم دوست ہیں ڈیوڈ! صرف دوست۔“ ماریا نے بڑی شکل سے کہا: ”میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“

ڈیوڈ کے منہ سے ایک سرواۓ نکلی، آنکھوں میں اُداسی چھا گئی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا پھر بولا: ”تم اچھا بیس سال کی ہو چکی ہو۔ یہ عمر تمہارے شباب کی انتہا ہے۔ اب گزرنے والا ہر لمحہ تمہارا سن ماندارکنا بن جائے گا۔ تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ موجودہ عمر سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تمہیں اس امن کی پیشکش قبول کر لینا چاہیے؟“ وہ زکا نے میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ غور سے سن لو میرے سو کوئی تمہیں اتنا پایا نہیں دے سکتا۔“

مارا یا ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ کیا تم مجھے نہیں مانتا چھوڑ سکتے ڈیوڈ؟ اُس کی دل کیفیت چہرے سے ظاہر تھی پھر بھی وہ زنی

”ڈیوڈ! ماریا نے ناگواری سے کہا: میری طبیعت سانا ہے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

ڈیوڈ چند لمحوں تک اُسے گھورتا رہا پھر ہلنگ کے قریب جا کے ماریا پر جھک گیا۔ اُس کے چہرے کی ہر پہی نری میں بدل گئی۔ ماریا! پلیز ماری! وہ خوشامد لہجے میں بولا۔

”ڈیوڈ! ماریا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈیوڈ کی خوشامد کا کیا مقصد ہوتا ہے۔

”ماری! آج میں جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہوں، مجھے کہہ لینے دو۔ اُس نے ماریا کے بازو پکڑ کر اُسے ہلنگ سے اُٹھایا اور کوچ پر بٹھادیا۔ چہرہ خود بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈیوڈ تم جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں مگر تم... تم مجھے خود سے دُور رکھنا چاہتی ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ ماریا ہلہول کر رہ گئی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔ ڈیوڈ نے بات جاری رکھی: ”مجھے معلوم ہے، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔ کوتاہ فاشی کے باعث لوگ مجھے تمہارا استاد جوڑ نہیں سمجھتے میری شخصیت بھی جاذبِ نظر نہیں ہے مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میں تم میں ہمارت نہیں رکھتا اور تمہیں تم سے ڈالمانہ شغف ہے لیکن ماری! یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ تمہیں کسوٹی

سے بولی۔ تمھارے ساتھ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں ساری عمر کنواری رہوں۔

”تمھارا دماغ غراب ہو گیا ہے۔ ڈیوڈ کو غصہ آ گیا۔ میں آئندہ تم سے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کروں گا۔“

وہ ماریا کے مکان سے باہر آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ شادی کے موضوع پر اس سے بات نہیں کرے گا مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس فیصلے پر قائم رہنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ وہ جب تک زندہ رہے گا، ماریا سے شادی کی کوشش جاری رہے گی۔ اس سے قطع نظر کہ ماریا اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

ڈیوڈ اور ہرٹ ایک خاص قسم کی آپریشن ٹیبل پر پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈیوڈ اپنے اور ماریا کے درمیان ہاتھ بٹھکے۔

”سمجھے ہرٹ! اگلے تین دنوں میں تم مجھ سے محبت تو بہت کرتی رہے کیونکہ جو ہمیری ظاہری شخصیت پر کشش نہیں ہے اس لیے میرے ساتھ شادی کرنے سے گریزاں ہے۔“

”شاید اسی لیے تم مجھ سے ہم تبدیل کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں اسی لیے۔ تم ایک بڑے زورمرد ہو۔ میں اگر تمھاری شخصیت میں ماریا کے سامنے جاؤں گا تو وہ مجھے تمھارے لیے لگے گی۔“

”تم میری سمجھتے ہو کہ جسم کی تبدیلی سے حالات بھی تبدیل ہو جائیں گے۔ یہ تو محض ظاہری تبدیلی ہوگی۔ باطنی طور پر تم وہی رہو گے جو ہو۔“

”ہاں اس حقیقت سے میں آگاہ ہوں لیکن ماریا باطنی خوبوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ بہت سطحی انداز میں سوچتی ہے۔ اُسے کون سمجھائے کہ صورت تو ایک تو ایک ہے اصل چیز سیرت ہے۔“

”تم نے ابھی کہا کہ وہ تم سے محبت بھی کرتی ہے؟“

”ہاں کرتی ہے لیکن اب نہ جانے کیوں اُس کی نگاہوں میں پہلے والی بات نہیں رہی۔ تم مجھ سے بے ناہم ہیں کیا کہنا چاہتا ہوں؟

لیکن ڈیوڈ اگر وہ تم سے محبت کرتی ہے یا کرتی تھی تو اُسنا کیوں گئی ہے اور شادی....“

”نہیں۔ ڈیوڈ نے ہرٹ کی بات کاٹ دی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے نہیں میرے ٹھکانے میں اور میرے بستر سے اُٹھتا ہے۔ اُس کی سرورہی میں روح چھوٹنے کے لیے فردی ہے کہ میں خود کو ایک نئی شخصیت میں ڈھال لوں۔“

”لیکن میرے جسم میں منتقل ہونے کے بعد ماریا سے تمھارا کیا رویہ ہوگا؟“ ہرٹ نے پوچھا۔

ڈیوڈ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ میں اُس کے ساتھ نئے سرے سے تعلقات استوار کروں گا۔ اب میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ میں اُسے محبت کے ایک نئے انداز سے آشنا کروں گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مزمنہ میں اُسے پہلے کی طرح ڈھیل نہیں دوں گا۔“

”تم خود کو میکس کوں تبدیل کر رہے ہو؟ کیا اپنی موجودہ شکل و شباہت میں کچھ اصلاح نہیں کر سکتے؟“

”میں کر سکتا۔ سبب یہ کہ مجھ سے کچھ زبردست غلطیاں ہو چکی ہیں اُن کا ازالہ ممکن نہیں ہے۔ میری موجودہ شکل و شباہت کے متعلق ماریا کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ تم جانتے ہو، کسی کے ذہن میں جو خیالات جم چکے ہوں انھیں بدلنا آسان نہیں ہوتا۔“

”یہ ارضیاں ہے۔ ہرٹ نے اختلاف کیا۔ کسی کے بھی خیالات آسانی سے بدلے جاسکتے ہیں۔ تمھارا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ تم ماریا سے اتنے ٹوٹ کر محبت کرتے ہو کہ وہ تمھارے دل و دماغ پر تسلط ہو چکی ہے اور تمھاری یہ کمزوری اُس کے علم میں ہے لہذا اب تم سے تم اُس کے خیالات تبدیل نہیں کر سکتے۔“

ڈیوڈ نے اقرار کیا۔ واقعی میں اُس سے اپنی محبت نہیں چھپا سکا لیکن اس بار اپنا یہ جذبہ اُس وقت تک ظاہر نہیں ہونے دوں گا جب تک اُسے شادی کی انگوٹھی نہ پہنا دوں۔ اب کے میں پانچ سال تک اُس کے پیچھے غار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ دیکھ

لینا۔ میں دو مہینے کے اندر اندر اُس سے شادی کی بات کروں گا۔ اسے یہ احساس تک نہیں ہوگا کہ میں اُس سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ ”تم اُسے اپنے جسم کے تبادلے سے آگاہ کرو گے یا نہیں؟“

”میں آگاہ کروں گا۔ بعد شادی سے پہلے ہرگز نہیں۔“

”تمہیں اب ہرٹ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ میری نیک خواہشات تمھارے ساتھ ہیں۔ کاش اپنا آپریشن کامیاب رہے۔“

”آپریشن یقیناً کامیاب ہوگا۔ ڈاکٹر فلیکر ایک ماہر ترین سرجن ہیں۔ وہ ایسے متعدد آپریشن کر چکے ہیں۔ ڈیوڈ نے گرم جوشی سے یقین دلایا۔

”یقیناً وہ ایسے متعدد تجربے کر چکے ہیں مگر صرف تئوں پر اسلواں پر نہیں۔ ہرٹ مسکرایا۔

”تمہیں پوچھنا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپریشن انسان کا ہوا جانور کا طریقہ ایک ہی ہے۔ ڈیوڈ نے جواب دیا۔

سب بنگ

مولوی عزیز مرزا علی گڑھ کے قديم عالم علم تھے۔ ان کا تعلق مدرستہ معلوم علی گڑھ کے ابتدائی دور سے تھا۔ ۱۸۹۱ء کا کہہ کر ہے۔ حیدر آباد کن میں عزیز مرزا کو ان کی قابلیت اور اہلیت کے صلے میں پہلے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ پھر کورٹ آف دارلکلام کان کے سپرد ہوا۔ اس سلسلے میں کن کے نظام کے انجمن میں سرپرست نامہ دار الاؤنس دینا چاہا لیکن انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ ان میں سے کون سے مال سے اپنا بیٹ بھرتا نہیں چاہتا؟

دکن کے تاج دار نظام ہر محبوب علی خاں کے زمانے میں مولوی عزیز مرزا ریاست کے بیڑ نامی ایک ضلع میں کلکٹر تھے۔ ان دنوں عدالت سے بولے اور قتل کے دھڑوں کے لیے جہانمی کی سزا تجویز ہوتی۔ عدالت عالیہ اور نظام کن نے سزا کی توثیق کر دی۔ راج کے ضلع داروں قیدی ضلع کے مدد نظام لے گئے تھے تاکہ انھیں کلکٹر کے سامنے چھانسی دی جاتے۔ کلکٹر مولوی عزیز مرزا نے انھیں ان کی لینڈ کے آخری کھانے کھلانے کا حکم دیا۔ کھانے آگئے۔ دو دنوں قیدی سرکھا کے کھانے گئے۔ عزیز مرزا ان سے مخاطب ہو کر بولے: "کاش تو لوگوں نے اس نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے کچھ سوچ لیا ہوتا۔ پہلے سوچ لیتے تو راج پر فیتہ نہ آتی؟" ایک قیدی نے جواب دیا: سرکار سوچنا تو مزے جھے چاہیے تھا۔ قیدی میں نے کیا ہے۔ یہ دوسرے شخص کیا سوچتا ہے۔ تو نہ جرم سے واقف ہے نہ اس نے جرم میں کوئی مدد کی ہے۔ یہ قطعی قاتل نہیں ہے۔ چارہ خواہ خواہ پولیس کے نکل کر شکا ہو گیا۔ آج بالکل بے خطا جان رہے ہیں۔"

عزیز مرزا نے چونکہ کن کے سرکشیوں سے پوچھا یہ کیوں میاں کیا اور اتنی تمھارا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ اس شخص نے ایک سردارہ بھری سرکار تعلق کیا ہے؟ مجھے تو اس قتل کی خبر بھی نہیں تھی۔ مالوں نے مجھے بے خطا قاتل قرار دے دیا ہے۔" عزیز مرزا کا دل ہل گیا۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ انھوں نے مقدمے کی قاتل نکال کر اپنے شروع سے آخر تک دیکھا معلوم ہوا کہ تین قاتلیں میں ایک بڑا لغزش ہو گئی تھی۔ اسی لغزش کی بنا پر ایک بڑے گناہ منشی قاتل سمجھا گیا عزیز مرزا نے اس وقت قاتل پر بھی "ایک شخص بالکل بے گناہ ہے۔ میں نے اس کی چھانسی ملتی کر دی ہے۔ مقدمے پر نظر ثانی کی جائے۔ قاتل کے موجودہ اقدار طبعی پر ایک بڑے گناہ منشی کے خون سے بڑھتے ہیں۔ ان کا میرے دلائل حضور نظام کی خدمت میں پیش کر دینے چاہیں۔ اگر پھر بھی شاہی شناسی ہے کہ مقدمے پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی اور دھوکہ کی ٹھیل میں دو دنوں قیدیوں کی چھانسی دی جائے تو اس ملازمت سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ میرے بعد میرا کوئی چاہنیں اس خطیم کا کہ مرگے ہو تو وہیں اپنے کا حضور نظام کے خلاف قیامت کے دن کا ہی نہیں دوزخ کا گمان کہ کے مجھ سے ایک بڑے گناہ قاتل کو دیا گیا تھا۔" مولوی عزیز مرزا کے احباب کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ انھوں نے مولوی صاحب کو بھی بلا کر دیکھے، آپ صاحبوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، آپ پر شاہی خطاب ڈال ہو سکتا ہے۔ حضور نظام نے خود چھانسی کا حکم دیا ہے۔ اس صورت میں آپ کی گردن پر گناہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گناہ تو اس راج کے سر ہو گا جس کے غلط فیصلے سے اس شخص کی جان جاری ہے۔ آپ کا اس معاملہ کی تعلق آپ فیصلے ہی حاسد کن کے رخ میں ہیں۔ بیٹھے تھامے مزید نصیحت مول لےنے کے کیا فائدہ؟ یہ تو دہری بات ہوئی۔ آجیل مجھے رات مولوی عزیز مرزا نے احباب کا مشورہ نہیں مانا اور قاتل قید کیا اور جج دی۔ نظام سے ان کا نوٹ پر دھا اور اس کی تائید کی۔ اس طرح ایک بے قصور کی جان کٹی

قتل الیہ فیہ احباب الیہ کے تحریر کردہ کتاب مصطفیٰ علی عزیز مرزا نے

ڈاکٹر فلیکر اپنے مددگار کے ساتھ کرے میں داخل ہوا۔ پٹیشن ڈاکٹر تو معروف ہر برٹ نے لیے تھے۔ ڈاکٹر کی فیس اور اسپتال وغیرہ کے اخراجات اگلے تھے۔

نتیجہ کامیابی کی صورت میں نکلا۔ پٹیشن کا میاں اب ڈاکٹر اور ہر برٹ نے گویا سرگردوارہ زندگی پائی۔ ڈاکٹر فلیکر نے رپڑ کے دستانے اتارے۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف ہنس تھا۔ فضا بہت خوش گوار تھی۔ لیٹتہ قد ڈاکٹر کے سر میں بے تڑنگے ہر برٹ کا داغ اور لمبے تڑنگے ہر برٹ کے سر میں لیٹتہ قد ڈاکٹر کا داغ منتقل ہو چکا تھا۔ منتقلی کے باوجود دونوں داغ معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آپریشن سے قبل کی زندگی طہیان سے شروع کر سکتے تھے۔ وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے میں منتقل ہو چکے تھے۔ انھیں ایک دوسرے کے منتقلی آپریشن سے قبل کی ایک ایک بات معلوم تھی۔ اب ڈاکٹر، ہر برٹ بن چکا تھا اور ہر برٹ ڈاکٹر۔

ڈاکٹر، اصل ڈاکٹر اسپتال سے نکلنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ اپنے نئے صحت مند اور دراز قد جسم کے ساتھ جلد از جلد راجیا سمک پہنچنا چاہتا تھا۔ اب جسم کے لیے اس نے خط رقم خرچ کی تھی۔ ایک لاکھ سب تک

نازک نازک ہونٹ اس کی گردن پر رکھ دیے۔ ڈیوڈ نے سوال ڈھرایا۔
”کیا تم مجھے پسند کرتی ہو؟“ ماریا منمن کر رہ گئی۔ ڈیوڈ اسے سینے
سے لگائے موسیقی کی لمبوں پر تھکنا رٹا۔



ماریا سے دوبارہ ملاقات ڈیوڈ کے لیے زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوئی
تھی۔ آپریشن سے پہلے دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پا چکا تھا، اس کی
رُوسے آپریشن کے بعد نئے ڈیوڈ یعنی سابق ہربرٹ نے پرانے ڈیوڈ یعنی
نئے ہربرٹ کو اپنا ایک پرانا کالج فیلو کہہ کے مایا سے ملوایا۔ نیا ہربرٹ
ماریا سے تعلقات بڑھانے لگا۔ وہ یہ بات ہر وقت یاد رکھتا تھا کہ
اُس سے گوشت و زندگی کی کوئی غلطی دوبارہ سرزد نہ ہونے پائے۔
ماریا ہربرٹ سے آمیزہ آمیزہ متاثر ہو رہی تھی۔ ہربرٹ اُس کے
ملائمٹ ہونے سے سلا تا تو مارا کے بدن میں ہلکا سا لاشعاش پیدا ہو جاتا۔
ہربرٹ کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور اس کی آواز بھی مردانہ تھی۔ کچھ
لڑکیاں یہ جانتی ہیں کہ محبت کے معاملے میں مرد بھگت نہ کرے
بلکہ یہ کارروائی وہ خود انجام دیں۔ ہربرٹ سابق زندگی میں دیکھ چکا
تھا کہ ماریا اسی مزاج کی لڑکی ہے چنانچہ اس بار ہربرٹ نے پہل
نہیں کی ماریا کو خود قدم بڑھانے کا موقع دیا۔ نتیجہ قہر نہ نکلا۔ ماریا
کچے ہوئے سبب کی طرح اُس کی بھولی میں آگری۔ ماریا کا شبہ بہت
ہوا کہ ہربرٹ کے دسپ میں دراصل ڈیوڈ ہے۔

ڈیوڈ اُس کھیل کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا کوئی ڈیوڈ
جھٹکتے بعد اُس نے پھر ماریا سے بات چھیری۔ ماریا کا غم نہیں ہاتھ اپنے
ہاتھوں میں لے کے وہ ہربرٹ کی بھوری چمکلی آنکھوں سے اُس
کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ڈارلنگ! میں تم سے ایک اہم بات کرنا
چاہتا ہوں۔“

”کوئی ڈیوڈ؟“ ماریا نیم بدوشی کی کیفیت میں بولی۔
”یقیناً یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ میں بہت جلد تم سے ایک
اہم سوال کرنے والا ہوں؟“
”یاد ہے ہربرٹ!“ سوچ گئی تم....“

”ہاں ہاں ماریا!“ ڈیوڈ جلدی سے بولا۔ میں چاہتا ہوں کہ
تم میری شریک زندگی بن جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں ہماری مشترک زندگی
انتہائی پُرصورت کوئے گی۔ یعنی مون کے لیے میں ایک چھوٹا سا خوب
صورت بچکا لے لوں گا، اُس میں راحت و آسائش کا ہر سامان ہم
ہوگا۔ ہمتی مون کے دوران تمہیں میں اپنی زندگی کے ایک اہم راز
سے آگاہ کروں گا۔“

”اوہ اوہ“ ماریا کی آواز بچھ گئی۔ ”میں تم سے شادی نہیں کر

سکتی ہربرٹ! میں کر سکتی۔“

”نہیں کر سکتیں؟“ ڈیوڈ دنگ رو گیا۔ لیکن کیوں؟ ماریا جواب
نہیں دے سکی پریشان ہو کر رہ گئی۔ ڈیوڈ نے تشویش سے پوچھا۔ کیا بات
ہے ڈارلنگ! ہم کیا بات کر رہے ہیں؟
”ہربرٹ ڈارلنگ! میں تمہیں کیسے بتاؤں آف“ ماریا نے
سرتھما لیا۔

ڈیوڈ کی آنکھیں پھیل گئیں ”کیا تم... کسی اور سے؟“
”ہاں“ ماریا کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”تم نے پہلے تو مجھ میں بتایا اُسے کب سے جا رہی ہو تم؟“
”طویل مدت سے“ ماریا کا چہرہ ہر سون سے ہو گیا۔ جسے کوئی منزل
پر پہنچ کر مطمئن ہو جائے۔ ”میں اُسے پہلے سے پانچ سال سے جا رہی
ہوں۔ وہ بھی مجھے بے حد چاہتا ہے۔“ ڈیوڈ کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔
ماریا کتنی رہی۔ وہ دیکھنے میں اتنا اچھا نہیں ہے مگر شکل و صورت
اسی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ میں نے اُس کی ظاہری شخصیت کبھی پر نظر
نہیں رکھی۔ ماریا دل فریب انداز میں سکرانی۔ ”میں کوئی عجیب سا
احساس مجھے اُس سے دور ہمارا تھا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟ اُس
کا قد ذرا.... چھوٹا تھا۔ بنز محفل اور برداشت کے بجائے اُس میں
جلد بازی تھی۔“ ماریا نے گفتگو جاری رکھی لیکن ڈیوڈ آگے نہیں
سن سکا۔ اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی، پیشانی پر پسینہ ابھرا آیا تھا
اور سانس بے قابو ہو گئی تھی۔ ماریا نے کہا۔ لیکن تقریباً دو مہینے سے
وہ ایک سرمدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اُس کا رویہ معقول ہو گیا ہے۔
اُس میں مردانہ پن آ گیا ہے۔ میں پہلے اُسے دیکھ کر کوفت میں مبتلا
ہو جاتی تھی اب یہ کیفیت ختم ہو گئی ہے۔ وہ مجھے ایک پُرکشش آدمی
لگنے لگا ہے۔“ ماریا سکرانی۔ یہی مسکراہٹ ڈیوڈ کو پائل کر دیتی تھی۔

”وہ کوئی اہم قاتل ضرور ہے لیکن میرے برابر ہے۔“ ماریا نے کہا۔
”ہمارا جوڑو قطعی مردوں ہے۔ اب میں تم سے کیا کہوں بس یہ سمجھ لو کہ وہ
پرستش کے قابل ہے اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ اُس
کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اور ہربرٹ! میں بھی اُسے بے حد بے انتہا
چاہنے لگی ہوں۔“ ڈیوڈ کی آنکھیں دیان ہو گئیں۔ وہ خشک ہونٹوں
پر زبان پھیرنے لگا۔ ماریا اٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے انہوں سے ہربرٹ!
بہت انہوں ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔“

اُس نے ڈیوڈ کے رخسار پر ایک اچھٹا بوسہ دیا اور روانہ
کی طرف بڑھ گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ تھی۔



سب بنگ

* اَلْبُيُوتُ الْمَكُورَةُ سُرُودٌ

حالات عزیزی • حسرت اظہر • مجموعہ کمالات عزیزی • حیات شاہ ولی اللہ • دیانت الطیب
مبارک غنائے خاصہ • حیرت دہلوی • ظہیر الدین سید احمد • رحیم بخشہ دہلوی • قاری محمد کلید
باسمہ مصروفیت کے تیار سے مشورے مندرجہ بالا کتابوں سے مدد لیں گے۔



”ماں قتل کرنا چاہتے ہیں“

”جہاں جرم؟“ بزرگ نے دریافت کیا۔

ایک لمبی قبا اور عمامے والے شخص نے طنزاً جواب دیا۔
”سبحان اللہ حضرت کو اپنا جرم بھی نہیں معلوم کیا ہے نیاز سی ہے“
پھر وہ غصے سے بولا تو کا فر ہے۔ تو نے کلام پاک کا فارسی میں ترجمہ
کیا ہے۔ یہ کتاب اللہ کی توہین ہے۔ تو نے گروں کو گمراہ کیا ہے تیری
سزا موت ہے۔“

بزرگ نے مجمع کو سمجھنا بھانا چاہا مگر مجمع سنبھلنے کے بجائے
سے نا ہو رہا گیا۔ اس صورت حال پر بزرگ کو صلال آ گیا۔ اُن کے
ہاتھ میں ایک تیلی سی پھڑی تھی۔ انھوں نے چھڑی اٹھانی اور اللہ عز
کا قہر بلند کیا۔ نعرے میں عجیب اثر تھا۔ پھر ہونے لگا گانپ گانپ
سننے لگے بزرگ نے اپنے ساتھیوں کو دروازے کی طرف بڑھنے کا
حکم دیا۔ مجمع کافی کی طرح چھٹ گیا۔ بزرگ دروازے سے نکلا اور بازار
کھاری باتوں کی جانب بڑھے۔ مجمع میں کوئی شخص چہیا نہ لوگو! خوروار
یہ ہر چاہیے گئے نہ پائے۔“

بزرگ رک گئے اور مجمع کی طرف مڑنے کو کہے بولے۔ ”مجموع
جس جگہ ہے وہیں خیر ہے۔ اگر کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا
تو وہ یہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔“

اس تنبیہ کے بعد کسی میں چلنے کی جرأت نہیں ہوئی بزرگ
اور اُن کے ساتھی اطمینان سے روانہ ہو گئے۔

بزرگ کا نام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تھا۔ وہ گھر بیٹھے پان
کا بڑا لڑکا عبدالعزیز ان سے پرہٹ گیا اور رونے لگا۔ مسجد کے داخلے
کی اطلاع گھر والوں تک پہنچ چکی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے عبدالعزیز
سے کہا۔ ”عزیز! رو تا کیوں ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ دنیا والوں نے

کا وقت تھا۔ ولی کی فتح پوری مسجد میں نماز شروع ہوئی ایم
عصر نے اللہ اکبر کہ کر نیت پاندھی۔ دعوت مسجد کے
دروازے پر ایک بے ہنگم شور اٹھا۔ شہر نمازیوں نے گھبرا کر نیت توڑ
دی اور پیچھے ہٹ کے دیکھا۔ ایک متعطل جھم دروازے پر قابض ہو چکا
تھا۔ ہجوم میں کسی کے پاس نہ بچ رہا کسی کے ہاتھ میں کتا تھی۔ کوئی تلوار
سے تلخ تھا، کوئی چھری سے بہت سے لوگ لاشیں گھا رہے تھے نیت
توڑنے والے نمازیوں کے برعکس ایک بزرگ اور اُن کے چند ساتھی
شروع و ختم سے نماز پڑھتے رہے۔ انھوں نے بنگلے کے باوجود
اطمینان سے نماز پوری کی اور سلام پھیر کے دروازے کی طرف دیکھا۔
ایک شخص نے مضطرب لہجے میں بزرگ سے کہا۔ ”حضور! یہاں سے
جلد از جلد نکل چلیے۔ فساد ہو رہا ہے۔“

دوڑے گئے کہا ”مسجد کے چھوٹے دروازے سے نکل چلیے۔“
”مفسد شخصیت سے بڑھاپا کیا ہے لوگ خدا کا گھر قتل میں
بدلتا چاہتے ہیں۔ آخراں کا مطلب کیا ہے؟“

بزرگ نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا ”خبردار!
کوئی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔ اگر ہماری موت میں کبھی ہے تو
اُسے کون روک سکتا ہے؟ اور اگر ہمارا وقت ابھی نہیں آیا ہے تو
اطمینان رکھو ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔“

ہجوم برابر نعرے لگا رہا تھا۔ پچھلو کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔
”ان محمدیوں نے ہمارا دین خراب کر دیا ہے۔ یہ کافر ہیں مرتد ہیں انھیں
قتل کر دو۔ مار ڈالو۔“ کچھ لوگ مسجد کے صحن میں گھس آئے۔ اُن کے
تیور بچکے ہوئے تھے۔ انھوں نے بزرگ اور اُن کے ننگاروں کو
گھیر لیا۔ بزرگ نے تحمل سے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ ہیں قتل کرنا چاہتے ہو؟“

سب ہنگ

میرے جیسے نبی کو کس قدر اذیتیں دی تھیں؟ بیٹا! آنسو بہت کچھ لے آبا
ہم جانے والے ہیں۔ ہماری میراث علم ہے۔ اسے سنبھال، علی العزیز
نہ ادب سے کردن غم کردی۔

ہجری ۱۱۷۴ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا انتقال ہوا۔
انھوں نے چار کمسن لڑکے چھوڑے تھے۔ عبدالعزیز کی عمر سولہ سترہ
برس کی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی میراث ضائع نہ ہونے دی اور
علم و عمل کے میدانوں میں ایسی شہرت حاصل کی جو کسی اور کے حصے
میں نہ آتی۔ تیسری عمر میں محدثین کے سب قدر سلسلے ہیں، ان سب کا
واسطہ عبدالعزیز ہیں اور اس کے آبا و اجداد سے ہے۔ باپ ولی اللہ دادا
شاہ عبدالرحیم پرورداد شاہ و جلیل الدین شہید، چچا شاہ اہل اللہ بھائی
شاہ ربیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی، چھینے شاہ اسماعیل
نور سے شاہ محمد اسحاق، شاہ محمد یعقوب اور داماد مولانا عبدالحی۔

شاہ عبدالعزیز ۱۱۵۹ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا باپ بھی
نام غلامِ حلیم تھا۔ اس نام کے اعداد ۱۱۵۹ ہیں۔ تیس ششوں بعد
ان کا نسب حضرت عرفانِ حق سے جا ملتا ہے۔ ان کے دادا شاہ
عبدالرحیم نے ولی میں علم و حدیث کی اشاعت کے لیے مدرسہ جمعیہ
قائم کیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم عالم گری محمد کے جلیل القدر علما میں تھے۔
شاہ عبدالعزیز کے والد شاہ ولی اللہ کے پیدا ہونے کی بشارت شاہ
عبدالرحیم کو خواب میں قطب الدین بنیانِ کالی نے دی تھی۔ شاہ عبدالرحیم کا
کناس ہے کہ ایک مرتبہ تین خواجہ قطب الدین کے مرتضیٰ زیارت
کے لیے گیا۔ میں ایک اونچے چوترے پر کھڑا تھا کہ دو خوشی خواجہ کی
روح ظاہر ہوئی اور ارشاد ہوا، غمغریب تمھارے ہاں ایک ہونمار لڑکا
پیدا ہوگا تم اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ میں حضرت کا یہ ارشاد
سن کر حیران ہو گیا۔ میری بیوی ایسی عمر کو پہنچ چکی تھیں کہ اولاد ہونا
عالم تھا۔ آخر میں سے اس کی یہ تاول کی کہ اس لڑکے سے خواجہ
کا مطلب پتا ہوگا۔ جوں ہی میرے دل میں یہ خیال گزرا، خواجہ نے
کہا میں خاص مختار سے مصلب سے لڑکا پیدا ہوگا چنانچہ چھوڑے
ہی دن بعد مجھے دوسرے نکاح کی خواہش ہوئی اور ولی اللہ پیدا
ہوا۔ ابتدا میں یہ واقعہ میرے ذہن سے اتر گیا تھا اسی وجہ سے لڑکے
کا نام تمام خاندان میں ولی اللہ مشہور ہو گیا مگر کچھ مدت گزرنے کے بعد
جب مجھے واقعہ یاد آیا تو میں نے اس کا نام بدل کر قطب الدین احمد
رکھ دیا۔

شاہ عبدالعزیز نے پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف پڑھنا
شروع کیا۔ اس کے بعد فارسی کے چند مختصر رسالے پڑھے۔ پھر صرف
دو تین سال میں عربی صرف و نحو کی کتابیں نکال لیں۔ بارہ سال کی عمر
میں انھوں نے صرف و نحو، فقہ، اصول منطق، کلام، عقائد، ہندسہ، طب

اور ریاضی وغیرہ میں کامل مہارت اور اعلا اہمیت پیدا کر لی تھی۔ اس کے
بعد حدیث کی تعلیم شروع ہوئی۔ لوگ ان کی ذہانت اور طباطبائی و کچھ
کردگاہ کے جاننے والے تھے۔ کوئی دقیق اور اہم مسئلہ ایسا نہیں تھا جسے وہ
پانی نہ کر دیتے۔ ہوس بڑے بڑے عالم تھا کہ خود شاہ ولی اللہ بھی حیرت
زدہ رہ جاتے۔ ان کے خاندان میں نقلی علوم کے ساتھ ساتھ عقلی علوم
کا بھی دلچسپ مطالعہ حدیث اور تفسیر کے ساتھ منسق و ریاضی، تاریخ اور
جغرافیہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی لیکن شاہ عبدالعزیز کو عقل کے بجائے
نقلی علم فرائض حدیث فقہ اور تفسیر سے دل چسپی تھی۔ انھوں نے زندگی
کا ایک لمحہ کبھی علوم کی تدلیس میں صرف کیا۔ ان کے ننوں چھوٹے
بھائی انھی کے شاگرد تھے۔ سترہ برس کی عمر میں وہ اپنے والد کے
جانشین ہوئے اور نہایت سرگرمی سے طلبہ کو پڑھانے لگے۔ مدرسہ جمعیہ
کوان کی وجہ سے دوامی شہرت نصیب ہوئی۔

اسی عمر میں ان کی برصیت کوئی اور ذہانت کے لیے چشمے
آبلے کرتے دیکھیں شش گئے۔ جب انھوں نے مسئلہ ارشاد سنبھالی تو
ولی اللہ خاندان کے چند شاگرد قصب بھٹلت سے بیل گاڑی کرانے
پر لے کر وہاں کی طرف چلے۔ راستے میں یہ لوگ علمی مباحثہ کرنے لگے۔
گاڑی بان ایک ہندو برہمن تھا اس نے ان لوگوں سے کہا، ایک
بات بتاؤ، ہندو ہند ہے یا مسلمان؟ سب نے اپنی اپنی اعتقاد کے
مطابق جواب دیے مگر وہ کچھ نہ سمجھا۔ آخر جہز آکر ان لوگوں نے
کہا، ولی چل کر شاہ صاحب سے اس بات کا جواب لے دیں گے۔
ولی پہنچ کے وہ اپنے ساتھ گاڑی بان کو شاہ عبدالعزیز کے پاس لے
گئے۔ اس نے کچھ کلام سترہ برس کا ایک لڑکا بٹھا ہے۔ وہ حیران
ہو کر لڑایا، کیا بڑے مولوی صاحب یہی ہیں؟ "لوگوں نے کہا، ہاں۔
اس نے شاہ صاحب سے کہا، ہماری ایک بات کا جواب دو، ہندو
ہند ہے یا مسلمان؟ شاہ صاحب نے کہا، جوابات ہم کہیں ان سے خوب
سرجنا۔ اگر خدا ہندو ہوتا تو گو بھتیجا کیوں ہوتی؟ گاڑی بان لاجواب
ہو گیا۔

شاہ عبدالعزیز نے قرآن حفظ کر کے پہلے سال نیا تو بڑا بیچ
کی نماز ہو چکی تھی۔ مگر ایک گھر سارا بہت عمر وہ بکتر بنے، برہما
پاتھ میں لیے آئے اور پوچھنے لگے، رسول اللہ کہاں تشریف رکھتے
ہیں؟ "لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور پوچھا، حضرت، آپ کیا فرما
لے ہیں؟ آپ کا اسم گرامی؟ انھوں نے بتایا، ملا نام ابوہریرہ
ہے۔ یہ عالم نے فرمایا، کیا ہم عبدالعزیز کا کلام مجید سننے میں آئے۔
یہ فرما کے مجھے انھوں نے ایک کام سے بھیج دیا، اس سبب سے میں
دیر میں آیا، انسا کہہ کے وہ غائب ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیز کا بارہ مسلمانوں کی اخلاقی گراہت کا نوازہ تھا۔

سب نگ

فنی و مجروح باز اگر کم تھا، کٹھن ملاؤں نے اپنے حلوے مانڈ کے لیے لوگوں کو بے شمار رسوم میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ کوئی شخص اٹھے اور اصلاح حال کا نعرہ لگائے بہت سے لوگ شاہ عبدالعزیز کو منسلک تھے جن میں یہ لوگ ہیں جو ان مشکلات سے آگاہ نہیں جن سے شاہ صاحب کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس پر فتنہ و در میں علمائے حق کو کئی سختی کا خاں مل رہا تھا۔ غلام شکر و جہل گمراہ کرنے والے صرفیا، دنیا دار علما، بغل سلاطین کی دینی بے حس، انجمن حکومت اور اس کے ایجنٹ وہ لوگ ہمسوا و اعظم کے بالکل مخالف تھے، انھوں نے شاہ صاحب اور ان کے والد کو بے انتہا افتقار بنایا۔ یہی سبب ہے کہ شاہ صاحب فتنہ و فتنہ عزائمات سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے۔ شاہ صاحب نے جس زمانے میں تختہ انارک عشرت پہنچی اس زمانے میں دلی کا کڑواں بھگت خاں تھا۔ بھگت خاں کو دلی اتنی شان سے ملتی بغض تھا۔ اس نے شاہ ولی اللہ کے پیچھے اتار دے کہے کار کر دیے تھے، تاکہ وہ کوئی کتاب یا مصنفین تحریر نہ کر سکیں۔ اسی نے مرزا مظہر جان جاناں کو شہید کر دیا، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز کو دلتے سے نکال دیا۔ یہ دونوں حضرات متواتر ہجرت بناہ حال شاد پر تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد مولانا فخر الدین لغامی کی کوشش سے عورتوں کو نو سواری مل گئی، وہ قصیدہ بچلت روانہ ہو گئیں لیکن شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سواری نہیں ملی چنانچہ شاہ رفیع الدین پہلے گھنٹوں گئے اور شاہ عبدالعزیز جون پور میں دو دن بھانوں کو رہا ایک ساتھ رہنے کا حکم تھا، نہ سواری پر بیٹھنے کا۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز کا سن پچھتر برس کے قریب تھا۔ بیانیہ جاتی رہی تھی اور ضعف سے ان کے لیے چند قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ اس سے پہلے بھگت خاں نے انھیں دو دفعہ زہر دلوا دیا، ایک مرتبہ بھگت کی چربی ان کے بدن پر نکلا دی، اس سے شاہ صاحب کو برس اور جذام ہو گیا۔ جون پور کے تکلیف دہ ہمدل سفر میں انھیں کو بھی گس لے لیے ان کے مزاج میں سخت حدت پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد بھگت خاں کو کسی دشمن نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شاہ رفیع الدین گھنٹوں سے اور شاہ عبدالعزیز جون پور سے واپس دہلی آئے۔ ان کی ہر حاضری میں مصنوعی حوینوں نے اُدھم مچا کر رکھا تھا۔ بادشاہ شہزادوں اور شہزادیوں پر ان کا بے پناہ اثر تھا۔ عوام ان کی تعجبی میں تھے۔ ان کی ہر جہازت ہو گئی تھی کہ حق کو علما اور صلوات گزیر زماؤں کے پاس آتے اور کہتے تھے: "اے مسجد کے سینڈھے! کچھ دوا ہم زہری رکھیں گے، شراب پییں گے، گینگ گھنٹوں گے، اگر کہیں دے گا تو سونا مار کر تیری کھوپڑی پاش پاش کر ڈالیں گے،" مجبور ہو کر انھیں کچھ نہ کچھ دینا پڑا تھا۔ خاں شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغادر بھی دیتے تھے۔ وہ پیسے دیتے

وقت ہمیشہ کہتے: "ہو میاں صاحب! ان پیسوں کا کھانا کھا لینا، لیکن شاہ عبدالعزیز نے کبھی کسی کو کچھ نہیں دیا۔ ان کے دہبے کی وجہ سے کسی لیے ویسے کو زوال کے سامنے جانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی بعض متکار طرح کے حیلوں سے ان سے کچھ ایشینا چاہتے اور نامرد لوٹتے۔ ایک واقعہ مشہور ہے: خواجہ قطب الدین بھٹنار کا کی کے مزار کا ایک مجاور علما کے پاس جانا اور کہنا: "مجھ سے قطب صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ کے پاس آؤں! ایک ٹکادوں اور کلاوہ سرب پر باندھوں لہذا تعمیل حکم کے لیے حاضر ہوا ہوں،" یہ کہہ کر وہ کچھ پیش کرتا اور کلاوہ باندھتا۔ عالم کو بھی کچھ نہ کچھ نذرانہ مجاور کو دینا پڑتا چنانچہ اس نے کسی کو نہ بخشا۔ ہر ایک سے زمین ایشیں کسی سے اس سے کہا۔ "ہم توجہ جانیں کہ تو شاہ عبدالعزیز سے کچھ وصول کر کے دکھائے۔" مجاور نے جواب دیا: "یوں ہی بات ہے۔ آج ہی ان کے پاس جانا ہیں۔ قطب صاحب کا نام نامی سن کر ان کو جب خیالی نہ کرے گا۔" غرض وہ کلاوہ باندھا اور کلاوہ لے کر شاہ عبدالعزیز کے پاس گیا اور بلا میں قطب صاحب کے حکم پر کھانا نہ کر کے اور کلاوہ باندھتے آجائیں۔ شاہ عبدالعزیز نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے مقدم سے کہا: "کہہ دو کہ ہم اس وقت وضو سے نہیں ہیں پھر کسی وقت آئے،" مجاور کلاوہ ڈھٹ تھا، کہنے لگا: "بستر ہے میں پھر حاضر ہوں جواں گا، چند گھنٹوں اور پھر گوارا کر کے دوبارہ خانقاہ میں گیا۔ اس بار شاہ عبدالعزیز نے اسے بلالید اس نے کھانا پیش کیا اور ان کے سر پر کلاوہ باندھا پھر ایک طرف پیچ کر یہ انتظار کرنے لگا کہ اب شاہ عبدالعزیز کچھ دیں گے لیکن انھوں نے تو یہی نہ کی۔ خاصی دیر گزر گئی۔ مجاور نے دیکھا کہ یہ تو بول رہا ہے میں نہیں کرتے۔ آخر وہ لولا۔ حضرت! مجھے کچھ تکرار مل جائے۔ شاہ عبدالعزیز نے کہا: "آپ کو حضرت قطب نے بھیجا، آپ نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب جب حضرت مجھے حکم دیں گے میں بھی آپ کی خدمت میں یہ سیدہ پیش کر دوں گا۔ فی الوقت آپ تشریف لے جائیے۔" مجاور اپنا سامان لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد اسے کسی عالم کے پاس جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

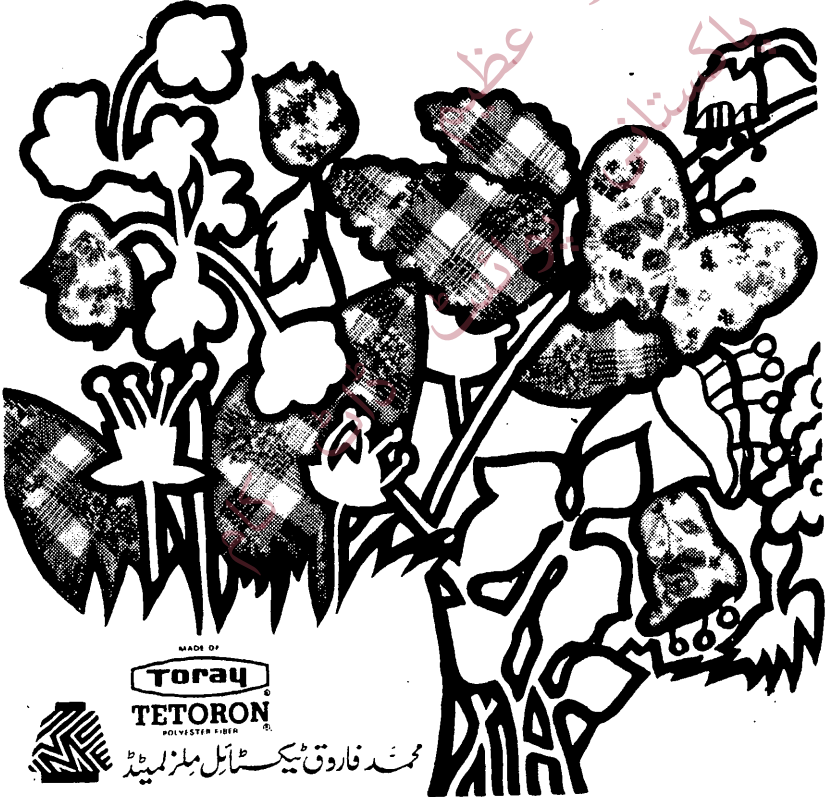
شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں امام شاہی فرقتے نے بے حد گمراہی پھیلائی تھی۔ اس فرقتے کے لوگ چار ابرو کا صفایا کرتے تھے۔ جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں انھیں حلال کہتے اور حلال کو حرام کہتے۔ اس فرقتے کا بانی ایک شخص امام شاہ تھا۔ امام شاہ کی تفریق کاروں کے ایک باغیچے میں تھی اس لیے اس کے سلسلے والے اپنا نام باغیچہ مناسبت سے رکھتے تھے کسی کا نام گلاب شاہ تھا، کسی کا چمبلی شاہ اور کسی کا بابر شاہ وغیرہ۔ جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت آئی اور انھوں نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے ہندوستانیوں کی فوج میں

بھرتی مشروع کی تو انھیں بڑی بڑی تنخواہیں دیں۔ وسیع اختیارات بھی دیے۔ لوگ عہدے اور رتبے کے لالچ میں کثرت سے بھرتی ہونے لگے۔ اس زمانے میں شاہ جہاں پور کا ایک حسین قریب تھوڑا نوجوان نسیم خاں تھا۔ اسے شعر و سخن سے بھی مشوق تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں قندھار نے تندرگہ گلشن بے غار میں اس کے حالات درج کیے ہیں۔ وہ انگریزی فوج میں رسالہ دار تھا اور نصرت لے کر اپنے وطن شاہ جہاں پور جا رہا تھا۔ راستے میں قندھار کا پورا با نسیم خاں دہاں ایک مراٹے میں ٹھہرا۔ مراٹے کے سامنے ہی وہ باغ تھا جس میں امام شاہ کی قبر تھی۔ آفاق سے نسیم خاں کھانا کھا کر نکلنے نکلا اور اس باغ میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک مکان تھا۔ اس میں امام شاہ کا سجادہ نشین گلزار شاہ رہتا تھا۔ اس زمانے کے عہد سے میں اس مکان کو مکتوف کہا جاتا تھا یعنی گنبد نسیم خاں مکان کے قریب کیا نو گلزار شاہ نے اس کی آہٹ سنی اور مکان کے اندر سے آواز دی: "کون؟" اس زمانے میں لوگ اپنا نام نہیں لیتے تھے اس لیے نسیم خاں نے جواب دیا: "نسیم گلزار شاہ" اندر سے کہا: "نسیم نو گلزار سے نہ ملے گا۔" اس آواز میں عجیب جادو تھا۔ نسیم خاں کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ چند لمحوں بعد گلزار شاہ مکان سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی نسیم خاں بے خود و بدحواس ہو کر اس کے قدموں پر گر پڑا۔ پھر اس نے کسی وقت جادو بردار کا صفا یا کر آیا اور فقیری اختیار کر لی۔ اپنے ہمارے میں کوہلا کے اس نے کہہ دیا کہ میرا سب تہذیب سا زمانہ ہے اس پر نصیحت اختیار ہے۔ جی چاہے تو میرے گھر سے دینا اور جی چاہے تو خود رکھ لینا۔ مجھے اب نہ گھر بار سے کوئی تعلق ہے نہ مرنے کوئی مشرکار۔ تم سب اپنے اپنے گھر چلے جاؤ، میں یہیں رہوں گا۔" اس نے بیوی کے نام طلاق نامہ لکھا اس پر گرا ہوں کے دھنڈکا کر اٹھا اور ان کے حوالے کر کے کہہ دیا کہ: "طلاق نامہ میری بیوی کو دے دیتا ہوں۔" ہماریوں نے بہت سمجھا یا، اونچ نیچ سے آگاہ کیا کہ ان کو گھر بار چھوڑنا اور فوج کی کوکری پر لڑتے مارنا کہاں کی داغ بیل تھی۔ نصیحت میں چھینسو گئے مگر گلزار شاہ کا سحر ایسا پڑھا تھا کہ نسیم خاں نے آپٹ سنی، وہیں امام شاہ کے پاؤں سے دھوئی رما کے بیٹھ گیا۔ بیوی اور اس کے گھر والے صبر و شکر کر کے فاکوشس پر رہے۔ فوج نے بھی اسے واپس نہیں لے سکا۔ گلزار شاہ کا یہ تصرف چونکہ عجیب تھا اس لیے عوام پر اس کا بہت اثر ہوا اور امام شاہی سلسلے کا انتہائی ترقی ہوئی۔ کچھ عرصے بعد گلزار شاہ مر گیا۔ اس کی جگہ نسیم خاں سجادہ نشین ہوا۔ بہت سے لوگ اس کے سلسلے میں داخل ہوئے اور ہر طرف نسیم خاں نسیم خاں کا ڈھنگ مٹنے لگا۔ کچھ دنوں ایک مرتبہ نسیم خاں دہلی کی سیر کے لیے آیا۔ اس نے جب شاہ عبدالعزیز کے علم فضل اور

کشف فکر امت کا حال سنا تو اس کے دل میں حسد کی چوگاری بھڑکی۔ اس نے سوچا کہ اگر شاہ عزیز کو بچا نہ دیکھا یا تو کچھ نہ کیا۔ یہ سوچ کے وہ اپنے مژدے میں سے بولتا: ابھی جا رہا ہوں اور اگر شاہ صاحب کو اپنے حلقہ غلامی میں داخل نہ کروں تو نسیم خاں نام نہیں۔" خاتوا بیٹھ کے اس نے شاہ عزیز کو نوابت منجھڑے مخاطب کیا: "شاہ صاحب، شریعت کی قید میں کب تک رہو گے؟ محکو اس قید سے اور چھوڑو یہ شریعت و رعیت۔" شاہ عزیز نے نہایت اطمینان سے کہا: "آئیے آئیے شریف لائیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور دیر تک اودھر اودھر کی باتیں کرنے لپے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے نسیم خاں سے پوچھا: "میاں صاحب، آپ نے قرآن بھی پڑھا ہے؟" "جی ہاں پڑھا ہے۔" نسیم خاں نے دعوت سے کہا۔ "کچھ فارسی بھی پڑھی ہے؟" "بے شک فارسی بھی پڑھی ہے۔" نسیم خاں نے کہا۔ "اور عربی؟" "جی ہاں۔ عربی میں بھی تہذیب رکھتا ہوں۔" نسیم خاں بولا: "تعلیمی تک تو پڑھی ہے۔" "گھر سواری بھی آتی ہے؟" "کیوں نہیں۔ اچھی طرح۔" نسیم خاں نے فرمایا: "شاہ عزیز نے تو بڑی فوری سپرگری بھی سکھے ہوں گے؟" "بہت اچھی طرح جھکیتی، کبیتی، تیرا نمازی اور بندہ ذوق چلانا سب جانتا ہوں۔" "میاں صاحب، اس فقیری سے پہلے آپ کیا کام کرتے تھے؟" "فوج میں رسالہ دار تھا۔" شاہ عزیز نے پوچھا کہ قرآن کتنے زمانے میں پڑھا؟ فارسی کتنی دیر میں پڑھی اور عربی میں کتنا وقت لگایا؟ سپرگری کتنی مدت تک سیکھی اور فوج کی ملازمت کتنے عرصے کی؟ اس نے سب سوالوں کے جواب دیے۔ شاہ عزیز نے پوچھا: "امام شاہی سلسلے میں کب داخل ہوئے؟" اس نے اس کا بھی جواب دیا۔ ان تمام باتوں کا انظار کر کے شاہ عبدالعزیز لکھا: "وہ فقیر، سنبھل کر بیٹھا اور سن۔ تو تو جیسے ماں کے بہت کی قید میں رہا اور اپنے اختیار سے نہ نکل سکا اور میتوں تو ماں کے دودھ کی قید میں رہا اور اس سے نہ نکل سکا اور برسوں تو انھیں پکڑنے کی قید میں رہا اور وہ بیٹھوں اور گدے کی قید میں رہا اور قرآن کی قید میں رہا۔ سناؤ نے چاہتے جی ماں سے ہوں گے، ملاپے بھی لگائے ہوں گے اور چھوڑوں سے تیری مرمت بھی کی ہوگی مگر تو اس قید سے نہ نکل سکا برسوں تو فارسی کی قید میں اور عربی کی قید میں اور گشتی کی قید میں رہا اور کبیتی اور سب گنگ

آنچل

پلین و پرنٹڈ
لاجواب واش اینڈ ویئر
۸۷ میں موسم گرما کے پربہار ملیو سات کیلئے
۶۵ فیصد پالی ایسٹر ۳۵ فیصد کاٹن - دلفریب و دیدہ زیب ٹورے ٹیرون سے تیار کردہ



MADE OF
Toray
TETORON
POLYESTER FIBER

محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

چھکیتی کی قید میں رہا اور گونے گھر دوسری کی قید کافی اور تیرا ملازی کی اور انگریزوں کی قید میں رہا اور اب چارابرو کی صفائی کی قید میں ہے۔ پھر گونے آپ کو آد کر کے کہہ سکتا ہے؟ سن اس عالم کون و مکاں میں کی اپنا نہیں جو کسی دسی قید میں نہ ہو تو چارابرو کی صفائی کی قید میں ہے ہم شریعت کی قید میں ہیں مگر یاد رکھو تیری قید کچی چاندی ہے تو اس کی قیمت مانگے گا تو پہلے اسے پناہ چاہئے گا اور تپانے بغیر کچی نہیں لے گا اور ہماری قید پر تپا ہی سکر نہگا ہوا ہے، ہم لے جہاں چاہیں گے جہاں لیں گے۔

اس طرح جلال نقرہ سے نیم خاں پر کچکی طاری ہو گئی۔ وہ دھاڑیں مارا کر رہتا ہوا شاہ عزیز کے قہروں میں لوٹنے لگا۔ آخری وقت سے اس نے فیکری کو خیر یاد کیا اور شاہ عزیز کی غلامی کا حلقہ گردن میں ڈال لیا۔ دہلی میں شہزادوں اور درباروں کی مشورہ پستی حد سے بڑھ گئی تھی کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہیں تھی۔ لوگ بازاروں میں علانیہ فتق فحور کرتے۔ بڑے بڑے نقاد و شریف آدمی طوائفوں ملازم رکھا و قلع داری سمجھتے تھے۔ چند شرفائے شاہ عزیز سے پوچھا کہ ان واماں کی اس بگوتی جو بنی حالت کا اصل سبب کیا ہے؟ جب کہ انگریز حکومت کا انتظام بظاہر عذر ہے۔ شاہ عزیز نے نہیں کر کہا۔ انگریزوں کا انتظام دکھانے کے لیے ہے اصل انتظام جس قطب کے ہاتھ میں ہے، بہت جمالی بڑگ ہیں۔ اسی سبب سے حال درگزر ہے۔ جب وہ تبدیل ہو جائیں گے تو انتظام بھی درست ہو جائے گا۔ لوگوں کو ان بڑگ سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور وہ اصرار کر کے شاہ عزیز سے ان کا پتہ پوچھنے لگے۔ شاہ عزیز نے ایک گلی کا نام یاد کر دیا کہ وہ اس گلی کے پتھر پر ملے گے اور ان کا علم یہ ہے... لوگ گئے، دیاں ایک نکتہ مال بڑھا زین پر لہو یا پھلے بیٹھا اور کھڑا تھا۔ اس کے سامنے خروڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ خروڑے بیٹھے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھ کر پوچھا۔ بڑے میاں! خروڑے کیسے دیے؟ جواب ملا۔ دو پیسے دھڑی۔ انھوں نے دو پیسے ان کے آگے چھینکا اور کہا۔ ایک دھڑی خروڑے تولیے بیٹھے بیٹھے گئے کہات تولا وہ بڑی ہے اور باٹ اور ہمیں تکلیف تو ہوگی خود تولیے لیجئے۔ لوگوں نے دھڑی بھر خروڑے بھی خود تولے اور چونکہ بڑگ کی آرائش مقصود تھی اس لیے تمام خروڑے چھری سے کاٹ دیے اور کچھ کچھ کر چھینکے مٹروے کیے کہ بڑے میاں! یہ تو سب چھینکے ہیں۔ انھوں نے بے نیازی سے کہا۔ اچھا؟ سب چھینکے ہیں تو بھیا اپنے پیسے لے لو یا جی چاہے تو دھڑی بھر خروڑے اور تول تولے۔ انھوں نے پانچ میٹر خروڑے اور اٹھالے۔ انھیں بھی کاٹا اور چھینکے کہ کہہ کر چھینک دیا۔ بڑے میاں نے ان کے دو پیسے اٹھا کر واپس دے دیے کہ بھائی! میں اوروں سے جا کر خرید لو۔ انھوں نے واپس آکر شاہ عزیز سے سب مال کہا۔

شاہ عزیز پو لے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ سب انتظام کی غلامی ہے۔“
 کچھ مدت بعد یکایک دہلی کے حالات درست ہو گئے۔ پہلے جیسی مشورہ پستی اور بد معاشی زری۔ وہی لوگ جو علانیہ بازاروں میں خفیہ اکثریتی کرتے تھے اب چھپ چھپ کر کرنے لگے۔ لوگوں نے شاہ عزیز سے کہا کہ حضرت! معلوم ہوتا ہے دلی کا انتظام کسی اور کے ہاتھ میں آگیا؟ شاہ عزیز پو لے۔ بیچھ کتے، ٹھاس مرتبہ بہت سخت آئی آیا ہے۔ وہ ایک سقر ہے اور ان کل مابع مسجد کی مشرقی بیڑھوں کے پاس کٹوا بجا کر باقی پلاتا ہے لیکن دیکھنا اس سے ذرا سنبھل کے بات کرنا۔ لوگ سنے کی تلاش میں جامع مسجد گئے۔ شاہ عزیز نے جو شکلیہ بیان کیا تھا اس کی مدد سے لوگوں نے اسے شناخت کیا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخی تھی اور چہرے پر درد بہ تھا۔ لوگوں نے کہا۔ بڑے میاں! باقی تو بلاؤ۔ سنے نے کہا۔ دو پیسے کا کٹوا لے۔ پیسے پشیمانی لیتا ہوں۔ لوگوں نے دو پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے۔ سنے نے کٹوا بھر کر دیکھا انھوں نے منہ سے لگائے ہی پانی پھینک دیا کہ اس میں تو بال بڑا ہوا ہے۔ اور دو پیسے نے کہا۔ دو پیسے اور کٹا دل و دل کٹوا لے لو۔ اگر یہ منظور نہیں تو جلیتے پھرتے نظر آؤ۔ ہمیں بھی کیا خروڑے والا بچھا ہے؟ اور دیاں دیکھو اس فائدہ والے بڑے سے کہہ دینا کہ لینے کام سے کام لے لے ہمارے معاملات میں دخل دیا تو خطا اٹھائے گا۔ سب کان دیا کر چلے آئے اور شاہ عزیز سے سارا مال کہا۔ شاہ عزیز پو لے ہم نہ کہتے تھے کہ بڑا سخت آدمی ہے۔ اب ہم پر نہ جانے کیا آفت ڈھائے۔ کتے ہیں کس کے بعد بھی خفاں کو تول شاہ عزیز اور ان کے خاندان کا مافی دین ہو جاتا۔
 شاہ صاحب کی معرکہ آرا کتاب تحفہ انشا عشریہ نے اور غضب ڈھایا۔ اتنی ضخیم کتاب شاہ عبدالعزیز نے بکمال تمام املا کوافی تھی ان کی بنیادی جاتی رہی تھی لیکن حافظہ بے نظیر تھا۔ مخالفین کی کتابوں اور احوادث سے انھوں نے تمام حوالے زبانی دیے مگر کیا مجال جو کوئی حوالہ غلط درج ہو۔ ہر جات دلی کے مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے غیر مشہور کتابوں کی طویل عبارتیں صرف اپنی یادداشت کے بعد سے طلبہ کو کھولیں حالانکہ ان کی عمر اسی سال کے قریب پہنچ گئی تھی اور جسمی امراض کی کثرت تھی۔ مذاکرت سے جسم میں طاقوت تھی لیکن غلبہ کے باوجود علمی نکات اس زور و شور سے بیان کرتے گویا سمندر میں قلعہ غیر مومیں اٹھ رہی ہوں۔
 تحفہ انشا عشریہ کھنڈوں میں پہنچی تو لوگ جامع الدولہ کی حکومت تھی۔ اس نے کتاب دیکھی تو اپنے ہاں کے علمائے اس کا جواب کھانا چاہا لیکن ہر ایک نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر دل و دلی خاں نام کے ایک عالم نے جواب کھنے کا بیڑا اٹھا یا مگر مشکل یہ پیش آئی کہ شاہ سب نگ

دوبڑ کی زبان سے نغیر تھی اور دل دار علی خاں ایسی فارسی نثر لکھنے پر قادر تھے لہذا معروف قناعہ مرزا قنبل سے درخواست کی گئی کہ وہ دل دار علی خاں کے مغان میں اپنی نثر میں ادا کریں تاکہ مغان کا جواب مغان میں سے اور عبارت کا جواب عبارت سے ہو جائے لیکن قنبل نے غصہ کیا کہ اس شاہ عزیز میسر فارسی نثر لکھنے پر قادر نہیں ہوں اور اس بڑے کا بغیر یہ بے کہ دل میں ایک غنچہ سے میری آشنائی ہے میں نے نہایت دماغ سوزی اور اپنی پوری قابلیت صرف کر کے اسے ایک خط لکھا تھا مغنچہ میر غلط دلی کے تمام لائق و فائق لوگوں کے ہاں لے گئی اور درخواست کی کہ اس کا جواب لکھ دیا جائے مگر سب نے لکھا کہ اس نثر کا جواب ہم سے نہیں ہو سکتا۔ مجبور ہو کر وہ شاہ عزیز کے ہاں گئی اور اس نے لمبی کہ میں تمام جگہ پڑھ چکی ہوں کسی نے جواب لکھنے کا حق نہیں بھری اب پریشان ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ شاہ عزیز نے خط منفقہ ہی اس کا جواب فی البدیہہ لکھ دیا۔ وہ خط چھ مہینے سے میرے پاس پڑا ہے۔ میں بار بار کوشش کرتا ہوں کہ اس کا جواب لکھوں مگر اپنے آپ کا عاجز پاتا ہوں۔ خود غور فرمایا کہ اس صورت میں شاہ عزیز کی اتنی منیم کتاب کے مقابلے میں نثر لکھنا میرے لیے کس قدر محال ہے۔“ ہر حال دل دار علی خاں نے نواب کے حکم کی تعمیل میں جس طرح بھی بن پڑا، کتاب لکھی پھر مرزا قنبل کو زحمت دی گئی کہ ذرا اس کا اسلوب دیکھ لیجئے۔ انھوں نے کتاب پڑھا بجا نظر ڈالی اور مسکرائے۔ نواب نے پوچھا: مسکراتے کیوں ہو پھر نثر کی بابت بناؤ دل دار علی خاں نے کہی تھی ہے؟ مرزا قنبل نے کہا: کہاں جاس کا تھلا یا اور کہاں جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا شہدہ۔ چر نسبت خاک را با عالم پاک“ دل دار علی خاں نصیبہ جاس کے رہنے والے تھے۔ جاس کے جلا سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔

دہلی کا ایک رئیس نواب سعادت یار خاں نہایت وجہ اور مردہ حسن و جمال کا مالک تھا اور اپنا حسن و دنوں ہاتھوں سے لٹا تھا۔ دہلی کی ایک سے ایک طرح دار طوائف اس پر جان دیتی تھی۔ ایک رات وہ اپنی عظیم الشان عویلی کی خواب گاہ میں گری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ یکایک خواب گاہ کا دروازہ خود بخود کھل گیا اور ایک سزاگیز خوش برکے میں پھیل گئی۔ سعادت یار خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک عورت کا چہرہ چودھویں کے چاند کے مانند دکھایا کھل عورت مرے پاؤں تک سونے کے زبوریں ہیں۔ لدی دل رسانی سے مسکرا رہی تھی۔ اتنے میں وہ پلنگہ پر اٹھ بیٹھی نواب متوجہ ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آخر سنھل کر پوچھا: عورت! لوگوں ہے اور عویلی میں کیوں کر آئی؟“ عورت نے منہ کر کہا: کھل عورت

بے گنگ



میں ایک درویش کا بہت چرچا تھا۔ حجاج بن یوسف اس سے ملنے کا مشتاق ہوا۔ ایک روز اس نے درویش کو طلب کیا اور کہا: اے درویش! میرے لیے دعائے خیر کرنا۔ درویش نے فوراً ہاتھ اٹھا کر کہا: ”ابھی اسے موت دے“ حجاج نے جربز ہو کر کہا: ”واہ! یہ کیا دعا ہوئی؟“ درویش نے جواب دیا: ”یہ دعائے خیر ہے، تیرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔“ حجاج نے پوچھا: ”کیسے؟“ درویش نے کہا: ”تو ملنے سے چھوٹ جائے گا اور دوسرے تیرے غم سے چھوٹ جائیں گے“

میں فنا و جنات سلطان محبوب شاہ کی بیٹی ہوں۔ عورت دراز سے تھاری دل داوہ ہوں۔ ہر چند کوشش کرتی تھی کہ تھلے پاس آؤں مگر کوئی موقع صیب دل خواہ نہ ملتا تھا۔ آج اتفاق سے نعلی مراد بر باد نواب بدحواس تو بہت ہوا لیکن طبیعت اس نے عاتقانہ پائی تھی ایسے مواقع پر چونکا نہیں جانتا تھا۔ لہذا وہ بے اہل عیش و عشرت میں غفل ہو گیا۔ چند ساعت کے راز و نیاز کے بعد وہ پری زاورخصت ہو گئی۔ اس کے بعد وہ برات معینہ وقت پر آئی اور کچھ دیر نواب کی غفلت میں پھر کر ملی جاتی اس روش کرمال بھر کر دیا۔ ایک رات وہی عورت سمند بدحواس اور پریشان حال آئی اور نواب سے کہنے لگی: سعادت! ملہدی اٹھ اور اپنی جان بچانے کی تدبیر کر۔ میرا باپ اپنے عہد سے واقف ہو گیا اور اس نے غضب ناک ہو کر کئی دیو تیری ہلاکت کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ وہ دیو غالباً آج صبح تک تجھے زندہ نہ چھوڑیں۔ میری یہ ملاقات آخری سمجھنا اب میں پیاس سے جاؤں گی اور نور اگراں بار زنجیر بینا کہ قید کو دی جاؤں گی لیکن یاد رکھنا میں اسی قید میں جان بے دوس کی تیری جدائی مجھ سے ہوا داشت نہیں ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

سعادت یار خاں پر انتہائی دہشت طاری ہوئی ہاتھ پاؤں قابو میں نہ رہے۔ اس ناگہانی آفت سے بچنے کا اسے اس کے سوا کوئی راستہ نہ سوجھا کہ وہ ننگے پاؤں ننگے سر جگا ہوا شاہ عزیز کے آستانے کی طرف گیا۔ وہاں پہنچا تو سر پرندہ قدامت نے اسے اندر جانے سے منع کیا لیکن وہ بے انتہا مضطرب تھا۔ اس نے قدامت کی اکٹھ سنی اور جس مکان میں شاہ عزیز مراقب تھے، بے اختیار اس میں گھس کر شاہ صاحب کے قدموں پر جا کر۔ شاہ صاحب نے گردن اٹھا کر اسے

ہمارے چلیں۔ میں انھیں شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ میرے نزدیک اس پریشانی کا علاج صرف شاہ صاحب کے پاس ہے۔ اسی وقت چند آدمی کھڑے ہوئے پر سوار ہو کر مسافر کے ساتھ سیدھے شاہ عزیز کے ہاں گئے۔ شاہ صاحب نے سارا حال سن کر کہا: میں روزیہ واقعہ پیش آیا فقیر کو اسی روز خبر ہو گئی تھی اور فقیر لوگوں کا منظر تھا۔ اب اطمینان سے خانقاہ میں بیٹھو، تمہیں انا اور پھر فقیر کوئی تدبیر کرے گا، خدا اے ان لوگوں کو کھانا دیا، بخوشی دیرودہ لوگ ستلے، پھر شاہ صاحب نے انھیں بلایا اور کمانہ تم لوگ ابھی ماش کی دوڑیاں نیل سے چڑھ کر جانے دو کہ اس کے لئے جاؤ۔ وہاں ایک خارش کی گتا نظر آگیا۔ ایک روٹی اس کے سامنے ڈال دینا۔ وہ بیت غرائے گھر بیٹھ کر گا اور تمہیں ڈرانے کی کوشش کرے گا، مگر خیروار بخوش منت کھانا، نہ اپنی جگہ سے ہلنا، تاکہ جب روٹی کھالے تو دوسری روٹی بھی اُس کے آگے چھینک دینا اور گھوڑے تیار رکھنا۔ گتا روٹی کھانے کے بعد صبح چلے، تم گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کے پیچھے جانا، گتا تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ میں یہ ایک رقعہ دیتا ہوں اسے گتے کے گلے میں باندھ دینا۔

وہ لوگ ماش کی دوڑیاں نیل میں نہر کے چاندنی چوک پہنچے۔ وہاں انھیں ایک دوڑیا تیار خارش کی گتا دکھائی دیا۔ انھوں نے روٹی اُس کے آگے چھینک دی۔ وہ دانت نکال کر غرا یا اور اُن پر حملہ کرنے کیلئے لپکا لیکن لوگ اپنی جگہ جمے رہے یہاں تک کہ انھوں نے دونوں دوڑیاں گتے کو کھلا لیں اور شاہ صاحب کا رقعہ اُس کی گردن میں دھاگے سے باندھ دیا۔ رقعہ بندھنے ہی گتا برق رفتاری سے ایک جانب دوڑا۔ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کو پس بہک گئے۔ کے تعاقب میں گئے۔ گتا ایک دیر نیل میں پہنچ کر رکا۔ وہاں اُس نے پتھوں سے کچھ زمین کھودی، تھوڑی سی گرائی میں ایک دروازہ سا نظر آیا۔ وہ لوگ باہر کھڑے رہے، گتا دروازے کے اندر چلا گیا۔ انھوں بعد چند روز سے اُن اُن میں سے کچھ پہننے دروازے سے نکلے۔ دھن اُن کے ساتھ تھی۔ انھوں نے کہا: حضرت! شاہ صاحب سے ہمارا سلام کہہ کر عرض کیجئے گا کہ ہمارے غلبے میں سے ایک پاجی نے یہ حرکت کی تھی۔ ہم نے اسے سخت مزاد دی ہے۔ آمیدوار ہیں کہ یہ خطا معاف فرما دی جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ دروازہ اُسی دروازے میں داخل ہو کر غائب ہو گئے۔ گتا باہر آیا، اُس نے اپنے پتھوں سے مٹی ڈال کر گڑھا بند کر دیا پھر دہلی کی طرف بھاگے گا۔ گھڑ سوار بھی اُس کے پیچھے پیچھے دہلی آئے اور شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ گتا کے سارا جراثیم شاہ صاحب نے کمانہ تم لوگوں نے رات کے وقت دھن کے ساتھ جنگل میں قیام کر کے غلطی کی۔ آدھر سے ایک شیر بچن کا گور ہوا، وہ دھن کے لپٹے

میان اٹھا اور آدھی رات کے وقت یوں حواس باختہ آہا کسی سخت آفتاد سے خالی نہیں۔ جلد مارا مال کو۔ نواب نے شروع سے آخر تک سارا حال رو کر بیان کیا۔ سب کچھ سننے کے بعد شاہ عزیز نے کہا: میں اگرچہ تمہارا کردار اسی منزل کے لائق ہے مگر فقیر کی التماس رکرو تا پند نہیں کرنا۔ میرے جد امجد کی ہدایت یہی ہے۔ غیور کی شب اسی مکان میں آرام کرو کسی حجرے میں جا کر سو جاؤ تھوڑی دیر میں فقیر اس عورت کے باپ کو بلا کر مہیاں بخشی کر آئے گا۔ اطمینان رکھو۔ نواب وہاں سے اٹھا اور ایک حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ قریب تھا کہ وہ غافل ہو کر سو جاتا، یکایک ایک بھاری چھتر نہایت ہول ناک دھلکے سے نواب کی پائنتی گر آچودہ طبق روشن ہو گئے۔ نواب چیخیں مارتا ہوا حجرے سے بھاگا اور شاہ صاحب کے اوپر جا کر اُس کے ہاتھ پاؤں اکٹھے ہوئے تھے، پیسی بھینچی ہوئی تھی اور ہنٹوں سے کف ہماری تھا۔ شاہ عزیز نے فوراً کچھ پتھر کمر کپا، اسی وقت اُسے ہوش آگیا۔ اُس نے دیکھا کہ شاہ عزیز کے علاوہ باج کوی میل اور حبیب مودوں کے لوگ آدب سے کھڑے ہیں اور شاہ صاحب اُن سے کہہ رہے ہیں: یہی شخص تمہارا گنگار ہے اور تمہاری خدمت میں مجھے مسافر کش کے طور پر پیش کر کے چاہنا ہے کہ تم اس کی خطا سے درگزر کرو۔ اب یہ میرے پاس آگیا ہے۔ اگر تم میرا کفر قبول نہیں کرو گے تو جیسی ذلت اُس کے ہاتھ سے تمہاری ہوئی ہے۔ ایسی ہی اپنی ذلت فقیر مختار سے ہاتھ سے نصیب کرے گا۔ پانچوں نے شاہ عزیز کے قدموں پر گر کر بوسے دیے اور نواب کی خطا معاف کر دی اس کے بعد غائب ہو گئے۔

انھی دنوں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص نے اپنے رات کے کتبہ شہر کے کسی شریف گھرانے میں بھرائی۔ رات کے دلی سے دور کسی اور قصبے میں رہتے تھے۔ وہاں سے صوم دھما کے ساتھ برات آئی۔ بزرگان نے دل کھول کر مہمان کی خاطر وارات کی اور کراچ کے بعد دستور کے مطابق جینے کے رات کو رخصت کر دیا۔ ایک منزل ملے کہ وہ کسی مقام پر رُکے، نفیام کے دوران دھن اچانک کہیں غائب ہو گئی۔ لوگوں نے اوڑھوڑ دیکھا لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ عورتیں رفتے پٹنے لگیں۔ بڑوں نے جنگل کا کونا کونا چھان مارا۔ سواروں نے چاروں کھنٹ گھوڑے دوڑا دیے۔ راہ براہ ہر آدمی سے پوچھا مگر دھن کو جیسے زمین نے نکل لیا تھا کہیں ہر رخ نہ ملایا۔ ان لوگوں میں یہ بہت سی تھی کہ دھن کو لیے بغیر اپنے شہر چلے جائیں۔ غیرت اس بات کی امانت دیتی کہ دہلی کوٹ چلیں، اسی پریشانی میں چار شب روڑ روڑ گزر گئے۔ اس اثنا میں ایک مسافر آدھ آٹھلا اُس نے یہ باج رانا تو کہا: میں دہلی جا رہا ہوں۔ چند سوار میرے

روحِ تَدانی



اکثر میرے صبر سے دوسروں کی سازشیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اگر کینہ ساز کا یہاب بھی ہو گئے تو یہی شکست پر قابو اور صبر پر خروج نہیں کر سکتا۔ صبر تعقل کا نام نہیں ہے۔ کوشش پر چھوڑ دینا بہر سمجھانے کا نام نہیں ہے۔ کوشش زندگی اور تعقل موت ہے۔

ذاکر اشتیاق حضرت خدایتعالیٰ

مجھے عمر کے اوائل میں دوق کا عظیم ترین راز معلوم ہو گیا تھا کہ صبر و تحمل کے حصول کے لیے دوست مت بناؤ۔ غور عرض کی کبھی بیچ میں نہ آئے تو دوستوں کی مدد کو دیکھیں انھیں تکیل کا آلہ کار نہ بناؤ۔ کہہ کر لیے بائیس ہزار

کامیاب اور مطمئن زندگی کے لیے ایمان ایک ضروری جزو ہے۔ یہ ایمان خدا پر ہو، یا کسی مذہب پر ہو، یا کسی بلند نصب العین پر۔ اس کے بغیر کامیاب اور مطمئن زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔



حمید ذکھلا مونس

سے کہا میں تم پر روزِ بدلتاش سے عاشق ہوں اور ایک بن مجھ پر ایسا ہی عاشق ہے جیسے میں تم پر ہوں۔ اس جن کو جتن بڑھ گیا ہے کہ میں تم پر نفرت ہوں۔ آج وہ مغرب کے بعد یہاں آئے گا اور تمہیں مار ڈالے گا، طالب علم پھر تھر کا پتلا ہوا شاہ صاحب کے پاس آیا اور سب حال کہا۔ شاہ صاحب بولے: اچھا، اُس عورت سے کہہ دو کہ اب جاؤ۔ عورت چلی گئی۔ مغرب کے بعد کسی نادیدہ ہاتھ نے طالب علم کا گلا گھونٹا۔ شاہ صاحب نے اُٹھ کر اسے ایک طابچا مارا۔ وہ جھٹک ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی عورت ہنستی ہوئی آئی اور کہا: شاہ صاحب کے طابچے سے جن کی حالت ابتر ہے۔ شاہ دیاں بوند ہوئے، اس کے بعد وہ چل گئی۔ پندرہ بیس روز بعد بنی چھڑا اور طالب علم کا گلا گھونٹنے لگا۔ شاہ صاحب نے دو طابچے مزدار گردن پر زور دے مارے۔ وہ عورت چھڑائی اور خوش ہو کر لوہل کا طابچے کی ضرب سے جن کی گردن کٹ گئی ہے۔ طالب علم نے یہ کیفیت شاہ صاحب سے بیان کی۔ شاہ صاحب نے اس کی ہتھیلی پر اپنی دائیں انگلی سے کئی خط کھینچے اور مٹی بند کرادی پھر کہا: اس عورت کے سامنے جا کر مٹی کھول دو۔ طالب علم نے یہی کیا۔ عورت کہنے لگی: میں نے تو تمہیں کئی تکلیف دی تھی لیکن اگر تمہاری خوشی ہی ہے تو میں جاتی ہوں اب نہیں آؤں گی۔ تم مٹی بند کرلو۔ طالب علم نے مٹی بند کر لی۔ عورت چلی گئی اور پھر کبھی نہیں آئی۔

ایک دن دو جوانوں نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے کوئی مسئلہ

پیش کیا تھا۔ اب خبر ہے اپنے مشہر جاؤ۔ ایک رات شاہ عبدالعزیز کے پاس ایک شخص روانہ ہوا آیا اور بلا کہ حضرت! میں برباد ہو گیا۔ شاہ صاحب نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ وہ کہنے لگا: حضور! ابھی میری بوی لا پتہ ہو گئی ہے۔ شاہ صاحب نے اس سے کہا: اچھا نصف شب تک بیٹھ رہو۔ وہ بلہ ہمارا ایک طرف بیٹھ گیا۔ جب آدھی رات کا گرجا گھر شاہ صاحب کے ایک غلے کا نام لے کے کہا۔ وہاں رخصت مرد کی غسل جی ہوئی۔ اس میں چلے جاؤ۔ محفلِ رخصت ہو کر تو لوگ اپنے اپنے گھر ماہیں گئے سب کے بعد ناچنے والی طوائف اُٹھے گی اور ایک سیف اعلیٰ حوائف کا سامان سر پر اُٹھائے اس کے ساتھ ہو گیا۔ یہ رخصت میں نہیں لے رہا ہوں۔ اس ضعیف شخص کو بے دینا، فریادی نور ہنچا۔ محفل سے اخراج پر اس نے ضعیف شخص کو رخصت دیا۔ رخصت پڑھ کے وہ صاحب پہلے خفا ہوئے پھر رخصت اپنے سر پر ادب سے رکھا اور اس شخص سے کہا: وہ ڈھیکرے اُٹھا لا، اس نے حکم کی تعمیل کی انھوں نے دونوں شیکروں پر چند کیلیں کھینچیں اور کہا: انھیں کر بن پر ڈال۔ مجھے طرح طرح کی مخلوق دکھانی ہے گی۔ خوف مت کھاؤ۔ آخر اس ایک سخت نشین آدمی نے آگے یہ ٹھیکری دودر سے اُسے دکھانا۔ لہٰذا وہ صاحب طوائف کے پیچھے چلے گئے۔ اُس شخص نے جیسے ہی شیکروں پر زین پر ڈالیں اُسے طرح طرح کی مخلوق چلتی پھرتی نظر آنے لگی کسی کا چہرہ گتے جیسا لیکن جسم انسان کا تھا اور کسی کا ہوش انسان کا۔ بدن گھوڑے کا تھا۔ آخر میں ایک حسین و جمیل بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا آیا۔ اس شخص نے ٹھیکری اُٹھا کر اسے دکھائی۔ اس نے فوراً اسی مخلوق میں سے ایک کو بھیج کر اسے بلایا اور پوچھا: کیسے آنا ہوا؟ اس نے سب حال کہا۔ بادشاہ نے اپنے غلاموں سے پوچھا: دیکھو کوئی تنس غیر حاضر ہے؟ غلاموں نے بتایا کہ بخرو میں سرحد دیکھ لی، ہر ایک شخص غیر حاضر ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے فوراً حاضر کرو۔ دیکھنا حضور کیا گیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: اس شخص کی بوی کہاں ہے؟ اس نے کہا: حضور! ابھی پیش کرنا ہوں۔ اتنے میں اس طرف سے وہ عورت آئی اور سر پر سے لپٹ گئی پھر اسے لے کر گھر واپس آ گیا۔

ایک دفعہ شاہ صاحب مدد سے ہیں بیٹھے تھے۔ چند طلبہ بھی بیٹھے تھے۔ ایک طالب علم بہت عجیب و غریب بیٹھ گیا کہ ایک کونٹ سے اس کی کھٹکی بندھ گئی۔ شاہ صاحب نے دریافت کیا: کیا ہے؟ طالب علم نے بتایا کہ حضرت! اس نے ایک عورت کھڑی ہے اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے مکارہ ہی ہے۔ شاہ صاحب نے کہا: وہ دم سے اس کے پاس جا کر پوچھو کیا کہتی ہے؟ طالب علم گم گھبرا گیا کہ عورت نے اس

بیان کیا۔ شاہ صاحب نے اسے حل کر دیا۔ انھوں نے غرض ہو کر کہا۔
 ”آپ نے دوست فرمایا۔ شاہ صاحب نے پوچھا تم نے کیسے جاناک
 یہ جواب درست ہے، پہلے گئے۔ ہم نے یہ مسئلہ حضرت علی کی خدمت
 میں پیش کیا تھا۔ انھوں نے بھی یہی جواب دیا تھا جو آپ نے دیا ہے۔
 شاہ صاحب نے پوچھا۔ اس وقت تم لوگوں کی عمر کتنی تھی۔ انھوں نے
 کہا۔ پانچ سو برس۔ یہ بکر کوہ رخصت ہو گئے۔ بعد میں شاہ صاحب
 نے مریدوں کو بتایا کہ یہ دونوں جن تھے۔

شاہ صاحب جیسے کی نماز اکثر شاہ جہاں کی بڑائی ہوتی جامع
 مسجد میں ادا کرتے تھے۔ وہ جیسے ہی مسجد کے مشرقی دروازے سے
 داخل ہو کر صحن میں جاتے، انھوں پر عمامہ رکھ لیتے۔ ان کے سر پر شیخ
 فیض الدین نے ایک دن عین مسجد میں داخلے کے وقت پوچھا کہ
 ”حضرت! اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ عمامہ انھوں پر کیوں رکھ لیتے
 ہیں؟“ شاہ صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے عمامہ ناز کر
 ان کے سر پر رکھ دیا۔ وہ فوراً غصہ کھا کر گئے۔ انھیں بہت دیر بعد
 بخش آیا۔ شاہ صاحب نے ان سے پوچھا۔ میان فیض الدین!
 کیا دیکھا؟“ وہ بولے۔ حضور اکرم! مسجد میں اس وقت پانچ
 چھ ہزار آدمی جمع تھے۔ مشکل سے سوسوانو سئیں آدمیوں کی تھیں۔
 باقی سب رگیچہ، بندر، سور یا میٹھے لے کر تشکلیں تھیں، شاہ صاحب
 نے کہا۔ میں کس کس کی طرف دیکھوں۔ اسی باعث نہیں دیکھتا اور
 انھوں پر عمامہ رکھ لیتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک مجذوب کہیں سے دہلی آئے اور دریائے
 جمن کے کنارے بیٹھے۔ یہ شخص ان کے قریب جانا، اس سے وہ
 صرف چار پیسے مانگے۔ اس کے سوا کوئی بات نہ کرنے نہ کسی سے
 اپنا احوال کہنے۔ ایک دن خلاف معمول شاہ جو بہت دیر سے آٹھے
 اور چند مریدوں کے ہمراہ ان مجذوب سے ملاقات کے لیے گئے۔
 مجذوب شاہ جو کو دیکھتے ہی غصہ آٹھے اور دست ہوس کے بعد اب
 سے بیٹھ گئے۔ شاہ جو نے اپنے ہمراہیوں کو اگ کر دیا اور مجذوب سے
 ان کا حال پوچھا۔ مجذوب نے عجیب غریب حکایت سنائی کہ ہم
 دو دوست تھے۔ آپس میں نہایت محبت تھی۔ ہم بہت سے مکوں
 کی سیاحت کی۔ ایک مرتبہ میرا دوست بیمار ہو گیا اور ذات پال گیا۔ جب
 میں اسے دفن کرنے لگا، اس وقت ایک نہایت قیمتی کتاب میری کر
 بی ہنر تھی۔ کمال کا کہیں نے قریب رکھ دی اور وہیں بھول
 گیا۔ بھولت کے وقت میں بستر پر لیٹا تو مجھے وہ کتاب یاد آئی۔ میں
 اُسی وقت فرشان کیا اور دفتر کھدی کھار دیں رکھی تھی لیکن مرہ قبر
 میں نہیں تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ دفعہ مجھے ایک کھوش نظر آئی جس
 اندر گیا، وہ ایک پرفضا باغ تھا اور میرا دوست وہاں بیٹھا کلام مجید

کی تلاوت کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ
 باغ کی میر کرد۔ میں سر کرنے لگا۔ چوبیس گھنٹے باغ میں رہے۔
 آگ کے انور روشن دیکھا اور بہت بڑے بڑے کوکھاؤ پر چڑھے پائے۔
 لوگوں کو بکڑ پکڑا کر ان میں ڈالا ماریا تھا۔ ایک شخص نے بہت زور
 سے میرا ہاتھ جی پکڑا۔ میرے ہاتھ پر اب تک اس کی انگلیوں کے
 نشان موجود ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ تو نے مجھ سے ایک چیز چار پیسے
 کی مول لی تھی وہ پیسے دے۔ میں نے کہا، میرے پاس پیسے نہیں
 ہیں۔ یہ سبیش قیمت کتاب ہے۔ لو۔ اس نے جواب دیا کہ ملے کر میں
 کیا کروں گا؟ اتنے میں میرے مرحوم دوست مجھے تلامذ کرتے ہوئے
 وہاں اپنے آپ انھوں نے اس شخص سے کہا کہ یہ عیانی صاحب سے ہیں
 زندہ ہیں اور مجھ سے ملاقات کے لیے آگئے ہیں۔ غرض بڑی مشکل
 سے انھوں نے مجھے چھوڑا اور کہا کہ دوست! یہاں سے جلد نکل جاؤ
 ایسا نہ ہو کہ صور ہو چکے۔ دیا جائے اور قیامت آجائے۔ میں بڑی کڑک
 سے نکل کر قبرستان میں آیا تو دُشیا ہی بدل چکی تھی۔

میں کوئی نہی تمہیں میں گئی تھیں۔ اب وہ عاتریں بھی
 نہیں تھیں جو قبرستان سے باہر ہیں دیکھ گیا تھا۔ پھر میں شہر آیا تو آیا
 کے نقشے بھی بدل گئے تھے اور لوگوں کے لباس بھی بدلے۔ میرے ساتھ
 میں سخت بدعواس ہوا۔ مجھ پر ایسی وحشت طاری تھی کہ جو شخص سامنے
 پڑتا، اس سے چار پیسے مانگنے لگتا۔ شاہ صاحب نے پوچھا۔ وہ زمانہ
 کون سا تھا جب یہ واقعہ پیش آیا؟ عذوب نے جواب دیا کہ
 ”ہمایوں کا دور تھا۔ شاہ صاحب کے مرنے سے بے اعتدال رکھا اللہ کرے
 اور اب یہ کہ شاہ ثنائی کا دور ہے۔“ عذوب کو شاہ جو نے نہ پانی
 دم کر کے پلایا۔ مجذوب کی وحشت دور ہو گئی۔ شاہ جو نے انھیں اپنے
 ساتھ ہی لے آئے۔ مجذوب مرنے دم تک شاہ صاحب کے ساتھ رہے۔
 آذر بائی جان سے ایک شخص اپنے بیٹے سمیت پھر پناہ لیا
 دہلی آیا اور شاہ جو نے ملا۔ شاہ صاحب نے اسے اپنا حمان بنایا۔
 کئی روز قیام کرنے کے بعد جب وہ رخصت ہوئے لگا تو شاہ صاحب
 نے اس سے کہا کہ اگر آپ اپنے بیٹے کو کچھ عرصے کے لیے میرے پاس
 چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ حضرت! یہ اس کی
 عورتیں نصیبی ہوگی۔ وہ لڑکے کو چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکا شاہ جو سے
 مختلف معلم و مومن حامل کر کے فارغ التحصیل ہوا۔ ایک روز اس
 نے شاہ صاحب سے کہا۔ جناب! مجھے یہاں سے جانے کی اجازت
 دیجیے تاکہ کسی مرید کو نالائش کروں۔ آپ کے ہاں نہ کوئی بات نہ
 دیجیے۔ شاہ صاحب بولے۔ تم اچھا تم آٹھ روز تک سورہ انا فتحنا
 پڑھو، لوگوں دن جہاں جی چاہے پلے جانا۔ اس نے آٹھ روز تک
 سورہ پڑھ کر لوگوں دن جھل کر راستہ لیا، وہاں ایک بیٹریا اس کی
 سب تک



حیدر آباد دکن کے وزیر عظیم مراد صاحب کرشن پرشاد ہندوستان کے ممتاز فقہر مفتی غایت اللہ کے حجرے میں لکھے انھوں نے مفتی صاحب کو نظام دکن کی طرف سے ایک سرشار دیے ماہانہ قیام کے لیے ایک بڑی جلی اور دیگر مراعات کے ساتھ مفتی عظیم حیدر آباد کے عہدے کی پیش کش کی مفتی صاحب نے یہ کرشن اور مالی فوائد سے بھر پور عہدہ قبول کرنے سے فوراً معذرت کر لی کیونکہ وہ اپنی زندگی دینی علم کی ترویج میں صرف کرنا چاہتے تھے۔ مدرسے میں انھیں صرف پچیس روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔

سر شفع نے مولانا اعجاز علی کو پیغام بھیجا کہ "حضرت! آپ ادوئیل کالج میں صدر مدرس کی حیثیت سے شرفیلائیے۔ میں آپ کو ایک ہزار روپے تنخواہ دواہ کی پھیلیں، ایک کازینو جو کمر رعات بھی دوں گا۔" مولانا نے جواب میں لکھا "میں آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے دارالعلوم ندوۃ عرب تنخواہ ملتی ہے اسے ہی میں سے پیسے کھاتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے، بس اسی چکانی پر بیٹھا ہوں۔"

لوگ ایک کمال کے پیچھے ہوئے تھے، برابر خوشامد کرتے نہ رہے آخر مجبور ہو کر رفاقت سے نکلتے۔ یہ صاحب جو آتم زنجار کا کاشانہ کر لپیٹ گئے کسی طرح پینڈہ پڑھتے ہی نہیں تیرم کر نہیں، عبدالعزیز پرنسزنگاہ کے کے تھادی و درخواست قبول کی جاتی ہے آج رات کو میں اور میرے ساتھی خواجہ نظام الدین اولیا کے اس باغ میں جمع ہوں گے جو درگاہ کے دائیں جانب ہے۔ تم حضرت شاہ صاحب سے مجھ عاجز کو سلام کرو، عرض کر کے لوگوں کو کہنا کہ میں اسی خدمت کے لائق نہ تھا۔ بلال بس جو یہی نسبت اس قسم کا ارشاد ہوا تو حضرت کے ارشاد کی برکت سے میرے پیچھے عامل ہو گیا لیکن جب تک شاہ صاحب خود زحمت نہ کر بن گئے یہ کاما سے نہ آئے گے۔ لوگ رفاقت کو سلام کر کے واپس شاہ صاحب کے پاس آ گئے شاہ صاحب نے کہا: اگر نیچو پھٹے منعف اور بیماری کے باعث چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا لیکن جس طرح ممکن ہوگا، عشا کے بعد آپ حضرات کے ہوا چلے گا چنانچہ عشا کی نماز اور اواراد کے بعد شاہ صاحب رؤسا اور علما کی ایک سمر برآوردہ جماعت کے ساتھ وہاں گئے۔ یہ جو بڑے صاحب بھی باغ میں اپنے تمام ساتھیوں سمیت موجود تھے۔ شاہ صاحب کی برکت کے مطابق سب لوگ اب سے دو زانو بیٹھے خود شاہ صاحب اپنے پیچ میں چلے گئے یہاں تک کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی، یہاں تک کہ انھوں نے رات بے سمر خٹاکے کہا: لو صاحبو! یہ وقت اجابت ہے۔ سب شخص کی جوار ہڈ خود اسے مانگے۔ کوئی غروم نہ رہے گا۔ ”مناظرین نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ پس نے جو چاہا اٹھا۔ شاہ صاحب نے صرف بارش کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ان غنٹ بزرگوں اور

طوف لڑکا۔ لڑکے نے اپنے باپ کا دیا ہوا منجھ کر سے نکالا اور جھپٹ
پر حملہ کر دیا۔ جھپٹے کو کاری زدہ نگہ کیا۔ وہ غنیمت بھاگ گیا۔
لڑکا دواں سے چلتا ہوا ایک فریالہ سرزمین میں داخل ہوا۔ دواں کی
عازلیں عجیب اور نئی تھیں۔ باشندے خوب لڑاؤ و خوش وضع تھے۔
وہاں ایک بزرگ سے لڑکے کی ملاقات ہوئی۔ بزرگ اسے اصرار سے
اپنے گھر لے گئے اور اس کی بہت خاطر انوار وضع کی، عمدہ عمدہ کھانے
کھلائے۔ پھر وہ بزرگ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ لڑکے نے دیکھا کہ ایک
طاق میں وہی منجھوڑ ہے جو اس نے جھپٹے کو مارا تھا۔ لڑکے نے
ہرچہ کو کشش کی کہ منجھوڑوں سے اٹھائے منکر ناکام رہا۔ اتنے میں
صاحب خانہ آ گئے۔ نوجوان کی نظر منجھوڑ پر پڑی۔ صاحب خانہ پوچھنے
لگے کیا بات ہے؟ ”نوجوان نے جواب دیا کہ کچھ نہیں، کچھ نہیں اٹھلا
نے کہا۔ سنو نوجوان! ہم دو انسان ہیں نہ جن تو فرشتے ہماری خلقت
اللہ نے تخلیق کی ہے اور یہ شہر ہمارے رہنے کے لیے بنایا ہے۔
ہم سے وہ کام لے رہے ہیں جن کی تحقیقت کا حکم بھی اللہ ہی کر
ہے۔ پس جھپٹے کو منجھوڑا تھا، وہ ہم تھے۔ یہ کہہ کر انھوں
نے اپنا زخم دکھایا پھر لے لے ہم تعجب زندہ دھوڑتے ہیں لیکن شاہ
عبدالغزیز کے سبب جان بخشی کر دی۔ اب لو تو منجھوڑ کیا چاہتے ہو؟“
نوجوان نے لڑنے سے بچے کہا۔ پس یہ چاہتا ہوں کہ شاہ صاحب
کی خدمت میں پہنچ جاؤں، نیز ان سے کہا۔ اچھا انھیں بند کرو۔
نوجوان نے انھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے آواز آئی ”کھول دو۔“
اُس نے آنکھ کھول دی۔ اب وہ جامع مسجد شاہ جہاں آباد کے پاس
کھڑا تھا۔ وہ فوراً حاکم شاہ صاحب کے قتلوں پر گرا۔

ایک بار دہلی میں قوط کے آثار دکھائی دینے لگے۔ برسات کا پورا موسم گزر گیا مگر آسمان سے ایک بوند نہ پھیل، لوگ پریشان ہو کر شاہ عزیز کے پاس پہنچے کہ حضور را کوئی تدبیر کیجئے، شاہ عزیز نے اُن کی دُحار سے بندھائی اور کہا ”چند آدمی پُراے شہر جائیں، وہاں بھڑوں کا ایک گروہ لے گا۔ اُن میں سے جو بھڑا رقص کا لباس پہنواؤ وغیرہ پہنے ہوئے ہو، اسے اُگ لے جا کر فقیر کی طرف سے سلام کنا اور بارش کی درخواست کرنا“ چنانچہ چند آدمی اسی وقت پُراے شہر گئے۔ وہاں انھوں نے بھڑوں کے گروہ سے ملاقات کی اور شاہ عزیز کے جہانے ہوئے رقص کو اُگ لے جا کر تاج بایاں کیا۔ رقص ناایاں چمکار کر منہ پر لگا۔ اسے حاو بھی تم اور مختار بھیجئے والا دونوں حق ہیں، عبدالعزیز نے تم سے مذاق کیا ہے۔ بھلا میرا برکت سے کیا نفع ہے میں تو میری نئی گناہوں کی پُلوئی ہوں، جنم کا کس دہ چلو رات سے سے مٹوں، ہمیں اپنے دھندے پر جانا ہے۔ ارہ کوئی موتی ہے، غرض اس نے اس طرح کی بہمت سی ناہیں اڑاؤں لیکن یہ

اپنی جماعت سمیت آمین آہن کی سدا میں بلند کیں اور اٹھ کر اولاد انہماک
انما میں تفصیل کرنے اور تالیان پختہ رشتہ کار گانے لگے۔ ایک بیک
مغرب کی جانب سے آمدی اٹھی ساتھ ہی بادل کی گرج اور بجلی کا لڑکا
نٹائی دیا۔ لوگوں کے دل دل گئے پھوڑ پڑنے لگی۔ شاہ صاحب نے
دعا سے ہاتھ بچھ لیے۔ صاحبو! جلد میاں سے شہر کا راستہ رو رو نہ پھر
بارش کی شدت سے شہر پہنچا دشوار ہو گا۔ لوگ اٹھ کے بھاگے اور
شہر آکر پناہ لی۔ پھر تو اس قدر بارش ہوئی کہ الامان والہ غیظ۔

میرٹھ کا ایک رئیس نواب مہاراج علی خاں شاہ صاحب کا
مخلص رہے تھا۔ اس نے حالات غریبی میں شاہ صاحب کے
متعلق عجیب و غریب واقعات تحریر کیے ہیں۔ اس کی روایت ہے کہ
میرے زہرہ شاہ صاحب نے فرمایا پرانے شہر دلی میں ایک شخص
رہتا تھا وہ مر گیا۔ ایک نبی اس کی اولاد میں تھی کچھ عرصے بعد کسی
اور آدمی نے میرے والدے شخص کو خواب میں دیکھا کہ کہتا ہے میری
بیٹی سے کوئی داکہ لیے میرے واسطے کچھ خیرات کرے۔ صبح خواب
دیکھنے والے نے اس شخص کی بیٹی کا حال دریافت کیا معلوم ہوا وہ آوارہ ہو
کر طوائفوں میں شامل ہو گئی ہے لیکن شاہ جہاں آباد میں موجود ہے۔ یہ صاحب
پر تو پوچھتے پوچھتے گئے تو وہ کوٹھے پر بازار میں رہتی تھی شکر اس کے
دروازے پر قفل لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ دربار پر نمائندگی ہے یہ صاحب
دریائے جمنہ کے گھاٹ پر گئے۔ دیکھا کہ وہ کئی مردوں کے ساتھ مل کر
نہا رہی ہے اور خوش طبعی سے مردوں پر بار بار پانی پھیلاتی ہے۔
انھوں نے کہا ہے ہی سے اسے اس کے باپ کا بیٹا (دوبارہ لڑنے
سننے ہی چلوں میں پانی بھر کھینکا اور بولی ہے۔ یہ میں نے اللہ کے
واسطے دیا۔ یہ صاحب شرمندہ ہو کر چلے آئے۔ اسی رات انھوں نے
دوبارہ اس کے باپ کو خواب میں دیکھا اور اسے بتایا کہ تھادی
لو کی نو آوارہ ہو کر طوائفوں میں شامل ہو گئی اور اس نے پختہ لاہور
پاکو گھر سے دو لڑکے چلوں میں پانی بھر کر کنا سے پر کھینکا اور کہا کہ
یہ میں نے اللہ کے واسطے دیا۔ یہ سن کر میرے والدہ لکھنے لگے۔ شخص
جو پانی اس نے چلوں میں بھر کر کھینکا تھا، اس کا ایک فطرہ ایک
کیڑے کے منہ میں بھی پہنچا جو دریا کے کنارے کئی دن کا پیاسا تھا۔
محض اس ایک قطرے کے عوض مجھے پروردگار نے بڑے انعام
کیے۔ میں پختہ لاہور شکر گزار رہوں۔

”ایک آدمی دلی کا رہنے والا شاہی ملازموں میں تھا وہ نماز
افسرہ اور تباہ حال شاہ صاحب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میرے
باپ کی تنخواہ ایک سو تیس روپے تھی۔ انھوں نے وفات پائی۔
اب مجھے فائدہ شاہی سے صرف تیس روپے ملتے ہیں۔ عیال دار
ہوں، اس تنخواہ میں گراں نہیں ہوتا۔ دل چاہتا ہے کچھ کھا کر مر

جاؤں مگر سنا ہوں کہ خود کشتی حرام ہے اس لیے آپ سے عرض کرتا
ہوں کہ جیسا ارشاد عالی ہو یا عمل میں لاؤں۔ شاہ صاحب نے
اس کی داستان سن کر فرمایا میاں! کلام مجید میں خال دیکھو۔ اس
نے خال دیکھی اور شاہ صاحب کو قطع کیا حضرت نے کہا، اب تم
جنوب کی جانب روانہ ہو جاؤ، چودہ منزلیں طے کرنے کے بعد ملاؤں
کا ایک شہر کے گاؤں میں رک جاؤ۔ اگر دو مہینہ وقت کا فائدہ بھی ہو
جائے تو گھرا جائیں۔ پھر انشا اللہ تم بہت خوش ہو کر واپس آؤ گے۔

اس شخص نے آپ کے ارشاد پر عمل کیا۔ دو آدمی اپنے ساتھ لیے اور
گھوڑے پر سوار ہو کر جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ چودہ منزلیں طے کرنے
کے بعد ریاست ٹوبہ آئی جہاں نواب بہر خاں کی حکومت تھی۔
اتفاق سے ان تینوں مسافروں نے جس مسجد میں قیام کیا، وہیں نواب
صاحب نماز کے لیے آیا کرتے تھے ان کا قاعدہ تھا کہ نماز کے بعد
ہمیشہ مسافروں اور خاندانوں سے پوچھتے کہ کسی چیز کی ضرورت یا تکلیف
تو نہیں ہے۔ ان تینوں سے بھی وہ نابت تپاک سے پیش آئے
لیکن کھانے کو نہیں پوچھا۔ انھوں نے بھی عرض نہ کیا۔ یہاں تک کہ
کئی فائدے گزر گئے۔ ان دنوں نواب کی آنکھوں سے سختی ہوئی تھی
اور دوا دوا اور دوا سے اس سلسلے میں شوق ہوتے تھے۔ سب نے
یہ صلاح دی کہ صلح کے چلے جائے آنکھوں سے دوا کی ضرورت ہے۔ نواب
صاحب نے سب کی باتیں سن کر مٹا گا۔ اس شخص کو بلا ناچا ہیے جو
مسجد میں ہے اسی وقت ملازم دوڑے ہوئے گئے اور اسے اپنے
ساتھ لے کر نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔ نواب نے تعظیم
دی اور مشورہ طلب کیا۔ اس نے دلائل سے ثابت کیا کہ جنگ کے
بجائے اس موقع پر صلح و معافی بہتر ہے۔ اب سوال یہ اٹھا کہ صلح
کس کی سفارت کے ذریعے بھیجی جائے آخر قزاق خاں اسی دلی والے
کے نام نکلا۔ نواب صاحب نے پانچ سو روپے مہوار تنخواہ مقرر
کی اور سواری کے لیے باقی رعایت کیا پھر سفارت کی سربراہی
پر مقرر فرما کر جنرل آکٹر ٹی کے پاس دلی روانہ کیا۔ وہ شخص دلی پہنچ
کر پہلے شاہ صاحب کی خدمت ہوئی کے لیے آیا اور کئی اشتیافاں نذر
کیں اور عرض کیا کہ حضور نے جس طرح ارشاد کیا تھا، ویسا ہی ظہور
میں آیا جب وہ سلام کر کے رخصت ہوا تو شاہ صاحب سے پوچھا
کیا آپ نے اس شخص کے بارے میں کشف باطن سے فرمایا تھا؟
جواب دیا نہیں، جب اس نے کلام مجید سے خال نکال کر مجھے
اطلاع کی تو میں نے آیات کا سابق و سابق دیکھ کر اسے شوق دیا تھا۔
ایک روز شاہ صاحب نے اپنے مدرسے کے ایک طالب علم سے
کہا: میاں! آج تم خواجہ نظام الدین کے مزار پر جاؤ۔ وہاں تازہ
کر کے پیلے مغرب آؤ۔ اگر نا اس کے بعد دو رکعت نماز اور چڑھنا۔
سب ننگ

آپ کے بچے کی صحت اور سکون کے لئے ویٹا ملک ماں کے دودھ کے بعد بہترین انتخاب

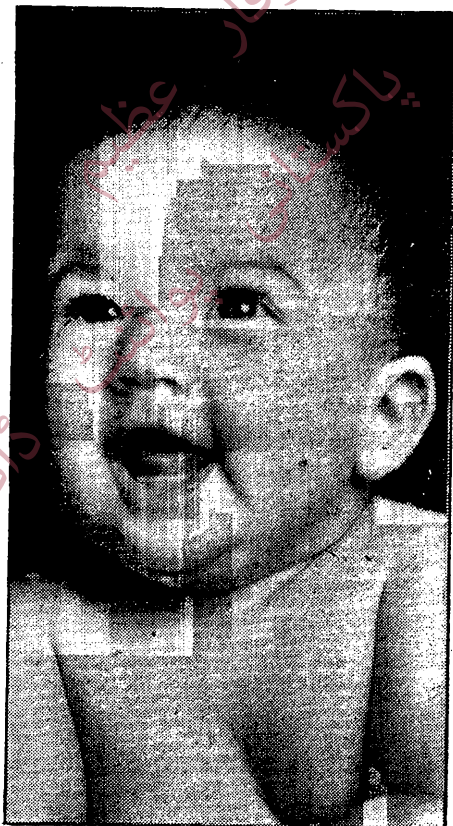
اگر بچہ کو ماں کا دودھ میسر نہ ہو یا اس میں کمی ہو جائے تو اس کا موزوں بدل ویٹا ملک دیکھئے جو مکمل غذائیت بخشنے ہے۔ آپ کے بچے کی صحت مند نشوونما کے لئے ویٹا ملک ضروری غذائی اجزاء بہتیا کرتا ہے ویٹا ملک میں ایک مخصوص کاربوہائیڈریٹ ہٹ مائلو ڈیکسٹریں شامل ہے جس سے بچے زیادہ دیر تک مطمئن اور آسودہ رہتے ہیں اور سکون سے سوتے ہیں۔ مائلو ڈیکسٹریں سے بچے کے جسم میں پانی کی کمی نہیں ہوتی اور بدہضمی کی شکایت کم ہوتی ہے۔ ویٹا ملک سب بچوں کے لئے موزوں ہے۔ بچے کا وزن کم ہو یا اس کی پیے دانتیں قبل از وقت ہوتی ہوں، ویٹا ملک مقررہ مقدار سے زیادہ پانی ملائے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویٹا ملک کے استعمال میں بھی سہولت ہے نلہل ہوجانے کی وجہ سے ایسی تیاری آسان ہے۔ ویٹا ملک آسانی دستیاب ہے بچے کی صحت اور سکون اس بات کی دلیل ہے کہ ویٹا ملک اس کو بہترین اور غذائیت بخش دودھ فراہم کرتا ہے

ویٹا ملک کی کتاب مفت حاصل کیجئے

"ویٹا ملک کی کتاب" بچے کی نگہداشت میں زہمائی کیلئے اردو میں دستیاب ہے۔ اپنے نام اور پتے کے ساتھ ایک روپے کے ٹکٹ 'خزوری محصول رجسٹرڈ ڈاک کیلئے' اس پتے پر بھیجئے۔ اور اپنے لفظی پروٹیا ملک" کیلئے پوسٹ آفس بکس ۴۶۷۴۳، کراچی-۲

ویٹا ملک

بچوں کے لئے
مکمل غذائیت بخش دودھ



GL-V-5-77

Asiatic

ایک بقی اُسے کی لیکن تم اپنی نماز پوری کرنا اور اُس کی طرف مطلق توجہ نہ کرنا۔ سلام پھیرنے کے بعد بعدی کو بچہ کو درجہ کرا اور اوپر سے بیس لپیٹ کر ہمارے پاس لے آنا۔ طالب علم نے اس ہدایت پر عمل کیا اور اپنی فرج کر کے لے آیا مگر جب بقی اُس نے شاہ صاحب کے سامنے پڑھے نکالی تو وہ تمام سونا تھی۔ دوسرے روز طالب علم نے پھر یہی کیا لیکن آج کچھ نہ ہوا۔

شاہ صاحب ایک دن حدیث کا درس دے رہے تھے رفتہ رفتہ ایک بزرگ آئے۔ شاہ صاحب نے اٹھکی سے انہی لپیٹ کی طرف اشارہ کیا کہ تو دھر ہے آئے۔ بزرگ نے تعجب سے کہہ دیا کہ جب درس تمام ہوا اور طلبہ چلے گئے تو شاہ عزیز بزرگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بزرگ نے کہا کہ رات خواب میں مجھے سورۃ کائنات کی زیارت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ سرور کائنات کے سامنے بیٹھے حدیث کی قرأت کر رہے ہیں۔ میں حاضر ہوا تو آپ نے اسی طرح اٹھکی سے اشارہ کر کے پس لپیٹ بیٹھے کا حکم دیا۔ اب جو میں آیا تو بھی ایسا ہی ہوا۔ اس میں کیا حید ہے؟ شاہ صاحب نے مسکرا کر کہا۔ آپ حقیقت پر پڑے ہیں اور آپ کے منہ سے تمہارے کوئی کوا آتی ہے۔ یہ نبی رسول اللہ کو سخت نا پسند ہے اس لیے فیقر نے آپ کو لپیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اُس دن سے بزرگ نے حقیقت ترک کر دیا۔

مفتی الہی بخش کا دھولی شاہ عزیز کے شاگرد و شاگرد تھے ایک دن انھیں خیال آیا کہ مولانا رحم نے اپنی شادی کا آخری دفتر ناما چھوڑ دیا تھا کہ میرے بعد ایک شخص پیدا ہوگا، وہ اسے پورا کرے گا کہ میں سو برس گزر گئے کسی کو شادی کی تکمیل کرنے کی توفیق نہ ہوئی کیا یہ اچھا ہو جو اسے تکمیل تک پہنچانے کی سعادت سیر حصے میں آئے۔ انھوں نے شاہ عزیز کو ایک عرفیہ لکھا کہ اگر آپ

کی اجازت ہو تو فتویٰ شرع کروں؟ شاہ عزیز نے جواب میں قرآن کی دو آیتیں لکھ کر مفتی صاحب کو بھیجیں کہ عشا کی نماز کے بعد یہ آیتیں پڑھ کر سو رہو خواب میں مولانا رحم کی زیارت ہوگی انھی کے سامنے اپنی درخواست پیش کرنا۔ مفتی صاحب نے اس پر عمل کیا۔ رات کو خواب میں انھوں نے مولانا رحم کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ہاں! شخص مفتی ہو جو فتویٰ تمام کرے گا۔ عشاء و مغرب کے درمیان قلم و رات لے کر اپنے حجرے میں بیٹھا کرو۔ باقی ماندہ تقصیر خود بخود قلم سے لکھ جائے گا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے فتویٰ کاسا نواں دفتر لکھا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس میں اور مولانا رحم کی فتویٰ کے چھ دفتر ہیں کوئی فرق نہیں ہے۔

مولوی خدائیش دہلوی کو بھی گرام کی جہی معراج میں شبہ تھا۔ شاہ صاحب نے ایک دن ان سے کہا۔ میان خدا بخش! آج رات سوتے

وقت ایک منتر یہ آیت اکرسی پڑھ لینا۔ مولوی خدائیش رات کو منتر لکھی پڑھ کر سوئے خواب میں انھوں نے آسمانوں اور زمین کے درمیان کی سیر کی۔ صبح اٹھتے ہی وہ شاہ صاحب کے پاس آئے اور خواب بیان کرنے کا ارادہ کیا مگر شاہ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ بل کوش رہو۔ بیڑ لڑھیں میں نے اس لیے بتایا تھا کہ تشنید کے بعد ماندہ دیدہ

ایک دن شاہ صاحب نے لوگوں سے کہا کہ ایک رات ہمیں عالم روایا میں حضرت علی کی زیارت ہوئی۔ ہم نے اُن سے بیعت کی درخواست کی۔ انھوں نے ہمیں بیعت سے مشرف فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ عبدالعزیز، فلاں شخص نے پشتونان میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں ہماری مذمت کی گئی ہے۔ ہم نے عرض کیا حضور! میں پشتون نہیں جانتا۔ امیر المومنین نے فرمایا! کچھ مذاقت تیں۔ ہم خواب سے بیدار ہوئے۔ خاص تلاش کے بعد وہ کتاب ہمیں دست یاب ہوئی اور ہم نے پتہ نہیں اس کا جواب لکھ کر شائع کیا۔

مشہور ہے کہ ایک آنکھیز پادری دلی آیا۔ وہ بڑا چرب زبان اور تسنن تھا۔ اس نے مٹکات صاحب ایچٹ گورنر جنرل سے کہا کہ مجھے شاہ عبدالعزیز سے مباہلے کی خواہش ہے صرف ایک سال کا جواب اُن سے چاہتا ہوں۔ مٹکات اُسے لے کر شاہ صاحب کے پاس آیا۔ پادری نے شاہ صاحب سے کہا کہ میں ایک سوال کرتا ہوں اور اس کا جواب عقلی علوم سے چاہتا ہوں۔ نقل سے نہیں شاہ صاحب نے کہا۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟ پادری بولا۔ کیا آپ کے پیغمبر خدا کے حبیب ہیں؟ شاہ عزیز نے جواب دیا۔ ہاں۔ پادری نے کہا۔ کہ بلا میں جب دشمنوں نے امام حسین کو شہید کیا تو آپ کے پیغمبر نے فرما دیا کہ تمہی محکمہ نہیں ہوا۔ امام کا حبیب کا محبوب تو حبیب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے؟ شاہ صاحب نے فوراً کہا۔ جناب! ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ یہ جواب دہا تھا کہ تم اپنے زوالے کا ردنا دیتے ہو، یہاں لوگوں نے ہمارے پیارے بیٹے کو سولی پر لٹکا دیا اور تم کچھ نہ کر سکتے۔

اُس زمانے میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے انگلستان سے بے شمار پادری ہندوستان آ رہے تھے۔ وہ شہر کے کلی کو چلے اور چاروں طرف پر تبلیغ کی غفیلں سجاتے۔ یہ پادری نہ صرف اردو بلکہ عربی فارسی میں بھی کمال دست گاہ رکھتے تھے۔ شاہ صاحب ایک روز جامع مسجد میں وعظ کر رہے تھے۔ ایک آنکھیز پادری نے وہاں آکر کہا۔ تہا صاحب! میرے ایک سوال کا جواب عایت فرمائیے۔ شاہ صاحب وعظ روک کر بولے۔ کہو کیا سوال ہے؟ پادری نے یہ شعر پڑھا ہے کہے جگت کر عیسیٰ ز مصطفیٰ اعلاست کہ ایں بزرگ ز میں است و ایں با نوح ساست

شعر پڑھ کر یاد دہی نے کہا: اس شعر سے حضرت علیؑ علیہ السلام کا بلند مرتبہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آسمان پر ہیں اور آپ کمزری زمین پر۔

اد صاحب نے شعر ہی میں اس کا جواب دیا ہے

بگفتش که نه این مُجَنَّت قوی باشد

جہاب بر سر آب و گہر تہہ دریا ست

شعری تشبیہ کرتے ہوئے شاہ عزیز بولے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ عالم بالا میں ایک جیلے کے مانند ہیں اور ہمارا بنی حضرت محمدؐ ایک نایاب گوہر کی مثل ہیں جو دریا کی تہ میں تپتا ہے۔ کسی دروازہ پر انگریز نے شاہ صاحب سے سوال کیا: آپ جتنے ہیں کوئی چیز ایسی نہیں جو ہمارے قرآن میں نہ ہو، کیا یہ صحیح ہے؟“ شاہ صاحب نے کہا: یوں بالکل صحیح ہے۔ اس نے پوچھا: ”اچھا، کیسی کائنات بھی قرآن میں ہے؟“ شاہ صاحب نے مانجے کا ایک ٹکڑا منگوایا اور ایک آیت پڑھ کر اس پر دم کیا۔ اسی لمحے تانے کی زنجت بدلی اور وہ کندن کی طرح دکھنے لگا۔ اُسے سوچتی پرکھا گیا تو وہ کھرا سونا نکلا۔ انگریز نے سوال کیا: کوئی دوسرا شخص یہی آیت پڑھ کر سونا بنا سکتا ہے یا نہیں؟“ شاہ صاحب نے جواب دیا: ضرور بنا سکتا ہے۔ ضرورت صرف زبان میں تاثیر کی ہے اور یہ تاثیر ہر شخص کی زبان میں نہیں پڑتی۔“

دلی کے ایک شہدے نے ایک درشاہ عزیز سے کہا: چاہا! آپ ہر شخص کے سوال کا جواب دیتے ہیں، میرے سوال کا جواب بھی عنایت میں، شاہ صاحب نے کہا: کنو کیا سوال ہے؟ وہ کہنے لگا: ہم لوگ جاڑے میں گولیاں پھیلنے ہیں اور اس موسم کے سوداؤں کے موسم میں ہیں عوام افس نہیں ہوتی اس کا کیا سبب ہے؟ شاہ صاحب نے کہا: میاں! اس کے دو اسباب ہیں، ایک سبب تو تمہیں معلوم ہے، وہ یہ کہ لڑیوں کا کھیل دوسرے کھیلوں جیسا نہیں کہ مکان میں بیٹھ کر کھیل لیا جائے، جس طرح گھنٹہ یا شطرنج پھیلنے ہیں، اس کے لیے تو میلان کی ضرورت ہے لیکن میدان میں دو چوپ اور بادش کے موسم میں کھلنا دشوار ہے۔ دوسرا سبب تمہیں نہیں معلوم، وہیں معلوم ہے وہ یہ کہ گولی پھیلنے سے مقصود نشان اڑانا ہے جو شہنشاہ جیتنے پر موقوف ہے اور شہنشاہ جتنا انجاء دعوں سے تعلق رکھتا ہے اور انجاء دعوں جابو لوں میں ہوتا ہے۔ حاضرین نہایت محظوظ ہوئے۔

مجلس میں ایک "زندہ پاک باز" بھی بیٹھتے تھے۔ وہ بولے۔

حضرت! ہم بھی ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں؟ کئی مولویوں سے پوچھ چکے ہیں، کوئی جواب نہیں دیتا، سب اغلیں جھانک جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کہاتے ہیں: ابراہیم کسانسہدہ جس کا جواب دینے سے مولوی عاجز رہیں؟ انھوں نے کہا: صاحب! یہ شرط انہیں

سب سے

رُقی ہیں ان کے جنازے کی نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟ شاہ صاحب مٹس پیسے، انھوں نے اپنی طرف سے سوال کیا یہ مٹاؤ کہ جو مردان طواف اقصیٰ کے آستانہ ہیں، تم ان کے جنازے کی نماز پڑھتے ہو یا نہیں؟ ”انھوں نے انکار کیا کہ جی ہاں پڑھتے ہیں۔ شاہ صاحب بولے ”تو یہ طواف اقصیٰ کا جنازہ پڑھنے میں کما حقہ ہے؟“

جہنے میں دوزخ میں مبتلا اور جہنم کے دل کو چیلان میں شاہ صاحب کا وعظ تھا۔ ہر فریب و ملک کا آدمی خوش ہو کر کھڑا تھا، اُن کی کوئی بات کسی کو لگوں نہ لگتی تھی، قہر و آواز قریب بیٹھے ہوئے لوگوں تک پہنچتی، اسی قدر دُور بیٹھے ہوئے لوگ سُننے جتنا وعظ کوئی عالم و فاضل سمجھتا، اتنا ہی جاہل کی سمجھ میں بھی آتا۔ شاہ صاحب مرتے دم تک وعظ کرتے تھے، مرض الموت میں بھی یہ وضع جاری۔ انتقال سے چند روز پہلے مرض کی شدت تھی۔ وعظ کا دل آباشاہ صاحب نے کہا: مجھے پڑے رہے ہیں جب میں بیان کر لے لوں تب چھوڑ دینا۔ لوگوں نے یہی کہا تھا۔ شاہ صاحب کامل دو گھنٹے پوری قوت سے وعظ کرتے رہے۔ انھوں نے لوگوں کے سوالات کے جواب بھی فی البدیہہ دیے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ ملا میں حبیب امام حسین اور یزید کا مقابلہ تھا تو خدا کس طرف تھا؟ شاہ صاحب نے جواب دیا: ”یزیدان عمل پر اسی لیے تو امام حسین کا صبر و قربانیہ کے ظلم پر غالب آیا۔“ آخری وعظ کے آخر میں انھوں نے چند اشعار عربی کے پڑھے: چند فارسی کے پھر گھر چلے گئے۔ گھر میں عزیز و اقارب کو جمع کر کے انھوں نے لکھا کہ میری ملکیت میں جس قدر نقد اور اسباب ہے سب ایک جگہ جمع کرو۔ سب کچھ ایک جگہ اکٹھا کیا۔ انھوں نے سارا سامان اچھے ماتھے سے لوگوں میں تقسیم کر دیا پھر وصیت کی کہ میرے کفن اسی پڑے کا ہو جو میں پہنا ہوں۔ وہ ہمیشہ دھوڑتا کرتا اور گاڑے کا باجیہ پہنتے تھے۔ انھوں نے یہ بابت بھی کہ میرے تجسّ و کفن کے بعد جب جنازہ تیار ہو تو نہایت وقار کے ساتھ لے جایا جائے اور شہر کے باہر صحرا میں جتانے کی نماز ادا کی جائے۔ بادشاہ مرے جنازے پر نہ آنے۔“

یہ باتیں جسے کہ وہ ذکر میں مشغول ہو گئے، اسی حالت میں اُن کی طرح ہمارے ہاں کر رہی اُن کی تکلیفیں و ذمہ داریوں کے مطابق عمل میں آتی ہیں۔ مگر جہاز کے کمانڈر پر بھی کئی شخص کی آنکھیں لٹکتی ہیں۔ صحیح مومن خاں مومن نے اُن کی یہ تاریخ و ذات کسی جہی سے

دستِ بیدارِ اجل سے بے سرو پا ہو گئے
فقر و دی، فضل و مہر، لطف و کرم، علم و عمل

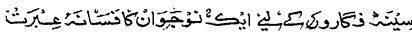
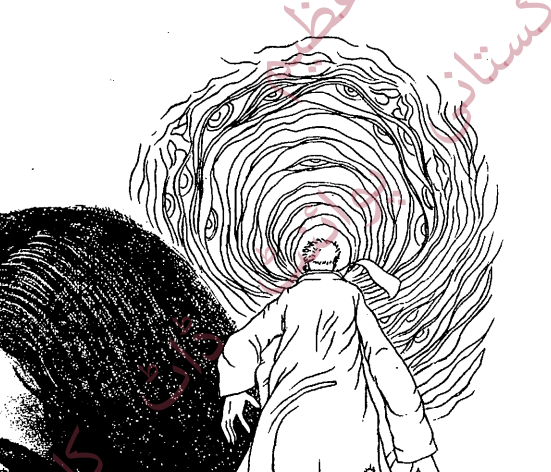
51439

51229





A black and white illustration. In the foreground, a close-up of a man's face. He has dark, curly hair, a thick beard, and a mustache. A cigarette is held in his mouth. He is looking upwards and to the right. He wears a dark shirt and a light-colored scarf or bandana around his neck. In the background, to the left, there is a scene of people in a mountainous area. Some people are standing, some are sitting. There are some structures or tents in the background. The style is a detailed line drawing or woodcut.

[illegible]

[illegible]

یادوں کی آڑ میں ہوتے ہی ہم نے نچنے نکال لیے تھے اور ان کے لاندھوں پر بندوبستیں لگ رہی تھیں، انھوں نے چشم زدن میں انھیں اُتار کے اپنے ہاتھوں پر اُٹھالیا تھا مگر وہ کسی ایک جانب بیٹھ گئے۔ دوسری کے اوپر پہاڑوں کی اونچی نیچی دیواروں پر نظر نہ رہا ہر جگہ وہ موجود تھے۔ ان کی تعداد سو سو ساوے کے قریب ہو گئی تھیں کہ کھڑے ہو جانے کے باوجود کوئی تیر نہیں چلا۔ چند لمحوں تک ہم نے انتظار کیا پھر بائیں کی غیر محفوظ اڈ سے نکل کے ان کے سامنے ہو گئے۔ ان کی آواز میں ایک دم بند ہو گئی تھیں لیکن ان کی کامیابی گھنٹی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں نیزے تھے۔ فاصلہ باز وہ تھا اور ہم ان کی شکلیں واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جھلنے فوراً ہاتھ اٹھا کے ہمیں ہندوؤں نے چلانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے بولا۔

”جانے پہلے نہ دیکھتے ہیں“

سب کی نظر سلطان اور تاشان پر آگے تر گئیں۔ براتی بن استاد اپنے سلطانے شاہ کو بدعنوانی سے اُٹے ہیں، جانے زہر خندے کہاں سمجھانے کو نہیں پہچانتے۔

”ہیں، ہیں، سلطان نے تاشان کو کھینچ کے اپنے بازو سے چرچکایا۔ اس نے انھیں نہیں بتایا۔ یہ نہیں بتا سکتی، وہ ہائی انداز میں بولا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ماں تم یہ...“ جھل گھورتے دیکھ کر اس کی آواز لڑکھڑائی۔

”میں پہے ہو اُستاد!“

”جامو! جھل نے درختی سے کہا۔ کھینچ کے رکھ“

”وہ نیچے اُتر لے رہے ہیں“ اچانک بلا کو بچنی ہوئی آواز میں بولا۔ جھل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ نیزے اور کہاں تانے پڑے وہ چند قدم اور آگے آگئے تھے۔ ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک کوشش کی جا سکتی تھی کہ ادھر ادھر چھٹ کے ہمارے گرد کی جٹانوں، مھاڑوں یا بدنصیبوں کی آڑ میں لیں، اس طرح نشانہ لینے میں کچھ آسانی ہو جاتی مگر ان کی آنکھوں میں دھول جھوک کر سیاہی کرنا ناممکن تھا۔ شاید سب نے جان لیا تھا کہ اب کوئی اور کوشش بے سود ہے۔ سو ہم لڑی طرح تیار تھے۔ اتنے فاصلے پر نہجوں اور بند قلوں کے صحیح نشانوں کا کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ انھیں آگے آنا چاہیے تھا اور ہمیں اس وقت تک کوئی گولی ضائع نہیں کرنی چاہیے تھی جب تک وہ خود پہل نہ کریں۔ پہل کرنے کی صورت میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم فاصلہ نشانے کی پردا کیے بغیر فکرنا شروع کر دیں اور اس کو قریب جو جگہ ملے وہ وہیں چھپ جائے۔ ان کی تعداد دس گنی کے گگ بجگ ہو گئی تھی وہ

سب گم

قبائلی تفریق نہیں تھے جو پہاڑوں پر تافلوں کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ وہ ہر سنے تو اتنا انتظار نہ کرتے، نہ ایک تیر چلا کے دوسرے چلانے میں دیر کرنے۔ سبھی کو یہ نعتیں کرنے کی جستجو تھی کہ وہ کون لگے ہیں۔ اور کیوں اس طرح چاروں سمت سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ دروہنگ بستی کے نزدیک جہاں سولہ مارٹی، جینی پلو اور زور نے ہم سے پہلے پہنچ کے پڑاؤ کیا تھا، وہاں سے ہمیں چلے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ آٹھی کے روکے ہوئے قلعے کے ساتھ تھے۔ جہاں تک بن پڑا، شام کو ادھر لگا ہونے کے بعد بھی ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ رات کو جتنا مشکل تھا وہ نہ کسی جگہ نہ پھرتے سب کا مقصد یہی تھا کہ جلد سے جلد دروہنگ بستی سے دُور ہو جائیں تاکہ ہمیں کسی قلعے سے ہماری مدد بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہم نے اپنے قلعے کی کوئی آمیت محسوس کی تھی۔ قلعے کی پرتلے نہیں تھے۔ دروہنگ بستی سے نکل کے سولہ نے آگے دو منزلوں پر انھیں تبدیل کیا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق کسی جگہ انھیں مشکل نگاہوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سولہ، مارٹی، جینی، پلو کو سفر کے لیے ضروری اسباب سمیت ہم نے دس دن پہلے رخصت کیا تھا۔ ان کے جانے کے بہن بن بعد باقی ہم سب بستی سے اچانک غائب ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے ہمارے پیچھے ادھر ادھر اپنے آدمی دوڑائے ہوں لیکن ہم بستی سے کہیں اور گئے ہی نہیں تھے۔ ہمیں بل جاتے۔ ہم بستی میں چند میل اوپر ہی مدرس کے علاقے میں واقع قدیم مندر کے تہ خانے میں مسلسل چار دن تک چھپے رہے تھے۔ تہ خانے سے دوبارہ برآمد ہوتے وقت ہر سو لگا کر اندھیرا مندر تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ہماری کنگن بل گئی تھی مگر وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دوسرے روز انھیں ان کے اکڑے ہوئے جسم ہی ملے ہوں گے۔

گویا بستی کے لوگوں کی نظر میں ہمیں وہاں سے چلے ہوئے مدت دن ہو گئے تھے۔ یہ عرصہ ہمارے دُور مکمل جانے کے لیے کافی تھا۔ اب انھیں ہماری امید ترک کر دینی چاہیے تھی لیکن وہ پھر ہمارے سامنے موجود تھے۔ وہ نہیں تھے تو پھر اور کون لگے تھے۔ اگر تاشان نے اپنے باپ ہی دسا کو بتا دیا تھا کہ سلطان نے چار دن بعد اس بستی کی سرحدوں پر مقدس جگہ ڈاکے علاقے میں ملنے کو کہا ہے تو انھوں نے مزید دو دن کیوں توقف کیا۔ جہاں تاشان ہمیں ملے تھے، وہیں وہ ہمارے راستے کی دیوار کیوں نہ بن گئے۔ اور انھوں نے تاشان کو ہمارے ہاتھوں میں کیوں چلنے دیا۔ سولہ مارٹی وغیرہ کو دوبارہ ہمارے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد

انھیں پھر کس کا انتظار تھا۔ بستی کے قریب ہی انھوں نے ہمارے اطراف اس طرح اپنے آدمیوں کو نہیں کھڑے کر دیے۔ جاموکی طرح سبھی کو انھیں دیکھ کے فوراً ہی گمان ہوا تھا کہ تشاف نے انھیں ہماری خبر دی ہوگی لیکن جلد ہی سب کو احساس ہو گیا کہ یہ محض ہنگامی ہے، ایک بے جواز شہر ہے۔ تشاف دودن سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ سب اس کی باتیں اس کا چہرہ جیسے بھول گئے تھے۔ اس کے چہرے پر پھولوں کی سی معصومیت اور اس کی باتوں میں بچوں کی سی ساوگی تھی۔ جب کوئی اس کے سامنے سلطان کا نام لے کے چھیڑتا تو وہ بری طرح شرما جاتی دو دن سے بھی اسے چھوٹے سے تھے۔ جب اس نے پہلی بار ہمارے سامنے اپنی ٹوٹی چھوٹی ہندوستانی میں بات کی تو سب کو حیرت ہوئی حالانکہ سبھی کو معلوم تھا کہ وہ سلطان سے اسی زبان میں بات کرتی ہوگی۔ کورا کو بھی ایسی ہی ٹوٹی چھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ کورا کے مانند سورج سورج کے کوشش کر کر کے لڑنا، پلنگ پٹ پٹانا، کوئی لفظ سمجھ میں نہ آنے پر گھبرانا، بے جا رنگ سے سر کرنا اور شرانہ ابا جان کو بھی اسے دیکھ کے کورا کی یاد آگئی ہوگی۔ سلطان نے اسے اشارہ کیا ہوگا جیسی وہ زیادہ تر ابا جان کے ساتھ رہتی تھی، ان کے پہلو پہلو دودن سے وہی ہمارے لیے شکار کیے ہوئے گوشت کا کھانا پکا رہی تھی۔ تشاف اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو کر آئی تھی جیسے کورا ایک رات ہمارے گھر آئی تھی۔ ابا جان نے نہیں سمجھا کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی، وہ تو ان کی بیٹی بننے کے لیے آئی ہے۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو وہ ان کی اپنی بیویوں سے زیادہ ان کی خدمت کرتی۔

کمان اور نیزوں سے مسلح ان لوگوں کو کسی اور ذیلیہ سے خبر ہوئی تھی۔ سولم کے ساتھ آنے والے قلبوں کو ہماری منزل کا پتہ نہیں تھا کیونکہ قتل کی ہدایت کے مطابق دوسری منزل پر انھیں بدلتے ہوئے سولم نے ان سے ہندوستان کی طرف جانے کے لیے طے کیا تھا لیکن کچھ دودا کے اس نے انھیں جاگمگ قبیلہ کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ سفر کی اس اچانک تبدیلی سے ہی مراد تھی کہ نئی چلتے وقت اپنی بستی کے لوگوں کو سولم کی منزل کی غلط نشان دہی کر کے آئیں۔ بس ایک ہی بات ممکن تھی کہ بڑے مندر کے تہ خانے سے ہمارے منگنے کے دوسرے دن جب انھیں وہاں موجود پھرے دار نظر نہیں آئے ہوں گے تو انھوں نے ان کی تلاش کی ہوگی اور بڑے مندر کے نشیب میں ان کی لاشیں پڑی ہوئی مل گئی ہوں گی۔ لاشیں بال نہیں کھسکتی تھیں لیکن ان کی ناقصتی صاف

غمازی کرتی ہوگی کہ ہم گوشت رات یہاں موجود تھے۔ ہمارے سوا ان کی موت کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا چنانچہ انھوں نے ہمارا پیچھا کرنے کے بجائے میدھے ہندوستان کے راستے کی سمت کوچ کیا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان راستے ہم سے بہتر جانتے تھے اور گھوم کے ہم سے پہلے ہماری منزل پر پہنچ سکتے تھے۔

قہقہے نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن ہم سب نے خود ہی اپنی اپنی جگہیں منتخب کر لی تھیں۔ اگر وہ وادی کے اطراف پہاڑوں پر ایک دائرے کی صورت میں بٹھتے ہوئے ہمارے گرد گھیرا ہنگ کر رہے تھے تو ہمارے منہجوں اور بندو قوں کا رخ بھی ان کی جانب تھا۔ پرو کا رخ کسی اور سمت تھا تو زورا کا کسی اور سمت۔ ہر ایک کی نگاہ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور سب نے غیر ارادی طور پر سمتیں اپنی اپنی جگہوں کے حصے میں تقسیم کر لی تھیں۔ ابا جان تشاف اور قلی درمیان میں تھے اور ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ قہقہے نے بھی اپنے کندھے پر ہتھیار ہوئی بندو قی ابھی تک نہیں اتار دی تھی اور اپنا منہ جیب سے باہر نکالا تھا۔ وادی کے نشیب کی زمین سطحیں تھیں۔ درمیان میں ایک تیز ندی گزرتی تھی جس کے کناروں کی زمین کہیں کہیں اتنی اوپر اٹھی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹی سی بن جاتی تھی۔ ہم نے فائدہ اٹھانے کے لیے ندی کے کنارے کنا سے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ نظر بھی بہت دل کش تھا۔ دھوپ نکل رہی تھی اور ندی کا چاندی جیسا پانی شلوار چاڑھا تھا۔ اسی شور کے سبب ہمیں اپنے پیچھے ان کی نقل حرکت کا پتہ نہیں چلا۔ ہمارے وادی میں اترنے سے پہلے وہ اوپر کسی ایک سمت چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم نے وادی میں اترنا شروع کیا، وہ اطراف کے پہاڑوں پر پھیلنے لگے اور انھوں نے اس وقت پہلا تیز چھپکا اور صدائیں بلند کر کے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ جب ہم وادی کے مین بجھیں پہنچ گئے۔ منصوبہ اس مقام پر جہاں نشیب گرا تھا اور ہمارے فوارا کا امکان اور مقاموں کی نسبت ہم ہوجاتا تھا۔ وہ ایک گھاٹی کی شکل کا راستہ تھا مگر ندی کے دونوں طرف اٹھی ہوئی زمین ڈھلوان تھی۔ اسی ڈھلوان کی وجہ سے ہم اوپر چاڑھوں طرف دیکھنے پر قادر تھے اور وہاں دیکھ سکتے تھے۔ وادی میں کسی جگہ ندی کے دونوں کناروں پر اٹھی ہوئی زمین غروی ہوئی تو یہاں کے بجائے وہ اسی جگہ کا انتخاب کرتے مگر ایسا توئی تھا وادی میں شاید کہیں نہیں تھا۔ نشیب کا یہ گھاٹی ماحقہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ انھیں درمیانی دیر ہوجاتی تو ہم آگے نکل چکے ہوتے۔ سب کو چند لمحوں اور چند منٹوں کے اسی ایک موقع کی تلاش تھی۔

ہوں کے مانند گنگ کھڑے تھل کی طرف سے کسی اٹالے
نہ نہ تھے۔ تھل تھلی کوئی اشارہ کرتا جب اسے کسی لمحے کوئی
حالت اپنکناٹش نظر آتی۔ ہمارے کسی بھی غلط فیصلے کی تلافی ممکن
ہیں ہی۔ تھل سر جھانے کھڑے کھڑے انھیں دیکھتا رہا۔

ایک ایک ماسٹر مانی کی گھٹی ہوئی چیخ پر سب اس کی طرف
دوڑ گئے۔ مانی اباجان کو روک رہا تھا جو ہم سے کچھ کے بغیر
اباجان درمیان سے نکل کے قریب کے ایک نیلے کی طرف بڑھ
گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اباجان کا یہ اعلان انا
پر ذوق اور ناقابلِ فہم تھا کہ سب ایک لحظے کے لیے جیسے اپنے
محاسن کھو بیٹھے۔ جامو سلطان اور اس نے انھیں روکنے کے لیے
ایک وقت بھاگنے کا ارادہ کیا مگر تھل کی آواز نے ہمارے قدم
سدا کر دیے۔ اباجان کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ ہم سے کچھ دور
ایک نیلے پر پہنچ کے وہ پھیر گئے۔ میرا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔
اوپر ہمارے آنکھوں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور ہاڈوں
ت اترنے ہوئے لوگوں سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہنا چاہا اور
ہیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ ان کے اشاروں کے جواب میں
وہ لوگ رُک گئے ہیں۔ جب آنکھوں نے اپنے سر جھکا کے ابا
جان کو تقسیم دی تو ہم سب کی سمجھ میں آیا کہ ابا
جان نے یوں آگے بڑھ جانے کی جرأت کس اختیار میں کی ہے۔
وہ جھکڑوں کے لباس میں تھے۔ اپنے مخصوص جلیے کے سبب دور
ہی سے وہ ہم میں سب سے الگ نظر آتے تھے۔ کھڑے کھڑے
ہیں ہانپنے لگا تھا جامو نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "لاڈلے! وہ آہستگی
سے بولا نہ نظر کو کسی بھی رکھنا۔"

"جامو بھائی! میری آواز ملنے میں گھٹ کر رہ گئی۔
"لاڈلے جانی! اس نے میرے بازو میں اپنی انگلیاں گڑو
دیں۔ کبھی تو نے یہ نہیں پوچھا کہ تیرے جامو بھائی نے کسی کاٹی بھیا
میں نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ جامو اپنی آنکھیں چھپانے
لگا۔ اس کے مونچوں پر لڑکتی ہوئی سکرابٹ زھنساں تھی۔ میرا جی چاہا
کہ اس کے گلے سے لیپٹ جاؤں۔ جامو نے کوکھا مار کے مجھے چوکایا
اور سامنے دیکھنے پر نے کی تلقین کی۔

اباجان کے ہاتھ ابھی تک اٹھے ہوئے تھے۔ ننہی کے کھٹکے
پر میری انگلی جی ہوئی تھی اور میری نگاہوں نے ان کے گرد ایک
بالا بنا رکھا تھا اور وہ لوگ پھیرے اُدھر سلطان نے لپکتے ہوئے
لیجے میں تھل کو مخاطب کیا۔ "اتادو! یہ تشاؤم ہوتی ہے اُدھر گانے لگانے
کا مطلب سفید جھنڈی ہے۔"

سب ہلک

"ہتھیار بڑھا لو! تھل نے بوجھل آواز میں کہا۔ سلطان نے
تو آگ لگانے۔" یہ کہہ کر وہ نیچے تلے قوس سے اباجان کے
پاس اُدھر پہلے پر چڑھ گیا۔ باقی سب لوگ نیچے ہی رہے سلطان نے
تھلیوں اور تشاؤم کی مدد سے ایک مشعل میں آگ لگادی۔ دھوپ
میں اس کے شعلہ مرجھا رہے تھے تاہم اوپر والوں نے اسے دیکھ
لیا ہو گا۔ صرف مشعل جھلانے پر اکٹاف نہیں کیا گیا۔ آڑے وقت
کے لیے ہاتھوں پر خشک لکڑیوں کا جو ڈھیر بندھا رہا تھا، اسے
آگ کے اس میں بھی آگ بھڑکادی گئی۔ اس طرح اوپر سے گھر کے
آنے والوں کو جاری طرف سے یہ پیغام منتقل کر دیا گیا کہ ہم درگت
کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ سب نے تھل کی ہدایت پر ہتھیار پیچھے
کر لیے تھے۔ جاتے جاتے وہ اشارہ کرتا گیا تھا کہ سامان نیچے چھوڑ
کے ہم سب اوپر آنے کی کوشش کریں۔ جس موقع کے ہم دیر سے
منتظر تھے، اس کی اتبید بندھ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اباجان
کی اہل پر نظر ثانی کرتے یا رائے بدل دیتے، ہم نے ایک دوسرے
کو ہنگاموں سے ٹوکے۔ آگ جھلانے کے بعد ہم نے چٹانوں
کی ناخبر کی ہو گئی کہ ایک ساتھ سب اُدھر اُدھر منتشر ہوتے ہوئے
ٹھیلے پر چڑھ گئے۔ ہم نے رفتار میں کسی جھلٹ کا اظہار نہیں کیا تھا۔
ہاں ہم زیادہ بہتر طریقے سے انھیں دیکھ سکتے اور زیادہ محفوظ انداز
میں اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ ہاں جگہ خاصی کشادہ تھی۔ تھل کی پتاؤں
میں آڑھینے کے لیے کئی گشتے موجود تھے۔ ہم نے دوبارہ اپنے
ہتھیار اوپر نہیں کیے۔ اباجان کو ادریچے اچھا تھا جیڑے صاحب؛
تھل تھل کی بجائے۔ میں اباجان سے بولا۔

"ہاں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اباجان نے مایوسی سے کہا۔
"ہاں! کا ابھی اور نیچے آنا چھیک تھا۔
"میرا خیال ہے ہمیں ان سے بات کر کے دیکھنی چاہیے۔
"وہ جو لہجے کے وہ آپ بھی جانتے ہو بڑے صاحب!
"لیکن ہمارے پاس ان کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔
"ہاں بڑے صاحب! تھل نے گری ماس لے کے کہا۔
"شاید اپنے کو بھی بعد میں ہی کرنا پڑنا۔ پُر ذرا پہلے ان کو نزدیک
سے دیکھ لینے میں کوئی عرج نہیں تھا۔"

"ان کے پاس کئی تعداد میں ہتھیار ہیں اور ہماری نسبت کوہ
زیادہ بہتر جگہ پر ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی خطہ مول نہیں لینا
چاہیے۔ صورت حال سبھی لینے چاہیے۔ اباجان نے تذبذب سے کہا۔
"آپ ادھر آ رہے ہیں۔ بیٹھے رہو، ابھی ہم لوگ ادھر ہلکے
سے بات کرتے ہیں۔ تھل نے سولم پیر اور مجھ سے آگے بڑھنے

”آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ ہمارا وعدہ ابھی تک قائم ہے ہم کاغذات انھیں واپس کر دیں گے۔ اگر انھیں حاصل کرنا مقصود ہے تو ہماری بات کا یقین کرنا ہوگا۔“

”آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟“

”جی ہاں، ابا جان، ہچکچا کے بولے۔“

”میں بولتا ہوں وعدہ پورا کرنے کے لیے آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ ایسا بولیں تو آپ کیا جواب دو گے؟“

”نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہوں گا۔“

”بڑے صاحب! پھل نے نرم لہجے میں کہا: آپ نے ان کو روک دیا ہے۔ ابھی آپ ادھر بیٹھو۔ ہم جا کے اُن کو دیکھتے ہیں، آپ سے وہ کچھ بولیں تو ہم سے آپ اپنے کو الگ بولنا۔“

”آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے سودمند ہے تو میرے ساتھ ہیں اُن سے یہی اظہار کر دیں گا لیکن آپ خود اوپر جا کے اُن سے کیا بات کریں گے؟“

”ابھی ادھر جا کے دیکھتے ہیں بڑے صاحب!“

”میں سمجھتا ہوں میری بات شاید وہ مان جائیں۔“

”پر آپ ایسی بات ہی کیوں بولو جس کے نہ ماننے سے آپ کا بھیم بھی جانا ہے؟“

”ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم سخت خطرے میں ہیں۔“

”اپن لوگ سب خطرے کی گھڑی میں جہنم لیتے تھے، یہی وہ آگے آگے تیزی سے بولا: یہ این کے راجا کے بارے آپ ٹھیکہ جانتے ہو گے؟“

”ابھی کو ایک دم یقین ہے راجا ابھی ایسی گھڑی میں ایڈر آیا ہوگا آپ بالکل ٹھیکہ کئے سے بیٹھو۔ این نے آپ سے بولا تھا: بولا تھا کہ اُدھر سے مارا حساب ٹھیکہ کر کے آیا ہے۔“

”مگر، مگر...“

”ابا جان نے انھیں بند کر لیں۔“

”بڑے صاحب! آپ ادھر ہمارے ساتھ ہی رہو۔ جاؤ۔“

”درست ہے، درست ہے۔ ابا جان اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے۔“

دیر ہو رہی تھی۔ وہ دُور کھڑے ہم لوگوں کو آپس میں بات کرنے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ ہماری جانب سے وہ جلد از جلد کسی اقدام کے منتظر ہیں گے۔ پھل نے ابا جان کی طرح چاروں طرف گھومتے ہوئے اپنے ہاتھ اٹھا لیے، پیرواد میں نے اُس کی تقلید کی۔ کچھ توقف سے ہنگ

کے لیے کہا۔

”میں! ابا جان ہندی سے بولے۔ اگر میری رائے آپ لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو میں آپ کو اُن کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں خود جا کے بات کرتا ہوں۔ آپ سے زیادہ یہ سب کچھ دیکھنے کا صدمہ مجھے ہوگا لیکن اُس کا امکان بدوقت موجود تھا۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ دوہیں سے ایک بات کا فیصلہ ہمیں ابھی کر لینا چاہیے کہ ہم زیادہ قیمتی ہیں یا ہمارا مال و اسباب۔“

”آپ کیا بول رہے ہو بڑے صاحب! پھل نے بے صبری سے کہا۔“

”میں درست ہی کہہ رہا ہوں میری رائے میں کسی قسم کی الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سامنے ہمارے لیے اندیشے زیادہ تحفظات کم ہیں۔ سب کچھ اُن کے حوالے کرنے کے لیے وہیں آگاہ کر لیجیے۔ اس آمادگی کے سوا کوئی اور تدبیر ہو تو مجھے بتائیے۔“

”آپ جو سوچ رہے ہو، صرف اتنا نہیں ہے۔“

”پھر کیا ہے؟“

”وہ نہیں جانتے کہ اپنے پاس کیسا سامان ہے۔ اُن کو اُس کا ابھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ وہ تو ہم کو لینے آئے ہیں۔“

”لیکن ہمارے پاس ادا کیا ہے۔ یہ سب اُن کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔“ ابا جان نے ہماری لہجے میں کہا۔

”بہت تھوڑا ہے بڑے صاحب! اتنے سے اُن کا بھلا نہیں ہوگا۔ ہم نے ادھر جا کے اُن سے بولا تھا کہ ہم اُن کے کھوسے ہوئے کاغذ واپس لانے کا متین کریں گے۔ اُن کو یہ بولے بغیر ہم روز ادھر آؤ پر سچے آجا نہیں سکتے تھے۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے، میں نے پہلی بار آپ کو سب بول دیا تھا۔ ان پتھروں کی نہیں اُن کو کاغذ کی ضرورت ہے۔“

”لیکن کاغذات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا مگر آپ نے پھل آپ کے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بہتر ہے انھیں ہمارے سامان کی تلاشی لینے دیجیے۔“

”وہ ہم کو واپس لینے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے اُن سے پورا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پر نو سال تک کسی نے ادھر آ کے اُن سے ایسا بولا تھا؟ نو سال سے وہ سالے ہندوستان میں سرمانے لے رہے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرو بڑے صاحب!“

”میں سمجھ رہا ہوں لیکن کاغذ یہاں نہیں ہیں۔“

”یہ بات آپ مجھ سے بول رہے ہو اُن کو کہہ بولا جائے۔“



”یہ ہم نہیں جانتے“ وہ نخرت سے بولا۔

”سردار سے بولو کہ ہم اُدھر واپس آئیں گے۔ ابھی ہمارا بہت سا سامان اُدھر بیٹھا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے سردار کو جوابت بولی تھی وہ ہم کو یاد ہے۔ اس کو یاد کرنے کے ہم کو شش کریں گے۔“

”جھل نے ضمانت سے کہا۔
”مڑنے میں ایک ہی حکم دیا ہے کہ تمیں واپس لایا جائے۔“
”جھل سردار نے لگا: ”تم کو پتہ ہے ہم نے سردار سے کیا بولا تھا؟“
”تھوڑا بہت اس نے مجھ تک کہا۔“

”ابھی ہم کچھ نہیں ملا ہے۔“
”یہ سردار کو ہی جاکے بتانا“

”سردار سے تو ہم نے ساری بات صاف کر لی تھی۔ ہم نے بول دیا تھا کہ چار مہینے تک کدھر بھی آئیں کدھر بھی جائیں۔ وہ بیچ میں دوا نہیں ڈالے گا۔ چار مہینے بعد اگر ہم کو کچھ ہاتھ نہیں لگا تو اپنا کالا منہ لے کے اس کے پاس تین ٹیوں لٹیں گے ہم لوگوں نے نو برس سپرانی چلائی ہے“ ابھی تین ایک مہینے کے لیے کہیں اٹھایا ہوا ہے ہو؟“
”ہم سے کوئی صفائی مت کرو“ جو کچھ کہہ لے ہو“ سردار سے جا کے اس کی وضاحت کر دو“

”اُدھر جانے سے سردار کا بھلا ہے نہ اپنا، تھا ہے پاس اچھا بدن ہے، چھپا بھی اچھا ہوگا۔ ابھی جانے پاس کچھ نہیں ہے تو جا کے سردار کو کیا ڈھینڈن دوں گے ہمارا راستہ کہیں کھڑا کرے ہو؟“
”ہم نے سردار کا حکم تمہیں بتا دیا ہے۔“

”اور ہم نے یہ نہیں بولیں گے کہ یہ سردار کا علاقہ نہیں ہے۔“
”تم یہ نہ کہہ کر اچھا ہی کر دو گے اور ہماری بات مان کے اور اچھا سردار سے جا کے خود بات کر لو۔ ابھی بستی زیادہ دُور نہیں ہے۔“
”چار آدمی بھیج کے سردار ہی کو اُدھر بلاؤ۔ ہم اس کا انتظام کر لیں گے یہ کہنے سے نہ جانے جھل کا کیا مقصد تھا۔“

کچھ بعد ایک طرف سے جواب میں ہاتھ بلند کیے گئے۔ جھل نے پھر دیر نہیں کی۔ باقی لوگوں کو وہیں ٹھیرے رہنے کی تاکید کر کے وہ اُدھر پہلے پہلے لگا جس جانب سے جواب آیا تھا دلوں سے چند آدمی بھی ہماری طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں جھل نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم تیز تر قدموں سے درمیان کا فاصلہ کم کرنے لپے۔ کبھی سامنے دو شخص اور چاروں کی وجہ سے کہیں کہیں وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ ہم نے ہتھیار ہاتھوں میں نہیں اٹھائے تھے۔ اُدھ گھٹنے کے قطفے میں ہم اُن تک پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے آگے آنے والے آدمی اپنے پیچھے رہ جانے والوں سے انتہی دُور نہیں آئے تھے جتنے ہم اپنے لوگوں سے دُور ہو گئے تھے۔ جو لوگ سامنے آئے تھے وہ ہاتھ نیچے ہی کے آدمی تھے۔ گنتی میں چھ عموں میں مختلف تیور میں یکساں آنکھوں نے کسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور ان کے چہروں پر سفر کی تھکن کے آثار نہیں تھے بلکہ ناز کی جھلک مٹی تھی۔ پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد۔ ایک جتنی سپاہی کے پاس میدان جنگ میں جتنے ہتھیار ہو سکتے ہیں اُن کے جسم اُن سب سے مزین تھے۔ ایک اُدھر عسکرانہ بلند اور تن درست و نوا نا شخص اُن میں سب سے نمایاں تھا اور ہمارا صورت آشنا تھا۔ اُس کی کمرے ایک تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ ہم نے اُسے قبیلے کے سردار کے خاص کرے ہیں کوئی بار دیکھا تھا۔ دوسرے آدمیوں کے ملنے اور دیکھنے کا اتفاق ہمیں شاید نہیں ہوا تھا۔ صورت شکل میں نامذاتہتی ایک جیسے لگتے ہیں۔ ممکن ہے اُنھیں بھی ہم نے سردار کے مکان یا بستی میں کہیں دیکھا ہو سب کی جھوٹی پوچھیں چک رہی تھیں اور ہمیں پُر مرکز تھیں۔ اُن کے چہرے انگارہ ہو لپے تھے۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے لپے پھر جھل نے کسی تہید کے بغیر دھم لپے میں پوچھا تو سردار نے بیجا ہے؟“

”سو لہ نہ فوراً اُس کے لیے میں ترجیح کر دی۔“

”ہاں؟ اُدھر شخص نے نہ بات آواز میں جواب دیا۔“

”سردار کدھر ہے؟“

”بستی میں ہے۔“

”ہم کو ساتھ لے جانے کو آئے ہو؟“

”ہاں! اس نے مختصر جواب دیا۔“

”اتنے بہت سے آدمی بلائے بیجے ہیں؟“

”بیچھے اور بھی ہیں۔“

”اچھا! جھل نے سکون سے کہا۔ پرسیوں؟“

”اُس نے منہ بنایا۔ ہمارے لیے سردار کا ایک ہی فرمان ہے۔
کوئی دوسرا نہیں؟“ بھلنے سے سر ہلے ہیں کہا۔
”دوسرا بھی ہے۔“

”اُس کو بھی بولو۔“

”اُس کے بتانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔“ اُس نے گلاڑی سے کہا۔
”نہم ادر کب سے ہو؟“ غالباً بھل کر یہ جاننے کی جستجو تھی کہ
وہ بڑے منہ کے علاقے میں اپنے چار آدمیوں کی موت کی اطلاع
سن کے آئے ہیں یا پہلے سے موجود ہیں۔ اُن کے تیور کو ترازو کرنے
کے لیے یہ جاننا ضروری تھا۔
”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔“

”غرض کیوں نہیں ہے سردار مانتیاں؟“ معلوم نہیں مولم نے تیاں
کا کیا ترجمہ کیا ہوگا۔ اُس شخص کے ماتھے پر سنسنیں پڑ گئیں۔

”تھخاری طرف سے کیا جواب ہے؟“ اُس کی آواز بگڑنے لگی۔
”کیا جواب دیں پیر دادا؟“ بھلنے پر وہی طرف بھجے کہا۔
”ابھی کیا بولیں سنا؟“ پروکرو وادھٹ سے بولا۔ سالار ایل
ہے منہ کو لگام آگیا ہے۔ اپنی اتنی بات نہیں سنا۔

”بھل چنڈ لٹے پچھ کھڑا رہا۔ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے
آدمیوں کا ہتھوں میں کمائیں تھی تھیں۔ جمادی ایک ایک جھنڈی اُن کی
نگاہوں کی زد میں تھی۔ وادی میں ندی کی آواز اس کے آواز میں
تھی۔ اپنے لیے واپس جانے میں مٹھالا ہی گھاٹا ہے۔“ بھلنے نے دھیسے
لیجے ہیں کہا۔

”ہم اپنا گھاٹا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ ہم تو ایک زلٹنے
سے گھائے ہیں ہیں۔ سردار کے پیغام بر کی آواز تیری ہوئی سی تھی۔
”رہو پیر دادا!“

پیر نے بھل کر جواب دینے کے بجائے مولم سے کہا۔ اس سے
بولو مولم سالار سردار کو اپنی کچھ جاسوسی پسند آگیا ہے کیا اور وہ اپنی
کے لیے اپنی ماں بن کر سانسے کر لیں گا یا خود پلے سے کو؟... اس سے
بولو کہ ابھی اپنا کچھ آدمی اپن کے ساتھ ہانہ دے۔ چہ اپن دنوں ساتھ
ساتھ ہندوستان کا سیرا دیں گا اور گھوڑے گھوڑے رتی کا فندہ بھی کرے۔
میں نے پیر کا ہاتھ دبا کے اُسے روکا۔ پیر کے ہونٹ چڑھ گئے۔

مولم نے اپنی طرف سے قطع و برید کر کے پیر کی پیشکش نہ بولی۔
”اس کا فیصلہ بھی سردار کرے گا۔“

”یہ چڑی مار تو اپن کو ایک تم حکم کا غلام لگتا ہے۔“

”پانزو ہے دادا!“

”اپن میل بولنے کو تھا۔“ پیر دھچک کے بولا۔

”مٹھالے سردار کو کاغذات چاہئیں یا ہم؟“ بھلنے پھیلنے ہوئی
آواز میں بولا۔

وہ جواب دیتے ہوئے پچھلے گنگا کاغذات

”تو ابھی اپن اُدور جا کے سردار سے منع بول دے تو کیا ہوگا؟“
پیر نے بھل کے کچھ کہنے سے پہلے دربان میں دخل دیا۔ غم بھی
تنبیلے کا آدمی ہے۔ ایدر تھالے ساتھ اور دب کوک تنبیلے کا ہے سب
سردار کے آگے پہنچے کی سکوت کر لو اور سمجھو کہ ابھی اپن کیا بولم مارنا
ہے۔ کاغذ ایدر نہیں ہے اپنا سامان تلاش کر لو۔ اپن اُسی کی جگاڑ
میں اُدور جا رہا ہے بابا! اپن کو بھی مال بنانے کی جلدی ہے۔ پیر
بیزاری سے کہنے لگا۔ اپن سے گھٹا لامنت کر د۔ نرل کیا سالار نوہزار
سال لگ جائیں گا سب ایک ایک کر کے سو جائیں گا۔ رفتے والا ابھی
نہیں ہونے لگا۔ مولم! اس کو بولو کہ ایدر بھی تمہارا لوگ نہیں ہے۔
جو اپن ایدر بول رہا ہے اُدور بھی جا کے اتنا بولے گا۔ پیر کی زبان
میں کلفت آگئی تھی۔ ”مولم! اس کو بولو کھوڑی سیدھی رکھو اور اپنے
آدمیوں سے سوچ بچار کر لو۔ اپن ایدر ہی ہیں۔ بولو کہ اپن کاغذ نہیں ہیں۔
مجھے حیرت تھی کہ بھل اور پیر واپسی اور اتنی باتیں کیوں کر
لیجے ہیں بالکل فضول۔“ انھیں ابتدا ہی میں اندازہ لگنا لینا چاہیے
تھا کہ وہ کوئی اور بات سننا نہیں چاہتے۔ گو مولم نے احتیاط پر تھی
ترجائی کرتے ہوئے پیر کا لہجہ منتقل نہیں کیا تھا۔ دن رواں اور سترے
انداز میں انھیں ”اس کی کسی ہوئی باتیں منتقل کرنا رہا تھا لیکن وہ
سب اگر ہندوستانی نہیں جانتے تھے تو پیر کا لہجہ اُن سے چھپا ہوا
نہیں تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے
دیکھا اور اُن میں سے ایک معترف شخص سر اُٹھا کے بولا۔ ہم تمہیں ہم اکلار
کر رہے ہو؟“

”اپن سمجھیں تم اکلار کر رہے ہو؟“ پیر دھچک کے بولا۔

”دونوں کا اکلار بڑا ہے دادا!“ کیا ایک بھلنے دھیسے
سے کہا۔

”چھ کر... کیا ہے بھل بھال؟“ پیر دھچک پڑا۔

”سردار کی عزت تم سے بڑی ہے۔“

”مطلب تم... تم واپس جانے کو کہنے ہو کیا؟“ وہ تعجب

سے بولا۔

”ہاں دادا! بھلنے نے کسمسا کے کہا۔

پیر کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، وہ بھل کر مستند
نظروں سے گھڑے لگا جیسے اُس نے جو تھائے وہ بھلنے نے نہیں
کہا ہے معرکہ بھل ہی نے کہا تھا۔ پیر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں

سب لگ



paragon lahore

ہے تو ہتھیار کے سنگ۔ اپن سالا قبیلے سے سردار کی ماں جھگاکے
نیں لایا ہے۔ اپن ایک چھوڑی کو اودر کی اپنی مرضی سے آئی ہے
مرضی بدلے تو کٹ جائے۔ اپن دایر کا اودی ہے، سردار کا بچا
کھا تا ہے۔ سالا ایک کے برابر ڈزن ڈزن بھر ہے، پھر لو لٹا ہے تھیا
نکال دو۔ پھر لو لیں گا، آکھ اگ کردو، کان اگ کردو، پیر وہ نہ
چڑا کے بولا، میخڑی مارتا ہے قسم سے ابھی آسنا بدوشاہ کا خیال ہے۔
اپن کا خون بہت گدڑا ہے۔

وہ تشام کے ذکر پر ایک لمے کے لیے چوبکے تھے۔ شاید ان
کے لیے یہ اطلاع نئی تھی مگر انھوں نے پلٹ کے نہیں پوچھا کہ قبیلے
کی کون سی لوکی ہمارے ساتھ آئی تھی "تاہم ان کے چرکتے سے
اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مند کے تہہ فلنے سے ہمارے نکلے اور
تشام کے ساتھ ہونے سے پہلے انھوں نے بیان پڑا ڈال دیا تھا۔
انھیں یقین ہو گا کہ اگر ہمیں ہندوستان کی طرف چلنا ہے تو ہم اس جگہ
سے مزدور گزریں گے پرونے لگنا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمارے سامان کی
تلاشی لے لیں۔ انھوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ طے کر کے آئے
تھے کہ ہمیں ہستی واپس لے کے چاہیں گے تو ہمارا سامان چھٹا لانا مشکل
تھا۔ یہ کام وہ بتی میں جا کے بھی کر سکتے تھے۔ یہ وہ کہہ لیا تھا کہ ہم کوئی
جرم نہیں ہیں جو ہتھیار اُتار کے چلیں، انھوں نے بحث نہیں کیا کہ
وہ کہہ سکتے تھے کہ چھری بستی سے کوئی اطلاع دیے کسی سے کچھ کہہ سنے
بغیر میں یں غائب ہوجانے کی کیا ضرورت تھی۔ اطلاع دینے میں
کیا عذر تھا۔ یہ کوئی منظم پروگرام ہی ہو گا، وہ سردار کا بھی ہمارے ساتھ
تھا جسے ہم نے اپنے جانے سے تین دن پہلے بستی سے روانہ کیا تھا۔
پروڑ اور بھل نے سردار کے سامنے خود کو دو قافلوں کے طور پر پیش
کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے آئے تھے۔ اب وہ
دونوں ساتھ تھے۔ پڑاؤ کے دوسرے اُن کے ذہن میں گردش کرنے
ہوں گے۔ کاغذ کی متبرک چٹھیت کے علاوہ اُن کے ہائے میں اور بھی
بے شمار دوائیں مشہور یقین، ہر چہ کوئی بات واضح نہیں تھی۔ اس
سلسلے میں اُن کا علم سنی سنا ہی باتوں سے زیادہ نہیں تھا کہ کسی مخفی خزانے
کی روایت بھی اُن میں سے ایک ہوگی۔ اشاروں کا یوں میں انھوں
نے اُس کا تذکرہ بھی کیا تھا مگر وہ یقیناً بڑے مند کے تہہ فغانے
میں پیچھے ہوئے عظیم اُشان خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔
کبھی انھوں نے ان کا غنات کی تحقیق کی باقاعدہ کوشش ہی
نہیں کی تھی۔ ایک نوہ انھیں چھوٹے پونے ڈرتے تھے یا پھر وہ ان
کے رُوز خانے کی استقامت نہیں لکھتے تھے ممکن ہے کبھی کسی نے
ان کی تحقیق کی حرمت کی ہوا و تنبیہ میں فساد کے خوف سے خاموش
سب بنگ

جب بھل نے مولم سے کہا۔ بلو کر چلو۔ یہ اب کاغذ کا دھیان
چھوڑ دو۔ اب تمہارا باب اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلو کر سردار نے
کاغذ بچ بن ڈال کے اپنا عدد نوٹ دیا ہے۔ ہم بھی اب اُس کے
پابند نہیں ہیں کاغذ کو بھول جاؤ، ادھر سردار نے اُس نام تم میں
سے بہت سے ہیں گے جب اُس نے ہم کو تولنے کے لیے اپنے
آدمیوں کو اُٹھک بیٹھک کرانی تھی اور ہم نے اُس کو بولنا تھا کہ
اپنے کو اکیلے جانا اُٹھیک نہیں لگنا۔ کتنی تنہا رہی زیادہ رہے گی۔ ہم تو
ادھر اپنے ٹھکانے سے سرکڑا دھار جان کے چلے تھے۔

سردار کا پیغام بر فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا، وہ دُش کا
کوئی ساتھی۔ انھیں بھی بیرونی طرح جیسے بھل کی بات پر اعتبار
نہیں تھا۔ کئی کئی گور گئے۔ وہ چپ کر رہے۔ اضطرابی نگاہوں سے
ہیں کھتے رہے۔ پھر سردار کے پیغام بر نے سٹ پٹا، تو ہونے لگا۔ ہم نے
ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔

"جو بھی کیا ہے تم سے اُس پہ چٹیا نہیں گوانا ہے۔"

"اپنے ہتھیار اُتار دو۔"

"تھوڑی دیر میں بولنا اپنے کپڑے اُتار دو۔"

"سردوست ہتھیار ہی اُتار دو۔"

"ہاں ہاں، بھل کے تختے چھوٹنے لگے۔ ہتھیار بھی اُتار دیں
گے بلکہ اپنے لیے چپ کرنا چڑیاں لائے ہو۔ بلو کر تو اُن کو بھی بہن
لیں گے۔ ہر تھالے پینے کے بعد۔"

"ہم کہتے ہیں اپنے مالے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔"

"تم بھی ایسا کرو گے تو اپنے کو کیا انھیں چاٹنا ہے۔"

"ہم.... ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ادھر تھالے ساتھ یہ سب حرام کے چنے ہیں کیا! ایک بار پھر
گنتی کر لو، بھو ساھر کے نہیں لائے ہو گے۔ دادا! سناؤ ہتھیار اُتارنے
کو بولتے ہیں۔"

"اپنے کو سالے اُلو کا پتھا سمجھتے ہیں۔ پروچھک کاتے ہوئے بولا۔

"تھالے ہتھیار ہمارے پاس محفوظ رہیں گے۔ سردار کے پاس

جا کے یہ تحقیق واپس مل جائیں گے۔ ان میں سے ایک نوجوان تیزی

سے بولا۔

"اور تمہارے اپنے پاس۔"

"اس کا مطلب ہے تم انکار کر رہے ہو تو ہم چلنا نہیں چاہتے۔"

"ہم نے جو بول دیا ہے اُنہی ہی ٹھیک ہے۔"

"چھوڑو بھل جیانی ایہ سالا کہنے کی دم ہے۔ پرونے تھلا کے

کہا۔ "مولم! ابھی اس کو بلو کر فیصلہ کرے۔ اپنے کو لے جانا لگنا۔"

تعلیم

ۛے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ تھیں تو اس کے کس شیخ پر لگا ہوا ہے۔
 آپ کو تو اس کے دونوں رخ کھانے پڑتے ہیں۔
 ۛے اُسے سانپ نے ڈس لیا۔ میں نے اُسے شراب پی، اُس کا
 زہر تو میں اُترا مکروہ اس ڈبائے خوشی خوشی خضت ہو گیا۔
 ۛے تم اگر لوگوں کے جنازوں میں نہیں جاؤ گے تو وہ بھی تمہارے جنازے
 میں نہیں آئیں گے۔
 ۛے وہ بہت امیر ہے، خیرات مانگنے کے لیے دو کھول لے جاتا ہے۔
 ۛے جی ہاں اودولت صرف مصائب لاتی ہے مگر آپ دولت سے انہیں
 دور بھی کرتے ہیں۔
 ۛے کھیل تو بہت اچھا تھا مگر تھیر میں ایک بات غلط تھی، کرسوں کا
 رخ اسبیخ کی جانب تھا۔



تھیر اُن کے حوالے کرنے تھے تو میرے ہوئے ہی کیوں نہ بنیں
 اول کار تو اس خالی کر کے اور خجروں چاقو فوں کی دھار کند کر کے ہی
 کیوں نہیں۔ ایک پل، دو پل کی دیر تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کے پیچھے
 کھڑے ہوئے ابا جان کی طرف دیکھا، اُن کا سر ہٹکا ہوا تھا، میرے لیے
 دھار کر لیے ہوں گے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھر اُن کا چوہ دیکھنے کا وقت
 ملے گا یا نہیں۔ آنے والی گھڑی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا
 سکتا تھا۔ اگر تھیر ابا جان سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تو
 میں اُن سے ذلیل، نساں، شہ پارہ کے لیے کچھ کہتا اور اپنی بندنی
 میں رکھی ہوئی چیک بک اُن کے حوالے کر دیتا۔ تھیر اُمید تھی کہ
 وہ ابا جان پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے لیکن اُن کی موجودگی میں
 ابا جان میری لاش کو بھی اپنے سینے سے نہیں لگا سکیں گے۔ اُن پتہ
 لمحوں میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے کہ میرا سرا ہول زلزلہ زلزلہ گیا۔ کچھ
 دیر پہلے میرے ابا جان سے کہا تھا کہ میں خطرے کی کسی گھڑی
 میں پیدا ہوا ہوں گا خطرے کی نہیں تو وہ غرور سے گھڑی ضرور
 تھی میرا وجود ہی نہیں تھا۔ سب ایک آدمی کے سبب سے تھا۔ وہ
 نہ ہوتا تو اتنے لوگ اس دورا فائدہ، اجنبی جگہ پر یوں زندگی اور موت
 کی کش مکش میں مبتلا نہ ہوتے۔ کاش عدالت میں تین آدمیوں کے
 قتل پر اُسے ابتدا ہی میں موت کی سزا مل جاتی، کتنے چاقو اُس کے
 جسم کے لیے کھلے تھے۔ کوئی ایک اُن میں سے لگ جاتا تو یہ وقت نہ
 آتا معلوم نہیں، وہ چندہ آدمی دیا ہے کیوں نہیں اٹھ جاتے جو خود
 بھی زندہ نہیں رہتے، دوسروں کو بھی پین سے نہیں لہتے دیتے۔ میرے
 قریب جھل پر سکون انداز میں کھڑا تھا۔ پر بھی بظاہر مطمئن لفظ
 آتا تھا۔ انداز ایک طوفان چا ہوگا۔ اُس کی بیٹی گیا اور بوی کی

دلہا، اگر کسی ایسی کوئی کوٹش کی گئی تھی تو اس کا علم چند لوگوں
 تک محدود رہا ہوگا جس ریلے میں قبیلے کا سردار کرا کا باب مارا گیا
 تھا، اُس ریلے میں اُس کے انا بین، اچین نے، ہو سکتا ہے، کوئی دمر
 صداقت کر لی ہو جس کا علم کرا کے چا کو بھی ہو گیا، ہر اول اس نے
 محض اسی سبب سے اپنے بڑے بھائی کو راستے سے ہٹا دیا جو مگر قبیل
 کا فدا تھا اور کرا کو لے کے اُس کی دست بڑے دود ہو گیا۔ ہر حال
 کا فدا تھا سے متعلق اُن گنت روات ہیں، قبیلے میں ہماری اچانک آمد
 ادم مالے متفاد و ظر عمل کے پیش نظر وہ ہمارے بارے میں اُن گنت
 قیاس آرائیاں کرنے میں حق بجانب تھے مگر انہوں نے ادھر ادھر
 اُلٹنے کے بجائے بس اپنا مقصد سامنے رکھا تھا کہ وہ کسی طور ہیں نظر
 کے سامنے زندہ پیش کر دیں۔

پیر اور جھیل کی زبانی ہتھیار انا نے سے حتی انکار سُن کے
 وہ آپس میں سرگشتاں کرنے لگے۔ اور ہر شخص جو اُن میں سب سے دیر
 تھا، پہلے ہتھیار تھانے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھا مگر اس کے دوسرے
 سامنے اُس کے ہم زانو فز نہیں آتے تھے۔ اس دوران پیر و بڑا انا
 رہا جھیل نے اُس کی کڑھیک کے اُسے کسی طرح چپ کیا اور ہم سب
 اُن کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی اور اُمید باقی نہیں رہ
 گئی تھی۔ ہتھیار بچھ جانے سے ہماری تعداد نہ ہونے کی برابر وہ
 جاتی جھیل پیر، سولم اور میں، چاروں اُن کی نا اداؤں کی صورت
 میں اپنے منہ اور چاقو کاٹنے کے لیے متعہ تھے اور میں اندازہ
 تھا کہ ہماری کسی بھی حرکت پر ایک لٹے میں چاروں طرف سے تیر
 برسا شروع ہو جائیں گے۔ تیر چلنے کی توبت آئی تو ہم میں سے کوئی
 بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکتا تھا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ایک
 بات جس میں نچا، دوسرے میں چاقو لے کے جھٹ اُن کے غول میں
 گھس جائیگا۔ وہ اپنے آدمیوں کو اشارہ کرنے سے پہلے چاہے
 جواب کا انتظار ضرور کریں گے۔ اسی مہلت میں ہم اُن پر چھپ سکتے
 تھے جھیل پیر، سولم نے بھی یہی سوچ رکھا ہوگا۔ اس موقع پر پہنچنے
 سے کارگر کوئی اور ہتھیار میں ہوگا۔ پیچھے ابا جان کے ساتھ کھڑے
 ہوئے چاہے سارے آدمیوں کی نفریم پر ہوگا۔ وہ اب ایک ٹیلے
 پر تھے اور اُن کی بند قیں اوپر کھڑے ہوئے لوگوں کا نشانہ لے
 سکتی تھیں۔ وہ آخر دم تک نشانے لگاتے رہیں گے اور کسی کو بھی
 کسی جیلر کن نتیجے کی توقع نہیں ہوگی۔ ہم کتنی کر لیاں چلائیں گے
 چالے پاس کا زونس یقیناً اُن کی تعداد سے بہت زیادہ تھے مگر
 انہیں استعمال کرنے کا موقع ملتا ہی نہیں اُن کے ساتھ جانا
 تھا لیکن ہتھیاروں کے بغیر زندہ جانا بھی غروروں کے مانند جانا تھا۔

پر چھانیاں آنکھوں میں لرز رہی ہوں گی۔ کاش وہ سب مل کے پہلے مجھے مار دیتے۔

ادھیڑ عمر شخص اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جیسے ہی ہمارے طرف متوجہ ہوا میرے ہاتھ تیزی سے اپنی جیبوں کی طرف لپکے لیکن ہتھیار باہر نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی، ایک لمحہ جانا تھا کہ میرے نیچے کی گولی اس کے سینے میں پیوست تھی۔ اس نے سر کی جنبش سے اپنے ازار کا اظہار کر دیا تھا۔ کسی ناخبر کے بغیر میرے اس نے اونچی آواز میں ہمیں حکم دیا۔

* جھل اود بیرو پھر ایک پل کے لیے بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہرے۔ چپ چاپ پیچھے ہٹ گئے جہاں سب جاکے منتظر تھے اور یہ جاننے کے لیے مضطرب کہ ہر کیا ملے کر کے آئے ہیں۔ شاید یہ سب عمریہ کی توقع کر رہے تھے۔ جھل نے ان سے سامان اٹھانے اور چلنے کے لیے کہا تو ان کی گردنیں ڈھکنے سی گلیں ہتھکھوں سے کوئی تیرہ نہیں کیا یا کولن کانس فوراً موڑ دیا گیا۔ جاگت ٹیلی کے سارے آدمی اوپر ہی رہے اور اطراف سے ایک جانب سمٹنے گئے۔ وادی سے نکلتے ہی وہ ہمارے ارد گرد ہو گئے۔

انھوں نے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ ہمارے آگے تھے، کچھ پیچھے، کچھ دائیں بائیں، کچھ ہم سے قریب تھے تو کچھ دور۔ جو قریب تھے ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔ دور چلنے والوں کے ہاتھوں میں کمانیں تھیں، ابا جان اور انشا نے ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ایک بزرگ شخص نے آبا جان کے پاس آکے انھیں الگ ہو جانے کی پیش کش کی تھی، ابا جان نے یہ کتنے بڑے انکار کر دیا کہ ایسے حالات میں وہ ان لوگوں سے جدا ہونا مناسب نہیں سمجھتے جن کی رفاقت میں انھوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہمارے ہمراہ ان کی واپسی کا براز موجود تھا۔ ان دشوار گزار راستوں میں تنہا سفر کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے لوٹنے کے بعد آبا جان اکیلے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں راستے میں کسی دوسرے قافلے کی ہمراہی کے عذر سمجھ کر ہمارے ساتھ واپس چلنا تھا۔ جیٹھو اور ناجا جوں کے قافلوں کی سفری رفاقت کوئی نئی بات نہیں تھی۔

سفر کی دشواریاں کم کرنے کے لیے کبھی ناچر ہیکمشوڈن کے قافلے کے ساتھ ہو جاتے تھے، کبھی ہیکمشوڈن جوں کے ساتھ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہمارے ہمراہ آبا جان کی موجودی پر کسی شبہ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ قریب آکے انھوں نے نشام کا چوڑھی دیکھ لیا تھا۔ عجز نہ تو اسے برا بھلا کہا، آبا جان کی طرح اسے ہم سے جدا ہونے کی پیش کش کی جب سب یقینی ہی کی طرف ہلاک تھے تو نشام

اور میرے باؤدھ بات ایک ہی تھی۔

اتنے بہت سے مردوں کے درمیان نشام صرف ایک لڑکی تھی۔ واپسی کا سن کے اس کے سرخ وسفید چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ لمبے لمبے جیسے اس کا خون سوکھ رہا۔ ہر جھل نے اسے ایک پاک پر بٹھا دیا تھا مگر اس کے بدن کی لڑش کم نہ ہوئی۔ سلطان اس کے قریب ہی تھا اور سرگوشیوں میں اسے بار بار نہ جانے کیا تسلیاں دلا سے دے رہا تھا۔ پھر جھل بھی اس کے پاس پہنچ گیا اور اس نے نشام کا ہاتھ تنہا کے اس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکا دیا۔ مگر آبا جان وہ مسکراتے ہوئے بولا: رنگ کیوں بدلتی ہے۔ وہ لال رنگ ہی تیرے کو اچھا لگتا ہے۔

نشام کے ہونٹ سکے گئے۔

”نا، نا، جھل اس کی انگلیاں چومتے ہوئے بولا: تیرے کیا ہے

ری۔ گدا تو ادھر ہی ہے۔ سب تک سنگ جانا۔“

نشام نے اسے ڈھائی آنکھوں سے دیکھا۔ دونوں سے وہ ہمارے ساتھ تھی۔ جھل نے اسے ہلے ہلے مخاطب کیا تھا: یہ جیسے چار دن پڑے تھے اور گھر سے بچوڑا کا راستہ بھی چھوڑا نہیں تھا۔ جب دھیان نہیں دیا تو اب کا بے کا دھواں ہے سبھی اے بڑے رکھا ٹھیک نہیں لگتی: وہ منہس کے بولا: یہ لوٹ پھر تو ساری زندگی کا ہے۔ سینے کو آجلا ہی رکھ، جیسا لے کے آئی تھی دیا بھتی ہے نا۔ پتہ نہیں نشام کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر دیکھنے دیکھنے اس

کا کھوپڑا ہوا رنگ واپس آنے لگا۔ اس کا مہر بھیا ہوا بدن جیسے پھر سے فوہانے لگا۔ سہ پہر ہو گئی تھی، ابھی ہم نے وادی سے چند میل آگے کا سفر طے کیا ہو گا، اندھیرا لگنا نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے اچانک سفر ملتوی کر دیا، وہ ایک کشادہ اور ہوا راجگ تھی۔ قریب ہی پڑا کیلے ایسی کوئی جگہ ملنی مشکل ہو گی اسی لیے انھوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیے۔ ان کے ساتھ بار بار وادی کے لیے میس کے لگ چنگ

پاک تھے۔ باقی سامان بڑے بڑے ٹھیلوں میں ان کی پیٹھ سے بندھا ہوا تھا۔ وہ فاصلے فاصلے سے ہمارے ارد گرد مختلف مقامات پر جم گئے تھے۔ اندھیرا ہونے ہی انھوں نے شعلیں روشن کر دیں اور لاڈ جلا دیے۔ ان میں سے چند لوگ ہماری پہرے داری چھوڑ کر کھانا تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ جاما اور پیرٹ نے صبح صبح کمی پر ندوں کا شکار کیا تھا لیکن انھیں ہم نے محفوظ رہنے دیا۔ سولم نے ان سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ہمارے لیے بھی کھانا تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ وہ منع نہیں کر سکے۔ سو ہم نہیں خیمے نصب کر کے

اور ستر لگا کے لیٹ رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ انھوں نے

تمام راستے آبا جان سر جھکائے کسی مختلک کی طرح قدم
 بڑھاتے ہے۔ ہمارے ہمراہ ہونے کے باوجود بھی وہ سب سے
 الگ الگ تھے۔ انھوں نے اپنی جانب سے کسی سے کچھ کئے، کچھ
 پوچھے کی بہل نہیں کی البتہ وہ لوگ ان سے وقفے وقفے سے
 پوچھتے رہتے تھے کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ آبا
 جان ہر چیز پر بھی سر جھکا کے کبھی ہنسی کے دو لپک لپکوں میں منع کر
 دیتے تھے۔ تو بال میں انھوں نے بتاتی زبان سے بڑی حد تک
 واقفیت حاصل کر لی تھی پڑھنے میں تو انھیں بلکہ حال ہو گیا ہو گا تھی غذا
 میں کبھی ہوتی ہزاروں سال پہلے کی زبان ان کی سمجھ میں آتی ہوگی تاہم
 بتی بولنے میں پڑھنے جیسی روانی نہیں ہوگی تبت کے مقدس معلموں
 خانقاہوں کی زیارت کرنے والے کسی راہب کے لیے لازم بھی
 نہیں تھا کہ اسے بتی سے خوب آشنائی ہو۔ دنیا بھر سے راہب یہاں
 آتے تھے۔ آبا جان نے بتی محض کا غزات کا علم اندر کرنے کے لیے
 سیکھی ہوگی۔ ہر کسما ہے وہ پہلے ہی اس میں کچھ شہدہ رکھتے ہیں۔
 وہ کیا ہیں چلا ہوئے تھے، انھیں ہزاروں بتی راہبوں سے واسطہ
 پڑا ہو گا۔ کوئی بعد میں کہ کاغذات کسی اور زبان میں ہوں۔ بتی
 اور بتی ملی ہوئی زبان۔ بہ حال وہ کسی بہت مشکل زبان میں ہیں
 گئے جو آبا جان کو نو سال تک گئے۔ یہ ان کے تو سال کی ریاضت
 تھی جو صندوق میں پتھر اور دھاتوں کی شکل میں چھپی ہوئی تھی۔
 صندوقوں میں قند اور قح کی رو میں بند تھیں۔ آبا جان ہی ٹھیک
 جانتے تھے کہ ان میں کیا کیا بند ہے۔

دوسرے دن ہم پھر ہونے تک ہم اس طرف کے پاڑوں
 کے آخری سرے پر پہنچ گئے تھے۔ اس طرف کے لوں کشا چاہیہ کہ
 ایک گرنشیب دریا میں رکت کاٹ دینا تھا۔ دوسری طرف
 بھی بلند بالا پاڑے تھے مگر ان تک جانے اور اس سفر جاری رکھنے
 کے لیے آئے سامنے دونوں پہاڑی سلسلوں کے بیچ رتوں اور کڑی
 کے تختوں سے بنا ہوا پل عبور کرنا پڑتا تھا۔ نیچے ہزاروں فٹ گہرائی
 میں دریا بہ رہا تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ کے سبب پل بھی بڑا
 تھا۔ میاں سے ہم دونوں پہلے گزر چکے تھے۔ پل آئے پر سب
 نے بے اختیار ٹھل کی طرف دیکھا لیکن ٹھل کے ماننے پر کوئی ٹھل اور
 آٹھ میں ہلکی سی چمک جی نہیں ابھری۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں
 سب کمرٹ کے پل پار کرنا تھا۔ ٹھل کی پراہیت پر وادی سے لوٹنے
 کے بعد اب تک ہم نے ہتھیاروں ہی پھوڑ رکھے تھے۔ بند فین گنوں
 پر جھوٹی رہی تھیں اور نیچے چار تو صیہوں میں پڑے رہے تھے انھیں
 بھی اس مقام پر احتیاط کا احساس تھا۔ اول تو وہ قطار کے اعانہ میں

بٹھے ہی نہیں۔ پل کے آس سرے پر دائیں بائیں پھیل گئے۔ دوسرے
 انھوں نے پہلے اپنے آدھے آدمی جو دگر دیے تب ہم سے بڑھنے کو
 کہا۔ باقی آدھوں نے دوسری جانب چارے بیچ جانے پر پل پار کرنا
 شروع کیا۔ دونوں اطراف آدھے بیچ جانے لگے اور ادرہ رہ جانے
 والے لوگ ہلے پل سے گزرنے کے دوران ہتھیار اٹھائے کھڑے
 رہے۔ انھوں نے اس ہمارے پیش میں پڑیاں اور پاٹھوں میں
 ہتھ کڑیاں نہیں ڈالی تھیں۔ ٹھیل اور پڑے ہتھیار ساتھ رکھنے
 پر ان سے بے کار اصرار کیا تھا۔ یہ صرف ذہن کا دلاسا تھا کسی لمے
 ان کی نظر اس ہم سے اوچھل نہیں رہی تھیں۔ ہر طرف ان کی سلاخی
 کھڑی تھیں۔ ہماری حالت اس قیدی سے مختلف نہیں تھی جسے
 سلاخوں کے پیچھے ہتھیار دے دیا جائے قیدی زیادہ سے زیادہ
 کیا کرے گا، قیدی ہرے وار پر چھینے کا یا پھر خود کو مارے گا۔ سارا
 جبل خانے کو تو وہ منے اور جانے سے ہیں کاٹ سکے گا۔

پل طے کرنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ ہم ایک آدھ
 ہی میل اور چلے ہوں گے کہ ٹکی بولنا باندی ہونے لگی۔ جیسے بھی اندر
 آنے والے دھندل کرنے لگا تھا۔ وہ ایک مناسب جگہ ٹھہر گئے۔ بولنا پادیا
 زیادہ دیر جاری نہیں رہی۔ شام کو آسمان خشک ہو گیا تھا۔ دن بھر
 اونچے نیچے راستوں پر چلنے چلتے پڑے تھے۔ میری ہڈیوں
 میں ٹوٹیں اٹھ رہی تھیں لیکن میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا
 میری طرح سب کا یہی حال ہو گا۔ اونچائی پر ایک کوس کا سفر سیدھا
 علاقوں کے کوئی کوس کی ٹھکن کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی ایک تا تیس
 پہنچنے کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ آگے ہمیش تراؤ بچاتی تھی۔ چڑاؤ
 کے بعد کل کے معمول کے مطابق وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو
 گئے۔ چھوڑ دیا ریا نصیب کرنے، کھانے پکانے الاؤ جانے اور
 مشعلیں روشن کرنے کے لیے چند آدمی الگ ہو گئے تھے۔ باقی
 سب کا کام جاری نگہداشت کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہمارے
 آس پاس انھوں نے ایک حرج کے موڑ پر قائم کر لیے تھے۔ ٹھیل
 نے آبا جان نشانم اور فلیوں کو نہیں میں بھیج دیا اور خود ہم سب کے
 ساتھ باہر مارا اور ہم کسی ایک جگہ تک کے پیچھے کے بجائے ستار
 جگہ گئے۔ تک ایک محدود فاصلے میں خواہ مخواہ ادرہ سے ادرہ پتھر
 لگاتے رہے۔ کتنا کھانے ہی ٹھیل نے الاؤ حلو دیا تھا سب موٹے
 کپڑوں اور کپلیوں میں لپٹے ہوئے اس کے گرد بیٹھے کھانے پاتے رہے
 اور وہ ہمارے ارد گرد مڑلاتے رہے۔ ہم سب پر سکوت طاری تھا۔
 سکوت ٹوڑنے کے لیے بیرو بیٹی کے واقعات سناتے لگا پھر تو فتنوں
 کہانیوں کا ایک ناخوشاں بندہ گیا۔ بیرو کی زبان اس کے سناتے اور

”تم باوقی خواتین کو
پسند کرتے ہو یا مردوں کی
قسم کی؟“
”دوسری کس قسم
کی؟“
* عورت سب سے زیادہ کس چیز سے خوف لگاتی ہے؟
* حسین تر عورت سے۔

* خواتین کو کم عقل کیوں سمجھا جاتا ہے؟
اس لیے کہ وہ مردوں کی تمام حماقتوں سے واقف ہوتی ہیں۔
* عورت، مرد کے مقابلے میں بار بار اپنا خیال بدلتی ہے۔
مرد خیال کے بغیر عورت بدل دیتا ہے۔
* ایک خوب صورت خاتون کسی ماہر نفسیات کے زیر علاج تھیں۔
وہ دواؤں ماہر نفسیات سے اپنے خوابوں کا تجزیہ کروا دیا۔ ایک نازک
نہایت سیریشانی میں وہ مبالغے کے پاس پہنچیں اور گھر کے بولیں
”دو گڑھ صاحب! کل رات مجھے کوئی خواب دکھائی نہیں دیا۔“
”محترمہ،“ ڈاکٹر نے مسکراتے جواب دیا: ”اگر آپ اپنا بہم
دک کر کرنا بھول جائیں تو میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟“
* ”تمہاری عمر کتنی ہے؟“ ”جے جے پوچھا“ ”یاد رکھو، تم غلطی بیان دے
رہی ہو۔“
”اکیس سال، چند مہینے“ خاتون نے جواب دیا۔

”چند مہینے سے کیا مراد ہے؟“ ”مہینوں کی تعداد بتاؤ؟“
”جی“ خاتون نے سوچ کر جواب دیا: ”ایک سو آٹھ
مہینے۔“

* تین سہیلیاں ایک چینی ہوٹل میں پہنچیں۔ سیریاٹو لایا۔ تینوں نے
اپنے اپنے پیسے سے ٹیکسٹ نکالیں۔ پہلی نے شہزادے کا کہا: ”میں
صرف چوتھے وقت عینک لگاتی ہوں۔“
”دوسری کا چلائے وقت عینک لگاتی ہوں۔“ دوسری بولی
”اور میں“ تیسری نے انکشاف کیا: ”صرف آس وقت
عینک لگاتی ہوں جب مجھے کچھ دیکھنا ہوتا ہے۔“

بجائے طوفان کے آدمی کو ٹھنڈا مارا، ہاتھ پاؤں الگ سمجھا دیا۔ بولتے
ہیں طوفان نے سالاحرامی کیا۔ اپن سب گتے ہیں، پر وہ بہت
بچی جات کا تھا۔ لومڑی کا بچہ، ایک رات مالے پر چا کے طوفان کے
آدمی نے تارہ کو کھجھا دیا۔ پھر کچھ دن بعد جامنی بائی کا داد میں ایک
دن بجلی چڑھا۔ اس سے پہلے آدھر کسی نے اس کو نہیں دیکھا تھا۔
جامنی سیدھا طوفان کے پاڑے پہنچا اور جا کے لڑا کہ اپنے بھائی کا
بدل لینا مانگتا ہے۔ طوفان دادا بھجھا چھوڑ کر مٹھی سے جامنی بائی
تیار ہو کر آیا تھا اور پتہ نہیں سالی لڑا ہی کے آیا تھا یا جا دور کر کے
آسی ٹیم طوفان کو نہ کہ کا کھٹ کٹا دیا۔ اپن کا دایک آدمی بھی آدھر
تھا۔ بولتا تھا کہ جامنی کا ہاتھ آٹھ فانی تھا طوفان جیسا دبو آدمی کا

دفاصت کے لیے ہاتھ کے اشاروں کا انداز آتا جس سے انگریز تھا کہ
سب کھو گئے تھے اور کچھ دیر کے لیے انھیں بالکل یاد نہیں رہا کہ
وہ کہاں اور کن لوگوں کے درمیان ہیں۔ بیرو کہیں ایک جانا یا بھول
جانا تو زور اور مارائی اسے کسانے اور یاد دلایتے۔ ”دادا! وہ آدھر
دادر وال جامنی بائی کا سالالیا لفظ تھا؟“ بیرو کے چپ بولتے ہی
مارٹی نے کسمائی آواز میں پوچھا۔

بیرو آدھر کے بولایس کا نام لے دیا ماسٹر!
”بولو دادا! مارٹی نے اصرار کیا۔
”جہلے مے ماسٹر! کیوں سوئی مارنا ہے؟“
”اپن اس ٹیم چھٹکا آس کے پاڑے میں تھا۔ زور انتہائی سے
بولتا پر اپن کے کان بند نہیں تھے۔ سنا تھا کہ سالی نے آدھر تمھارا
لیے لمبا پھندا ڈالا تھا۔“
”ابھی اپن کیا بولے۔“ بیرو کی آواز کہیں کھو گئی۔ ایک ٹیم تو
اس نے اپن کو کچا دیا تھا زور دادا! “
”اپنے کو ایسا بول کے کہیں خوار کرتے ہو دادا! زور دادا! کان
پکڑتے ہوئے بولتا! اپن ابھی تمھارے پیروں کا مٹی بھی نہیں دادا! کہ
سے ہو گیا۔“

بیرو اسے کوئی جواب دینے کو تھا کہ ذریعے بھجھکتے ہوئے لمبے
میں اسے ٹوکا یہ وہ جامنی بائی والا قصہ بول رہے تھے نم۔۔۔“
”جامنی بائی! جامنی! کس منہ سے بولے۔“ بیرو ٹھنڈی سانس
بھرنے لگا: ”ایک نمبر فٹوٹل تھا وزیرے! ایک ٹیم بولر دادا! اس کا
فلام تھا۔ کلر لال کا بالکل جامن جیسا اور بدن! بدن کسی مندر کا مورت
مافک تھا۔ رزناس کو بھٹوڑی سے بھٹوٹا تھا یا چاقو سے کاٹ
چھانٹ کر تھا۔ ایسا منہ حال کے رکھا تھا جیسا اور بیٹی میں ڈولی
رام اپنی دکان کے کانچے کے پیچھے گوری میمر کی مورتی منہ حال کے کھٹا
سے۔ ایک دم نیچے سے اوپر تک کھنچا ہوا قلب کی لاٹ کی طرح، آنکھ
بڑا بڑا، برنی ماٹک، بال سالاس پیروں تک اس نے بچ گیا تھا۔
کھرامنی نہیں، مونا کو کسی عمل کا رانی بنا، رانی تو وہ اس ٹیم بھی تھا۔
لوگ باگ اس کو دادر کا رانی بولتا تھا۔ جب پاڑے سے نکلتا، لگتا
شیر بنی سے نکلتا ہے، ایدر سے آدھر تک دادر کے جنگل میں سب
کی بولتی بند ہو جاتا۔ پتہ نہیں سالی کہ اسے آیا تھا۔ کچھ بولتا، بنگال
سے آیا ہے۔ کچھ آدھر لنگا سے بولتا، جب آتا تو دادر کے پاڑے میں
طوفان دادا بھٹنا بولتے ہیں جامنی بائی سے پہلے اس کا بھائی
شارہ بیٹی آیا تھا اور آسے دادر میں ہی اونچا نیچا کام کرنے لگا تھا۔
طوفان دادر کے آدمی نے جتنا مانگا۔ شارہ بھی آدمی سونا تھا۔ جیسے کے

بے سنگ

اُس نے دیکھتے دیکھتے چٹنی پیس دیا کیس چلا، کچھ تو عورت میرے
 کا سال کو خوش ملا، کچھ دکل کے زور مارنے سے جامنی بائی کو
 صرف ۵ برس کا منتر ملا، پانچ برس میں ابھی جاہل برس کا ملنا تھا کہ جیل
 سے جھوٹ کے پھر داد آگیا اور طوفانِ داد کے پاؤں پر آکے ہی
 جرم کیا۔ سالی کی عمر بھی کم تھی۔ جاہل برس بندی کے بعد بھی مجھ کو
 گناہ تھا جیسے اور سالانہ شیشے کے سامنے بیٹھا رہا۔ پورے جیل سے
 بدل کر پوئیاں لکان بنائے ہوئے نکلا تھا، پیر کی آواز سننے لگی اور
 وہ بولنے بولنے گم سا ہو گیا۔ سب انتظار کرتے رہے۔ چند منوں
 کی خاموشی کے بعد پیر خود ہی بولا: کید کید سے بولے پورا ناگ
 تھا سالانہ جیل آگیا تو پاؤں کے سارے آدمی کو تھر تھری گنا جاتا۔
 کسی نے اوچا پوم مارا، اُس کو سدا کے لیے بیچا دیا۔ گھر سے اور
 نیلے رنگ کے سواد و سر لکھ کر ساڑی میں پہنتا تھا۔ اید داد کے
 آواز پاڑاڑوں کے دادا لوگوں کو موت مانگتا تھا تو وہ اور جامنی
 بائی کے پاؤں کو ان کا منہ پھیر دیتا تھا جس نے جامنی بائی سے
 غول کیا، اپنے آپ سے غول کیا۔ جامنی بائی بھی خود سے کسی پاؤں
 میں نہیں گیا۔ وہ اور دلہنے کو بند کرکھتا تھا۔ پورا داد ایک عورت
 کاسن کے اپنی خوری سمجھتا تھا۔ اُس ٹیم داد کے بازو میں جاگڑی
 دادا کا بہت مشہور سی تھا، اُس کو لوگ بلڈاگ بھی بولتے تھے شانی
 بائی نے کچھ نہیں بولا تھا کہ جاگڑی نے آدمی بھیج کے بولا، اُس نے
 تباہی بناؤ تم رانی اپن راجا، دونوں کا پاڑا مل جا میں گلا۔ جامنی
 بائی جاگڑی کے آدمی کی بات سننا نہ پھر اپنے ماتھے کی جھڑی
 اُنا کے بھیج دیا۔ جاگڑی سمجھ گیا کہ ابھی جامنی بائی کا کیا مطلب
 ہے۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں پیرنا تھا۔ آنکھ کا گرم اور دل کا جلنا تھا،
 بولا، اپن آنا ہے تیار ہو۔ ابھی لال کلر کا ساڑی پہنتا۔ جامنی نے
 جراب بولا ابھی آؤ اپن اید رہی ہے۔ دوسرے دن جاگڑی باجھل
 لے کے گیا تھا جامنی نے لال کلر کا ساڑی پہن رکھا تھا، ہار جھول
 لے کے ایک طرف دکھا، جاگڑی کے آگے چاقو پھینکا اور سامنے
 آگیا۔ جاگڑی نے چاقو اٹھا لیا، جوا اور دس بارہ ہاتھ سے جامنی
 نہیں چلا یا تھا کہ بازو پر نشان ڈالو لے کر گیا۔ جامنی بائی کھڑا رہا۔
 اور جاگڑی کا سارا آدمی بھی یہ تماشا دیکھتا تھا۔ جاگڑی نے پھر سے
 چاقو اٹھا لیا۔ سب سمجھ کے جامنی بائی پر پھینکے گا۔ پھر جاگڑی نے
 اُس کو اپنی چھاتی میں اتار لیا۔

کی بہت سی باتیں یاد تھیں، ناقابلِ یقین باتیں وہ اُس کے چاقو
 چلانے اور داد دینے کے انداز پر دیکھتا تھا۔ کدہ بانگہا کہ بظاہر وہ ایک
 سیدی سادی سی عورت تھی گتھی گتھی محراب چاقو اٹھاتی یا سامنے کوئی
 آواز باکل بدل جاتی۔ آنکھوں میں انکالے سے سے دیکھتے گئے۔ چپے کا
 جامنی رنگ سرخ ہو جاتا اور بدن پھٹنے لگتا۔ پیر کو کتا تھا کہ دھسے
 داد تو اُس کی آنکھوں کے تھے جسے نظر پھر کے دیکھ لیتی، اپنی جال
 جھول جاتا۔ ہاتھ اٹھاتی کہیں تھی، مانی کہیں تھی۔ کوئی اُس کے آؤ کا
 پہلے سے یقین نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے آنے ہی ہرن کی لڑن چوکری
 بھرتی۔ اُسے پیڑ سے بدلے اور جھوٹ کے وار کرنے کا منہ رمل
 تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ کوئی مادہ کوئی ہے لیکن اُسے تقریباً تمام
 داد آتے تھے نیز، بلکہ چاقو وغیرہ اور خالی ہاتھ کے داد۔ اُنی عمر میں
 اُس نے نہ جانے پیرب کچھ کہاں اور کیسے لکھتا تھا۔ عوامہ اپنے پاؤں
 تک محدود رہتی تھی نہ اُسے اپنا پاڑا بڑھانے کی خواہش تھی۔ جتنے
 آؤ سے اُس کی تحویل میں آئے، اُن سب کے استادوں نے خود اُس
 سے چھڑ خانی کر کے اُس کی گود میں ڈال دیے تھے۔ جن میں کئی کوڑ
 اُس نے یوں ہی چھوڑ دیا کہ کوئی پہچانے آدمی بٹھا دیے۔ خود اُس نے
 اپنے پاؤں میں تمام آؤ بلا آدمی نکال کے تختہ آدمی رکھے تھے۔
 اپنی دو کوڑائیوں کے سوا وہ ملے پاؤں میں تیار رہتی تھی۔ پیر
 سے بھی اُس کے تعلقات ٹھیک نہ تھے۔ علانے سے اُس کے
 کسی آدمی کی شکایت آتی تو وہ اُسے سدھرنے کا موقع ایک موقع
 دیتی تھی، دوسری شکایت پر اُسے پاؤں سے نکال دیتی۔ قسم قسم
 کی کہانیاں اُس کے بالے میں مشہور ہو گئی تھیں مگر وہ اُن سب سے
 جیسے جے جرتھی۔ اُس کے پاؤں کے آدمیوں کا کتا تھا کہ اُس نے
 کبھی کسی مرد کو قریب نہیں پھینکے دیا، پاؤں کے کسی آدمی سے
 زیادہ بات نہیں کی۔ علانے کے لوگ اُسے جامنی دیوی کہنے لگے تھے
 کہتے تھے کہ وہ کافی دیوی کا کوئی روپ ہے۔ پاؤں میں کوئی ضرورت
 حانا تو خالی ہاتھ والیں نہیں آتا تھا مگر اُس کے ساتھ کسی نے
 زیادتی کی ہوتی تو وہ اُس کے ساتھ خود باہر آجاتی اور بادی کرنے
 والے سے باز پرس کرتی۔ داد کے لوگ اپنے بعض فیصلے بھی
 اس سے کرانے لگے تھے۔ جاگڑی کی موت کے بعد میں نے کسی
 دادا نے پھر جامنی بائی کے علانے کا رنج نہیں کیا۔ سب نے جان
 لیا تھا کہ جامنی کو کدہ بانگہا اپنی موت کے مترادف ہے۔ جامنی بائی
 کو ایک ہی شوق تھا۔ گانا گانے اور ناچ دیکھنے کا شوق، اُسے کسی
 نے گانے ہوئے دیکھا نہیں تھا۔ عاقبت رات کو کبھی پاؤں کے اوپری
 منزل سے جہاں وہ رہتی تھی، کبھی کبھی اُس کے گانے کی آواز
 سب گاہ

مضبوط اور پائیدار

نوبصورت اور شاندار



پاکستان کی بہترین اور پائیدار سائیکلوں کا انتخاب

معروفیت اور ننگاموں کی دنیا سے دور پیسیو سائیکل کے
ساتھ سفر کی وسعتیں وسیع ہوتی ہیں۔ شہر ملک ہو کر تمام
دنیا ہر آن کی جڑیں ہر وقت ایک نازہ سفر کے لیے
آپ کی متاع عزیز پیسیو سائیکل



پیسیو سائیکل حاصل کیجئے
کام میں اولے نام میں اولے
چاند شاندار ماڈل چار چکدار رنگ
پائلر، ڈی کس، انڈس فولڈنگ، سپورٹس

پاکستان انجینئرنگ پکٹریٹ



آئے گیتی اور وہ صرف رات کو کافی تھی۔ پروکٹا تھا کہ اس کی آواز سننے کے لیے اس کے پاؤں کے آدنی کان لگائے رہتے تھے لیکن پھر رات کو گونا گونا گس کا معمول نہیں تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا اور جب اسے ناچ دیکھنا ہوتا تو کسی طواف کو بلا کر بند کر لیتی اور تنہا اس کا نفاذ دیکھتی رہتی۔ بیٹھے ہیں دو ایک بار وہ ضرور کسی طواف کو بلائی تھی اور رات کا کھانا اس کے ساتھ کھاتی تھی، اسے ایک چوڑا ہینائی اور پلے دینے کے بجائے سونے کا لنگن یا چوڑیاں دیا کرتی تھی۔ ”اچھا تم نے کبھی کالا گلاب دیکھا ہے؟“ پیرو نے اچانک ہم سے پوچھا۔

”دیکھا ہے دادا! ہمارے جواب دیا۔

”بس سمجھو جامنی بائی بھی ایک کالا گلاب تھا“ پرو خود ہی دے آواز میں بلا بلا گلاب کی جی میسا پر پڑھنی پرکا ٹاٹا ہست تھا“ ”جھل مریجھ کائے پرو کی باتیں سن رہا تھا اور بڑی کے کش لگا رہا تھا۔ آواز میں ننگ رہی ہے دادا؟“ وہ سر ہٹا کے پہلی تہہ درمیان میں بلا بلا ابھی آگے زبان کھول کر

”آگے، آگے کیا زبان کھولے۔“ پرو سوٹ پٹا سا گیا۔ ابھی ابد رات بھی مانے کو ہے۔ جامنی بائی ایک رات سے بہت بڑا تھا بائیں کٹنا چھان کے بولے۔

”اور حجامنی بائی نے تم کو کب دیکھا؟“

”کم تر سمجھتا ہے استاد!“ پرو جو بھوک پڑا۔

”آگے بولو دادا!“

”تم سے بھل جھانی! اپنے کو بولو تم حجامنی بائی کو جانتا ہے؟“ ”کبھی نام نہ نہ تھا“

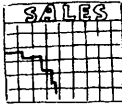
”صرف نام! دیکھنے کی چیز تھا۔ اور بیٹی میں امین نے تم کو پہل بار دیکھا تو حجامنی بائی بہت یاد آیا تم اس نیم ہوتا۔“

”اب وہ کہاں ہے دادا؟“ ہلا کرنے سے چہرے سے پوچھا۔

پہرے دار ہمارے قریب آئے اور کن آنکھیں سے جھانکتے ہوئے گزر جاتے۔ کل کی طرح اپنے نیموں میں سونے کے بجائے ہمارا الاؤ کے گرد بیٹھے رہنا ان کے لیے حیران کا باعث ہو گیا۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ الاؤ کے شعلوں نے کم از کم ہمارے اطراف کی سڑی دور کر دی تھی۔ تاہم ہوا کا کوئی تیز بھونکا چل جانا تو آگ بھی بھڑکنے سے لگتی۔ سولہ نے دیر ہوئی، چائے کی کیتلی انگوٹوں پر رکھ دی تھی۔ پانی کھولتے تھے تو کھل گیا کسی کرچائے پینے کا خیال نہیں آیا۔ جامو، پلاٹا اور مانی پرو کو تنکے چھو رہے تھے۔ ابھی رات بائی تھی، پرو کٹنے لگا کہ اس وقت جب حجامنی بائی دار

کے علاقے میں آڈا ہمارے ہونے تھی اور بے ناچ کی رانی تھی۔ پرو کا بھی ماہم کے علاقے میں ایک آڈا تھا، زیادہ بڑا تو نہیں مگر آمدنی کے اعتبار سے بڑے آڈوں سے کم نہیں تھا۔ چھوٹے جانے اور شراب کی کمی جھانپاں علاقے میں ملتی تھیں۔ اور دھڑکے پاؤں کے آدنی آگے پرو کو حجامنی بائی کے نقشے سناتے تھے۔ پرو ہاتھ کا پتھا تھا۔ ماہم کا آڈا اس نے اپنے ہاتھ ہی کے بل پر حاصل کیا تھا۔ بیٹی کے اور داداؤں کی طرح پرو کے دل میں کبھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ حجامنی بائی کے ہاتھ سے چاقو چھین لے سکیں پڑا اس کے بہت سے واقعات سن چکا تھا اور جب حجامنی نے بھی اس علاقے کو نہیں چھڑایا تھا تو اسے خواہ خواہ اس سے ہیر کر کے لے گیا ضرورت تھی۔ دوسرے دادا حجامنی بائی کو دادا کے علاقے سے قتل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے شوکر کر دیا تھا کہ وہ کالا جادو کرتی ہے۔ پرو کو ان روایتوں پر یقین نہیں تھا لیکن اگر اس میں ایک فی صد بھی سچائی تھی تو اسے مخاطب رہنا چاہیے تھا۔ پرو کسی کے کسانے میں نہیں آیا۔

اور چند دنوں سے پرو کے آدنی اس کے پاس شکایت لے لے کے آ رہے تھے کہ حجامنی بائی کے آدنی اس کے علاقے میں گھس کے پیسہ پالے ہے۔ ہاں اور بھی پاؤں کے داداؤں کو بھی شکایت تھی۔ حجامنی بائی کی شہرت کی وجہ سے اس کے آدنی بے مسا ہوتے جا رہے تھے۔ دار کے علاقے میں حجامنی بائی کے ڈیرے وہ کچھ تین کر پائے تو دوسرے علاقوں میں جا کے لوگوں کو تنگ کرتے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب کوئی بھی حجامنی بائی کے آڈے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بس اس سے دور دور آگ رہنے ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ سو کسی کو ان کی شکایت کی حرارت بھی نہیں ہوگی۔ ہوتا بھی یہی تھا کہ حجامنی بائی کی وجہ سے لوگ انھیں دنگڑا کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کا کٹ کھانا پڑھنا گیا بہت لوگوں کا خیال تھا کہ حجامنی بائی خود اپنے آدنیوں کو دوسرے پاؤں سے جھپٹ بھاڑ کے لیے بھیجتی ہے۔ پرو کے لیے یہ بات فاسی نشوونما کی تھی کہ وہ اس کے علاقے تک پہنچ گئے ہیں مگر پیرو نے جلدی نہیں کی۔ خود علاقے میں گیا۔ انھیں سمجھا کہ ان جاؤ۔ وہ پیرو کے منہ گلنے لگے۔ پیرو نے پھر محفل کیا اور کسی دن شام کو دادر کے علاقے میں پہنچا اور حجامنی بائی کو کھلا دیا کہ ماہم کا پیرو دادا ملنا چاہتا ہے۔ حجامنی نے فوراً بلوا یا۔ پیرو کیلا پاڑے میں داخل ہوا تو وہ ایک تخت پر بیٹھی تھی۔ پیرو نے اسے پہل پار دیکھا تھا۔ پرو کہہ رہا تھا کہ تخت پر وہ کوئی ملک معلوم ہوتی تھی۔ کچھ سب تک



کیا؟ تم اس سے کیوں نہ لو لے؟

انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن جامنی بانی کی آنکھوں میں لگ اور ہاتھ میں خنجر دیکھ کے کچھ کہنے لگے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ جامنی کا خنجر اٹھے اور اداؤں میں سے کسی ایک کے سینے میں پیریت ہو خنجر اُس نے اٹھا بھی لیا تھا مگر کچھ سوچ کے رک گئی، بولی ابھی تم اپنا فیصلہ غور کرو۔ "تینوں آدمی چند لمحوں میں اُس کا چہرہ نکال کر پھر ایک دم تیزی سے آگے بڑھے اور کتوں کی طرح پیرو کے قدموں سے لپٹ گئے۔

پرو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ ٹھیک ہے علیٰ بانی وہ اٹھتے ہوئے بولات اپن اب جاتا ہے۔ پرو نے کتے کو نواہ کر دیا مگر اُس کا جی دواں سے جلنے کو نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹھو دارا! کوئی اور کام ہو تو روبرو؟"

"اپن کو اتنا ہی کام تھا، پرو نے تدم لمبے میں کہا۔

"ابھی اپن ان کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اپن کا فیصلہ رہ گیا ہے۔ جامنی بانی سرد آواز میں بولی۔

"ابھی اتنا ٹھیک ہے جامنی بانی!"

پرو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اپنے سب آدمیوں کو باہر جانے کا حکم دیا صرف وہ اور پرو اُس بڑے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

پرو اُس کے قریب ایک نوٹ دے پر بیٹھا ہوا تھا۔ گلوں کے جانے کے بعد وہ نوٹ پر کچھ نہیں بولی۔ پرو بھی خاموش رہا مگر اُسے اس خاموشی سے جلد ہی آگاہ ہٹ سی ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ جامنی بانی سے اُس کے بارے میں کچھ پوچھے۔ بے شمار سوال اُس کے دماغ میں اٹھ رہے تھے لیکن پرو زبان بند کر کے رہا جامنی بانی نے میل کی اور اُس سے باہر کے علاقے کے متعلق پوچھنے لگی۔ پرو کو شبہ ہوا کہ کہیں جامنی کی نظر اُس کے علاقے پر نہ پڑے ہو مگر اُس نے

دیر کے لیے تودہ بھول گیا کہ وہ یہاں کہیں آیا ہے اُسے دیکھت ہی رہا۔ اُس کا بدن ترشا ہوا تھا، ساپچے میں ڈھلا ہوا، گردن لائی تر آٹھا ہوا، قد بڑا، بال کھلے ہوئے۔ گہرے رنگ کی ساڑی سے اُس نے اپنا سارا بدن ڈھانپ رکھا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں کے گجرے، ناک میں لوہنگ اور گلہاڑیوں میں چوڑیاں چوڑیوں کے سوا بدن پر کوئی زیور نہیں تھا۔ چمکنا ہوا جامنی رنگ پیرو کے کتے کے مطابق جیسے کوئی بچی ہوئی جامن شام سے توڑی جائے، زمین سے نہ اٹھانی گئی ہو۔ عمر میں وہ بالکل لڑکی نظر آتی تھی۔ اُس لوکی کے مانند جس کا شوہر شادی کے فوراً بعد چھن گیا ہو۔ سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں، نیلا ہٹ لیے ہوئے سیاہ آنکھیں جو گہری گہری ڈوبی ڈوبی اور بڑی بڑی تھیں۔ ان میں چمکنا ریاں سی لپکتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بھی پیرو کو دیکھ کے چپ رہی پھر پرو ہی کچھ پوچھنا آیا۔ سینیل کے بولات جامنی بانی اپن تم سے کچھ بولنا چاہتا ہے۔

جامنی جتنے کے مانند ساکت بیٹھی رہی۔ پرو نے تلخی سے کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو روک لے۔ جامنی بانی کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اُس نے جواب نہیں دیا۔ پرو کو عجیب سا لگا۔ اپن پھر اپنے آدمی ابڑ بھیجے کیا؟ ان کو روک لو جامنی بانی، اپن بھی ان سے آؤد فرمٹ کرنا تھا، پرسوچا پہلے تم کو بل لے۔ پرو نے اشتعال میں کہا۔

جامنی بانی پرو کی آواز پر جیسے خواب سے جاگی اور اپنی لائی لائی پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ واوا! ابھی آؤد سے بیٹھو، پرو کہتا تھا کہ اُس کی آواز کھن کھنکھناتی تھی۔ پرو جھپکنے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جامنی بانی نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ پرو کے سامنے اُسی وقت صراحی اور گلاس رکھ دیے گئے۔ پہلی مرتبہ جامنی بانی نے کسی کو اس طرح شراب پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ پرو نے ایک گلاس پی لیا اور بولات ابھی تھا کیا جواب ہے جامنی؟

جامنی نے اپنے پاؤں کے سائے آدمیوں کو اندر بٹا لیا۔ اور پرو سے پوچھا۔ ان میں سے کون تھا دارا! پرو نے تین آدمیوں کی طرف انگلی اٹھائی۔ ابھی اپن ان کو پہچانتا ہے اور دونوں کا اپن کو پتہ نہیں۔

پرو نے جن آدمیوں کی نشان دہی کی تھی ان کے سوا کسی نے واویلا نہیں کیا۔ وہ پیرو کے آدمیوں کو اتنا الزام دیتے تھے۔ جب پرو جامنی نے ہاتھ اٹھا کے کہا آؤد وہ تم کو پھینچ لے گئے تھے

کسی بچک کے بغیر جواب دینا یہ علاقہ چھوٹا پر جھلا ہے۔ پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ کبھی اودار اپنی طرف آؤ جامنی بائی! ” تم بولتے ہو تو خود آؤ میں گے دادا! ” وہ ٹھٹھکی سے بولی۔

پیڑ اس سے کچھ اور تین کھڑکے۔ وہ یہاں پہلی بار آیا تھا۔ دھلے جامنی بائی کیا جھکتی اور خود اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ ایک علاقے کا دادا ہو کہ اس پر اچھا محسوس ظاہر کرے چنانچہ اس نے اختصار برتنا اور رسمی طور پر جامنی بائی کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔

پیڑ تیار ہوا تھا کہ وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اپنے پاؤں سے آنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی کی آنکھیں اس کے ساتھ آگئی ہیں اور اسے گھور رہی ہیں۔ ابھی ایک رات نہیں گزری تھی کہ صبح اٹھے اطلاع مل۔ جامنی بائی کے پاؤں کے قریب کوڑے کے ڈھیر پڑیں آدمیوں کی لاشیں پڑی ملی ہیں پولیس نے جامنی بائی اور اس کے پاؤں کے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ پیڑ کو اس خبر سے دکھ ہوا۔ یقیناً یہ وہی تین آدمی ہوں گے جن کے بالے میں کل شام جامنی بائی نے کہا تھا کہ ابھی اس کا فیصلہ باقی ہے۔ پیڑ دن بھر سے چین رہا۔ وہ تیار تھا کہ پولیس اسے بھی ملا گی۔ پولیس کا کوئی آدمی اسے بلانے نہیں آیا اور دوسرے دن دوپہر اسے خبر ملی کہ جامنی بائی اپنے ساتھیوں سمیت تھانے سے پاؤں والیں آگئی ہے۔ اس کے تین دن بعد سر شام وہ پاؤں سے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی نے اسے اطلاع دی۔ ” دادا کا جامنی بائی ایدر پاؤں کی طرف آ رہا ہے۔ “

پیڑ بہت جبران ہوا، خود دوا ہوا پاؤں کے باہر گیا۔ جامنی بائی تیار دروازے پر موجود تھی۔ دادا! اپن آگئے! اس نے ہولے سے کہا۔

” تم، تم جامنی بائی! پیڑ وحشت سے بولا۔ ” آؤ، آؤ، اندر آؤ۔ ابھی اپن کوئی پہنا دیکھنا ہے کہ ایدر کھڑی کا کوئی کل آٹ ہرگیز ہے۔ “

جامنی بائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی کھلی۔ وہ پیڑ کے پیچھے پیچھے اندر آئے گی پاؤں کے تمام لوگ اسے دیکھ کے بہت زدہ تھے اور اس کی آمد کا قصہ جاننے کے لیے بے تاب تھے اس سے پہلے جامنی بائی کے بالے میں کبھی نہیں سنایا گیا تھا کہ وہ کسی پاؤں سے میں خود آتی ہو۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ پیڑ اسے ایک کشادہ اور صاف کرے میں لے آیا اور پوچھا کہ وہ اس کی کیا خاطر کرے جامنی بائی نے کہا کہ اسے بھیج بھڑکانا نہیں ہے۔ پیڑ نے اپنے تمام آدمیوں کو باہر نکال دیا۔ ” تم نہ بولا تھا، اپن ادھر آ گئے۔ “

وہ دھیمے دھیمے بولی۔

” تم نے ایدر کے اپن کو بہت بہت غصہ کیا۔ “ پیڑ کو سب لفظ نہیں مل سکتے تھے۔ ابھی بولا اپن کیا۔ کیا کرے؟ “

” پیڑ ہو دادا! “

” بیٹھا تو اپن ایدر ہی ہے۔ پر اپنے کو۔۔۔ “

جامنی نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو پیڑ بوکھلا گیا۔ ” اپن صرف تم سے ملنے، تم کو دیکھنے آیا ہے۔ وہ ڈوٹی آؤ میں بولی۔

” ہو ہو، پیڑ پہلو بدلنے لگا۔ ” اپن تمھارے سامنے ہے۔ “

” تم ایدر دادا کیسے ہو گئے؟ “

” کیوں، کیوں، پیڑ کا خون بہہ نکلنے لگا۔ ” تمھارا مطلب؟ “

اپن کو یہ سب باپ مرتے ٹیم نہیں لکھ گیا تھا جامنی بائی! “

” جانتے ہیں دادا! “

” پھر تم کیا بولنا چاہتا ہے؟ “

” کچھ نہیں دادا! “ وہ کسی فردا داسی سے بولی۔

” نہیں تم کچھ بولنا چاہتا ہے؟ “

” پیڑ نے اپنی نظریں جھکا لیں اور ڈیڑھ جیسے کچھ سوچتی رہی۔

پیڑ نے بھی بات وہیں چھوڑ دی لیکن اس کا اضطراب سوا ہو گیا تھا۔ اسے کچھ بولنے میں اس لیے دھڑک رہی تھی کہ

ابھی تک وہ جامنی بائی کی اچانک آمد کا سبب طے نہیں کر سکا تھا۔ دادر سے چلتے وقت اس نے رشتا جامنی بائی سے آنے کو کہا

اور اس کا خیال تھا کہ رشتا ہی جامنی بائی نے حامی بھری تھی مگر

اب وہ سامنے بیٹھی تھی اور اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی بھٹی بھٹی

آگنی جیسی خوشبو بکھرے میں چھا گئی تھی۔ پیڑ کا تذبذب بے جا

نہیں تھا۔ اسے اس کے آنے سے ایک خوشی تھی تو کتنی اندیشے

بھی لاحق تھے لیکن ہے اس کا کوئی اور ارادہ ہوا وہ پیڑ کو اپنی

مرگت کے اہلاد پہ بعد میں شبانی ہو۔ وہ خواہ مخواہ جامنی بائی سے

کوئی کہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس چھڑک کا کوئی جواز ہونا تو ٹھیک

تھا۔ مبینہ میں بہت سے علاقے تھے جہاں جامنی بائی کی طرح

دادا پاڑا چلاتے تھے اور بے دلیل ایک دوسرے کے معاملے میں

دخل دینا پسند نہیں کرتے تھے لیکن کوئی دلیل پیدا ہونے میں

دیر بھی لگتی گنتی ہے۔ بدیہی بھی ایک دلیل ہے اور کسی وقت

بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چاقو اور زور بھی ایک دلیل ہے۔ پاؤں میں

یہی ایک دلیل چلتی ہے۔ پیڑ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ جامنی بائی

کو ایک سمان سے مختلف درجے اور اس کی خوشنودی کیلئے

اپنی طبیعت کے خلاف کوئی بات کرے اور جامنی بائی پر کڑی ایسا

سب تک

اُونی، سوئی، رشتی، سبھی کپڑے بے کفایت
 ڈھل کر فوراً صاف اور اُچھے ہو جاتے ہیں
 اور ہاتھ بھی محفوظ رہتے ہیں۔



جیٹ سے گھر بھر کے کپڑے پل بھر میں اُجلے

تاریخ قائم ہو جیسے وہ کسی دفاعی حالت میں ہے۔ اپنے بارے میں وہ جاسنی بائی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات منہ سے کھلے آوارہ نہیں تھا۔ جاسنی بائی کے بچے کوئی اور دادا آنا تو بیرو کو اتنی اچھن پیش نہ آتی مگر وہ جاسنی بائی تھی۔ بیرو کو خود اپنی جانب سے خدشہ تھا۔ اپنے خون کی گرمی سے اور اسے یہ گرمی عزیز بھی بہت تھی۔ وہ جاسنی بائی کا ارادہ سوچنے کی جستجو میں تھا اور جاسنی بائی تھی کہ آگے گم غم سہی پیچھے گئی تھی۔

بیرو موضوع بدل کے اس سے پوچھے بنا اپنے علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اسے کچھ جانا تھا تو اس کی یہی ایک صورت سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کا علاقہ کتنا زرخیز ہے یہاں کے لوگ مکانات کا دربار لگیں بیان کتنی جھٹنیاں کا رہا ہے اور پچھے ہٹے ہوئے گودام ہیں وغیرہ وغیرہ کوئی دادا کسی دوسرے دادا کو اپنے علاقے سے متعلق ایسی باتیں نہیں بتا کر کرتا جو بیرو نے اس سے کہی تھیں۔ بیرو نے اس سے کچھ نہیں چھپایا نہ مبالغہ کیا۔ وہ اپنی کش مکش سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس دوران وہ بڑی طرح کسی بھی بدلے کی صورت حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ بہر حال اس صورت حال کے لیے اس کی سبکی کا کوئی پلہ نہ تھا، بیرو کو اپنے اس عزم سے طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ بیرو تھا، بیرو کی جگہ کوئی دوسرا دادا ہونا تو شاید یہ فیصلہ نہ کر پاتا۔ جاسنی بائی اس کے علاقے کا حال سن رہی، نہ اس نے انتہائی کا اظہار کیا، نہ سرد مہری کا سو بیرو کا غمتس گم نہیں ہوا پھر اس نے ان تین آدمیوں کا ذکر چھپڑ دیا جو درودن پلے ختم کر دیے گئے تھے۔ بیرو نے کہا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔

”اُن کو جانے دو دادا! جاسنی بائی بے دلی سے بولی۔

”ہم پرانے نے اُن کو عافیت کر دیا تھا۔“

”اپن نے نہیں؟ جاسنی نے زیر لب کہا۔ ابھی اُن کی بات

چھوڑو۔ وہ چلے گئے ہیں۔“

”چھوڑو“ بیرو نے جھینک کے بولا۔

”ابھی ادھر کی زد دل کی بات کرو۔“

”جو بولے لڑکے سے بیرو نے تیزی سے کہا۔

”ابھی تم سدا کے لیے ادھر پاؤسے ہیں رہنا چاہتے ہو؟“

”ابھی اپن کے ہاتھ پاؤں اک دم جھینک ہیں۔“

اس نے نظر بھر کے بیرو کو دیکھا اور کہنے لگی۔ ادھر تھا ارا

بہت من گنا ہے کیا؟“

”گنا کیلے؟“ اس نے میٹھا ہے۔“

”تم اس کو بڑھانا چاہتے ہو کیا؟“

”ابھی اپن نے ایسا سوچا نہیں ہے۔“ بیرو نے مذہذب سے

کہا۔ ”پر جاسنی بائی! اپن کو بولو! ایسا بولنے سے تم کیا کہو...“

”سوچتے ہیں تم کو دادا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

بیرو نے جھینک سے کہا۔ ”تم کو بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں! جاسنی بائی میرا بھگنے کے بولی۔“ پر اپن دادا ہے۔“

”اور اپن بھی۔“ بیرو نے اونچی آواز میں کہا۔

جاسنی بائی نے منع کیا تھا لیکن بیرو کے آدمی مٹھائیاں

نہیں جنزیر اور چائے وغیرہ لے کے آگئے تھے، بیرو کے کہنے پر

اس نے چند کا جو منہ میں ڈال لیے اور چائے پی لی۔ ابھی تم کچھ

اور پیے تو لالے؟“ بیرو نے جھینکے ہوئے کہا۔

”نہیں دادا! جاسنی بائی غور سے بیرو بولی۔

”اپن سوچا، پہلے تم سے پوچھ لے۔“

چائے پینے کے بعد وہ بھڑکی سوچ میں ڈوب گئی تھی،

ابھی نہیں نیم اور کیے۔ بیرو کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ بھی سوچتا رہا اور جاسنی بائی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی

کوشش کر رہا۔ آج بھی وہ گیارہ سال کی بیٹی سے کہتی تھی۔ کھلے

ہونے والے اس نے ایک بار سے باندھ لکھے تھے۔ کالوں میں جھول

کھلے ہونے تھے۔ ناک میں شہری رنگ چمک رہی تھی۔ جاسنی رنگ

پراس کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ پوچھنا تھا کہ جب وہ بات

کرنے کے لیے اپنے لبوں کو مٹیش دیتی تو اس کے سفید دانت

موتوں کے مانند لگتے۔ موتی جو بازی رنگ کی شکل میں بنے ہوئے

ہوں۔ انداز سے اس کے ہونٹ اس کا منہ بازی رنگ کا تھا، ہار سے

سارا جاسنی بیکایک جاسنی بائی کچھ بے چین سی ہو گئی اور اٹھنے لگی

”چلتے ہیں دادا!“

”یہ کیا؟“ بیرو نے جواب سے بولا۔ اپن اس کو کیا سمجھے؟“

”تم نے بولا تھا تو اب...“

”پر اتنے ٹیم کے لیے نہیں۔ تم کو آئے دیر کتنا ہوا ہے ابھی

چلنے کو بولتا ہے۔“ بیرو ابھی ہونے لے میں بولا۔

”بھڑکی آئیں گے۔“

”وہ جھینک ہے۔ مولد آؤ، ہزار باد آؤ، پر ابھی کہوں جاتا

ہے۔ بول چلا جائے گا تو اپن سمجھے گا، اپنے سے دھان کا خیال

نہیں ہوا۔ اپن جھکی ہے۔“

”نہیں بیرو دادا! وہ بھڑکی ہوئی آواز میں بولی۔

”بھڑکی ہے، بھڑکی ابھی اپن بیٹھے کو بولتا ہے جیسا ابرا نے

سب گنگ

کو رہتا تھا، پریشنے کہا کہ وہ تو کچھ بولی ہی نہیں، وہی سربے سُر
الپتا رہا ہے۔

جامنی کچھ دیر کے لیے اور بیٹھ گئی اور اس آشنائی میں اُس
نے پیر سے اُس پاس کے علاقوں کے بارے میں چند باتیں چھین
کر ان سے علاقہ کس دادا کے پاس ہے کہا ہے۔ پیر کو ان جوانوں
پر حیرت ہوئی جیسے جامنی کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اُسے بتانا
رہا اور اُس نے ان پاڑوں سے اپنے تعلقات پر کسی قسم کا تبصرو
کرنے سے گریز کیا۔

وہ جانے لگی تو پیر سے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ پیر
نے ایک آدمی سے کہہ کے اُس کے لیے کوٹور یا منگوا لیا تھی وہ بیٹا
میں سوار ہوتے ہوئے جامنی کے ہونٹوں پر لہر زب تھی۔ اُس نے
پیر سے پھر کسی دن اپنے پاڑے آنے کو کہا۔ پیر نے وعدہ کیا۔
جامنی بائی کے جاتے ہی پیر کے آدمیوں نے اُسے گھر لیا اور جامنی
بائی کے آنے کا سبب پوچھنے لگے۔ پیر کو خود کچھ پتہ نہ تھا تو وہ
انھیں بتاتا کہ سب ٹھیک ہے بابا، ظاہر ہے، پیر کے آتنا
کہہ دینے سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

جامن دن بعد کی بات ہے کہ پیر کے پاڑے میں ایک منبری
تھیں مٹھائی اور پھولوں کی دو ٹوکریاں لے کے آیا اور اُس نے غلیے
میں انھیں صرت پیر کے حوالے کیا شکل و صورت سے وہ کسی
پاڑے سے متعلق آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹوکریاں جامنی بائی نے
بھیجی تھیں۔ پیر نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور تیسرے روز اپنی طرف سے
پھولوں پھولوں اور مٹھائیوں پر مشتمل چار ٹوکریاں جامنی بائی کو بھیجیں
اُس نے بھی اپنے پاڑے کے بجائے باہر کا ایک آدمی منتخب کیا۔
پاڑے میں کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ جامنی بائی کی طرف سے کوئی
سوغات آئی ہے اور پیر نے بھی جیسا با اُسے ٹوکریاں بھیجی ہیں، اپنی
بائی نے انھیں شکریے کے ساتھ قبول کیا اور سکوا یا کہ بھنے کی شام
اپنے پاڑے میں وہ پیر کی منتظر رہے گی، بیچ کے دو دن پیر کے لیے
نمازت اضطراب کے تھے۔ جامنی بائی کے پاس دوا دوا جانے کے
خیال سے اُس کے دل صومناغ میں عجب عجب احساسِ جہم لے
لے تھے۔ اس دوران وہ خاکے بنانا، بکھڑا مارا اور جد جہنہ آیا،
سورج ڈوبنے لگا تو اُس نے داور کے علاقے کا رخ کیا۔ وہ اپنے
ساتھ کسی آدمی کو نہیں لے گیا تھا۔ جس وقت وہ جامنی بائی کے
پاڑے میں داخل ہوا وہ نیلی ساڑی پہنے، ہونٹوں پر ایک مٹی کی سکر سٹ
لیے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کی چمکتی
نظروں نے پیر کا طواف کیا اور وہ اسے فوراً اندر لے گئی پالنے

سب بنگ

میں کوئی اور شخص نہیں تھا۔ البتہ اوپر ہی منزل پر جامنی بائی کی دو
خادما میں موجود تھیں۔ پیر ایک صاف ستھرے بچے ہوئے کمرے
میں اُس کے بیٹھ گیا۔ کمرے کی دیواریں رنگین تھیں۔ دروازوں اور
کھڑکیوں پر لٹھی پڑے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں
بھلی ہوئی جامنی کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک مختصر قالین بنا
درز، بھیجی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی میز پر صراحی اور گلاس لٹکے ہوئے
تھے جامنی بائی نے خود اسے جام بنا کے دیا، اُسی وقت گت میں
رنگ اور بوٹے قد کی ایک خوب صورت لڑکی راتق ہوتی پیر سے
پہننے، گھنگرو چھنکا کا آواز آئی اور اُس کے آنے ہی پر نویم اور ستار
کی آواز گونجنے لگی۔ ساڑھ سے کمرے ہی میں کہیں تھے، نظر نہیں
آئے تھے لیکن جلد ہی پیر کو تہہ چل گیا کہ وہ سامنے لٹکے ہوئے دیز
پیلے پڑے کے پیچھے موجود ہیں۔ لڑکی نے دونوں کو جھک کے
سلام کیا اور رقص کرنے لگی۔ پیر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سولہا
ہے اور کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ جامنی بائی ایک دوسرے گاؤ
جینکے سے ٹیک لگانے اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُسے اس طرح
بیٹھا دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی پاڑے سے متعلق ہے
اور چاقو اٹھا نا جامنی ہے۔ وہ یں ایک عورت تھی، ایک لڑکی۔
پیر نے چاہا کہ وہ اُس کے اور قریب ہو جائے، بہت قریب
ہو جائے لیکن وہ خود اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکا، دجامنی کی طرف
ہاتھ بڑھا سکا، نہ اُس سے اپنی خواہش کا اظہار کر سکا۔ جامنی
بائی کی طرف نظریں اٹھانے ہی اُس کا ارادہ ستر لزل ہو جاتا تھا۔
وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک دم رانی لگتا تھا۔ اپن سالارانی سے کہے

غیر مُمالک میں مُقیم افراد

جکپات سے رکنڈ رشیڈ گاریاٹ

پاکستان میں خود منگو اچیت

تحفہ میں اجل خاندان کو بھجوائے

اعلیٰ معیار - پاکفائیت

اور ساتھ ہے

آپ کی رقم کے تحفظ کی مکمل ضمانت

تفصیلات کیلئے دیکھئے

العبد کارپوریشن

21-11-14 دہلی آئیڈ - ڈینو بکال - ایم اے جناح روڈ

پوسٹ بکس 709 کراچی - پاکستان

بول سکتا تھا؟

• جاسوئے درمیان میں دخل دے کے پرچھا: دادا! اور تم؟
”تم بھی بولو؟ تم اس وقت کیسے لگ رہے تھے؟“

پیر نے اُسے جہر کے کما۔ اپن کیا جانے پر جھک جھکا ہی ہوگا۔
پیر نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ خود کیا معلوم

ہو رہا تھا۔ اب بھی اس کا مترج و سفید رنگ اس کے گالوں پر دکھتا
تھا۔ اس کے گھٹنگر لالے بالوں پر ابھی تک سیاہی غالب تھی۔ نگ

بھگ بیس سال پہلے کی بات تھی، اس وقت پیر کو کہا جا رہا تھا۔
تد کا بڑا، کاغذی کاغذی طور و خال کا ٹیکھا۔ بڑی آنکھیں کھل

پیشانی پر جوڑے تھانے اور اچھلے، واسینہ۔ وہ بھی کوئی شہزادہ معلوم
ہو رہا تھا کسی راج کمار سے کیا کم۔ جامنی بائی اپنی جگہ بیٹھی رہی

اور پیر کو آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے حواس میں ایک
چھوٹا سا سرور لہجہ رہا تھا اور وہ پیر سرور نوڑنے کے لیے اپنے آپ

سے مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جامنی بائی کے سامنے
مرد بکس ہو جائے۔ لڑکی ناچتی رہی۔ جامنی بائی نے ناچ کے دوران

اُسے دوسرا جام بنا کے دیا۔ پیر نے منع نہیں کیا، وہ چمکیاں لپٹا
رہی دیکھتا رہا مگر اس کا دھیان رقص میں نہیں تھا۔ وہ سلسل جامنی

بائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لڑکی نے ناچ کے دو تین جھانکے
ہوں گے کہ جامنی نے اگلے کے اشارے سے اُسے روک دیا

اور پیر سے پوچھا کیا رقص جاری رکھا جائے؟ پیر نے بول
ہی سر ہلکا کے انکار کر دیا۔ اس میں اس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔

پھر خاموشی نے کھانا لگا دیا۔ کھانوں کی اقسام کم تھیں مگر وہ سب
نفاست سے چنے ہوئے تھے اور نہایت لذیذ تھے۔ جامنی بائی اس

قدر تکلف سے کھا رہی تھی کہ پیر کو کھانا پڑا۔ ابھی تم کو کچھ کھانا ہی
نہیں۔ اب یہی تم سے اپنی ہی بولے کیا؟

”کھا ہے، میں دادا!“ وہ قہقہہ لہجے میں بولی۔
کھانے کے بعد جامنی بائی نے پھر اس سے پوچھا کہ کب

دوبارہ ناچ کا اہتمام کیا جائے۔ پیر اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔
سو اس نے کما۔ ابھی تمنا مرضی ہو تو چلے گا۔

جامنی بائی نے لڑکی کو نہیں بلکہ اپنا اور اپنے لب جیسے سی
کے پیچھے گئی۔ پیر کو خاموشی، پیر کو کا داغ کا سام نہیں کر رہا تھا کہ وہ

کیا کہے کیا کرے؟ کیا بولیں ہی بیٹھا کبھی دلواریں؟ کبھی جامنی بائی کو
گھوڑا لے۔ سکوت کے ایک طویل وقفے کے بعد جامنی کے مہن

میں جنبش ہوئی، اس کی پلکیں تھوڑی تھوڑی اور اس کے ہونٹ سکڑنے
اور پھیلنے لگے جیسے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو۔ دادا! وہ گڑبڑ

بھی میں بولی۔ اپن تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔
”اپن کو حکم دو۔ پیر نے غل کے کما۔

”حکم نہیں ہے۔“
”جو بھی بولو اپن سننے کے لیے بے کل ہے۔“

”ابھی اپن تم سے سب بول رہے تھے۔ اس کی آواز سنی ہوئی تھی۔
”ہاں! ہاں!“

”پتہ نہیں سنم کیا بولو گے؟ پر اپن کو اس کی جنتا نہیں ہے۔“
”اپن کے سن میں تھکالے لیے بہت جگہ ہے۔“

”اپن نے سوچا، تم سے سب کہیں کچھ نہ چھپائیں جو کچھ اپنے
پاس ہے ابھی بول دیں۔ تم روز ادھر آ سکتے ہو، ذرا دن ادھر جا

سکتے ہیں۔“
”تم بولو گی تو ان روز ایدہ آئے گا۔“

”اپن کو بھی ادھر آنے کے لیے کسی سے بولنے کی ضرورت
نہیں ہے پر ایسا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بولی۔

”پھر جو ٹھیک ہے بولو۔ پیر نے بے تابی سے کما۔
وہ چند لمحے حجب رہی پھر لڑکی کی آواز میں بولی۔ اپن

سدا کے لیے تم کو اپنا اور اپنے کو تمنا کرنا چاہتا ہے؟
پیر کے کان میں گونجے۔ ”جامنی بائی!“

جامنی بائی نے سر جھکا لیا۔ اپن کو لاگ لپیٹ نہیں آتی
صاف بول دیے ہیں پر اس کو کچھ اور مت سمجھنا۔ اپن کی ابھی مرضی ہو۔

”جامنی بائی! پیر کی سسکی نکل گئی۔
”تم کو بہت حیرت ہے کیا؟“ وہ بولی۔

”نہیں! نہیں۔“
”کیا اپن کے لیے ایسا بولنا ٹھیک نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں کہیں نہیں۔“ پیر نے بدحواسی سے کما۔
پیر کو کاسا لاجم لگ گیا تھا جو کچھ اس نے سنا تھا، اس

کی بازگشت اس کے رگڑاپے میں سن سنا رہی تھی۔ اس کے
باوجود اُسے اپنا سنا ہوا ایک سراب معلوم ہو رہا تھا۔ جامنی بائی کے

اطلا میں کوئی بات مراحت طلب نہیں تھی، اس نے جو کما تھا
اُس میں کوئی ترن نام کوئی ریز، کوئی آمیزش نہیں تھی۔ اُسے صاف

سنا، صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ دن کی طرح، اجلا، رات کی طرح سیاہ
تھا، پیر کو ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی نے اُسے اٹھائے آگ

میں چھینک دیا ہے۔ اس کے مساموں سے پسینہ رس رہا تھا۔
جامنی بائی نے ایک مضطرب نظریے سے اُسے دیکھا اور کہنے لگی کہ اُسے

احساس ہے ایسا کتنا کتنا بڑا ہے جو کہہ دیا اس کو کتنا کتنا مشکل ہے
سب تک

لیکن اُس نے سوچنے سمجھنے کے چند لمحوں کا عذاب بھگتنا ہے یا سود و زیاں کے چند لمحوں کا گناہ بھی کیا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اُس کا کیا ہوا ہے اُس کا سنا ہوا نہیں چنانچہ اُس کا فیصلہ پیر کے افراد انکار سے مشروط نہیں ہے۔ پیر کو اختیار ہے کہ وہ اُسے قبل کرے یا رد کرے۔ اُس کا نہ کوئی دعوایہ نہ حکم اُسے بے شک اقرار میں خوشی ہوگی تو انکار میں دکھ و محرومی کچھ اُسے طے لگا، وہ اُسے اپنی قیمت کا لکھا تصور کرے گی۔ اُس نے پیر کو اپنا دیوتا تسلیم کیا ہے اور دیوتا کی مرضی اُس کی داسی کے لیے ہر حال میں تسلیم ہوتی ہے۔ جامنی بائی کہنے لگی کہ زندگی میں پہلی بار اُس نے کسی سے کچھ کہا ہے اور اُس کی التجا ہے کہ پیر اُسے پاڑے کے ایک دادا کی فرمائش سمجھ کے قبول نہ کرے۔ اُس نے اپنا سب کچھ اپنے دیوتا کے حوالے کر دیا ہے اور یہ کوئی جھینٹ نہیں جس کے عوض دیوے اُس کی خوشنودی کا سودا کیا جائے۔ پیر چاہے گا تو وہ ابھی پاڑا چھوڑ دے گی۔ پیر کو کہے گا تو وہ یہیں لے کر آئے گا جھوپڑی میں لے جائے گا کسی محل میں بیٹنے سے لگائے گا پھوڑا سے پاؤں پاؤں کرے لیکن اگر اُسے اپنی آرزو کے اظہار کی اجازت دی گئی تو وہ اپنے دیوتا کے ساتھ کہیں دو جانا پسند کرے گی۔ پیر دیکھنے کی سی حالت میں سننا دیا۔ اُس کے لیے یہ سب بہت خواب ناک بہت عجیب تھا۔ اُس دن جامنی بائی کے اپنے پاڑے میں آنے کے بعد سے اُس نے بہت سے غامکے بنائے تھے، اُن میں ایسا کوئی غامک نہیں تھا۔ پیر کی عزت زیادہ نہیں تھی۔ اس مختصر زندگی میں اُس پر بہت سے وقت گزرنے لگے تھے مگر وہ کسی ایسے وقت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اُس نے زندگی میں بہت سے سوالوں کے جواب دیے تھے، یہ سب سے مختلف سوال تھا۔ جامنی بائی! اُس نے بالکل اپنے حواس بجا کیے اور مذہبی کاتی آواز میں بولا۔ میں کرو، ابھی اپنا تم کو کیا بولے؟

”اپن نے کسی جواب کے لیے تم کو نہیں بولا ہے۔“

”جامنی بائی!“ پیر نے جھپٹ کے اُسے اپنے بازوؤں میں جھینک لیا۔ پیر کو کتنا تھا کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے نا آشنا تھیں لیکن وہ سب کہیں نہ کہے ہوئے تھے جن کا ملم پیر کو نہیں تھا۔ اُس رات اُس کی آنکھیں چھٹ پڑیں، اُس کا سارا چہرہ جھیک گیا۔ جامنی بائی بھی سسک رہی تھی۔ وہ اُسے کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ جامنی بائی نے بہت دیر کو دی تھی۔ پیر کو داغ ایک اندر شخص کے خیال سے لبرن تھا، وہ بھی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی۔ اُس کے سینے میں بھی دل کی جگہ سب بنگ

بچوں دھڑکتے تھے۔ پیر نے گن رہا تھا کہ وہ کب آتی ہے۔ پیر نے اُس سے کہا تھا کہ وہ آفری سانسوں تک اُس کی راہ کھانا لے گا۔ اُس لڑکی کے گھر والے عزت شان کے لوگ تھے اور وہ اپنی نازک بدن بیتی کے لیے کسی ریاست سے آنے والے ایک راجہ کار کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہاں میں پیر نے اُس راجہ کار کی جگہ لے لی تھی پیر کو کہے پاس کوئی ریاست نہیں تھی، داس کا کوئی تجربہ تھا، نہ دنیا، نہ زمین، نہ پیش منظر۔ جامنی کے خناؤں میں اُس کا نام سر فرست تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا، اُس کا ہنر صرف چاقو تھوڑی لوکی والوں نے اُسے مستر کر دیا لیکن لوکی نے نہیں۔ وہ اپنے گھر والوں کو آمادہ کر رہی تھی اور اُس نے پیر سے کہا تھا کہ اگر وہ انھیں منانے میں ناکام ہوگی تو ایک دن سب کو چھوڑ کے اُس کے پاس چلی آئے گی اور وہ ایسی ہی تھی۔ پیر کو یقین تھا کہ دنیا بدل جائے گی، وہ نہیں بدلے گی، اُسے ایک دن آنا ہے کسی بھی لمحے وہ ساری زنجیریں اس کے بندھن توڑ کے اپنی منزل اپنے مرکز پر آجائے گا۔ پیر کی ذات میں جذب ہونے اور پیر کو اپنی ذات میں جذب کرنے۔ پیر اُس دن کا بے قرار سی سے منتظر تھا۔ اُس نے جامنی بائی سے کچھ نہیں پوچھا، سب کچھ کہہ دیا۔ جامنی بائی کی آنکھوں کے سمندر میں ایک ٹائیپ کے لیے غلام سا پیر ہوا محروم ہے ہی لے اُس میں ایک خیراؤ لگیا۔ پیر کو اُس غلام سے اتنی وحشت تھیں ہوئی جتنی اُس کے سکون سے۔ جامنی بائی سر جھکا کر غامکس رہی۔

رات گئے پیر کو داد کے پاڑے سے واپس آ رہا تھا تو اُس کے پیر کو لکھ رہا ہے تھے۔ اُس کا سارا جسم مل رہا تھا اور مڑا خالی تھا۔ اسی عالم میں کئی دن گزر گئے۔ پیر جامنی بائی کے پاس نہیں گیا مگر جامنی بائی ہر لمحے اُس کے سامنے ہی رہی۔ پیر ایک دن شام کو بچہ لارہ اُس کے تہہ داد کے پاڑے کی طرف آٹھ گئے۔ جامنی بائی کے کان جیسے اُس کی آہٹ پر گئے ہوئے تھے۔ پیر کو دیکھتے ہی اُس کا سر پٹا لڑ گیا اور اُس نے داما نہ نظروں سے اُس کا استقبال کیا لیکن اُس کے ہونٹوں پر سکوت کی مگر رہی۔ پیر اُس کے بعد بھی کئی بار اُس کے پاڑے میں گیا۔ جامنی بائی کی ڈبڈبی نظریں اُس کا سیدھ کاٹی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ پچھ چپا، محرم اور میلا آتا تھا۔ جامنی بائی بھی اُس کے سامنے بیٹھی کہیں اُس کے ہلوں میں سہمی جا، بنا کے دیتی رہتی اور وہ انھیں ملتی ہیں آٹھ لہنا رہتا تھا جا، زیادہ ہو جلتے تو جامنی بائی ہاتھ رکھ لیتی۔ مگر پیر اپنے پاڑے میں کسی کو اطلاع دے کے نہیں جاتا تھا مگر جامنی بائی کے ہاں اُس کے آنے جانے کی خبر پر پورس نہیں رہی۔ لوگ چومیکو ہاں کرنے لگے۔ وہ اُن سے بے نیاز جامنی

ہائی کے ہاں جاتا رہا۔ اُس کے پاس اُس سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تب بھی وہ جاتا رہا اُس کے پاؤں کے ساتھ اُسے متوجہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ پیرو اب اُن سے نہ ملاتے کا حال پوچھتا تھا، نہ آملی کا حساب لیتا تھا۔ دن بھر تیار وہ پاؤں کے کسی کمرے میں پڑا رہتا تھا پھر کہیں نکل جاتا اُس نے پاؤں میں چاقو فروغی نہیں لانا اور زور کرنا چھوڑ دیا تھا اور سویرے درز کش کرنے کا معمول بھی بھول گیا تھا۔ پیرو کے جسم میں اُس کے قبول دھواں سا پھرتا گیا۔ آنا دھواں اُس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا، آخر ایک روز اُس نے اُس لڑکی کو جاسنی ہائی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جاسنی نے اُس سے کیا کہا ہے، اُس نے اُس سے کچھ بھی نہیں پچھایا۔ اُسے اُنہی قید کردہ لڑکی کیا کے لیے کہو کہ اُس کا دل بھول کی طرح نرم، تیز مگر کی طرح ثقافت تھا۔ وہ پیرو کی سچائی، اُس کا ملاوٹی پیرو جب اپنا احوال کہہ کے اُس کے پاس سے اُٹھا تو اپنے آپ کو بے وزن محسوس کر رہا تھا لیکن وہ تقریباً ایک مہینے تک جاسنی ہائی کے پاس نہیں گیا۔ ایک مہینے بعد جب اُس نے دار کے پاؤں کے جانے کا فیصلہ کیا تو اُس کا خون تیزی سے گردش کر رہا تھا مگر وہ اُس کے عزم کی گردش کو بھی حسرت نہ بعد جاسنی ہائی نے پیرو کو دروازے پر دیکھا تو اپنے قابو میں نہ رہ سکا اُس کے بازوؤں میں چھپ کے پھنسی گئی۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی، ابھی اپن آگیا ہے۔ پیرو ہانپتے ہوئے بولا۔

”اسنے دن تم کدھرتھے دادا؟“

”اپن اپنے آپ کو ہمارا دھننا، جاسنی ہائی کی آنکھیں پھپکنے لگیں۔ اُس کی سمجھ میں پیرو کی بات نہیں آئی تھی۔ پیرو نے اُس کے کان میں پچپکے سے کہا: ”ابھی اپن تم کو ایدر سے لے جانا مانگتا ہے جاسنی ہائی!“

”دادا!“ وہ تڑپ کے بولی۔ ”تم کیا بولنے ہو؟“

”ہاں جاسنی ہائی! اپن نے بات کر لیا ہے۔“

”کس سے؟“

”اپنے آپ سے اور ابھی اُس سے جس کا اپن نے بولا تھا۔ اُس نے اپن سے بولا۔ پیرو جادو، جاسنی ہائی کو لے آؤ۔ اُس کو اپن نے ایک دم سب بول دیا تھا، سننا رہا اور سن کے بولا ہوا جادو، جاسنی سے بولا، اپن دونوں ساتھ ساتھ لے گا۔ نہ مانے تو بولو ہم اُس کی نوکرائی بن کے لے گا یا اُس سے الگ لے گا۔ پھر بھی نہ مانے تو بولو، اپن بالکل الگ ہو جائے گا۔ اپن نے بولا۔ ”تم نہیں ہوگا تو ایدر اپنا کیا ہوگا۔ بولا، ابھی تم ایدر سے جادو جاسنی ہائی ایسا نہیں کرے گا، اپن کو یقین ہے۔“

جاسنی ہائی کی مہموت آنکھیں اُس پر مرکوز رہیں۔

”تم نے سنا جاسنی ہائی! اپن کیا بولتا ہے؟“

”میں لاوا! دادا!“ وہ مڑھال ہو کر بولی۔

”بس ابھی تم تیار ہو جاؤ، چاقو اٹھاؤ۔“

”چاقو؟“ وہ پوچھنے سے بولی۔

”ہاں جاسنی ہائی! چاقو۔“

”چاقو کیوں دادا؟“

”ابھی اپن جانتا ہے کہ ایدر ویدر پاؤں کے داداؤں نے تم کو لے جانے کا کوشش کیا تھا اور تم نے بولا تھا اپن کے ہاتھ سے کوئی چاقو گرا لے تو اپن پھر ایک پل نہیں بھیرے گا۔ اُنہی کے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسا بولا تھا نا؟“

”ہاں، پر تم سے نہیں بولے تھے۔“

”اپنے سے نہیں بولا، ٹھیک ہے، پر اپن کو پتہ ہے اور اپن بھی ایک دادا ہے۔ اپن ابھی مختاری بات پورا کرنے کی کوشش کرے گا تم کو چاقو کے بل پر لے جائے گا اور اپن کے چاقو میں بل نہیں تو سلاٹم سے دور ہو جائے گا، اپنا منہ سدا کو نہیں کھٹکے۔“

”میں دادا! اپن تم سے نہیں ملو سکتا۔“

”کیوں نہیں ملو سکتا، پر تو جی سے بولا۔ اپنے کو بھیک نہیں چلتا، اُس نے تیرے منہ لے لیے ہیں جاسنی سے کہنا کہ اگر وہ چاقو نہیں اٹھائے گی تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے پیرو کے ساتھ رعایت کی ہے، غشش کی ہے۔ پیرو ہمیشہ اس میں اپنی سبکی محسوس کرتا رہا ہے گا۔ زندگی بھر اُسے غلش رہے گی کہ جاسنی ہائی نے اُسے کسی سبب سے دور کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نگاہ ملا کے رہنا چاہتا ہے، نگاہ چرا کے نہیں، اس کا منہ کے ساتھ نہیں کہ مہموت کے ایک پاؤں کے دادا کی حیثیت سے وہ جاسنی ہائی کا اہل نہیں تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جاسنی نے پیرو کو ایک دادا کی صورت میں نہیں دیکھا تھا اور اُس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ پیرو اُسے بھی ایک پاؤں کی دادا دیکھ لے لیکن اپنی ذات کے سکون آمیزہ دلوں میں جاسنی ہائی کی نظروں میں اپنی سرخوشی کے لیے پیرو اُس سے چاقو اٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

جاسنی ہائی مستحضر کھڑی تھی۔ اُس نے شدت سے اٹکا کر دیا اور بولی کہ پیرو کا ہڈیاں بے کیا اُس نے اُس لڑکی سے بھی جس کی اجازت لے کے وہ جاسنی ہائی کے پاس آیا ہے، اسی طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے۔ اگر پیرو نے اُس لڑکی سے کچھ نہیں کہا اور اُسے جس کا توں قبول کیا ہے تو جاسنی ہائی کے سلسلے

ہیں اس کی یہ خواہش کیوں ہے۔

”وہ جاسنی بائی نہیں ہے، پاڑے میں نہیں ہے۔“ پیڑ نے جھجھلا کے کہا۔ اس نے پہلے کسی کو ایسا نہیں بولا۔ جیسا جاسنی بائی نے بولا تھا۔

”واوا! اپنی تم سے نہیں لڑ سکتے، جاسنی بائی ناٹانی سے بولی۔ پیڑ نہیں مانا، کہنے لگا کہ جاسنی بائی کے انکار کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پیڑ کی شکست سے ہل سا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ پیڑ اس پر قابو نہیں پاسکتا۔ پیڑ کے لیے یہ صورت حال کسی غدا ب سے کم نہ تھی کہ اس کے بالے میں ایسا سمجھا جائے۔

”چھترم جھجھو! اپن جو بولے تھے، اس کو واپس لیتے ہیں تم اُسی جھجھو کری کے پاس چلے جاؤ۔ اپن کا دھیان چھوڑ دو۔ اپن بھی تم کو بھول جائیں گے۔“ جاسنی بائی شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ پیڑ نے کہا کہ اس طرح وہ اس کے شبے کی تصدیق کر رہی ہے۔ وہ پیڑ کو رسوا کرنا نہیں چاہتی مگر پیڑ کے لیے اس سے بڑی رسوائی کوئی نہیں کہ جاسنی اس کے خیال سے جا تو اٹھانے سے باز ہے۔ اپن جانتا ہے کہ وہ ایسا کیوں بولتا ہے چھترم بھی اپنے کو ابھی پیڑ دمت مانا، ماہم کے پاڑے کا واوا جانو جو پھلے واوا کی طرح تمہارے پاڑے میں جا تو چھوٹا ہے۔“ اس نے اشتعال میں کہا۔

”ایسا مت بولو، جاسنی بائی ترششی نے بولی۔ پیڑ ضد کرنے لگا۔ وہ ہم سے پوچھ رہا تھا، تباؤ میں اُسے ایسے کیسے لے جانا۔ پیڑ کے احساسات سمجھنا ہمارے لیے دشوار نہیں تھا۔ پیڑ نے اپنی زبان سے نہیں کہا لیکن اُسے بہت سے احساس ہوں گے۔ دوسرے پاڑوں کے واواؤں کا اور سب سے زیادہ اپنے آزاد کا۔ وہ اس عورت کو کیسے گھر لے جاسکتا تھا جس پر کئی اعتبار کا اُسے اعتماد نہ ہو۔ اگر جاسنی بائی پر کے بیان کے مطابق اُسی کے خیال سے پہلوتری کر رہی تھی تو پیڑ کے لیے یہ ہمیشہ کا تباؤ تھا۔

جاسنی اس سے التجا کرتی رہی لیکن منادہ التجا کرتی پیڑ کا صراحتاً ہی بڑھتا جانا اور جب جاسنی بائی نے یہ جان لیا کہ اس کا اکڑہ پیڑ کے لیے اتنا ہمیز کا کام ہے رہا ہے تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پیڑ کو کتنا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر گھٹاسی چھائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر اس پر سناٹا طاری رہا۔ تھیک ہے واوا! وہ شکستہ آواز میں بولی ”جیسا تم بولتے ہو، تھیک ہے۔“

پیڑ نے آگے بڑھ کے اُسے اپنی آنکھ میں سمیٹ لیا۔ ”جاسنی بائی! اس نے زندہ ہے مجھے لہجے میں کہا۔ ابھی تم سمجھو اپن ایسا کیوں مانگتا ہے۔“

جاسنی بائی کا سر پا اس کی آنکھ میں پھر کٹا رہا۔ پیڑ نے دیر نہیں کی۔ اُسے خدشہ تھا، جاسنی بائی اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ ”ابھی پاڑے کے سارے آدمی کو بلاؤ، اس نے جاسنی بائی سے کہا۔ ”اُن کو کہیں واوا!“ جاسنی بائی کی آواز لٹو لٹو کر رہی تھی۔

”اپن چاہتا ہے وہ صوب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپن تم کو اپنی تمہاری ماں کی تمہارے بھگوان کی سوگند دیتا ہے، اگر تم نے جا تو میں کوئی چوری کیا، اپن کا دھیان کیا۔ پھر لین چھاتی ہیں اس کو اتار لے گا، سمجھا۔“

صبح قریب ہی تھی، ہالے ارادہ گرو جھگڑا لگاتے ہوئے پھر دار ایک لحظے کے لیے بھی نہیں بیٹھے تھے۔ نہ صوف وہ بلکہ اُن سے دور کے لوگ بھی۔ اُن میں سے شاید کوئی نہیں سہا تھا۔ نالے نالے پر کئی لاواؤں مل رہے تھے اور اُن کے اطراف بیٹھے ہوئے بیشتر لوگوں نے متحیر اپنے ماتحتوں میں تیار رکھے تھے۔ پیڑ و سانس لینے کیلئے رک گیا تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اُسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ بچل کا منہ بھی اُسی کی جانب تھا۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ جاسنی بائی کی جو شکل و صورت پیڑ نے بیان کی تھی، اُسے سن کے بھی کے دل میں اُسے ایک بار دیکھنے کی خواہش جاگ ہوگی، ضرور بچل کے دل میں بھی۔ دیر ہوگئی تو جاسنی نے پیڑ کو ٹوکا۔

پیڑ نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کا منہ جیسے کھل گیا تھا۔ یہی کہی آواز میں کہنے لگا کہ خود ہی ٹریٹس جاسنی بائی کے حکم پر اُس کے پاڑے کے سارے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ اس دوران وہ تخت پر اپنے آپ میں گم ہو چکی رہی۔ پیڑ اس کے پاس تخت کے دوسرے سرے پر تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو وہ تخت سے اُتر آئی۔ پیڑ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلے گئے جگہ پہنچ گیا۔ جاسنی بائی نے ساڑھی کا پلٹر کر کے باندھ لیا اور اپنے بچھرے ہوئے بالوں کی لٹوں میں گرہیں لگا دیں، سر کو کبھی جھٹکے دیے اور اٹا

ایڈیٹر ڈیگ پاکستانی اخبارات
رسائل
خالد فضل ٹریڈر
نہاں اور اسکول کی کتابوں
کی فراہمی کے لیے (رابطہ قائم کیجیے)
100 گزریلی بلڈنگ صدر کراچی

ہاتھ بائیں جانب بڑھا دیا۔ پاڑے کے ایک آدمی نے فوراً چاقو اس کی طرف اچھا لاجامنی بائی نے چھرتی سے اسے ایک لہا چاقو ہاتھ میں آئے ہی اس کے سر پر بائیں ایک بھر جھری سی پیدا ہوئی اور اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں چند لمحوں کے لیے میچ لیں اس کے سینے میں ہوا جھانسا اٹھ رہا تھا۔ آنکھیں کھول کے اس نے پیر کو ایک نظر دیکھا۔ پیر کو ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ ”واوا!“ اس نے لرزیدہ آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”جامنی بائی! پیر نے وارفتگی سے کہا۔

مگر جامنی اسے مخاطب کر کے رہ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹی اور یکایک اس کے بدن میں ایک بجلی سی جھکی باکری شعلہ سا لپکا۔ اس کے پیچھے پھٹتے ہی پیر نے بھی اپنا چا تو تان لیا چشم زدن میں وہ دونوں آمنے سامنے تھے پیر کی نظر اس کے چاقو سے بندھی تھی۔

اس نے سن رکھا تھا کہ جامنی بائی کی آنکھیں اس کے متقابل کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں پیر کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ان میں جھانک رہا تھا۔ آنکھیں ہی نہیں جامنی بائی کے سالے بدن سے پرنگار لیں آہستی محسوس ہوتی تھیں۔ پیر کو اپنی توجہ مرکوز کرنے میں کسی قدر مشکل پیش آئی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ جامنی کے ہاں اس کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ گریا اس نے اس کی دی ہوئی قسم کا پاس کیا ہے۔ دیکھ کے پیر کی رگوں میں دوڑنا ہوا خون آبلے لگا اور اسے جامنی بائی کے دودھن ہی پینتوں سے اس کے متعلق سنی ہوئی رائیں چھٹ نظر آئیں۔ وہ کسی جادو کا کرشمہ تھا، نہ اس کی شرارت بار آنکھوں شعبہ۔

وہ سب جامنی بائی کے چاقو کا تماشا تھا کہ اسے چاقو تھا مٹا آتا تھا۔ پیر نے بہت سے لوگوں کو چاقو اٹھانے چاقو زلتے دیکھا تھا مگر جامنی بائی کا انداز سب سے جدا تھا۔ وہ اپنے مخالف کو اپنے ممکنہ داؤ کی ہوا میں نہیں گلے دیتی تھی۔ کبھی ادھر کبھی ادھر ایک پل میں اس بازو دوسرے پل میں اس بازو، اس کا بدن ہوا کے مانند تھا، سمندر کی آہستی ہوئی لہر پھر کی طرح۔ پیر کو ابنتا ہی اس اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں سوچنے کا کوئی لمحہ ملنا دشوار ہے سو جامنی بائی کا چاقو منتشر کرنے کی ایک ہی صورت اس کے ذہن میں آتی تھی کہ وہ خود آہی کا تیور اختیار کرے۔ اسے اپنے داؤ کی آہٹ کا احساس نہ ہوئے۔ وہ جیسا کہ جامنی بائی کا طریقہ تھا۔ جامنی بائی کا یہ طریقہ کوئی حربہ یا ہتھکنڈا نہیں تھا۔ چاقو پیر سے ہونے لگا تھا اور جسم کی قابو یافتگی کے اعتماد کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔

پیر کی خواہش تھی کہ جو کچھ ہونا ہے، جلد سے جلد ہو جائے، ویر تک آئے سامنے رہنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ شروع ہی سے جامنی بائی کی کلائی پیڑنے کی ٹکڑ میں تھا۔ جامنی بائی نے اپنا ہاتھ اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیا اور پیر ویلے ہی مرحلے میں ادھر ادھر سے بڑھ بڑھ کے جھپٹ جھپٹ کے اسے دفاعی حالت میں لانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے پیر نے اپنے جسم دماغ اور چاقو کی تمام صلاحیتیں آزما کے دیکھی ہوں گی۔ وہ بتا رہا تھا کہ جامنی بائی ہر مرتبہ اس کے زرنے سے بھدک کے بھل جاتی اور آٹا مانا پینتیزا بیل کے اس پر چھپتی۔ پیر دیکھی نہ کسی طرح کبھی جبک کے کبھی تیرا کے کسی طرف یکے اور اپنے آپ کرا چاہا کہ سمیت کے اس کا دارا کارت کو دیتا اور پیر اس کی تدبیر پر عمل کرتا کہ یکے جھپٹنے میں چاقو تانے اس پر اٹھنا، بڑھنا اور دلاڑن اس پر پھلنے کی کوشش کرنا۔

جامنی بائی کے لیے پیر جیسے کسی شخص کا تجربہ نیا ہو گا۔ ہم نے ہمیں اور پھٹکنے کے پاؤں میں اسے اپنے آدمیوں سے بار بار زور آزمائی کرنے دیکھا تھا۔ اب بھی اس میں ایسی پھرتی تھی تو جامنی کے ذہن کیسی ہو گی۔ اب کی نسبت جب ایک ہی فرق ہو گا کہ پیر کے ہاتھ میں گرمی کے ساتھ دماغ میں گرمی زیادہ ہو گی پیر پھل کے نزدیک ایک نامناسب بات تھی۔ اس نے کئی بار مجھے تائبہ کی تھی لاڑنے چاقو اٹھاتے ہوئے سر اگ لکھنے کی کوشش کرنا۔ خون کی گرمی کے اثر سے سر دودھ سی کھنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کہ آدمی اپنے جسم کی کھولتی ہوئی گرمی گودن سے اُتر پڑے نہ پھل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سر پیر کے مانند منہ ہونا چاہیے اس کی مراد یہ تھی کہ سر میں جس نہ ہو، کھلا ہی ہے تو بہتر ہے۔ پیر کو بھی یہ بات معلوم ہو گی۔ اس نے ماہم کا پاڑا میں ہی حاصل نہیں کر لیا تھا۔ بہت سے آدمیوں میں وہی آدمی آگے کا ایک بننا ہے جس کے جسم اور میں توازن ہوا اور اس کی طام سے جامنی بائی ہمیں کے ایک پاڑے کی واو تھی اور اس نے کئی پاڑے لیں ہی لوگوں کے سر دودھ کی تھوہ بھی اس توازن سے نا آشنا ہو گی۔ انھیں دس منٹ سے زیادہ گزر گئے تھے بشور تھا کہ جامنی بائی کو چند ہی لمحے گتے ہیں۔ اس کے آدمی جاردن طرف دم سامنے کھڑے تھے۔ بیچ میں پیر کو ایک بار شہرہ ہوا تھا کہ جامنی بائی اس کے ساتھ رعایت تو نہیں برت رہی ہے مگر پھر خود ہی اسے اس دھم کی توبہ کرنی پڑی کوئی پل ایسا نہیں گزرا تھا جب جامنی بائی نے اس کے وارے بچنے یا اس پر وار کرنے کا موقع کھو یا وہ دونوں سب تک

پہننے میں شراورد ہو گئے تھے۔ پروا سے اور تھکا دینا چاہتا تھا کہ اس صورت میں شاید کوئی وار کار کر ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے پر چافانو کا کوئی نشان ڈالنے سے بچ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گڑ بڑا دینے کے خیال سے چاقو کی بھیکیاں مے سے لے رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی اپنی اس نگاہ میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ گڑ بڑا کے کوئی بھی چافو نہیں چھوڑ دیتا۔ چافو ہر حالت میں ہاتھ سے چپکا رہنا چاہیے۔ یان کوئی چارہ زرد سے زرد دوسری بات ہے جو زرد بڑا کے چافو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ بھٹل کے کٹنے کے مطابق اُسے دوبارہ چاقو نہیں خٹامنا چاہیے پھر اُسے چاقو خٹامنا نہیں آتا چنانچہ ایک دوسرے کو متنبہ کرنے یا بولکھلا دینے سے اُن کا مقصد بعض کسی بہتر راؤ کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ اُنہماک اڈا کے نیچے گرانے، باز سے پیچنی ڈالنے۔ نوازن بگاڑنے اور کسی خاص جگہ سے نیچہ پھڑٹنے وغیرہ اس کامیابی حاصل کرنا ہوا تھی مگر نہیں ہو رہا تھا۔ جاسنی بانی، پیر سے وزن میں بہت کم ہو گئی۔ کلائی بھی اس کی پیرو کی طرح مضبوط نہیں ہو گئی۔ نیچے کی پکڑ بھی پیرو کے مقابلے میں کم زور ہوئی چاہیے لیکن کورسی اور مضبوطی کا تعلق داؤ نہ جاننے والوں سے ہوتا ہے۔ صحیح رنگ اگلی کی زرد پر آجائے نو دو پیکل آدمی بھی تڑپنے لگتا ہے۔ جاسنی بانی کو اپنی گرفت کا کوئی بھڑسا ہی ہوگا جیسا وہ اس پاس کے پاؤں کے واواؤں سے دور مافی کرنے دیتے ہیں۔ جھمکتی تھی۔ ہر طرف دائرے کی شکل میں کھڑے ہوئے دیول کے بیچ میں کھل جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ پیرو متعدد مرتبہ دائیں بائیں پھیر لگتا، پھیر پھڑٹا، نا بڑھاتا کسی ایک گوشے میں جاسنی بانی کیلئے جگہ تنگ ہو جائے اور اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جائے مگر وہ اُس تنگ گوشے میں آنے سے پہلے ہی اُس کے پہلو سے لڑکی طرح نکل جاتی تھی۔ اُس کے بدن میں بے مدد کی تھی۔ اُسے دھرا ہوئے، اپنے آپ کو تھک کرنے میں انہی دشواری نہیں ہوتی تھی جتنی پیرو کو ہوتی تھی۔ دونوں کے بیچ دیر تک چپ رہے، کب کب کھیل ہوتا رہا۔ پھر معا پر پیرو کے ذہن نے کوئی سی بدل یا جیسے اندھیرے میں امید کی کرن چھوٹی۔ اُس نے کسی تاخیر کے بغیر اسی پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

میں پرو پر لوٹ جاتی۔ اس گڑبڑا ہٹ کے دوران اس کا چاقو پرو کے جسم کے کسی حصے پر لگا سکتا تھا اور اس کا پنجہ بھی پرو کے نصیب میں آ سکتا تھا۔ خود جامنی بائی کے لیے اتنے کم فاصلے پر سنبھلنا اور سنبھل کے پرو کا پنجہ پکڑنا نامکن نہیں تھا۔ لاکھ بھرتی ہونے کے باوجود اتنی جلد ارادہ بدلنے کا امکان سو میں ایک فی صد ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ ایک دوسرے کے وار ٹالنے لے رہے تھے۔ اس بار بھی پرو پر پھپھتے وقت جامنی بائی کو موقع ہو گا کہ پرو کی جانب بچ نکلا سکے۔ پرو کا یہ اقدام جامنی بائی کے ذہن میں دُور دور تک نہیں ہو گا کہ وہ وہاں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دے گا۔ یہ ایک طرح کی وحشت مافی محو ہے۔ دیکھ کے جامنی خود سوٹ پٹا سکتی تھی۔ بہر حال پرو اس موقع کی تاک میں تھا۔ جس ہی جامنی بائی اس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آئی، پرو نے چند قدم پیچھے ہٹ کے پہلے تو اسے یہ تاثر دیا کہ وہ اس کے ممکنہ دھار سے بچنے کے لیے تیار ہے لیکن جیسے جیسے جامنی کا اور اس کا فاصلہ ایک گز سے قریب رہ گیا تو دفعہً وہ بچھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے تھے اور اس کا خیال تھا کہ ضرورت پڑی تو وہ اپنا چاقو بھی جوڑ دے گا۔ جامنی بائی بچ میں مائل پرو کے جسم سے تیزی سے ٹکرائی مگر ابھی پرو ہاتھ اٹھا کے اس کا بازو یا کلائی پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے بدن کی پوری طاقت سے اوپر چھلی اور پیچھے پرو کے دوسری جانب لوٹ گئی، فرش پر دو لپک فلا بازیاں کھاتی ہوئی وہ کچھ دُور جا کے کھڑی ہو گئی۔ پرو کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے دھند سی چھا گئی لیکن وہ جلد ہی اپنی جگہ سے اٹھ کے کچھ پیچھے آ گیا اور اس سے پہلے کہ اب جامنی بائی اس پر پکڑتی، وہ تڑپا ہو کر، ایک ہاتھ بچھا، چاقو کو ناک کی سیہ میں کیے چند قدم جھٹ لگا کر پھر جامنی کے قریب آ گیا۔ کوئی ادنی بات اس کے سوا اس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ جامنی بائی کا اور اپنا فاصلہ کم سے کم رکھے۔ اس نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ جامنی بائی فاصلہ کم کرنے سے کرا رہی ہے۔ اگر یہ اس کا گمان ہی تھا، تو بھی اب زیادہ دیر تک پرو یہ آٹھکھ مچولی جاری رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ فاصلہ کم ہونے پر جلد سے جلد کوئی نتیجہ برآمد ہونے کی توقع تھی۔ ادھر با آدھر، جو کچھ بھی ہو، پرو کا چاقو والا ہاتھ اپنے سامنے دراز لیٹنے کی وجہ سے جامنی بائی دائیں بائیں ہونے کے اس کا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتی یا پہلو سے رخ منکل کے پرو کو پھر پلٹنے پر مجبور کر دیتی۔ پرو کی خواہش تھی کہ جامنی بائی اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور اس کے نیچے پر پھینکا مارے۔ بس یہی سب

لے ہو جانا تھا کہ وہ جامنی بائی سے بچہ چھڑا لیتا ہے اور خود اس کا بچہ لٹپٹے میں کر لیتا ہے یا نہیں۔

پیرو کو کنگا میں چانو پر جی ہوئی نہیں تھیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جامنی سامنے سے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کے چانو کی لوک پر آنے سے تو رہی اسی بلے پیرو اس طرف سے بے فکر تھا اور سامنے دیکھنے کے بجائے ادھر ادھر جامنی بائی کی نفل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ہنرم کی صورت حال کے لیے مستعد تھا۔ جامنی بائی اسے بڑھتا ہوا دیکھ کے فوراً ہی بائیں جانب ہٹی، پھر دائیں جانب۔ ایک آن میں اس نے کئی پنیر سے بدلے۔ پیرو نے اپنا ہاتھ بیدھا ہی رکھا اور اس طرح جامنی بائی کو کوئی رستے قائم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ جامنی کے لیے اس میں کوئی خطہ نہیں تھا۔ وہ کسی طرف بھی ہو سکتی تھی مگر پیرو کا اس اساز میں چانو اٹھائے، ہاتھ پھیلائے رکھنا اسے شک میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پیرو کے انتہائی بائیں جانب ہو گئی۔ نتیجتاً پیرو کو بھی رنج بدلتا پڑا لیکن اس نے اپنا ہاتھ لیے ہی پھیلائے رکھا۔ جامنی بائی اس اثنائیں بڑھ چکی تھی۔ پیرو نے رنج بدلنے میں نالستہ و پریشان لگائی تھی۔ وہ ادھر سے برسی، ادھر سے پیرو پلٹ کے جامنی کے سامنے ہو گیا۔ جامنی بائی اتنی تیزی میں تھی کہ پیرو کو اپنا ہاتھ پھینکنے کی محنت نہیں ملی، وہ عین اس کے مقابل آجی تھی اور چانو ٹھیک اس کے سینے میں بیوست ہوا، دوسری ہل وہ پیرو کے بازو پر بھول رہی تھی اور پیرو کا سارا جسم چکرا رہا تھا۔

وزیر اور مارٹی کی سسکیاں بھل گئیں سبھی پتھرائی ہوئی نظروں سے پیرو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ پیرو کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کا جسم ایک دیگر رکڑا تھا کسی کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ مجھ بھی غم غم بٹھا نکلوں سے آگ کر رہا تھا۔ خاصی دیر بعد جامنو نے جھپٹے ہوئے زبان کھول کر دوا! پر پراپا کیا ہے ہو گیا؟ اس کی آواز ملحق میں امک رہی تھی۔

”ہو گیا جامی! سب ایسا ہی ہوا“ پیرو بھاری لہجے میں لولا۔

”جامنی بائی! آپ سے مسخری کر رہا تھا۔ وہ سب مغل تھا جامو! ان سالہا مجھ تھا، اب یہ جامنی بائی کو نچاٹا ہے وہ اودو اپنے کو نچاٹا تھا۔ اسنے آدھوں کے بیچ اپنے پیرو کو ذیل کرنا نہیں مانگنا تھا۔ انا ٹیم اس نے ان کے لیے لیا تھا“

”نہیں دوا!“ جامو مشتعل لہجے میں لولا۔

”ان نے آخری ٹیم اس کا مسکان دیکھا تھا۔ وہ اودو ان کے

بازو پر ہی پڑا تھا۔ ہنستا ہوا لولا، اپن ہار گئے دوا! اپن سے کچھ نہیں لولا گیا۔ لولا تو وہ کان بند کر چکا تھا۔ تم سمجھتا ہے جامو! اودو! انہوں نے پلٹتے میں دیر کی کہ اودو سے وہ چل پڑا تھا۔ وہ جان کے چل پڑا تھا جامو! وہ چاہتا تو کسی اور طرف کو جا پڑتا۔

پیرو ٹھیک ہی کتا تھا، جب اس نے جامنی بائی سے ہمارا کیا تھا تبھی جامنی بائی نے بیٹے کر لیا ہو گا۔ جامنو نے اس سے کچھ اور نہیں کہہ پیر کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اس نے دبان میں جس لوکی کا ذکر کیا تھا، اس کا نام نہیں بتایا، دسکی نے پوچھا مگر میں اود بھول اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ گیتا کی ماں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

الاؤ میں آگ دھک رہی تھی۔ آگ دھبی ہو جاتی تو لوگ بااں اور جھوک دی جاتیں، رات بھر آسمان صاف رہا اور اتارے ٹٹھانے لے اور پرے دار بجائے اطراف چکر لگاتے لے۔ اندھرا دھندلا ہوتا رہا تھا سب کو جیسے سانپ سو مچھ گیا تھا۔ یوں بیٹھے بیٹھے دھبے دھبے کتا وقت اور بیت گیا کہ سورج کی پہلی کرن نوردار ہوئی۔ جاگمک فیصلے کے آدھوں نے فوراً بھول دار یاں اپنی شرح کر دیں اور ان کے کچھ آدمی کشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ باقی سب ہمارے قریب ہی منڈلاتے رہے۔

انڈیل لڑی طرح چھٹ چکا تھا کہ آنکھوں نے میں آگے ٹھٹھنے کا اشارہ کیا۔ ابتدا میں ان کی رفتار تیز تھی، رفتہ رفتہ سست ہوتی گئی۔ گزشتہ دو دن میں وہ مسلسل چلتے رہے تھے یا جاگتے رہے تھے۔ میں رفتار سے وہ فاصلے طے کر رہے تھے، وہ دھک بھتی تھیں۔ پہنچے ہیں مزید ایک دن اور آگ کتا تھا۔ شام آتا جان کے ساتھ تھی۔ دونوں کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ رات بھر غصے میں کوٹیں بستے رہے ہیں۔ ہم نے اپنے تھیلے بھی بالوں پر ڈال دیے تھے۔ دھوپ نکلنے سے سوئی کچھ کم ہو گئی تھی۔ آگے اونچائی ہی اونچائی تھی۔ اونچائی پر مسلسل نہیں چلا جاسکتا۔ چنانچہ وقفے وقفے سے سب دم مزدور لیتے تھے۔ اب یہ وقفے پہلے سے طویل ہو گئے تھے۔ آگے جا کے ان کی رفتار کچھ اور سست ہو گئی، اور ہم ایک اونچا پہاڑی راستہ طے کر کے پھر نیچے اترنے لگے اور ایک مختصر طری میں آگے۔

ابھی دو پر نہیں ہوئی تھی کہ کھانا کھانے کے لیے وہ ہیں ٹھہر جانے حالانکہ وادی نہایت خوب صورت تھی، چاروں طرف پہاڑ کے بیچ میں کسی بڑے کٹوے کی پینڈی کے مانند۔ بڑے سب

نہیں دینا تھا۔ ہماری گریوں نے اُن کا دوشے ہوئے لعنت کیا اور شیر کو راستے میں ہی جا لیا۔ ہر سو اُن کی بچپن کی گوج نہی تھیں اور ہمیں سے کسی کو ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کا ہوش نہیں تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں پیچھے بھاگ رہے تھے پھر سب جس قدر ہی پتھر کی آڑ ملی، وہ وہیں چھپ گیا۔

اُس وقت ہمارے کانوں میں جھل اور ہیر کی آواز آئی۔ وہ چلا چلا کے ہیں اور آگے بڑھنے کو کہہ رہے تھے تاکہ تمچک کی ہر گول کا فاصلہ اپنی حد ہی میں رہے۔ کوئی نشانہ خطائے ہر سامنے اُن کے مرے ہوئے اور ٹڑپتے ہوئے آدمیوں کو سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگا ناممکن نہیں تھا کہ اُن کی ایک بڑی تعداد ختم ہو گئی ہے۔ سارے منچے بھرے ہوئے تھے اور ہر ایک کے ہاتھ میں نچنا تھا، بعض کے پاس دو بھی تھے۔ پتھروں کی آڑ میں کمان یا نیزے سے ہم پر نشانہ لگانے کے لیے انھیں بہر صورت آڑ سے نکالنا پڑنا تو نہ کہ اُن کے پاس ہماری طرح بندوبست اور تینے نہیں تھے کچھ آگے بڑھ کے ہم بھی احتیاطاً ٹوٹی ہوئی چٹانوں کے کان نو دوں کے پیچھے ہو گئے جو وادی میں جا بجا پڑے تھے۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اور اسی اثنا میں اپنے خالی منچے بھر لیے۔ اُن میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ انھیں وہاں سے نکالنے اور اپنی سمتوں کا اندازہ کرانے کے لیے ہم نے آپس میں حائلیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ اُن میں سے چند ہی نے نشانہ لینے کی جرات کی اور تیروں کے بجائے نیزے پھینکے۔ اُن کے آگے ہم نے فیر کر دیے تھے پھر بھی اُن کے کئی نیزے ہمیں لگنے لگتے پیچھے ہم اپنی تعداد کے مطابق پتھروں کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ پتھروں کی تعداد جہاں وہ پھینچنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ہم سے زیادہ تھی اور تینوں سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ سامنے ہمیں پتھروں کو ہم نشانہ بنائے ہوئے ہیں اس کے بارہ موجود بھی ہیں یا نہیں۔ ایک سترہ ہماری آوازوں پر اپنی اپنی آڑ سے نیزے پھینکنے کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کچھ توقف کریں۔ وہ جاتے کمان وادی کے ہر طرف اُونچے پاڑے تھے۔ اُن کی کوشش یہی ہوتی چاہیے تھی کہ وہ کسی طرح اُن تک پہنچ کے وہاں پھیلے ہوئے درخت کے جھنڈ میں جا چھپیں اور رنگ رنگ کے آگے بڑھنے لگیں یا وہاں سے ہم پر تیراؤ نہیزے پھینکیں۔ پاڑوں پر پگ ڈنڈیوں کے بغیر چلنا مشکل تھا۔

دن کے بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ دھوپ ساری وادی میں کھلی ہوئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دھوپ تمہارے لیے وقت کا انتظار کریں۔ اندھیرے میں اُن کا پاڑوں کی دیواروں کی جانب رینگنا آسان تھا

بڑے توڑے پاڑوں سے ٹوٹ کر کبھی نیچے آگئے ہوں گے۔ جگہ جگہ وہی بکھرے ہوئے تھے۔ پانی کی افراط تھی۔ آدیر سے گرتے ہوئے پتھروں نے نشیب میں ایک جھیل سی بنادی تھی۔ پتھروں کی دھیرے دھیرے زیادہ نہیں تھے۔ کہیں کہیں اُن کے ساتھ ملی ہوئی جھاڑیاں زمین سے چھوٹ آئی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے آگے پیچھے تھے، اباجان اور نشانہ سب سے پیچھے۔ ہمارے تینوں نفل یا کون کے ساتھ تھے، تقریباً سارا سامان یا کون پر لدا ہوا تھا۔ جینی اور پلوٹو ہم سب سے آگے تھے، زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے۔ اُن کے آدمیوں کی نگہداشت کے معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ہمارا ہتھیار بھی جینیوں میں پڑے ہوئے تھے اور بندوبست نشانوں پر لگی ہوئی تھیں۔ وادی کے دریاں جتنے میں آتے ہیں ایک ایک جینی اور پلوٹو کی زور زور سے ہانپ کر نے کی آوازیں آنے لگیں۔ سب ابھی کی طرف دیکھتے گئے۔ ابھی ہم کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک پلوٹو نے جینی کو کمر سے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور جاقو نکال لیا اور اس پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ ہم سب ابھی کی طرف بھاگے۔ جینی بڑی طرح سنج رہا تھا۔ جھیل نے پلوٹو کا چاقو والا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم سب بھاگ کے جینی کو دیکھنے گئے۔ وہ زمین پر نہانچیں پٹخ پٹخ کے جینوں مار رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے جھاگ قبیلے کے سارے آدمی ہماری طرف دوڑ پڑے اور ہمارے گرد اُن کا ایک گھیر سا بن گیا۔ ہر شخص اچانک اچانک کے جینی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وادی میں شور مچ گیا تھا۔ جہاں سے جینی کو پکڑ کے اُٹھایا۔ جھیل نے پلوٹو کو آگ پکڑ رکھا تھا اور پلوٹو کے منہ سے گالیاں اُڑ رہی تھیں۔ جھیل نے سنج کے اُسے چپ رہنے کی تلقین کی اور ٹھیک اسی لمحے ہم جیسے ہی جینی کو اُٹھا کے پلوٹو اور ہمارے چہرے اُن کی تجسس آنکھوں کے مقابل ہوئے تو ہمارا ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور خالی نہیں تھے۔ ہم نے بے دریغ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔

وہ ہمارے بہت قریب تھے۔ ہر کی طرف پلوٹو اور جینی بھی تمہیں سامنے اُن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ اُن کے گھیرے میں سامنے کے جھنڈے آدمی تھے، وہ دھڑا دھڑا کرنے لگے اور جیسے ہی پتھروں کے آدمی آگے والوں کے پیٹھ پر سامنے آئے، اُن کا بھی یہی مشر ہو۔ ابھی وہ اس ناگمانی کو ٹھیک طرح سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ تینوں تیس آدمی وہیں دھیر ہو گئے، باقی اندھا دھند بھاگنے لگے۔ بھاگ کے وہ کچھ فاصلے پر کھڑے اور ہم پر نیزے سامنے یا کمانیں چڑھاتے۔ سب کو احساس تھا کہ آگے جا کے انھیں ایک لمحے بھی ملتا تو وہ ہم پر نیزے پھینک سکتے ہیں یا تیر چلا سکتے ہیں۔ انھیں کوئی وقت

لے لیے پھر فراموشی چھا گئی۔ نیم ایک ہی سمت ہیں دو ایک چلے گئے تھے مگر ہمارا دور آنا بے کار ثابت ہوا۔ آگے کسی جگہ وہ بچے اور سارے کو نظر نہیں آئے۔

ابھی ہم کوٹنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وادی میں کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز گھونسنے لگی۔ ہم نے مسکنے کی کوشش کی مگر کوئی تفتی میں بل رہا تھا اور یہ معلوم ہی کی آواز ہو سکتی تھی۔ ہم نے پیچھے مڑ کے دیکھا، معلوم ہو کہ اس شخص کے ساتھ ایک اونچے پیٹے پر کھڑا دولہا ہاتھ منہ سے لگا کر غائب تھا، معلوم کے غائب جانک پہلے کے بچے کچھ لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ لہذا وہ ان سے کہا کہ ہرگز اس کے آجائیں اور اپنے ہتھیار چھین کر دیں مگر معلوم کی آواز کتنے آدمی سن رہے ہوں گے۔ گنتی کے چند آدمی آدھے سے زیادہ وہ گریوں کی پہلی دوسری باڑھ میں ہی تمام ہو چکے تھے۔ ابتدا میں ان کا ناپا سب کچھ نہ ہوتا تو شاید ان کے ہتھیار ان کے کسی کام آجاتے۔

تھلنے پلنے رات سو کے اور دوسری جاگ کے لی نہیں گزرتی تھی۔ پہلی رات ہمارے سو جانے کے بعد حفظاً بالقدم کے طور پر انھیں جاگنا ہی تھا۔ دوسری رات ہم انھیں جگائے رکھنے کے لیے دانستہ جاگتے رہے۔ دو دن نیند کے بغیر سپاڑوں پر مسلسل سفر ان کے جسم پر بوجھ کر دینے کے لیے بہت تھا اور ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں ہوا تھا۔ لہذا آدھے کے خیال سے ان پر ایک بوجھ سلاطری ہوگا اور ہماری جانب سے کسی وقت بھی کسی اقدام کا کھٹکا ان کے لیے

الگ ایک دقت کا سبب ہوگا۔ صبح آگے بڑھتے ہوئے ان کے قدموں میں پہلے جیسی متعدد نہیں رہی تھی۔ پھل پریوں کی ایک کئی وقت بھی مینی اور پلوٹو کو اس طرح آگے بڑھنے کے دوران کے درمیان جھکوا کر لے گئے انھیں اپنے قریب کر لیا تھا۔ ہم سب کا جینی اور پلوٹو کو اس میں جھکڑے سے باز رکھنے کے لیے ان کے پاس جھانک ایک فطری عمل تھا۔ ہم سب جب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے تو ان کا بھی بڑھن سے ہماری جانب بڑھنا لازم تھا لیکن ان کے گمان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہم اس اپنے قریب ان کے گھیرے کا انتظار کر رہے ہیں، پلٹتے ہی ان پر گولیاں چلا دیں گے اور انھیں ہتھیار توڑنے کے لیے بھی ایک لمحہ نہیں ملے گا۔ پریوں میں توکل ہم انھیں بول اپنے نزدیک بلا سکتے تھے مگر چاہی بھی تھا کہ دولہا توں اور دونوں کی ٹھکان ان پر غالب آ جائے اور اس دوران انھیں کسی قدر یہ اطمینان بھی ہو جائے کہ کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہیں ہے۔ پھل نے اپنے اس ارادے کے بارے میں پہلے سے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ مینی اور پلوٹو کو اسے بھیجنے کے بعد ہی اس نے ہم سب کو بتایا تھا کہ تیار رہیں سب اپنی جگہ

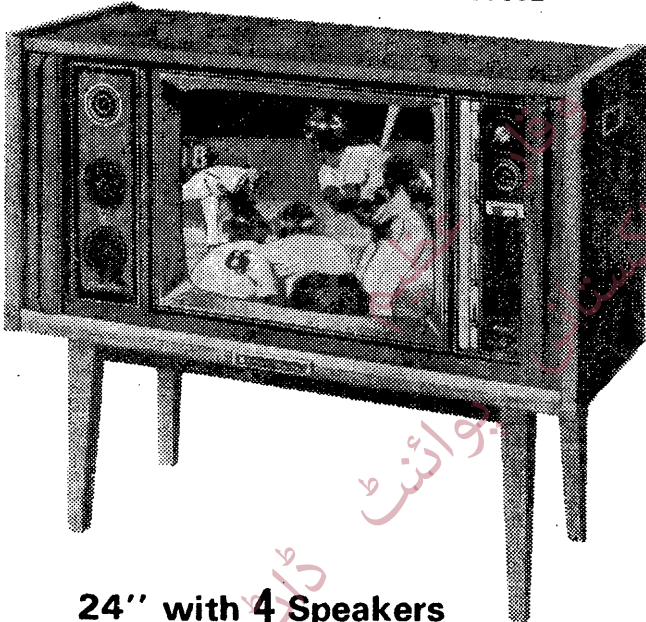
اٹ لے ہمیں انھیں زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ مینی جلد کن سکے۔ باقی رہ جانے والے ان تمام آدمیوں کو نشانہ بنائے ہیں جس کے لیے تیزی تھی۔ آگے بڑھنے کی وجہ سے ہمارا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور ہم ایک دوسرے سے خاصی دور ہو چکے تھے۔ آواز سن بلند کر کے ہی دوسرے کو غائب کیا جاسکتا تھا اور آواز سن بلند کرنا اب مناسب نہیں تھا۔ مجھے اب جان کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ انھیں دیکھنے کے لیے میں ایک نوے پر چڑھ گیا مگر ان کا اور نشانہ کم کا دور و نزدیک کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ پھل اور حامو بھی میری طرح اوپر توڑوں پر آ گئے تھے۔ حامو کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آترنے اور آگے جانے کا اشارہ کیا۔ میرے قریب صرف سارے تھا۔ میں دور آگے اس کے پاس پہنچا اور اسے ساتھ لے کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ حامو کے کتنے سے پہلے ہی میرا خیال تھا کہ انتظار کرنے کے بجائے قریب قریب کی تمام جگہوں پر وہاں ان کے چھپنے کا امکان ہے۔ خود ہی ان کے سامنے پہنچ جائیں، دو آدمی ایک ساتھ چلیں، ہم پنجوں کے بل اپنی جا بیں انتہائی دھم رکھتے ہوئے سامنے کے توڑوں کے نزدیک ہونے لے۔ دونوں کھلے ہوئے تھے کسی جانب سے بھی نیر یا تیر کا نشانہ تھا۔ بہت سے توڑوں کے ساتھ جھاڑیاں بھی لگی ہوئی تھیں اور وہ جھاڑیوں میں توڑوں کی نسبت وہ زیادہ محفوظ تھے۔ کیونکہ وہاں سے وہ نشانہ لے سکتے تھے۔ ہماری نگاہیں وہیں منڈلا رہی تھیں جہاں جھاڑیاں تھیں۔

میرے ایک ہاتھ میں چاقو، دوسرے میں تیر تھا۔ سارے کے دونوں ہاتھوں میں تیر تھے۔ ایک بڑے نوے کی دیوار سامنے آتے ہی ہم دونوں مخالف سمتوں میں تیزی سے بھاگے۔ سارے اُدھر سے ہیں اُدھر سے جیسے ہم اچانک زمین سے پھٹے ہوں ہم دونوں دونوں اطراف سے ان پر جھپٹے۔ وہاں پانچ آدمی دیکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے حواس ناہنگی سے تیر سے بھیٹنے چاہے مگر پینے کی گولیوں نے انھیں وہیں ختم کر دیا۔ میں نے کھٹکا بولنے کے ساتھ ساتھ چاقو بھی ان پر پھینکا تھا اور میں چاقو ایک آدمی کے سینے سے نکال ہی رہا تھا کہ وادی میں گولیاں چلنے اور چھپنے چلانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے ایک دم گولیوں کا شورا اٹھتے ہیں اور سارے آگے ہی بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اچانک ان کے سروں پر پہنچنے کے کوئی دس گیارہ آدمی ٹھکانے لگا دیے تھے۔ دوسری جانب گولیاں چلنے کی آوازیں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری طرح اور بھی لوگ انھیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تقریباً ایک گھنٹہ تک وقفے وقفے سے ہاڑوں میں گولیوں کے دھماکے ہوتے

آپ ہی کا انتخاب ، سانیو لاجواب

سانیو

SUPER DELUXE 24 TW910L



24'' with 4 Speakers

مقرر کردہ ڈیلروں سے براہ راست ہم سے خریدیں،
پاکستان ریڈیو ہاؤس
 عبداللہ مارون روڈ، بالمفتاب، ہوٹل جیسی، کراچی
 ادورنگ اسکوئر، شاہراہ قیام، اعظم، لاہور
 الیکٹرانک انڈسٹریز لمیٹڈ
 پوسٹ بکس ۷۴۲۲ کراچی



SANYO



سانو

PRH-K/1/78

ORIENT

جھکائے کھڑے ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر متقی میاں کی طرح ذہیر کو بھی منوں منوں کے پیچھے دبا دیا گیا اور ہم اسے دیرلے میں تنہا چھوڑ کے آگے بڑھ گئے۔

سلطان کی پینڈل کی سرچم بچی کو دی گئی تھی مگر اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زوراً جاما وار جھل بھی زخمی ہوئے تھے۔ ہلاکو کے سر پر کسی نے پتھر پھینچ مارا تھا۔ جھل کا پیر بھاگتے ہوئے ریٹ گیا تھا اور اسے چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ زوراً کی ہیلوں سے نیزا پھلتا ہوا گزر گیا تھا۔ قسمت تھی جو فتح گیا۔ سلطان کے مقابلے میں سب کے نرم معمول تھے۔ ہمارے مینوں قلیوں میں سے ایک ہی زندہ بچا تھا۔ باقی دو نے موقع دیکھ کر قبیلے کے لوگوں کے ساتھ بھاگنے کی غلطی کی اور نشانے پر آگئے۔ قبیلے کے زندہ رہ جانے والے پانچوں آدمیوں کے ہاتھ جھل نے کھڑا دیے تھے اور انھیں اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ بہت سے بال گئے تھے۔ ہمارے اور ان کے بالوں کو ملا کے کل گیارہ پاک تھے۔ انہوں کی غور نہیں تھی لیکن زندہ بالوں کو بے اثر چھوڑ دینے سے ہتر تھا کہ انھیں ساتھ لے کے ہی چلیں۔ چھول واریاں کھانے پینے کا سامان لے لیں اور سفر کے لیے دیگر ضروری اشیاء کا ایک بڑا ذخیرہ ہیں قبیلے کے لوگوں کے اسباب میں ملا تھا۔ ہم نے وہ سب کا سب اپنے ساتھ نہیں رکھا ضرورت کے مطابق ہی اس میں سے کچھ رکھ کے باقی وہیں چھوڑ دیا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی دیر تھی کہ ہم وادی سے چل پڑے اور اندھیلانہ ہونے کے بعد بھی چلتے رہے۔ شعلوں کی اب ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ آگے بیشتر نچانی تھی۔ مارنی اور زوراً بیڑیاں اور شعلیں روشن کر کے راستہ دکھاتے رہے۔ جب سردی بہت بڑھ گئی اور بالوں چھانے کی وجہ سے اچیرا گلا ہو گیا تو ہمیں ٹھیرھا نا پڑا۔ لکڑیاں رسی سے باندھ کے سلطان کے لیے ایک چادر پانی نا بھلنا سا اسٹرینچر بنا دیا گیا تھا جس کے آگے پیچھے نکلے ہوئے کمانے قبیلے کے آدمی آٹھانے ہوئے تھے۔ کبھی ہم بھی اسے کندھا دے دیتے تھے۔ تشام اسی کے سرھانے کے ساتھ بندھی ہوئی چل رہی تھی۔ سہ پہر سے اب تک سلطان کو ہوش نہیں آیا تھا۔ تشام کے منہ کو ٹیپ لگ گئی تھی۔ آبا جان کا بھی یہی حال تھا۔ وادی سے چلنے کے بعد وہ بھی سلطان کے اسٹرینچر کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔

پڑاؤ کی جگہ رکھتے ہی ہم نے سلطان کے لیے ایک علیحدہ خیمہ لگا دیا۔ تشام اور آبا جان کو اس کی دیکھ بھال کے لیے وہیں رہنے

سب بنگ

دیا کسی کو بند نہیں آ رہی تھی اور کوئی کسی سے نہیں بلبل رہا تھا۔ رات کو کوئی بارہم لوگ سلطان کو نہ کھینچے گئے۔ تشام رات بھر اس کے بالیں مٹھی رہی تھی۔ قبیلے کے آدمیوں کو بھی ہم نے ایک الگ خیمے میں بند کر دیا تھا۔ بادی بادی ایک ایک گھنٹے کے لیے سب پر دیتے رہے مگر کسی نے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صبح ہونے ہی ہم نے خیمے اکھاڑ لیے اور سامان سمیٹ کے باکوں پر لا دیا۔ دوسرے کو سلطان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی اس نے آنکھیں کھولیں مگر چند لمحے ادھر ادھر دیکھ کر گھبرا کر وہ پھر غافل ہو گیا۔ اسے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے اس کے لیے کئی ٹوئیاں جو نیزے کیوں۔ جامونے انھیں سلطان کو کھلانے سے پہلے خود قبیلے کے آدمیوں پر ان کا تجربہ کیا کہ کہیں وہ کوئی دھوکا نہ کرے یہوں ذرا سامان میں پڑنے والا رستہوں کا بل ہم نے سویرے ہی عبور کر لیا تھا دوسرے دن رات تک ہم نے ایک بڑا حاصل طے کر لیا تھا اور اسی سرسبز شاداب وسیع و عریض وادی میں آگئے تھے جہاں سے ہمیں کوٹنا پڑا تھا۔ چلتے چلتے جھل کا پیر بھی سوجھنے لگا تھا۔ رات کو زوراً اور مارنی نے پاک کے مکھن میں نمک ملا کے مالش بھی کی مگر صبح اس کی تکلیف اور بڑھ گئی تاہم وہ چلتا رہا۔ دوپہر کے کھانے

دلیپ کمار کی ہنگامہ خیز سرگزشت

سمرحد کا بیڑا

بہار کی زمینی زنیاب پر سب سے زیادہ مستند اور پوز کا دینے والی دستاویز



کتبانی صورت میں شائع ہو رہی ہے

ایضاً حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع کریں۔ (دستاویز)

داستان ۹/۸۸۴ شیگر کالونی کراچی ۳۵

مبونی پلار

درد آئندہ
مکرو دینے
شمس
کلب سلا شہ

روم ملتا آیا اور میرا سر ہی بجا رہا۔
روم کے اس ظالم بادشاہ کی بری کامیابی کا پورا پورا
دشمنی کے لئے یہ سب سے پہلے تین شاہان کی بھی اور پھر
نیزے ہی کی کہ اس کے سن شاہان کی کوئی فرقی نہیں تھا
ملک پوریا پر زور لگا کر وہیں کے گورنر کو قتل
کئے اس کے شاہان کی بھانجا۔

تشانم کے سینے سے نہ کوئی آہ بلند ہوئی نہ اس کے آنسو نکلے
وہ بہت کی طرح ٹھنکی بیٹھی رہی سلطان کو جب تیرس آنا راجا راجا
تھا تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ اس دوران ٹھن پیر، جاما اور اباجان
اسے تھامے رہے بازوؤں سے پکڑے گردن میں ہاتھ ڈالے آنسو
اُس کی آنکھوں میں جیسے نمود ہو گئے تھے جیسے اپنے اپنے طور پر
اُس سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے ماری، ملا کو زور، پلٹو، سلیم جینی
سارے اور میں نے بھی اُس سے بہت کچھ کہا لیکن اُس نے جیسے
کسی کی بات ہی نہیں سنی۔ اندھا ہونے لگا تھا لیکن ہم نے اُسی
کے خیال سے جلدی کی کہ وہ سلطان سے جینی جلد اور جینی دُور
ہو جائے اچھا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون رہتا ہے۔ مرنے
کا مطلب ایک مشغل دُور ہے۔ سارے لٹنے زندگی کے، میں
رات کو ہم نے خاما آگے جاکے ایکوں سے سامان آمارا۔ اُن رات
کسی نے کھانا پیا نہیں۔ جاگ تھیل کے آدمیوں کو گوشت کے پلچے
مکھن اور تھنا ہوا اناج دے دیا گیا، وہی آنکھوں نے کھایا۔

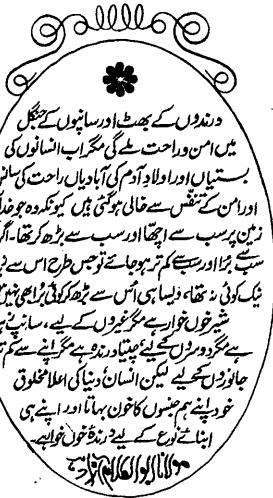
ہم سب ایک ہی خیمے میں تھے۔ تانام رات بھر ایک
کونے میں ساکت رہا۔ جاما بیٹھی رہی، ٹھن اُس کے ماتھے ہاتھوں
اور گالوں کو مبارک نہ تھا، اُسے جھنجھوٹا نا تھا مگر تانام کا بدن سن
بڑا تھا۔ ابگ باکل سفید ہو گیا بندھ جیسے رفتہ رفتہ کوئی اُس کا خون
پروٹا رہا۔ جاما ساری رات کوئی بھی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ نہ
ٹھن، نہ اباجان نہ پیر۔ پروٹے اُس کی دل جوئی کی سب سے
زیادہ کوشش کی تھی۔ عمریں تانام اُس کی بیٹی گیتا کے برابر ہی لگی
اور پیر ہی کی کوشش سے تانام کی آنکھیں نیسمیں صبح ہونے
سے کچھ پہلے پیر نے اُسے اٹھا کے اپنے سینے میں بٹھایا لیا تھا اور
اُس کا بدن گدگد لگنے لگا تھا۔ تانام کی آنکھوں سے آتشا سا بہہ نکلا۔
ایسے بک بک کے روتی کہ میں نے کبھی کسی کو ایسے روتے نہیں دیکھا
تھا۔ اُس کے ساتھ جیسے ہم بھی کورنا یاد آ گیا تھا۔

ہم شہزاد پاول سے بھی آگے بڑھ آئے۔ زاپول کی بستی میں
داخل ہونے کے بجائے ہم دور ہی دُور سے راستہ کاٹ کے نکل
گئے۔ راستے میں اور بھی کئی بستیوں پڑیں مگر جیسے ہی دُور سے
اُن کے نشانات نظر آئے ہم راستہ بدل دیتے۔ چاہے کتنا ہی پیچ
کاٹنا پڑنا۔ سدی، مالے، دریا، پل، ستواں پک و ڈنڈیاں گھاٹیاں
سلطان کو فون کرنے کے چار دن بعد تک ہم روز رات کو چوند
گھنٹوں کے لیے بجے سے مسلسل چلتے رہے۔ جاما کاظم کو تھکا گیا تھا
لیکن ٹھیل کے پیر کی تنویر، بڑھتی جارہی تھی۔ ہم غار کے اُسے
یاک پر بٹھا دیتے اور دن میں دو بار اُس کے پیر پر لیپ کرتے۔ اسی

کے لیے ہم ایک جگہ آدھ پون گھنٹے کے لیے بیٹھے تھے تیس دنوں
اندھا ہونے تک ہم نے اپنے راستے میں بڑے والے پہاڑوں
کی اور کئی دیواریں عبور کر لی تھیں لیکن چوتھے دن صبح رات بھر کے
پڑاؤ کے بعد صرف ایک میل کے قریب آگے آئے ہوں گے کہ
آسمان پر یکایک کالے بادل گھبرا اُٹے اور ہم خیمے نصب
کرتے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ کوئلہ وھا
بارش ہونے لگی سلطان بھی بھبک گیا۔ ہر چند ہم نے اُس کے اٹھ کر
پرفوراً پھول داری ڈال دی تھی غیموں کی مینیں ٹھونکتے ٹھونکتے
ہم بھی شہزادہ ہو گئے تھے۔ بارش جس تیزی سے آئی تھی اُسی تیزی
سے گزرا گئی تھوڑی سی دیر میں طلع صاف ہو گیا اور تازہ دھوپ
چمکنے لگی لیکن ٹھیل نے پیر آگے بڑھنے سے سب کو روک دیا تھا۔
سلطان کے ہم پر کچھ طاری تھی۔ اٹھ کر چھٹکوں اور بارش نے
اُس کے لیے سب سے اوسان بھی چھین لیے تھے۔ سب اسے مختلف
قسم کی دوائیاں دیتے رہے اور اُس کے گرد ہی بیٹھے رہے سلطان کسی
طرح قابو میں نہیں آیا۔ فتناس کا دھیان کرتے، وہ اتنا ہی اور بکھر
جاتا پھر اُسی دن شام کو اس نے نہ جانے کیسے آنکھیں کھول دیں
پٹ پٹاتی پکوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ تانام اُس کی نظروں کے سامنے
بیٹھی تھی۔ اُس پر نظر پڑی تو سکا یا بھیک بھیک کر اٹھا۔
”کیا ہے سلطان؟“ ٹھیل نے بے چینی سے پوچھا۔

”استاد!“ پر شکل دوہتی اور لڑتی آواز میں بولا۔ اُس کا
دھیان رکھنا۔ اب بھی اس کا...“
”کیا بولتا ہے بے!“ ٹھیل مضطربانہ اُس کا کال تھپتھپانے لگا۔
”پسے پاس وقت نہیں ہے“ سلطان کی آواز پر غصہ طاری تھا۔
”نہیں بے!“ ٹھیل نے تنہی سے کہا۔

معلوم نہیں ٹھیل کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچی بھی نہیں
وہ تانام کو دیکھ رہا تھا اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔
اُس کے چہرے پر کئی میٹھی میٹھی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ کچھ جھتی
کہہ سکا۔ تانام پُرا آنکھیں جاملے دیکھ رہا۔ دیر تک اُس کی آنکھیں نہیں
بٹھیں۔ ٹھیل نے پھر ہاتھ بڑھا کے اُنھیں خود ہی بند کر دیا۔



وہ جسے سفر میں کچھ رکاوٹ نہیں پڑی، مردی کی شدت بھی
کچھ کم ہو گئی تھی اور آگے راتنے اتنے پیچیدہ نہیں تھے۔ باری
جیہد کی ہمارے عام راستوں سے ہٹ جانے کے سبب سے تھی۔
پانچ دن تک تشام ہمارے ساتھ رہی۔ کھوئی کھوئی سی ساتھ چلتی
رہی جب کہنے، اٹھ جاتی جب کہنے، بیٹھ جاتی جب نظر پڑتی، اس
کی آنکھیں پھلکتی ہوتی دکھائی دیتیں سو ہر کوئی اس کے چہرے کی
طرف نگاہ کرنے سے باز رہتا تھا۔ یہ سب کچھ ہم نے خوب واقف
تھا اور تشام کو چونکہ ہندوستانی ٹوٹی جھوٹی ہی آتی تھی اس لیے بیشتر
اس کے قریب نہ رہتا تھا، سامنے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا۔ ابا
جیان بھی اس کے ساتھ ساتھ لہتے تھے اور دل میں ہم سمجھ رہے
تھے کہ اسے کچھ قرار آ گیا ہے۔ زوار سے ضرور آ گیا تھا لیکن پانچویں
دن سہ پہر کے وقت ہم نے دو بلند پہاڑوں کے درمیان رسوں
کا پل جو کہ اب بھی تھا اور پل سے چند قدم آگے آئے تھے کہ تشام کو اچانک
نہ جانے کیا ہوا، وہ واپس دپانہ دار کی طرف بھاگ گئی۔ راستے نے
اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر ٹیل، تک چند ہی قدم کا فاصلہ
تھا۔ تشام ہزاروں فٹ نیچے گھاٹی میں پتے پتے دریا میں کود گئی۔
مارتی بھی کرنے لگے، بجار جیہ تک ہم سب وہاں پہنچے، دریا کی
تیز زمر میں اسے ہلکے لے گئیں سب نیچے جھانکنے لگے۔ بیڑے نے
اچانک نہ کھسٹ لیا اور اباجان سینے میں سر جھپکا کے بیٹھ گئے۔
کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تشام چل گئی ہے۔ سب کی
نظریں اس طرح جھنک رہی تھیں کہ شاید ابھی وہ کسی جانب
سے واپس آجائے گی۔ ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ نیچے
گھاٹی میں اتنا ناہنک تھا اور نہ ہم اسے نیچے ماکے دیکھتے نیچے
جانے کا صرف ایک راستہ تھا کہ دریا میں جھلا تک نکلا دی جائے۔
ہم اور آگے بڑھ گئے مگر سب کے پیروں کو جیسے رنگ سا لگا
گیا تھا۔ کرتے پڑنے اندھ لڑھکے ہم پھر ایک جگہ آکے ٹھہر گئے۔
تشام بھی مٹی مٹی کی بنی ہوئی جلی جس کی کورافھی، اس
کی بہت سی بایں کورا سے ملتی جلتی تھیں۔ اس کے لاسنبہ بال
آنکھیں پشانی، اس کے منکرے اور شرٹنے کا انداز۔ تشام کو اگر
کورا کی طرح کوئی آمر ہونا سلطان واپس آجائے گا تو وہ کبھی
ایسا نہ کرتی ساری زندگی اس کا انتظار کرتی رہتی لیکن اس نے
ابھی آنکھوں سے سلطان کو ہمیشہ کے لیے جانے ہوئے دیکھا تھا۔
اسے کورا جیسا کوئی آمر نہیں رہا تھا۔ کورا کی طرح جھوٹ موٹ
کاسی۔ ہم نے تشام سے کون سی بات کہنے کی کوشش نہیں کی
تھی۔ مٹی ہی تسلیاں ممکن تھیں، دیتے رہے تھے سب کا خیال تھا کہ

دنیا کب کی ختم ہو جاتی مگر سب کو نہیں ملتا۔ جن کا نصیب کالا ہو انھیں نہیں ملتا۔ مولوی صاحب نے کورا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ اُسے پڑھایا لکھایا، اُس کے لیے اپنا گھر بار پائون چھوڑ دیا۔ در بدر مالے مالے پھرتے رہے۔ انھوں نے کورا کو اپنی دست بین ہزار تسلیاں دینی ہوں گی مگر یہ ان کی تسلیاں نہیں تھیں جو کورا کی انھیں روشن تھیں۔ وہ اُس کی اپنی تسلی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بھی لڑکچہ کستی ہوگا اُس کا دل بھی اُس سے کچھ کتنا ہوگا۔ اُس کا دل کتنا ہوگا کہ میں اُسے کہاں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں میری نظریں اسے اپنے بدن پر بوجھتی عسویں ہوتی ہیں گی کیونکہ اُس کی نظریں بھی مجھے اپنے ارد گرد محسوس ہوتی تھیں۔

مولوی صاحب نے اُسے جو کچھ بتایا ہو، امکان اسی بات کا زیادہ ہے کہ انھوں نے اُسے میرے مکرھپ جانے کا یقین دلانا چاہا ہوگا۔ وہ یہ اُسا چھوڑنے اُن کے خیال میں کورا کو اسی صورت میں میرا سکتا ہے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ کورا نے اُن کی بات کا بالکل یقین نہیں کیا ہے۔ وہ چپ ہے تو اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے دل میں اُن کی ساری کو تلبیں جل گئی ہیں۔ اُس نے مولوی صاحب سے محبت نہیں کی ہوگی کہ وہ نہیں مانتی۔ پس وہ چپ ہوگئی ہوگی۔ اتنے عرصے کورا کے ساتھ رہنے کے باوجود مولوی صاحب کو پتہ نہیں چلا کہ کورا کتنے عرصے نہیں چلے گا۔ آخر وہ تھک جائیں گے اور ایک دن انھیں احساس ہوگا کہ انھوں نے میری طرف سے بے خبری برت کے کتنا برا کیا ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی بات آتی تھی درخت پھر کیا وجہ تھی کہ مولوی صاحب نے کبھی چٹ کے میری خبر نہیں لی۔ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ میں مرنے نہیں گیا تھا اور میرا کیا تھا تو انھیں تم ازعم اس کی تصدیق ضرور کرنی چاہیے تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل مطمئن ہوں گے۔ بھیل نے ایک بار استادہ مجھ سے کہا تھا، لاڑ لے! کیا پتہ، مولوی صاحب ابھی تک اُن بھکشوؤں سے خوف زدہ ہوں جو کورا کی تلاش میں ماسے ہندوستان میں منڈلا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کبھی اُن بھکشوؤں سے اُن کا کوئی واسطہ پڑا ہو اور انھیں شہر ہو کہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد کورا اپنی محفوظا نہیں رہے گی جتنی اُن کے پاس ہے۔ میں بھیل کی بات سن کے خاموش ہو گیا تھا۔ بحث کرنے سے کیا حاصل تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کہنے سے بھیل کی مُراد مجھے سمجھا ناہی تھا۔ ایسا تھا تو بھی مولوی صاحب اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے میری تلاش ضرور کرتے۔ وہ مجھے تلاش کرنا ہی نہ چاہتے تھے وہ کورا کو اپنے پاس سے جدا کرنا ہی نہ چاہتے ہوں گے۔ انھیں خدشہ ہوگا کہ کورا پھر

وہ بھی اُنھی راستوں میں ہندوستان میں داخل ہونا تھا جن سے ہم یہاں آئے تھے۔ ہر مدی ہو کہوں اور ہندوستان سے گزرنے کے نہیں اور اب کے ہیں زیادہ احتیاط کرنی تھی کہ ہمارے پاس دُش کا بیش قیمت سامان تھا۔ زرد چوہا ہر محل دیا وقت ہزاروں سال پہلے کے برتنوں اور زوڑوں سے بھرے ہوئے صندوق۔ آدھے سے زیادہ راستہ ہم نے کسی دوسری طرح طے کر لیا تھا۔ ہر دن میں ہندوستان کی سرحد سے اور قریب کر دیتا تھا۔ کوئی بیسیویں اکیسویں دن پہلی بار ایک بڑا قافلہ ہمیں ہندوستان کی سمت سے آتا نظر آیا۔ ہم اُسے بڑھنے کے بجائے پھرنے لگا اور قافلے کے کچھ قریب ہونے کا انتظار کرنے لگے مگر وہ سب بھکشو تھے جو اپنے مخصوص لباس کے باعث دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ ویسے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن ہمارے ہمراہی قافلے کے چار آدمی اور ایک تھپی تھی قافلہ ایک آدمی کو حکم عطا کر رہا تھا کہ کوئی مار دی تھی۔ قافلے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ شور مچا سکتے تھے۔ زور، ہلاکار اور سولہ نے انھیں اُس کے سامنے ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ تینوں فوراً انھیں دُور لے گئے۔ آبا جان کی وجہ سے قافلے کے بھکشو کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ آبا جان اور اُن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ انھوں نے ہماری نیرت بھی پوچھی اور سکرانے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے سکون کی سانس لی۔ ہوسکتا تھا کہ آگے جا کے اُن سے کوئی ہمارے بارے میں استفسار کرنا لیکن ہماری گنتی کم تھی۔ آبا جان ہمارے ہمراہ تھے اور اس دوران ہمارے چلے یک سر بدل گئے تھے۔ چہرے پرواڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کے ہم نے بند قیاس پہلے ہی چھپادی تھیں۔

اس سے پہلے بھی راستے میں آگاہ کا چھوٹے موٹے قافلے گزرے تھے مگر اُن کے سامنے وہ ایک لفظ نہیں بولے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ہماری بند قیاس اور تنہا اُن کی کسی بھی آواز پر چلنے لگیں گے اور صرف وہی نہیں جائیں گے قافلے کے لوگ بھی ختم سب تک

ہو جائیں گے۔ انھیں یہ بات پہلے بتا بھی دی گئی تھی۔ جھکٹوٹوں کا فائدہ بہت بڑا تھا اور ویسے بھی ان پر بندھنی اٹھانے سے ہمارا جھکٹنا لازم تھا اسی لیے ہمیں انھیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کرنا پڑا کہ وہ اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانے کی غلط نہ کریں۔

ڈیڑھ مہینے کی مسلسل مسافت کے بعد ہم ہندوستانی سرحد کے خاصے نزدیک ہو گئے۔ قبیلے کے آدمی اور نفل ہمارے ساتھ تھے لیکن انھیں مزید آگے لے جانا مناسب نہیں تھا کہ وہ ہمیں ان کی اب بھی ضرورت تھی۔ وہ وقت آپہنچا تھا جب ہمیں ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا تھا۔ جامو کی رائے تھی کہ انھیں مار دیا جائے۔ ملاکو، جینی، مارٹی اور سارٹے بھی اس کے ہم نوا تھے۔ جٹھل بیچ میں نہیں بولا۔ پیر نے منع کر دیا اور انھیں اپنے ساتھ ہی لکھا محدود دوسرے دن صبح ہی ایک گری گھاٹی پر نظر پڑی۔ پیر نے ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ قبیلے کے آدمیوں اور نفل کوٹھول سے بازماندہ کے یکے بعد دیگرے پیچھے گھاٹی میں آنا دیکھا گیا کہ لالین مینجین ایک خیمہ مشکنے اور مسافر کا مزدی سامان بھی ان کے آگے کے بعد پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ ہزاروں فٹ گھاٹی کی تہ سے انھیں اوپر چڑھنے اور کسی قریبی بستی پہنچنے میں کسی دن لگتے اور اس دوران ہم کب کے تہمت کی سرحد پار کر چکے ہوتے۔ انھیں ایسے چھوڑ دینے پر کوئی بھی تیار نہ ہوتا، اگر ہمیں یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ ہمارے سامان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ وہ صندوق میں بھری ہوئی چیزوں کے متعلق قطعاً لاعلم تھے جس وقت بڑے مندر کے تہ خانے سے نکل کے راتوں رات ہم اہل مقام پر پہنچے تھے جہاں شوکم جارا انتظار کر رہا تھا تو ہم نے اپنی جیبوں اور پٹلیوں میں بھرا ہوا سامان اس کے ساتھ لائے ہوئے صندوق میں منتقل کرتے وقت اس بات کی خاص احتیاط کی تھی کہ تینوں نفلی اسے نہ دیکھ پاویں انھیں اس دوران دور رکھا گیا تھا۔

اوپر پھاڑوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا مگر مری میں بتدریج کچھ ہل چکا تھا۔ دن میں ہم اپنے اُور کوٹ آنا دیتے تھے۔ مری کا موسم بھی بدل گیا تھا۔ راستے میں بادی باری سبھی بیمار پڑے تھے۔ سب کے بدن کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ مزہ کھولتے ہوئے ہونٹ دکھتے تھے، رات کو لیٹتے تو گرہن خننے لگتیں۔ اباجان بہت کم کسی سے بولتے تھے، مجھ سے بھی نہیں۔ تقی بیابھی کے منہ سے بولے تھے۔ ہمارے ساتھ اب کوئی رہبر نہیں تھا صرف ایک اندازہ تھا کہ ہم سرحد کے قریب ہو رہے

ہیں۔ سرحد اب آیا ہی چاہتی ہے، ایک مہینہ گزر گیا۔ کہیں بھی مری بستیوں کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس وقت ہمیں راستہ جھنگ جانے کا شبہ ہوا۔ اب تک ہم بستیوں کاٹ کاٹ کے گزر رہے تھے مگر اب ہمیں خود ان کی تلاش تھی۔ اُنچائی سے ہم جادوں طرف نظریں دوڑاتے رہتے کہ کہیں انسانی زندگی کے نشانات دکھائی نہ جائیں۔ کئی دن تک ہم اسی ٹنگ دوں میں رہے۔ اس عرصے میں کسی بھی ناقلے سے جارا آنا سامنا نہیں ہوا۔ یقیناً ہم کسی ویران جگہ آ گئے تھے۔ یہاں سبزہ بھی برائے نام تھا اور آگے دور تک عموماً پھیل پھاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن پر کہیں کہیں برف پڑی ہوئی تھی۔ اگر سرحد اتنی ہی دور تھی تو ہمیں قبیلے کے آدمیوں اور نفل کی گڑھاٹی میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے ہی ہمارا رخ کسی دوسرے راستے کی طرف موڑ دیا تھا لیکن سمت کی پہچان مشکل نہیں تھی۔ اب جان کے پاس قطب نما کی ایک چھوٹی ڈبیا تھی۔ سورج سے بھی سمت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ہم نے اپنے اندازے کے مطابق جنوب کی سمت سفر جاری رکھا اور زمین جیسے ہمارے پیروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ ہر پتھر پتھر پر پاڑوں، میدانوں کو دیکھے ہوئے مہینے گزر گئے تھے۔ سب کی رفتار تیزی سے بندھان کی سرحد نزدیک آنے کے خیال سے سبھی کے قدم آٹھ رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا یہ پاڑا کبھی ختم نہیں ہوں گے، ساری زندگی ہم انھی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ سامنے جب کوئی اونچا پاڑا دیوار بنا کھڑا نظر آتا تو جی چاہتا ہرے سے اس میں سوراخ کر دیں ایک مختصر فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک ہاڑ کے کسی چکر کاٹنے پڑتے تھے۔ جب کہیں وہ سامنے سے ہٹتا تھا مگر اس کے مہینے ہی دوسرے سامنے آ جاتا تھا۔ تہمت کی پہلی سرحدی چوکی کا نام ساما تھا اور اس کے پاس بہت سی چھوٹی بڑی بستیوں آباد تھیں۔ ساما یا کسی دوسری بستی کی دودھ دوسرے کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ قبیلے کے لوگوں کو خدا ہوئے دس روز سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ہم چلتے رہے۔ چلتے ہی کی صورت میں کوئی بستی ملنے کا امکان تھا اور آخر کیا رہوں روز بندی سے مشرقی نشیب میں واقع ایک چھوٹی بستی ہم نے دھڑ دھڑاہی کی کسی ستیا کو دیکھا کہ کوئی ناخظ دریافت کرنے کی اتنی خوشی اور حیرت نہیں ہوئی ہوگی جتنی ہمیں گنتی کے چند مکانوں پر مشتمل وہ بستی دیکھ کر ہوئی۔ سب لوگ آگے جا کے رک گئے اور شوکم اور پیر تقی بیابا جگتے ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ جب تک وہ نہیں لوٹے ہم ان کا بے صبری سے انتظار کرتے رہے اور جب وہ لوٹے تو ایک لہریں

تھے اُن کے ہمراہ یاکوں کے ساتھ چار آدمی بھی تھے۔ یقیناً وہ قلعہ ہی ہو سکتے تھے اور وہ قلعہ ہی تھے۔ اُنھی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم آسام کی طرف جانے کے بجائے جنوب مغرب میں بھوٹان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بھوٹان کا سارا علاقہ عبور کر کے ہی ہندوستان میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ وہ جلیں اور دواں کے لوگ ہمارے دیکھنے پہنچے نہیں تھے۔ بھوٹان زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا لیکن ہم نے قلیوں کو آسام کی سرحد کی جانب چلنے کو کہا۔ انھیں ایک بڑے معاوضے کی پیش کش کی گئی تھی اور کچھ رقم پیش کی بھی تھی۔ ساتھ ہی اُن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ آسام کی سرحد ہی چوکی تک ہمارے ساتھ چلیں گے تو ہم اپنا بچا ہوا تجارتی سامان اور چند پاک بھی اُن کے حوالے کر دیں گے۔ وہ آنا کافی کرپے تھے لیکن آبا جان کا اصرار کارگر ثابت ہوا، وہ مان گئے۔ آئندہ ایک مہینے کی مسافت سے، ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے مختلف راستے پر اپنی منزل سے کتنی دور چلے گئے تھے۔

ایک ہفتے بعد جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ آسام کی سرحدی چوکی اب ایک دن کے فاصلے پر رہ گئی ہے تو سب ایک دوسرے کو ناقابل یقین نظروں سے دیکھنے لگے۔ گویا چند میل کے فاصلے پر ہندوستان تھا۔ دوا تین دن کا سفر۔ سبھی کی بھی ہوتی انھیں جھپکنے لگی تھیں۔ ہم نے قلیوں سے کہہ دیا تھا کہ آسام آنے سے کچھ دور پہلے ہی وہ ہمیں مطلع کر دیں۔ اب تک ہم نے انھیں نہیں بتایا تھا کہ ہندوستان میں واپس ہونے کے لیے ہمارے پاس راہ دار کا کا باقاعدہ پروانہ نہیں ہے ورنہ وہ شروع ہی میں آئیں بائیں ٹائیں کرتے۔ آبا جان کا کچھ نہیں تھا۔ جھکشو پروانہ راہ دار کی کی نقد سے آزاد تھے۔ صیبا کہ میں توقع تھی، یہی سن کے قلعہ میں متہ بنانے لگے اور انھوں نے پروانے کے بغیر ہمیں آگے لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ یہاں تک آگے ہم اُن سے کوئی ضد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لبتیاں قریب تھیں اور ہمارا کوئی بھی ناروا عمل نہیں اُن کی نظروں میں مشکوک کر سکتا تھا۔ جانے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پروانے کے بغیر قلعہ بڑی مشکل سے ہمیں تہمت میں داخل کرانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں ایک بڑی رقم کی پیش کش کی اور اپنے تمام کے تمام مال اور ایک ہندو بھی اُن کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا۔ پچھلے تجربے کے مطابق ہمیں اندازہ تھا کہ اُن کا انکار ہماری طرف سے محض رقم میں مزید امانت کے لیے ہے۔ وہ انکار کرتے رہے اور جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم اس

سے زیادہ نہیں بڑھیں گے تو وہ چپ ہو گئے۔ ہم ساما نہیں گئے بلکہ کچھ پیچھے لوٹ کے ایک جانب پاڑوں پر چڑھنے لگے۔ ایک دن دو دن تین دن پورے پانچ دن بعد ہمارے دنگ لگاتے قدم ہندوستان کی زمین چھو رہے تھے۔ ہم ہندوستان کی پہلی سرحدی چوکی والنگ کے اطراف گھومتے ہوئے اُس سے کچھ آگے ساتی نانی ایک قصبے کے گرد و نواح میں آگئے تھے۔ ساتی سے ہم پہلے بھی گزر چکے تھے۔ یہاں دہری شہریت کے لوگ رہتے تھے۔ بجز وقتی تہیتی، بجز وقتی ہندوستانی ہم ساتی کی بستی میں بھی نہیں گئے۔ قلیوں نے ہمیں وہاں چھوڑ کے واپس جانا چاہا تھا۔ ہم نے انھیں کسی نہ کسی طرح اور آگے چلنے پر آمادہ کر لیا اور دونوں کی مزید مسافت کے بعد وہ ہمیں قصبہ من زانگ کے علاقے میں لے آئے۔ یہیں یاد تھا کہ من زانگ کے دوسری منزل قصبہ پوچی کا فاصلہ تقریباً آٹھ میل کے برابر ہے اور ان آٹھ میلوں میں بڑے پاٹ کے دریا گھاٹیاں اونچی چوٹیاں کیڑے کوڑے جنگلات اور درندوں کی کثرت ہے۔ چن دتی سے ہمیں جیسے مل سکتی تھیں۔ قلعہ من زانگ سے آگے بڑھنے پر نقصان تیار نہیں تھے لیکن اُن کے بعد بار بار دریا کی لیے چھوٹے اونٹنے قلیوں کی تلاش میں ہمیں مجبوراً قصبہ من زانگ میں داخل ہونا پڑتا۔ چھوٹے اونٹیاں کوں کے بغیر آٹھ میل کا یہ دشوار گزار راستہ طے کرنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ قلعہ ہاری کزوری سے غریب واقف تھے۔ سامان تو ہم کی طرح اپنے کھدوں پر اٹھالیتے تھر جھل کے لیے پیر کی موجوں کی وجہ سے زیادہ دور چلنا نقصان دہ ثابت ہوتا۔ وعدے کے مطابق ہمیں اپنے تمام مال اُن کے رخصت ہونے پر اُن کے حوالے کر دینے تھے۔ ہمارا کوآن پرفقہ آ رہا تھا۔ چرنے نے اُسے قلعے رکھا اور پھول داریاں کدالیں بنجیے باقی ہندو تہیں گرم کرپے اور مزید نقدی کے معاوضے پر آئیں ہمارا کر لیا۔ قلیوں کو بھی واپس جانے کی جلدی تھی۔ انھوں نے ہمیں ایک ہی دن میں من زانگ سے چن دتی پہنچا دیا۔ چن دتی ہم چن دتی کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ سورج چمک رہا تھا۔ گھنٹی سی ہو چلا۔ دیہی تھی۔ اعلیٰ اعلیٰ سی ہوا۔ جسم چھپاٹے جاتے تھے۔ ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر کدوری اور بانس کے مکانات کے جھنڈے تھے۔ مگر ہم اُن سے دور ہی رہے۔

سب کے سپرے زمین پر نہیں پڑے تھے۔ مارٹنے قلیوں کو اپنی گھڑی میں سے دی ہرنی بے قدم گھومتی تھی۔ ہم نے جتنی چیزوں کا اُن سے وعدہ کیا تھا، اُس سے بڑھ کر جو کچھ ہمارے سب بنگ

صابری کی تیل



خالص سرسوں اور قدرتی اجزاء سے تیار کردہ
اپ کے جسم کی نشوونما
اپ کے سراپا کی رعنائی کے لیے

صرف ایک شیشی میں مشرق محسوس ہو جائے گا
مکمل کورس کے لیے
زیادہ سے زیادہ تین ہفتے

صرف خواتین کے لیے

واحد تیار کنندہ

صابر پروڈکٹس
کراچی پاکستان

پڑ نہ ہمارے سامان پر اور ضیے جیسے ہم ہاڑی علاقوں سے میدانی علاقوں کی طرف بڑھتے گئے، ہمارے اندیشے بھی کم ہوتے گئے لیکن کسی قدر اطمینان سب کو اسی وقت مال ہوا جب ہم نے توں کیا ریلوے اسٹیشن پر کھلتے جانے کے لیے ریل گاڑی میں قدم رکھے۔

ساری بند رتیں تلی لے گئے تھے تینچے کا قابلیت ہماری جیوں میں موجود تھی۔ چنگک پوریس والوں اور مسافروں کی نظروں سے بچنے کے لیے ہم نے فرسٹ کلاس کے کھٹ لیے تھے حالانکہ ہمارے پڑے فرسٹ کلاس مسافروں جیسے نہیں تھے۔ کاش میں کسی تمام پر اپنے صندوق سوٹ کیسیوں سے بدلے اور اپنے پڑے بڑے کا وقت مل جاتا مگر کسی جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرا ہمارے لیے مناسب ہی نہیں تھا۔ جلد سے جلد سرے دور، انسانوں کی بھیڑ میں ہم ہر جانا ہی قرین صحت تھا اگر صندوق میں وہ سامان نہ ہوتا جو اب موجود تھا تو ہمیں قدم قدم پر یہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھنے کے بجائے ہم دو ڈبوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ چیل، آباجان، میں، ملاکو، مارٹی اور سلاٹ ایک ڈبے میں، دوسرے میں بیرو، بامو، پلو، سولم، زورا اور مینی۔ لگ بھگ چھ بیٹھے ہوئے تھے۔ چھ بیٹھے بعد ریل گاڑیاں، اسٹیشن، بجلی، تقسیم کی کٹ، طرح طرح کے لوگ، بھاگتے چلتے جاتے ہوئے آدمی پھر ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ ہر طرف نور ہوئی۔ قصبہ دری ای میں بہت دنوں بعد ہم نے ہندوستانی طرز کا کھانا کھا یا تو مرچیں سے مزین جل گیا۔ دودھ میں کھوئی ہوئی چائے کا ذائقہ بھی سنبھال سکتا تھا۔ سب کچھ بدلا، نیا نیا سا تھا جیسے ہم کسی نئی دنیا میں آگئے ہوں یا ہم نے دوسرا جنم لیا ہر نئے پلنے ہر طرف پتنگے سے اڑتے محسوس ہو رہے تھے اور ایسا لگا تھا جیسے میں سیدھا کروا کے پاس جا رہا ہوں۔ میری انگلیاں بے اختیار گولوں میں پڑی اس کی دی ہوئی مالاکے دلنے ٹوٹتی تھیں اور ہر لمحے مجھے گمان ہوتا تھا کہ میری مالا کھو گئی ہے اس کی کوئی ایک ایسی چیز تو میرے پاس موجود تھی جسے میں چھو سکتا تھا۔ جب بھی مالاکے دانوں سے میری انگلیاں ٹس ہوئیں لگتا جیسے اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں اور وہ میرے سینے سے لگی ہے مجھے لوگ رہی ہے، ٹوکے مار رہی ہے، میں سو گیا ہوں تو مجھے جگا رہی ہے، وہ میرے سامنے کھڑی ہے بس میں اسے دیکھ نہیں سکتا لیکن میں اسے چھو سکتا ہوں۔ میں اندھا بہ خواب ہی دکھاتا رہتا تھا۔ ہر لمحہ میں کھلتے سے قریب کر رہا تھا میری طرح کرنی لگے کر رہا

پاس نہ تھا، سب ان کے سپرد کر دیا۔ یوں بھی ہمیں اپنا سامان کھم کرنا تھا، غلیوں کے جانے کے بعد اور جیبوں کی تلاش میں بھٹکنے سے پہلے ہم نے اپنے علیے ٹھیک کیے۔ سب نے شہو کیا، ایک دوسرے کے بالوں کی لٹینی پیچھی سے تراشیں اور نئے کپڑے بدل لیے۔ آباجان نے بھی اپنا بھٹشوٹ کا لباس آٹا دیا۔ ان کے پاس کوئی اور لباس نہیں تھا۔ میرا کرنا، باجام اور صدی ہیں کے انھوں نے اوپر سے بندھی ہیں لی۔ زریں نے یہ سارے کپڑے اپنے ہاتھوں سے سے تھے۔ سورج ڈوبتے وقت میں پسینا ملنا ممکن نہیں تھا اس لیے ہم نے سولم اور جامو کو جلد سے جلد آگے رانا کر دیا اور خود اپنے سر پر ہندوؤں کا بوجھ اٹھائے جن کی دنی کی بستی کی طرف بڑھتے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح بھی کٹل دھڑک لے رہے ہوں گے۔ ابھی ہم ہتھی کے کنارے پر تھے کہ سولم اور جامو واپس ہونے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ بچہ اور قتل تھے۔ کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ انھیں جیبیں میں مل سکی ہوں گی۔ ہم نے سامان بچوں پر لا دیا۔ جن دنی سے آگیا قصبہ ناراسات میل کی دوری پر غنیمت و مان پہنچتے پہنچتے اندھرا ہو گیا۔ قتل اندھیرے کے باوجود ہمیں سستی تک پہنچانے کے لیے تھک رہے تھے لیکن ہر پڑے انھیں لکھ دیا۔ اسے بھرنے کا ایک مندر نظر آیا تھا۔ بستی میں جانے سے بہتر تھا کہ رات ہم مندر کی غارت میں گزار دیں۔ پھر قتل بھی ہمارے ساتھ بٹھیر گئے۔ ابھی صبح پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ جامو اور سولم کسی سے کچھ کہے بغیر پھر جیبوں کی تلاش میں نکل گئے۔ واپس آئے تو ان کے ساتھ دو جیبیں تھیں۔ ناراسے قصبہ بوجی ما پھر سارا، تھڑنال، پانگ، پھر دنگ، ایک۔ تین دن بعد کہیں بچوں کہیں جیبوں کے ذریعہ شب روز سفر کرتے ہوئے قصبہ دری ای میں آگے ہم نے دم ایلا مگر بس دم لینے کی حد تک۔ ہمیں معلوم تھا کہ دری ای میں ہندوستان کے پولی ٹیکل ایجنٹ انٹیل میں انسٹر اور ٹریڈ ایجنٹ کے دفاتر موجود ہیں اور پولیس اسٹیشن بھی ہندوؤں میں بکھرے ہوئے سامان کی وجہ سے ہمیں خود کو چھپائے رکھنا پڑ رہا تھا۔ زیادہ احتیاط میں بھی اندیشے تھے، کوئی بھی ٹک کر سکتا تھا۔ جن دنی سے چلتے قتل اور ڈراٹور میں ملے، ہم نے انھیں ہی بتایا کہ ہم انھی قصبوں کے اطراف تجارت کی غرض سے گھوم رہے تھے۔ اب واپس اپنے گھروں کو چلے رہے ہیں اور دم دو دفاتر ہیں جو جن دنی میں اتفاق سے ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ ہم نے اپنے چہرے لباس اور انداز سے طویل سفر کے نشانات مٹانے کی ہر فن کو کوشش کی تھی۔ بہر حال انھیں ہم پر شک نہیں ہوا، ہم

ہوگا۔ گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر ٹھہری تو کبھی وہ دوسرے ڈبے سے نہیں پوچھتے آجائے کبھی میں مادی، ہلاک، سارے اُن کے پاس چلے جانے، سارے کو کھلتے پہنچنے کی سب سے زیادہ بے کل تھی۔ کتنا خفا تھا ہم اچانک اڈے پہنچیں گے تو کانتے اور کتب خاں جیلن رہ جائیں گے۔ اتنے دن ہو گئے تھے، اُدھر اڈے پر وہ سب نہ جلنے کیا سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کبھی لوٹ کے آئیں گے بھی یا نہیں۔ بھل نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کا ارادہ کس طرف جانے کا ہے مگر اُس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ واپس آنا نہ آنا اتفاق ہے، ایک حادثہ۔ انھیں معلوم تھا کہ اس نے بارہ آدمی اُن لوگوں میں سے منتخب کیے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو جن کے پیر بندے جوئے نہ ہوں۔ تینوں اور مدفن کی مشقیں، جانے سے پہلے بھل کا دن دن ہجرات سے باہر رہنا، انھیں یہ سب باتیں یاد آتی ہوں گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی ہوگی سب ایک دوسرے کا منہ نہ کھینچیں گے کہ ہماری کوئی خیر نہ ہو! ہمیں زمین کھا گئی یا آسمان بھگ گیا؟ کانتے کے نام زین کے روز نہیں تو مفت میں ایک دو بار ضرور خط آتے ہوں گے۔ کانتے اُسے یہ بے جواب دیتا ہوگا۔ مبینی سے جولین اور چچا کے خط بھی اُس کے نام آتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے وہ جولین اُس کی ماں اور چچا بچم کو فیض آباد ہی لے آیا ہو۔ کتنا تھا کہ استاد ناراض ہوں گے مگر ایک بار جب جولین فیض آباد آ ہی جائے گی تو استاد اسے مبینی واپس نہیں بھیج دیں گے۔ اگر کانتے واقعی اُسے فیض آباد لے آیا ہے تو حویل میں ہر وقت ایک ہنگامہ رہتا ہوگا۔ مینر علی، زہرہ، سلمہ، جو میاں، ارشد، خانم، نیساں، جہاں گیر، رند ڈاکے کا انتظار ہوتا ہوگا۔ نیساں پانچوں وقت مٹھلے پر بھی دماغیں کرتی ہوگی، الہی، بابر بھائی کو سلامت رکھنا، انھیں کامیاب و کلران کو ملانا۔ اس عرصے میں نیساں اور بڑی مرگئی ہوگی۔ جہاں گیر نے بھی میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہوگا۔ نہ جانے کیا کیا بد لیا ہوگا۔ مزید علی فیض آباد میں رہ سکے یا نہیں، واپس جیلن جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اگر رانا منتاب کے آدمیوں کو اُن کا کوئی پتہ مل گیا ہو، میرے دماغ میں سب کی تشکیل گڑبڑ ہو رہی تھی، سیدنا کبھی بند ہونے لگتا، کبھی جیسے اس کے سارے درد اُسے کھل جاتے اور درشتی سی بھر جاتی۔

گاڑی تیز رفتاری سے بنگال کی طرف بڑھ رہی تھی سب اپنی اپنی نشستوں پر جمے کہیں گم تھے۔ بھل کو کبھی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے پاؤں میں تکلیف کچھ زیادہ ہی تھی۔ چہرے سے اس کا ہمار

سبب

نہیں ہوتا تھا مگر اُس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اُس کے پیر اپنے زانوں پر رکھ لیے تھے۔ میرے متعلق بابا جان کھڑکی کی طرف منہ کیے گھومتی ہوئی زمین دھک رہے تھے۔ کر ڈبے کی دیوار سے ٹکی، انھیں خالی خالی پریشان کن تنکسٹ، معلوم نہیں کہاں کھوئے ہوئے تھے، برت میں کس طرح میں ملا تھا میرا خیال تھا گاڑی میں وہ مجھے اپنے پاس بلا کر ضرور پوچھیں گے کہ تو اتنے دن کہاں رہا، یہ لوگ کون ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں انھوں نے کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد کوئی بات اُن سے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہوگی مگر انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا سارے سفر کے دوران انھوں نے مجھ سے بہت کم بات کی تھی۔ ہاں مجھے دیکھتے ضرور دیکھتے تھے، بارہا میرے دل میں آیا، اُن سے پوچھوں وہ فرما لے، فرخ، فارہ اور اکبر کس کس کے پاس چھوڑ کے آئے ہیں لیکن ڈر لگتا تھا، نہ جانے کون سا جواب سننے کر لے، اُن کے پاس جاتے کو کچھ ہوتا ہو۔ شاید بھل نے اُن سے کچھ پوچھا ہو۔ وہ دونوں آپس میں کبھی کبھی جیک جیک بائیں کرتے رہتے تھے۔ لیکن بھل نے انھیں بتایا ہو کہ اُن کی خواہش کے مطابق میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ میں بہت پڑھوں کھوں اور بڑا انفرم جلاؤں۔ شاید بھل نے اُن سے نہیں کہا کہ میں نے قتل کے جرم میں سات سال جیل کی سزا کاٹی ہے۔ مجھے بہت اچھا چاہتا تھا کہ اُن سے مل سکے، لیکن مجھے بھی نینچا ملتا ہے تو انھوں نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا۔

مجھے احساس ہوتا تھا کہ ممکن ہے وہ اپنی جھک کی وجہ سے مجھ سے توقع کرتے ہوں کہ میں اُن سے فنی، فرما لے، فرخ، فارہ اور اکبر کے بارے میں پوچھوں گا۔ لیکن ہے سوچتے ہوں، کیا بھائی ہے جسے اپنی بیویں اور بھائی کے نام بھی یاد میں ہے۔ بھائی اُن سے کیا کہتا، اگر اُس نے فنی کو بھی نظر دس کے درمیان بیٹھا نہ دیکھا ہوتا تو کسی اور کے بارے میں پوچھتے ہوئے اُس کی برکت یوں جواب دے جاتی، غالباً ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں خود ہی جواب نظر آتے ہیں تو جھک ہے۔ میں نے بھل سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی کہ وہ کھلتے جا کے پھر جائے گا یا سیدھا فیض آباد جانے کا ارادہ ہے۔ جہاں جہاں گیر ہے۔ اباماں اُسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوں گے، ایک مدت بعد وہ اُن کے سامنے آئے گا تو اُن کا کیا حال ہوگا اور جہاں گیر کیسے ہیں۔ یہ وہ جانے گا۔ ہوسکتا ہے بھل نے اُن سے کہا ہو کہ دو چار دن کھلتے میں پھر کے پھر فیض آباد میں

مجھے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کے وہ چوکتا ہوا اور چھبکا کے بلانا دکھاؤ۔ اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں نے دکھائے ہیں مگر پہلے بات کرنے کی تیز سیکھو میں چپ رہا۔ بھلنے نے اپنی جیب سے نمک نکال لیے تھے۔ دکھائے بالو صاحب کہ۔

میرے ہاتھ سے نمک لینے کے بعد جو دس کا نمک کم نہیں ہوا۔ لوٹ پلٹ کے کبھی نمک کو دیکھنا ابھی نہیں کبھی سامان کو۔ ٹھوک بھلا کے دیکھ لو بھل نہیں ہیں۔ میں نے کہا۔

”آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟“
”نمک میں کھاسے۔“ میں نے نفی سے کہا۔
”ہوں اور نہ ملانے لگا اور کچھ توقف کے بعد تجسٹس آواز میں بولا۔ آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟“

”کیا نمک کے ساتھ یہ سب بتانا بھی ضروری ہے؟“
”نہیں۔ اتنا بھی ٹھیک ہے۔“ اُس کے لیے میں نرمی آگئی تھی، نرمی اُسی لمحے آگئی تھی جب میں نے اُسے انگریزی میں جواب دیا تھا۔ بھل نے مجھے اشارہ کر دیا تھا اور میں اُس سے چند باتیں ضرور پوچھتا۔ بھل کا خیال ہوگا کہ وہ پولیس افسر ہے۔ ہمارے سامان پر بھی نمک ظاہر کر سکتا ہے کسی وقت بھی کوئی حکم چلا سکتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، ساری گاڑی پولیس والوں نے گھیر رکھی ہے۔ ڈبے میں موجود اُس کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہیوں کی نظریں صندوق پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر کو کوئی اشارہ کرتے افسر نے مجھے سے وضاحت کی اور کہنے لگا کہ گاڑیوں کی یہ چیلنگ مسافروں کے فائدے کے لیے ہے۔ میں نے اپنے لفظ منہ ہی میں دبا کر رکھ دیے وہ اُپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو گئی۔

میں نے رُک کے دیکھا، اباجان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں کہ اباجان بھی ڈبے میں بیٹھے ہیں اور وہ انگریزی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود بولنے کے بجائے مجھے اُن کے پولیس افسر سے بات کرنے کا اشتہار کرنا چاہیے تھا۔ پولیس افسر کسی طرح واپس چلا گیا تھا اور گاڑی بھی روانہ ہو گئی تھی لیکن جاتے وقت اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نمک سے ضرور مطمئن ہو گیا ہے۔ ہم سے نہیں وہ اپنا اطمینان کرنے پھر واپس آ سکتا تھا باگاڑی کے ساتھ چلنے والی پولیس کو چوکتا کر سکتا تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھیں۔ مجھے اُس سے اتنی ڈرتی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مباراد وہ اعلان ہو جاتا ہے جس سب سب

گے بحال اباجان کو معلوم ہوگا کہ کہاں جاسے ہیں اور ان کے ذہن میں آگے کے بھی خاکے ہوں گے۔ وہ فیض آباد میں رہیں گے باکس اور۔ اب اُن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ ظاہر ہے اب وہ گیا تو نہیں جائیں گے اور لڑکیاں انھیں کیوں جانے دے گی۔ حویلی میں جاکے اباجان سب سے زیادہ اُسی کو پسند کریں گے۔ وہ ان کا اسی طرح خیال رکھے گی جس طرح بھل کا۔ شاید وہ دوسروں کا خیال نہ رکھنے ہی کے لیے پیدا ہوئی تھی، فنی کی بہت سی خصوصیات اس میں موجود تھیں، اباجان نے فنی کو کھو دیا مگر رزین سے مل کے بڑی حد تک فنی کا ازالہ ہو جائے گا مگر یہ سب میرے اپنے ذہن کے خیال تھے۔ میں اباجان کے دل میں چھپا نہیں بیٹھا تھا۔ زوال میں انھوں نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ اب ان کی تعبیر کا وقت آیا۔ اتنی بڑی دولت سے وہ کیا کر دیں گے۔ غلات جاگیر پر کوئی ریاست، ان تھوڑے سے وہ اپنے خوابوں کی کیسی کیسی تعبیر کر لیں گے۔ اُن کا شمار دنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ہونا چاہیے۔ اب خزانہ اُن کے ساتھ تھا اور وہ خزانے کے ساتھ۔

بھل انھیں مونہے لیٹا تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ اباجان تھوڑی دیر کے لیے لیٹے پھر اُٹھ کے بیٹھ گئے وہ کھڑک سے کسی کبھی نظر اُٹھا کے میری طرف دیکھ لینے۔ رات کو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بھی لیٹ جاؤں مگر مجھے پینہ پی نہیں آرہی تھی میں رات بھر بیٹھا رہا۔ صبح سویرے گاڑی نو کو بج رہا ہے ایک پہل نمک آئی ہوگی کہ اچانک رگ گئی۔ ہم نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ گاڑی دونوں طرف سے پولیس نے گھیر لی تھی۔ ابھی گاڑی پھیرے چند لمحے بھی نہ گزے ہوں گے کہ ایک پولیس افسر دو پامیور ہکے ساتھ ہمارے ڈبے میں داخل ہوا۔ پہلے اُس نے انگریزی میں دل اندازی کی معافی چاہی لیکن دوسرے ہی کلمے جیسے ہی اُس نے ہماری صورتیں دیکھیں صورتیں کیا لباس دیکھے ٹوناک جھول چڑھا کے بولا۔ تم لوگوں کے پاس فرسٹ کلاس کا نمکٹ ہے؟“ اُس نے انگریزی میں کہا۔ اُس کی نگاہیں ہمارے چہروں اور سامان پر چل رہی تھیں۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا نمکٹ ہوگا۔

”بالو کیا گٹ پٹ کرنا ہے لے؟“ بھل نے بولھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔

”نمکٹ کو پوچھ لے ہے۔“ میں نے تشریح سے جواب دیا۔ مجھے پولیس افسر کے لیے پوچھنا اور اباجان اُس کی نظروں میں تھا۔ فنی تھی۔ ہمارے پاس نمکٹ ہیں۔ میں نے آہستگی سے انگریزی میں کہا۔

”زرا دور چلے گئے تھے“
 ”دور چلے گئے تھے۔ اُس کی آواز جھرجھراہی تھی تو پتہ لڑھ
 کب آئے؟“
 ”ابھی اترے ہیں لے“ اُچھلنے تک کے کہا۔
 ”ابھی آؤ گھر کے بولا۔“
 ”ہاں لے!“
 ”لوگ ادھر نہ جانے کیا کیا کر رہے تھے“
 ”اُن کو بولنے دے۔ کانتے کیسا ہے؟“
 ”کانتے! کانتے تو جیل میں ہے استاد!“
 ”جیل میں! کب سے ہے؟“

”میتے سے اُن کو کچھ نہیں پتہ؟“ وہ سٹ پٹا کے بولا۔
 ”بھلنے نے اُس کے بال بچڑ لیے۔ کھل کے بول“
 ”تم سے استاد! تم کو کچھ نہیں پتہ؟“ وہ گھگھیا نہ لگا۔
 ”منہ کھلا رکھ“ بھلنے نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

پردہ لڑکھڑکیا استاد! استاد! تم کو کچھ پتہ نہیں ہے تو ابھی
 ادھر سے لوٹ جاؤ۔“ وہ دھواں سے بولا۔ ”پولیس تم سب کو ڈھونڈ
 رہی ہے۔ ادھر سب اُٹھیں، ہو گیا ہے۔ کتنے فغان کو مار کے رونا چلائی
 تمہارے اڈے پر بیٹھتا ہے، شولی لالہ، قبا، سب سب ایک دم۔“
 بھلنے نے لے افتخار اس کا منہ تھپڑ مارنے لگا۔



اپنی بیٹی * جگ بیٹی
 سبابت زمانہ نخواستہ

ایک آدمی کی عیبت خانہ کی سرگزشت
 باقی آئندہ شمار سے مہیے

فانک ہو جاتا ہمارے بھر بھرتا ہوتا ہمارے ہر چند میں نے کوئی
 غلط بات نہیں کہی تھی لیکن مارنی کے بغیر افسر تو افسری ہوتا
 ہے تمام راستے مجھے بے چینی رہی۔ جہاں گاڑی کوئی، میں بس
 پہلے باہر بھاگنے کے دیکھ لیتا کہ پولیس نے گاڑی کے گرد دو بار
 تو گھیرائیں ڈال دیا ہے۔ مجھے خزانے کی فکر نہیں تھی۔ اُس کا
 مجھے کیا کرتا تھا مگر جہاں تک ابا جان کہتے، ہمیں یہ حفاظت اتنے
 دیاں تک پہنچی دینا تھا۔ تمام پورے ہی گاڑی تیزی سے چلتے
 کے نزدیک ہوتی گئی۔ پھر کوئی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا، اگر بھل
 نے ابا جان کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے تو میرا دل انگریزی
 بولنے پر انہیں ضرور جرت ہوئی ہوگی۔

ابھی کلکتہ آنے میں درمیان کے دو ایک اسٹیشن باقی تھے
 کہ بھل نے پیر، زور، مارنی اور ابا جان کو ایک ڈبے میں کر دیا
 اور خود دوسرے ڈبے میں چلا آیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ آ گیا۔
 ہم نے وہ سب صندوق بھی اُسی ڈبے میں منتقل کر دیے تھے جس
 میں ابا جان تھے اور اپنے ساتھ صرف وہ سامان رکھا تھا جس
 میں خزانہ نہیں تھا۔ یہ اختیار سب کی سمجھ میں آتی تھی اس لیے کسی
 نے اعتراض نہیں کیا، بھل چھ مینٹے بعد کلکتہ واپس جا رہا تھا سامان
 مختلف ہوتا تو بات اور تھی۔ ہمارے پیچھے کلکتہ میں بہت کچھ بدلا
 ہوا ہو سکتا تھا۔ پیر، زور اور مارنی کا تعلق ممبئی کے باڈوں سے
 تھا، انہیں کلکتہ میں آؤے کے چند آدمیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا
 تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت چاروں ایک دوسرے سے جدا جدا
 رہنا ہی ہوتا تھا۔ اب کے اسٹیشن پر کوئی نہیں لینے کے لینے
 والا نہیں تھا لیکن وہاں مختلف اڈوں کے چند آدمی ہمیشہ موجود
 رہتے تھے۔ اسٹیشن تقریباً ہر وقت مسافروں سے بھرا ہوتا تھا کسی
 بھی اڈے کا آدمی ہیں وہاں مل سکتا تھا۔

گاڑی کو رکتی ہوئی باؤڈل کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو
 میری رگوں میں خون چمنے لگا۔ ہم پہلے اترے، بعد میں پیر اور ابا جان
 وغیرہ۔ بھل ٹکڑا کے چل رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے گور کے ایک آدمی کے
 پیچھے جب ہم گیت سے باہر آ گئے تھے اور یکسیدوں کی طرف بڑھا
 ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی بھاگتا ہوا ہماری طرف
 آیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بدرد تھا، ہمیں لوہے کے اڈے کا
 آدمی۔ آنے ہی اُس نے بھل کے پیچھے چلے اور ہانپتے ہوئے بولا۔
 ”استاد تم!“

”کیسا ہے لے بندو؟“ بھل لے بندو ہی کہتا تھا۔
 ”تم... تم کو کدھر تھے استاد!“ وہ حواس باختگی سے بولا۔

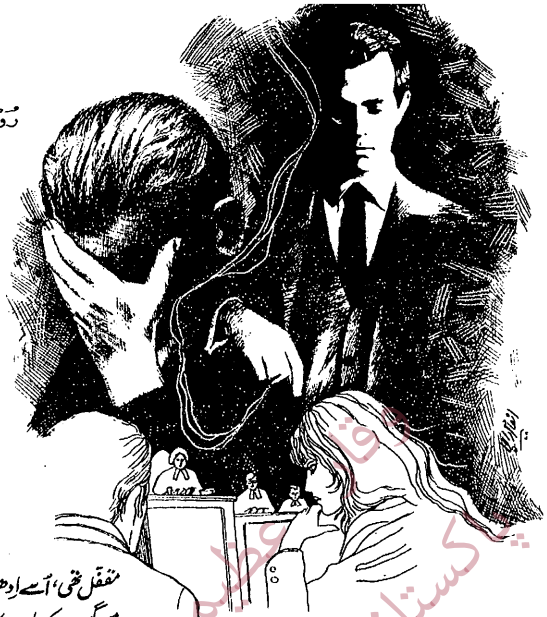
سب بنگ

دوڑے ہوئے وقت کو مٹانے کے لیے
سمندر کی آواز
کم شخصیت، بالانشائیہ
کیلا اشر

* ایڈیسی
آنور خواجہ



ایک سنگین مقدمے کی روداد



مقتول تھی، اسے ادھر ادھر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جان نے اپنی گاڑی
میں گھس کے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ ہارن بجانے کا مقصد یہ تھا
کہ دوسری گاڑی والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جائے رات
کی خاموشی میں ہارن کا شور انتہائی ناگوار تھا۔ کانوں کے پرے
پھاٹنے والا یہ ہارن تقریباً دس منٹ تک مسلسل بجتا رہا۔ ہر رٹ
نے عدالت میں یہی بیان دیا تھا۔ ہر رٹ کے ایک پڑوسی مسٹر
تھامس نے کھڑکی سے سر نکال کے آواز لگائی۔ ”یہ بیٹی آواز بند کرو۔“
جان نے ہارن بجانا موقوف کر دیا اور بلند آواز میں ٹٹھکان
سے پوچھا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ میری گاڑی کے پیچھے والی
کار کس کی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“
”تو آپ کا کیا خیال ہے؟ میں ساری رات یہیں گزار دوں گا؟“
جان نے پھر زور زور سے ہارن بجایا۔
ہر رٹ تفریقِ افواہات کی لمبی زنجیریں جمع کر رہا تھا۔ پندرہ
منٹ سے اس کی تمام توجہ اسی کام پر مرکوز تھی مگر جان نے اس کا
سارا حساب گرد و بر گرد دیا۔
پڑوسی مسٹر تھامس نے جان سے پوچھا: ”مسٹر کیا تم پرے
غلے کو جگنا دینا چاہتے ہو؟ میں صبح جلدی کام پر جاتا ہوں۔ مجھے
نیند کی ضرورت ہے۔“

”یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔“ جان نے بیچے سے جواب دیا۔
”میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے جلد سے جلد گھر پہنچنا ہے۔ اس سے پہلے
کہ میری بیوی شوہر جانے لگے۔“ اس نے پھر زور سے ہارن بجانا

یہ کوئی باقاعدہ قتل نہیں تھا مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ لاشنگ
میں ایک قتل کو بیٹھا تھا۔ وہ قاتل ہو گیا تھا۔ اس کی عمر ۲۹ سال
تھی۔ وہ تیلے چہرے اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ اسے ایک
معتقل دفتر میں جوئیر کا ڈسٹنٹ کلرک جگہ ملی ہوئی تھی۔ گزشتہ چند
دنوں سے اس کے افسرانے ایک مشکل جانچ پڑتال اس کے سپر
کرکھی تھی اس لیے اسے دفتر کے علاوہ رات کو گھر پر بھی کام
کرنا پڑ رہا تھا۔

جس رات اس نے مقتول کو ہلاک کیا، وہ اپنے فلیٹ میں
دفتر کا کام کر رہا تھا کہ رے کی کھڑکی پر ٹرک کی طرف کھلتی تھی۔ رات
گرم اور چھپی تھی گرمی اور چھپا ہٹ نے ہر رٹ کے حساس اعصاب
نتیج میں بند کر دیے تھے۔ پسینہ اس کی پیشانی سے ٹپک کر آنکھوں
میں آ رہا تھا، آنکھیں دھندلائی جا رہی تھیں۔ سارے نو بجے اس
کی بڑی ایلن ہسٹر پر لیٹ کر کچھ پڑھنے لگی۔ دس بجے ایک فی دی
شوٹھا۔ ایلن یہ شوہر تئوٹ سے دیکھتی تھی لیکن اسے معلوم تھا
کہ فی دی کی آواز سے ہر رٹ پریشان ہو گا اس لیے اس نے شو
نہیں دیکھا۔

مقتول کا نام جان تھا۔ اس کا تعلق ایک ہیرکینی سے تھا،
اس کی کار پیچھے کھڑی تھی۔ پورے دس بجے وہ اپنی گاڑی کے
پاس پہنچا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے کسی اور نے ایک کار کھڑی
کر دی تھی لہذا جان اپنی گاڑی نہیں نکال سکتا تھا۔ دوسری کار

شروع کر دیا۔ رات بکھٹاٹے میں ہاؤن کی تیز آواز کانوں کے پرے پھاڑنے لگی۔

ہربرٹ نے کام چھوڑ کے کھڑی سے سر ہار نکالا اور زور سے چیخا: ہند کر دیہ نشور، جان نے اُس بات کا جواب سبیل ہاؤن دیا۔ کمرس پر کیمپنی نے ہربرٹ کو جینی کا ایک بڑا پیپر وٹ تحفے میں دیا تھا۔ اُس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر پیپر وٹ اٹھا کر کار کی طرف بھینچ مارا۔ پیپر وٹ کار کے آدھ چڑھے ٹینڈے پر لگا۔ ٹینڈے ٹوٹ کر جان کی شہد رگ میں پیسٹ ہو گیا۔ شہد رگ کٹ گئی۔ ہاؤن کی آواز بند ہو گئی، ساتھ ہی جان کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔

پولیس نے اس امر سے اتفاق کیا کہ یہ محض ایک حادثہ تھا۔ ہربرٹ کے وکیل نے اُسے اور اُس کی بیوی ایلن کو یقین دلایا کہ گھرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ صاف عارضی پاگل پن کا مقدمہ ہے۔ ملازم غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ آدھ پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ لیکن استغنائے کے سرکاری وکیل نے عدالت میں اُس کے برعکس بیان دیا۔ ملازم ایک بڑھا کھیا آدمی ہے وہ ایک ذمے دارانہ کام پر مامور ہے اور اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہے۔ اُس نے اپنے غصے پر قابو کیوں نہیں پایا۔ اُس کے غصے کی وجہ سے ایک انسانی جان ضائع ہو گئی۔ مانا کہ مقتول اُس وقت وٹس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا لیکن وہ ہاؤن بجانے پر مجبور تھا اور ہاؤن بجانا اتنا بڑا جرم نہیں۔ ہاؤن بجانے پر قتل کر ڈالنا بہت بڑا جرم ہے۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ قاتل کو قتل و انصافی سزا دی جائے۔

جج نے جیوری کے ارکان سے فیصلہ کرنے کے لیے کہا۔ جیوری کے ارکان دو مرتبہ کمرے میں چلے گئے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہربرٹ کو جیل بھیج دیا گیا۔

سات بجے کے قریب ہربرٹ کے وکیل نے خوف زدہ ایلن کو بتایا نہ جانے جیوری کے لوگ فیصلے میں اتنا وقت کیوں لگا رہے ہیں حالانکہ ہمارا مقدمہ واضح اور صاف ہے۔ ویسے پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے مگر میں نے جیوری کے ارکان کے چہرے دیکھے تھے ان کے چہروں کا تاثر مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا۔

نوبے کے قریب جیوری نے بتایا کہ وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں اب وہ اپنے ہوٹل میں جا کر آرام کریں گے اور آرا کے دوران مقدمے پر بحث بھی جاری رکھیں گے۔

ہربرٹ کا وکیل پریشان تھا۔ اُس نے ایلن سے کہا: اگر جیوری کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو یہ بھی ہماری جیت ہوگی۔ مجھے سب ننگ

امید نہیں ہے کہ حکومت ہربرٹ پر دوبارہ مقدمہ چلائے گی۔ ہر حال اب تم گھر جا کے تھوڑا سا آرام کر لو۔ صبح دس بجے ملاقات ہوگی۔

دوسرے دن دس بج کر تیرہ منٹ پر عدالت کو بتایا گیا کہ جیوری کے ارکان فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔ ملازم ہربرٹ کو عدالت میں لایا گیا۔ ہربرٹ نے ادھر ادھر دیکھا پھر وکیل سے پوچھا: میری بیوی کہاں ہے؟

”معلوم نہیں۔ وہ صبح سے نظر نہیں آئی۔“

”کہاں غائب ہو گئی؟ اُسے تو یہاں ہونا چاہیے تھا۔“

”خاموش ہو جاؤ۔ جیوری کے لوگ آ رہے ہیں۔ وکیل نے کہا۔“

جیوری کے ارکان اندر آئے سب کے چہرے بڑے بے رحم تھے۔ ہربرٹ کے افسر نے قریب آ کے اُس کا کندھا تھپ تھپایا۔

چند منٹ بعد جیوری کا فیصلہ سنایا گیا: ہم سب کا متفق فیصلہ ہے کہ ملازم محض عارضی پاگل پن کی وجہ سے اس ہلاکت خیز اقدام کا مرتکب ہوا ہے۔ اُسے جرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہربرٹ کے وکیل نے مسرت سے اُس کا ہاتھ دبا یا۔ ہربرٹ کے افسر نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اُس کا کندھا تھپ تھپایا۔

پڑوسی مشرقی ماسن نے کہا کہ انصاف ہوا ہے۔

ہربرٹ نے کسی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ کسی کو تلاش کرتا رہا۔ اُسے بے حد افسوس ہوا رہا تھا کہ ایلن اُس کی خوشی میں شریک نہیں ہے۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ عدالت کے باہر اُس کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ تیزی سے باہر نکلا لیکن ایلن یہاں بھی نہیں تھی۔

ہربرٹ فوراً ٹیکسی کر کے گھر پہنچا۔ اُسے ڈر لگا رہا تھا کہ ایلن کو کچھ ہونے لگا ہو۔

نہایت میں ایلن گری مندرسولہ تھی۔ ہربرٹ کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے غصے سے ایلن کو تیزی سے گھر بھیج ڈالا۔ کیا تم میرا بڑا تم عدالت میں کیوں نہیں آئیں؟ مجھے باعزت بری کر دیا گیا ہے۔

”مجھے معلوم ہے۔ ایلن کی تینہ میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ میں شاید زیادہ سو گئی۔“

”کیا مطلب؟ مجھے امید تھی کہ تم عدالت کے باہر کار لے کر میرا انتظار کر رہی ہو گی لیکن۔۔۔“

”مذکورہ بالا کار خراب ہے اُس کی بیڑی ختم ہو چکی ہے میں ساری رات جیوری کے ہوٹل کے نیچے ہاؤن بجاتی رہی ہوں۔“





گشتاپو کے ہیڈ کوارٹر میں طلبہ کے ایک بڑے مطلق ہو تا تھا

لیکھ مہمنہ کے مقصد دے چہ آویکھ

دوسرے چنگی عظیم کے ایک کھانا

* ایڈورڈ ایملون سن

* حیاضنا الرکھناے قادر ہو



کرت ہرقین گشتاپو کا ایک بہت اہم شخص سمجھا جاتا تھا اس کی پہلے سے دوستی تھی۔ لوگ اسے سہل سے بھی زیادہ بارشوع اور طاقت ور سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کا نام سن کر لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ٹوگ والٹر کے ساتھ اپنے دفتر سے نکلا۔ لوگ خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے، اس طرح جیسے وہ اسے آخری دفعہ دیکھ رہے ہوں گشتاپو کے کسی آدمی کے پاس جا کر واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک بھوری کار ٹوگ اور والٹر کے انتظام میں باہر کھڑی تھی۔ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ بار کا ایک خوب مواریت دن تھا لیکن ٹوگ میں موسم سے لطف اندوز ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا دماغ ماؤت تھا۔ وہ بے خیالی میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ کار ایک مضافاتی علاقے سے گزر رہی تھی۔

پلیہ قد کے ایک بچہ کی شخصیت والٹر نے لوگ کو قلع دی۔ تم سے مشر ہونے اور املنا چاہتے ہیں، ٹوگ کا سرخ سفید چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس کا موٹا نازہ جسم کرسی سے تقریباً آدھا اٹھ چکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح بھاگ نکلے لیکن وہ جانتا تھا، بھاگنے سے بڑی حماقت کوئی نہیں ہو سکتی۔ گشتاپو سے پناہ بہت مشکل تھا۔ وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اپنی کار باری کامیابی پر اسے پھینکا وہ ہونے لگا۔ یہی کامیابی آج اسے لے ڈوئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا کلرک بیٹھا ہوا تھا۔ کلرک پر کچی طاری تھی۔ ٹوگ نے نرمی سے کہا یہ ٹھیک نہ ہو رہیں گے تم نہیں ملو گے، میں ملوں گا یہ ٹوگ کے دماغ میں بدترین خدشات برپا ہونے لگے۔

نکالی تہ مجھے معلوم ہو رہا ہے، آج کل اس ماڈل کی گڑبڑ میں پیرس میں مقبول ہیں؟“

ٹوگ کو اپنی پشیمانی پر ٹھنڈا پسینہ محسوس ہوا۔ جی ہاں، میں نے اس ماڈل کی بہت سی گڑبڑیں پہنچی ہیں۔“

ہوفمین نے گڑبڑ کا پڑا بھڑا ڈالا۔ اب گڑبڑ کا سپاٹ جسم پر کوئی پڑا نہیں تھا۔ دیکھو، مشر ٹوگ، وہ گڑبڑ کی پشت ایک چاقو سے کاٹنے لگا۔ اُس نے ٹوگ پر نظر نہیں ڈال کر دیا کاٹا رہا۔ آج کل پیرس میں مارکس کا کیا بل جاتا ہے؟ میسر مطلب ہے کیا بھڑا چل رہا ہے؟“

”مہم... مجھے نہیں معلوم جناب، ٹوگ چمکا کے بولا۔

”کیا تم مجھے بے قوت سمجھتے ہو؟“

”میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ مجھے...“

”فاکسوس۔ کیا تم سمجھ رہے ہو مجھے یہ معلوم نہیں کہ اب تک تم کیا کرتے رہے ہو؟“ وہ کئی ہونی گڑبڑ کا اندرونی خالی حصہ دکھاتے ہوئے بولا۔ کیا تم نے کبھی یہ ترکیب دیکھی ہے؟“ دوسری دروازے اُس نے بہت سے ٹوٹ نکالے اور انھیں سختی سے تہہ کر کے گڑبڑ کا خالی حصے میں رکھ دیا۔

”پچاس ہزار گڑبڑوں میں اس طرح ٹوٹ رکھ کر انھیں ملک سے باہر اسمگل کیا جا سکتا ہے۔ یہی ہوتا ہے نا؟“ ٹوگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہوفمین بولتا رہا۔ یہ گڑبڑ کا خالی حصہ جو ابھر بھرنے کے کام میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ کیا یہ بات نہیں ہے؟ جو شخص ملک سے وفادار نہیں ہے اور جسے افراط زر کا خوف ہے، وہ مشر ٹوگ ایکسپوٹر کے پاس چلا جاتا ہے۔ مشر ٹوگ اُس کی دولت ملک سے باہر اسمگل کر دیتا ہے۔ پھر وہ دہاں اُس کی دولت پونڈ اور ڈالروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ کیا میں غلط کر رہا ہوں ایکسپوٹر؟“ وہ سکڑا ہوا لہجہ اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر ٹوگ بھی خالی الذہنی سے مسکرایا۔

”ادھ! ہاں! ہوفمین نے بات جاری رکھی۔ مشر ٹوگ

ایکسپوٹر کو یہ بھی معلوم ہے کہ کال آمدنی کہاں ٹھکانے لگائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی اس خدمت کے حوصنی دس فی صد وصول کرتا ہے اور معاوضہ دینے والے کو پوری طرح مطمئن کر دیتا ہے۔ وہ دانت پیس کر یہ باتیں کر رہا تھا پھر بھی اُس کے چہرے ہرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میرا خیال ہے اُس کے صلے میں تمھاری گردن بڑے سے بڑے انعام کی منتظر ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے دوست؟“

رہی تھی۔

کچھ دیر کی مسافت کے بعد وہ ایک بہت بڑے عمارت میں داخل ہوئے۔ دو شخص کے جھنڈے سے ایک سفید چٹشک وہ عمارت بھاگ رہی تھی۔ کارٹر ٹی ٹیٹائی آگے بڑھی اور عمارت سے کچھ فاصلے پر ٹک گئی۔ ایک بلٹر انھیں عمارت کے اندر لے گیا۔ دالٹر نے بلٹر سے کہا یہ مشر ٹوگ ہیں۔“

”ان کا انتظار کیا جا رہا ہے؟“ بلٹر نے بتایا

دالٹر نگلی منزل پر ٹک گیا۔ ٹوگ بلٹر کے ساتھ بالاٹی منزل کے ایک رڈن کمرے میں پہنچا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک بڑے ڈبک کے دوسری طرف کٹ ہوفمین بیٹھا تھا۔ یہ ٹوگ کی بیٹھ جاؤ۔ ہوفمین نے کہا۔

ٹوگ شکستہ دل سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہوفمین اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک دہلا پتلا آدمی تھا۔ اُس کے بال سیاہ اور بھڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر وہ بڑے شیشوں کا چشمہ تھا۔ چہرے سے سختی جھک رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر کھینچی ہوئی خم دار مسکراہٹ ایسی تھی جیسے ہونٹ مزاح دھلکے سے سی دیے گئے ہوں۔ تو تم ہو مشر ٹوگ۔ مشہور ایکسپوٹر؟“

”جی ہاں“

”تمہیں کھلونے بنانے میں مہارت حاصل ہے؟“

”جی ہاں جناب!“

”اور گڑبڑاں بنانے میں بھی؟“

”دوسرے کھلونوں کے علاوہ گڑبڑاں بنانے میں بھی۔“

”تمھارا گڑبڑ کا کاروبار سب سے بہتر چل رہا ہے؟“

”بے شک جناب! میرا گڑبڑ کا کاروبار جھیک چل رہا ہے۔“

پچھلی بات اُس کے منہ سے نکل ہی گئی۔ وہ چمکنا چاہتا تھا کہ مٹی جو ہے کا کھیل بہت ہو چکا اب اس سے بھگنا چاہیے مگر اُس کی آواز ملتی میں گھٹ کے رہ گئی۔

ہوفمین نے پوچھا۔ ”تسا ہے؟ پیرس میں کوئی مشر دوجیٹ ہیں؟ وہ تمھارے بہت اچھے خریدار ہیں؟“

ٹوگ نے سوچا، اسے تو ہر بات معلوم ہے۔ وہ بہت مشکل سے ہل سکا۔ ”میرے بہت سے گاہکوں کی طرح مشر دوجیٹ بھی ایک گاہک ہیں۔“

”ہماری اطلاعات کے مطابق وہ تمھارا بہترین خریدار ہے۔“ ہوفمین نے ڈبک کی دروازہ کھول کے ایک بڑی سی گڑبڑ

سب بگ

”میں موت سے خوف زدہ نہیں ہوں۔“ لوگ نے سادگی سے جواب دیا۔ عجیب بات ہے، اس میں اچانک یہ جرات پیدا ہو گئی تھی۔

ہو نہیں تھوڑا سا آگے جھک گیا۔ لیکن شاید یقین مرنے نہ پڑے۔ یہیں اُن لوگوں کے نام جانتے سے زیادہ دلچسپی ہے، جنہوں نے تھاری خدمات حاصل کی ہیں اُن چند بد نصیبوں کے نام جو اپنے ملک کی عظمت پر یقین نہیں رکھتے۔ یہیں معلوم ہوا ہے کہ تھارے اُن سرپرستوں میں چند اہم شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ میں اپنی زندگی بچانے کے لیے اپنے سرپرستوں کو چھوکا نہیں دوں گا۔“ لوگ نے کہا۔ مجھ سے اُن کے نام اگلوں نے کی کوشش نہ کیجیے۔

”گو تاہم اپنے گاہکوں سے بے وفائی کرنا نہیں چاہتے؟ لیکن یقین ہماری طاقت معلوم ہے؟ ہم شاید یقین بولنے پر مجبور کر دیں۔“

”میرے ہونٹ سلے ہوئے ہیں اور سلے ہی رہیں گے۔“ ”دیکھو لوگ! میں یقین ایک پیش کش کرنا ہوں۔ بعض اطلاعات کی روشنی میں مجھے یہ یقین ہے کہ کہیں انگریز تھارا ایک گاہک ہے۔ تم صرف اس کے بارے میں اقرار کرو تب یقین رکھا کر دیا جائے گا۔“

”تو لوگ نے عزم سے جواب دیا۔ ”تم تھاری ایک ماں تھارے لیے زندگی کی ضمانت دے سکتی ہے جلدی کرو۔ تباہو؟“

”نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”سوچ لو لوگ! میں کتنا ہوں تم صرف کیپٹن انگریز کا نام ظاہر کر دو، تھاری زندگی بچ جائے گی۔ تم پاگل نہیں ہو گئے؟“

”میرے لیوں پر ہر گز ہے۔“ لوگ نے کہا۔ ”تو پھر مجھے افسوس ہے میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ملک سے بے وفائی کے جرم میں یقین اپنے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹیں گے۔“

”میں تیار ہوں۔“

دبیز نشیوں کے پیچھے ہو نہیں کی آنکھیں جھک اٹھیں وہ کھڑا ہو گیا۔ میں تھاری بادی کو سلام کرنا ہوں مگر لوگ، لیکن بات یہ ہے کیپٹن انگریز نے میں بتا دیا ہے کہ وہ تھارا گاہک ہے۔ لوگ نے اپنی حیرت اور جھجکا ہٹ چھپانے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا کہ اب ہو نہیں اُسے دوسرے طریقے سے مال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں کسی کیپٹن انگریز کو نہیں جاغتا۔

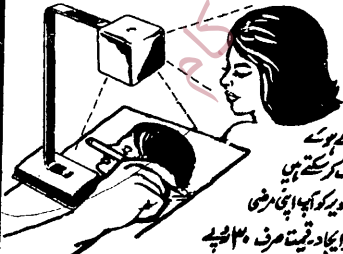
ہو نہیں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مگر لوگ! اپنی بادی اور اپنے گاہک کی پردہ پوشی پر مبارک باد قبول کر دو۔ جیسا کیپٹن انگریز نے بتایا تھا۔ تم ویسے ہی ثابت ہوئے۔“

لوگ نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اب وہ ہو نہیں نے کہا۔ تھاری یہ نورانی نظر رکھتے ہوئے مجھے خوشی ہوگی، اگر اس سلسلے میں تم میری بھی کچھ مدد کر دو۔“



اب آپ ہر تصویر

ایک ماہر مصور کی مانند بنا سکتے ہیں۔



سی ڈی کا یہ ہر قسم کی تصویر بنانا جدید اسان ہے کیونکہ سی ڈی کا یہ اپنے سائے پڑی ہوئی ہے جس کی تصویر یہ سیکھ کر ہوتے کاغذ منتقل کر دیتا ہے اور آپ اسے ٹری آسانی سے ڈرائنگ کر سکتے ہیں اس میں رنگ بکھر سکتے ہیں یا برعکس سے پیش کر سکتے ہیں۔ تصویر کو آپ اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چھوڑا بھی کر سکتے ہیں۔ امریکہ کی جیت انجینئرین کا جدید ترین ۳۰ لپے آج ہی ایک کارڈ لکھ کر بدلیے دی جا طلب کریں

میسرز انٹرنیشنل سے سی ڈی ۲۶ پیٹیا گراؤنڈ، لاہور

جہد مسلسل

✽ ایک مبصر کے قلم سے

نیشنل بینک آف پاکستان، پاکستان کا سب سے بہتر اور بینکاری کا قدیم ترین ادارہ ہے۔ ملک بھر میں اس کی ۱۰۶۰۰ شاخیں کام کر رہی ہیں اور ۲۴ بین الاقوامی شاخیں ایسے اہم شہروں میں موجود ہیں جو دنیا بھر میں مالیاتی مراکز تصور کیے جاتے ہیں۔ نیویارک، لندن، پیرس، ٹوکیو اور ہانگ کانگ۔ بینک کا موجودہ عملہ بیس ہزار افراد پر مشتمل ہے اور اثاثوں کی مالیت دو ارب امریکی ڈالر سے زیادہ ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان نے ۱۹۷۴ء میں اپنا ایک نمائندہ دفتر تباہہ میں کھولا تھا پھر ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو تباہہ ہی میں آزاد کرنسی کی ایک شاخ قائم کی۔ یہ اس سمت میں قدم اٹھانے والا پہلا پاکستانی بینک ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان نے اپنا دائرہ کار و تباہہ تک وسیع کرنے کا فیصلہ مندرجہ ذیل وجوہ سے کیا تھا۔

① دنیا کے ایک بڑے بین الاقوامی مرکز کی حیثیت سے تباہہ کی اہمیت اور مصری معیشت کی تیز رفتاری پر پختہ یقین۔

② اس امر کی خواہش کہ پاکستان اور مصر کے درمیان ایسا ادارہ جاتی رابطہ پیدا کرنا جس سے دونوں ملک مستفید ہو سکیں، دونوں ملکوں کے بہت سے مسائل مشترک ہیں، ان مسائل سے آگہی حاصل کرنا، ان کی کامیابی کے لیے کی جانے والی کوششوں اور مواقع کا جائزہ لینا، باہمی ارتباط کا دائرہ وسیع کرنا اور مشترک مسائل میں ایک دوسرے سے مشورے کرنا۔

پاکستان میں سرکاری پالیسی کے عین مطابق ملک کے تمام تر اقتصادی فروغ کے لیے زراعت کی ترقی پر بطور خاص توجہ دی گئی ہے۔ زراعت کی ترقی میں سب سے اہم اور مشکل مرحلہ چھوٹے کاشت کاروں کی پیداواری صلاحیت بڑھانا ہے۔ پاکستان و مصر کی دیہی آبادی میں کاشت کاروں کی اکثریت ہے۔ چھوٹے زرعی فارموں کی پیداوار میں نمایاں اضافہ کیے بغیر معیشت کی استحکم بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

اس میدان میں نیشنل بینک آف پاکستان نے خصوصی مہارت حاصل کر لی ہے اور گزشتہ پانچ برس سے یہ بینک ایک اسکیم پر کامیابی سے رُو بہ عمل ہے۔ یہ اسکیم رُوڈل کریڈٹ فار اسمال فارمرز کہلاتی ہے یعنی چھوٹے کاشت کاروں کے لیے دیہی قرضوں کی فراہمی۔ اس اسکیم کی اساس یہ ہے کہ کاشت کاروں کو بینک آنے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ بینک کو کاشت کاروں تک پہنچایا جائے۔ اس اسکیم کے تحت بینک کے ترسیل یافتہ ایگریکلچرل کریڈٹ افسروں کو موثر سائنکلیں فراہم کی گئی ہیں اور ہر افسر کو دیہات کی ایک مخصوص تعداد میں دیہی قرضوں کے صحیح استعمال کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ قرضے نقد نہیں دیے جاتے بلکہ کمیائی کھاد، کیڑے مار دواؤں وغیرہ کی صورت میں دیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اب تین ہزار دیہات اس اسکیم کے تحت آتے ہیں اور ستر ہزار کاشت کار اسکیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسکیم کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ چھوٹے کاشت کاروں سے قرضوں کی وصول یابی کے مشکل کام کی شرح ۹۸ فی صد سے اوپر ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اختتام تک اس اسکیم کے تحت دس ہزار دیہات آجائیں گے۔ یہ ملک کی کل دیہی آبادی کا ایک چوتھائی ہوں گے۔

یہ دونوں ملکوں کی بڑے اور مشترک معیشتی مسئلوں کے حل کی محض ایک مثال ہے ایسے بہت سے علاقے ہیں جن میں مصری زراعت پاکستانی زراعت سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ موجودہ ادوار جاتی رابطے سے زرعی مسئلوں کی اطلاعات کا تبادلہ ممکن ہو سکے گا۔

اپنی کثیر شاخوں اور وسیع عملے کے ساتھ ساتھ نیشنل بینک آف پاکستان نے صدر دفاتر میں انتظامی امور سے متعلق جدید تکنیک متعارف کرائی ہے اور انتہائی جدید و حساس آئی بی ایم کمپیوٹرز بھی نصب کیے ہیں، اس بینک نے ملک کے پانچ اسٹاف کالجوں میں ایک سب

اعلا تربیتی پروگرام شروع کیا ہے۔ کراچی میں ماہرانہ انتظامی امور سے متعلق تربیت کے لیے بینک نے ایک قومی انتظامی ترقیاتی مرکز بھی قائم کیا ہے۔

معاشی ترقی کے میدان میں مصر اور پاکستان کو جس مشترکہ مسئلے کا سامنا ہے، وہ جدیدیت کا چیلنج ہے۔ جدید فنی مہارت متعارف کرانے کے اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ معاشرے کے عمرانی اور ثقافتی ڈھانچے میں حقیقت پسندانہ تبدیلیاں کی جائیں۔ نیشنل بینک آف پاکستان کی انتظامیہ کو احساس ہے کہ جدید فنی مہارت رو بہ کار لانے کے عمل میں، پاکستان اور مصر کے تجربوں اور علم کا تبادلہ، ترقی یافتہ ملکوں پر انحصار کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سودمند رہے کیونکہ ترقی یافتہ ملکوں کے حالات اور وہاں کی فضا قطعاً مختلف ہے۔

چنانچہ ہمارے نیشنل بینک آف پاکستان کا نمائندہ وفد اور آزاد کرنسی کی شاخ موجودہ شمار مالیاتی اداروں کی صف میں محض ایک اضافہ نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اسلامی دنیا کے دو برابر ملکوں کے درمیان ایک مستقل اور پختہ ادارہ جاتی رابطہ ہے۔ دونوں ملک ترقی کے ایک جیسے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔





تھے بڑی مٹی مانوس جگہ تھی۔ برجِ اژان کے لیے منجی تھی۔ انھیں کوئی اٹا زہ نہیں تھا کہ وہ کھر جا رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور ایسا دورِ علاقہ آگیا تھا جو کیکر کی جھاڑیں اور کرل کے جنگل پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ کرل کے پودوں میں چٹیاں نہیں تھیں، کانٹے ہی کانٹے تھے۔ ان کے درمیان سے راستہ بنانے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی۔ رحیم داد کے چہرے پر ہنسنے اور کانٹوں سے لہو لہان ہو رہے تھے۔ محرومِ کھانا لالی کے ساتھ ساتھ چلنا رہا۔ رات بھر کھانا کھا رہا تھا۔ سڑکوں پر کھانا کھا رہا تھا۔ چلتے چلتے دونوں ایک مڑ پر پڑے تو جگہ جگہ جھنڈے کی دھند نظر آئے۔ ان کے پیچھے ریل کی پٹری تھی۔ وہ اسی طرف چل دیے۔

ریل کی پٹری میں کی دھندل روشنی میں مساکن کی ماگاب کی طرح دوڑنا سبھی جلی گئی تھی۔ دونوں نشیب سے مل کر اوپر آگئے اور ریل کی پٹری کے کنارے چلنے لگے۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ انھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھی۔ کچھ دور گیا رحیم داد کے کسی دستِ ر عاجزی سے کہا: "بار! ذرا دم تو لینے سے۔" نیچے کیا پتہ، کانٹے چھیننے سے میرے پردوں میں کتنی اذیت ہو رہی ہے۔

"تیری مرضی ہے تو ٹھیکہ جاتا ہوں۔" لالی نے کہا۔ پیسے یہ جگہ ٹھیک نہیں۔ یہ کب کب رہا ہوں۔ یہاں ٹھیکہ، ذرا دم رحیم داد کو لگتا۔ میں کب کب رہا ہوں۔ یہاں ٹھیکہ، ذرا دم لے کر چھوڑ کر چلے ہوں گے۔ تجھے بھی زیادہ چلنے سے تھکی ہو رہی ہوگی۔ یہ کتنا براہِ پٹری کے کنارے بیٹھ گیا اور دونوں سے کانٹے نکالنے لگا۔ لالی بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ دونوں چند منٹ تک تھکن سے ہڈیاں خاموش بیٹھ رہے۔ چہرہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور پٹری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

دونوں نے میل سواہیل کا راستہ طے کیا تھا کہ دوسرے میل کے انجن کی چنگلی ڈنڈے میں ابھری، ساتھ ہی لوہے کی پٹریاں کھٹ کھٹ بجنے لگیں۔ دونوں ٹھیک کر کھڑے ہو گئے اور پٹری کر اٹھ کر دھنکے لگے۔ جھڑ سے ریل گاڑی آرہی تھی۔ اب ریل کی پٹری پر کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں نیچے آنکر قریب ہی ایک دھند کی آڑیں کھڑے ہو گئے۔ پٹرل پر ریل گاڑی دوڑنے کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

ذرا ہی دو پہرے مڑی دھندل کے میں ریل کے انجن کی تیز روشنی ابھری اور دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی ان کے سامنے آگئی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے آگے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پہلے انجن دبا ڈتا ہوا

گورا پھر ایک ڈبا، دوسرا ڈبا، تیسرا ڈبا گورا پھر فرسٹ کلاس کا ڈبا سامنے آیا۔ ایک کھڑکی کھلی۔ دو ہاتھ ایک سوٹ کس آٹھائے باہر نکلتے سوٹ کس کھڑکی سے نیچے گرا اور پٹری کے نشیب میں دوڑنا لگا۔ اڑھٹا گیا۔ دھنک دھنک کھٹ کھٹ کرتی تیری سے آگے نکل گئی۔ یہ سب کچھ آٹا خانہ ہوا۔ دونوں حیران و پریشان وہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔ سوٹ کس چند منٹ کے خالص پان کے سامنے پڑا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اسے حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ چلنے پھرنے اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سارا چھڑے کا سوٹ کس تھا۔ رحیم داد نے بے صبری سے تھک کر اسے اٹھا لیا۔ لالی نے روک دیا: "ٹھیکہ جا رہے!"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا: "کیوں؟" لالی نے مشعلی نظروں سے سوٹ کس دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے۔ وہ چند لمحوں سے خاموش رہا۔ پھر جھلکتے ہوئے اڑا۔" "یار! اس کے اندر کس کئی بیٹی لاش نہ رکھی ہو۔"

رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر لالی کو دیکھا اور اسے ہونے لگے ہیں بولا: "دیکھنے میں بھی بھاری بھاری لگتا ہے۔" لالی مختصر میں پڑ گیا۔ خاموش کھڑا سوٹ کس کو تکتا رہا۔ چند لمحوں میں ہڈیاں کھڑے رہے۔ چھوڑ لالی نے ہاتھ بڑھا کر سوٹ کس کا ہینڈل پکڑا، آگے اٹھا یا اور آہستہ آہستہ اونچا بچا کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اندر کیا ہے۔ سوٹ کس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس کے وزن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کھڑے اور دوسرا سفری سامان بھرا ہے۔ لالی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مسکرا کر بولا: "یار! کام میں گیا۔"

رحیم داد نے بے صبری سے پوچھا: "کیا ہے؟" "یہ تو کھولنے ہی پر پتہ چلے گا۔" لالی نے کہا۔ مجھے تو پتہ ہے کہ معلوم ہوتے ہیں اور وہی کام کی بہت سی چیزیں ہر سستی میں فرسٹ کلاس کے ڈبے سے گرا رہے۔ سامان بھی اس میں فرسٹ کلاس ہی ہوگا۔ وہ اپنی بات کہتے کہتے پھر گورا کچھ جھک کر بولا: "یار! کب کھانا کھا کر آکر کھائے جیسے اپنے ہی لیے چھینکا گیا ہو۔"

رحیم داد کو لگتا تھا کہ کھول کے تو دیکھ "یہاں نہیں آگے چل کے۔ اب یہاں زیادہ ٹھیکہ نہیں۔" وہ سوٹ کس ایک ہاتھ میں لٹکا کر چلنے لگا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ دونوں نشیب سے نکل کر اوپر آگئے۔ سڑک پر کھڑا عالم طاری تھا۔ ریل کی پٹری دھند میں اپنی سنسان پٹری تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ پٹری کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ محروم سب تک

انہی ہی عمل داری ہے۔ لاہریک کی میں گناہی لیتا ہوں۔
”تو پھر ایسا کر سوٹ کیس کھول۔ اپنے مطلب کے پڑنے نکل آئے
تو بن گیا کام۔“

اشرف سوٹ کیس کھولنے پر آمادہ نہ ہوا۔ یہ سنڈیکٹ کا مال
ہے۔ اسے صرف باس کھول سکتا ہے۔
”باس؟“ لالی نے حیرت سے پوچھا۔ یہ باس کیا چیز ہے؟
”بہت اونچی چیز ہے۔ فٹ کلاس سے نیچے نہیں چلتا۔
کراچی گیا ہے۔“

لالی نے دریافت کیا۔ سوٹ کیس کسی نے چھید کیا تھا؟
”ہاں۔“ اشرف نے جواب دیا۔ میں بھی اسی ٹرن میں تھا۔
فٹ کلاس کے ساتھ والے انٹر کے ڈیوے میں بیچھے کاؤڈا باؤنڈیشن
ہے۔ وہیں آکر گیا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ میٹین یہاں سے زیادہ دور
نہیں۔ یہ رہا سامنے آؤٹر گنگل۔“

لالی نے سوٹ کیس اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔
”سنبھال اپنی امانت۔“ اس نے ڈیوے تو قف کیا پھر مسکرا کر پوچھا۔
”کتنا مال پانی ہو گا اس کے اندر؟“

اشرف بتانے لگا۔ ”غیر نے تو اتنی سزا کی اطلاع دی تھی۔
مال زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ جزاؤں بولات جا رہے تھے اس میں۔ اس
نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا پھر بینڈل چڑھ کر اٹھانے جیسے بولا۔ اپنا
سنڈیکٹ چھڑا شکار نہیں مانا۔“

لالی مرعوب ہو کر بولا۔ ”یہ تو بہت اونچا چکر معلوم ہوتا ہے
پر خطرناک بھی آتا ہے۔“

”کوئی خطرناک تر نہ کہ انیس۔“ اشرف نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے سوامینے
میں صرت ایک بار دیکھتے ہیں اور ہنگوڑا شکار دانتے ہیں۔ ایکلے نہیں
کھاتے بل باٹ کے کھاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک سب کا حقد
بندھا ہے۔ اپنے پر کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اس نے
ایک آنکھ دوائی۔ جی چاہے تو لوگ جاہلین ہیں۔ بول کر کیا کتا ہے؟
پلتا ہے میرے ساتھ۔“

لالی نے رحم واد کی جانب دیکھا۔ اگر مجلس گے تو ہم دونوں ہی
مجلس گے تو سوٹ کیس کھولنے کو تیار نہیں۔ پھر اپنا رحیم کیسے چلے گا۔
”تو اپنی بات کر۔“ اشرف نے رحیم واد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”یار
برانہ مان۔ یہ تو دیکھتے ہی میں قہقہے مچا دیتا۔“
ایک بار اسے پوری سزا کاٹ لینے سے۔ پھر فوٹ ہو کر کھلے گا۔ ابھی
تو بہت کچا ہے۔“

لالی ہنس کر بولا۔ ”خیر نے! بہت اونچا نہ اڑا مارا جائے گا۔ یہ

اُدھر نہیں گئے جاہل ریل گاڑی گئی تھی بلکہ وہ اس طرف بڑھنے لگے جاہر
سے ریل آئی تھی مشکل سے وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئے ہوں گے،
ناگہ دو خنٹوں تلے خشک پتوں پر قدموں کی آہٹ اُبھری۔ انھوں نے
گھڑ کر اس طرف دیکھا۔ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر ان کی طرف
بڑھ رہا تھا۔ وہندل روٹنی میں دونوں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے اس نے
دوڑی سے ٹکمانہ انداز میں ڈانٹ کر کہا۔ ”اُدھے چٹھرا سوٹ کیس کھٹے۔“
لالی خشک کر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے سوٹ کیس نہیں چھوڑا۔
ابنی اور قریب آگیا۔ اس دفعہ وہ زیادہ گرج دارا داز سے بولا۔ دیکھتا
کیا ہے مسکا کتا جس دیا کر وہ چھپنے کے انداز میں تیزی سے آگے
بڑھا پھر کٹے بڑھے ہٹتے اچانک خشک کے حیرت سے چیخا۔ اُدھے
لالی کٹے حرام کے قسم۔“

لالی نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ اشرف تھا کئی سال پہلے وہ
اسکی کے گروہ میں شامل تھا، جبل میں بھی ایک بار ساتھ رہ چکا تھا۔
اشرف پارسے کا گلیاں قتل ہوا قریب آیا اور لالی کے گلے سے لپٹ
گیا اور نہایت گرم جوشی سے اسے اپنے بازوؤں میں بیچھے لگا پھراس
نے علیحدہ ہو کر لالی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اس کی گلی کی لپٹ شرٹ
اور پتلون دیکھی، بڑھی ہوئی داڑھی اور گروسے آٹے ہوئے بال دیکھے
پھر کہیں خاطر ہو کر بولا۔ ”بار! تو نے یہ اپنا علیہ کیا بنا رکھا ہے؟“
لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

”مجھے معلوم ہے تو شہا پر جبل سے جا گا ہوا ہے۔“ اشرف نے
کہا۔ ”جیسے تو تیرے ساتھ ہی جبل میں تھا۔ پرسوں چھوٹ کر آیا ہے۔
وہی بتاتا تھا۔ اپنی بات کہتے کہتے اس نے سرور رحیم واد کو دیکھا۔
رحیم واد لالی کے بیچھے کھڑا تھا۔ اشرف نے اس کی جانب اشارہ کر کے
کہا۔ ”یہ تیرے ساتھ کا دور مراغہ ورتیدی ہے نا؟ یار! اس کی جبل کی
وددی تو بد لادوی ہوتی ہے تجھے صاف پھڑوٹے گا۔“

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ اس
وقت یہاں کیسے آچکا؟“

”ڈیوٹی پر تھا۔“ اشرف نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”اسی کے اختصار میں تھا۔“

”کچھ اونچا چکر معلوم ہوتا ہے۔“ لالی نے آنکھ مار کر کہا۔ ”معاذ کیس؟“
وہ بولا۔ ”پھر تھراں گانا۔“ پہلے بتا۔ تیرا اس وقت ہو گا کہ کیا ہے؟
”میرا کیا ہو گا؟“ لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ چھپتا
چھپتا رہا۔ نہ ہٹنے کا ٹھکانا ہے نہ کھانے پینے کا کبھی یہاں کبھی ہاں۔
”ایسا کر میرے ساتھ چل۔“ اس نے لالی کا کندھا ہولے ہولے
تھپ تھپایا۔ لالے کی پروا نہ کر کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ادھر
سب تک

دونوں سنبھل سنبھل کر دیکھ کر کہتے ہوئے ڈھلوان سے نیچے اترے اور غراب کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ غراب اُن کے قدم سے خاصی اونچی تھی۔ اند کی زین ہموار اور گچی تھی اُس میں سخت مٹی کی تہ اور نیچے تھے مگر زین صاف ستھری تھی۔ غراب سے ذرا بہت کر فرزاش کا ایک درخت سر اٹھتا تھا۔ غراب کے دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اُس کے عین نیچے گرا کھڑا تھا، کھڑ میں رتیلی مٹی کے اپنے اپنے توبے تھے۔ رحیم داد زیادہ کھڑا نہ رہا، غراب کے نیچے چمکا گیا اور بڑھل ہو کر زین پر لپٹ گیا۔ لالی بھی اُس کے برابر لپٹ گیا۔ دونوں دیر تک خاموش پڑے۔ باہر جنگلی درختوں اور ٹیلوں پر زرد وزد دھوپ چلیتی جا رہی تھی۔

مرحبا۔ اچھا ہی ہوتا۔ لالی کی آواز میں درد کی چھین تھی۔
 ”یار! تو نے بڑی عجیب بات مانی۔“
 ”عجیب بات تو یہ ہے رحیمے سو رہے کی چوری پر سال بھر کی سزا ہوتی ہے عورت کی ناک کاٹنے پر صرف چھ مہینے کی اور صرف دس روپے ہیں جو ان چھوڑ کر کی جوانی لوٹ لینے کی کوئی سزا نہیں۔“
 لالی نے گردن موڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“
 ”یہ تو بتانا آیا ہے جی اور ہوتا رہے گا۔ رحیم داد نے بڑے لڑکھوں کے انداز میں کہا۔ کہتے ہیں انصاف اندھے کی لاٹھی پڑتا ہے۔“
 ”اور یہ بھی تو کہتے ہیں کہ مسیہ کا تھکا کا میل ہوتا ہے معلوم نہیں کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔“

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی نہ بولا۔ دونوں چپ پڑے۔ بادوں کی دھوپ چھاؤں میں ڈھلنے لہے پھر اُن کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری غنڈھ سو گئے۔ دھوپ ٹیلوں کی بلندی سے زمین زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیری گھاٹیاں روشن ہوئی جاری تھیں۔ دن کا ایک پرگزہ کیا۔ دوپہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج کا الاؤ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ دونوں بے خبر سوئے۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے لالی کی آنکھ کھل گئی۔ غراب کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ وہ آنکھ کر بیچھ گیا۔ رحیم داد اچھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سخت جھوک لگی تھی وہ آنکھ کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو سوتا چھوڑ کر باہر نکلا اور کچھ دیر خاموش کھڑا سوچا رہا پھر ایک طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کے وہ آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے لگا۔ یہ وسط مارچ کی ایک خوش گوار شام تھی۔ ہوائیں خشک تھیں۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھللا رہی تھی۔ نیچے گھاٹی میں ہلکا نیل گوں دھند لگا پھیلتا جا رہا تھا۔ لالی آگے بڑھا تو اسے سرس کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ ان میں پہلے پہلے پتوں کے گچھے جمول رہے تھے۔ اُن کی ٹپکی ٹپکی تھک جوا میں رہی ہوئی تھی۔ فضا میں پہلے رات کی دُھن کی سی چھب تھی اور لالی کو شبہ نہ چھوٹا لگی تھی۔

وہ ٹیلوں کے دامن میں اپنے نیچے جا ہمارا راتوں پر چلتا ہوا درد تک چمکا گیا۔ چپکے تیز رو کا جھپکا آیا۔ لالی ٹھٹک کر رک گیا۔ اُس نے ایک ٹیلے کی بلندی سے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک مزار چڑھ چلا تھا۔ دو بڑے بڑے گدھ اُس کا گوشت نرغہ نرغہ کر کھا رہے تھے۔ اوپر ٹیلے پر پانچ چھ گدھ فطال میں بیٹھے تھے اور اُن کے لیے پرتول رہے تھے۔ مردہ چمچے کے جسم سے اٹھتی ہوئی تیز بکے کا دھو دھالی دہیں کھڑا ہوا گردن اونچی کر کے جت جس نظروں سے اوھر اوھر دیکھتے

رحیم داد زین پر چپٹ لیٹا تھا۔ اُس نے کوٹ بدل لی۔ لمبے بھڑالی کوکتار دیکھ کر گرنے کے انداز میں بولا۔ یار! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ شادوں بڑی خطرناک عورت ہے۔“

”ہے تو۔ لالی نے اُس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ پر اس میں ایک بات ہے جو ہر عورت میں نہیں ہوتی۔“
 رحیم داد حیرت سے بولا۔ کیا؟“

”شادوں کھڑا رہتے ہیں۔ بجائے توڑنے سے بولے۔“
 رحیم داد نے احتجاج کیا۔ کیا بات کر رہا ہے لالی! بال بال بچ گئے ورنہ اُس نے تو مر دیا ہوتا۔ دونوں کو۔“

”دو ہزار بہت بڑی رقم ہوتی ہے رحیمے! وہ اپنی بات کہتے کہتے لمبے بھر کوڑ کا۔ میری تو سگی ماسی نے صرف دو سو روپے کی خمار مجھے آگ میں جھونک دیا تھا۔“
 ”چوری کی ہوگی۔“

”نہیں۔ لالی اسی طرح چپٹ لیٹا اور دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ میں نے اُس کے دوسرے کوٹ چرائے سے ملا کر روشنی کی تھی۔ اُس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ شبیرات پر اس کے ساتھ ماسی کے گھر گیا تھا۔“

رحیم داد نے تیکھے لمبے میں کہا۔ بڑی عالم عورت تھی۔“
 ”یہ بات بھی نہیں ہے۔ لالی ایک ناگنگ پر دوسری ناگنگ لے کر

کر ہو لے، بولے۔ ملانے لگا۔ تیز موسا درزی تھا۔ سلائی کی شین پیچ کر اپنی بیٹی کے پیاد کے لیے دو سو روپے لایا تھا۔ موسیٰ اُس کی دوسری بیوی تھی پہلی مرگئی تھی اور اسی کی دھم کا پیاد تھا۔ میں نے موسا کے دو روپے ملا ڈالے تو وہ غصے سے ہلکی ہو گیا، جلتا چراغ اٹھا کر موسیٰ کے منہ پر سے مارا۔ اُس کی ایک آنکھ مل گئی، اُس نے اپنا غصہ مجھ پر اتارا۔ مجھے دھکا دے کر جلتے الاؤ میں چھینک دیا۔ اس نہ ہوتی تو میں بل کر

میں آنکھیں ڈال کر لبلیں توڑے جانا ہے ہی؟
 ”ہاں جی“ لالی نے مختصر جواب دیا۔

اس کے بعد کوئی بات سمیت نہ ہوئی۔ خانہ بدوش لڑکیوں نے قریب پڑے ہوئے گھوڑوں کے گھٹے آنکھ کر مڑیں پر لکھے اور ہر نیوں کی طرح چوکریاں بھرتی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ لالی آہستہ آہستہ ڈیرے کی جانب چلا۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بوڑھا باوند دو نوجوانوں کے چہرہ میموں کے پیچھے سے نکلا اور لالی کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب آکر زمین پاؤں میں نے مشتہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ بوڑھا اپنے کھڑے لیے میں ملنے لگا کہ پڑاؤ رات ہی کو ختم ہو جائے گا اور صبح نہر کے قافلہ کوچ کرے گا۔ وہ نظر گڑھ کے راستے ڈیرہ غازی خاں جا رہے تھے۔ بوڑھا پوچھے بغیر لالی کے سامنے صفائی پیش کر رہا تھا اسے یقین دلانا تھا کہ قافلے کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے نہیں ہے۔

لالی تھی برس پہلے چند روز کے لیے پاؤںوں کے ایک ٹرے میں قیام کر چکا تھا چنانچہ وہ اُن کے عادات و اطوار اور اُن کے طرز زندگی سے کسی حد تک واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ پادریس اُن خانہ بدوش قبائل میں سے ہیں جو موسم سرما شروع ہوتے ہی افغانستان کے کوہستانی دروں سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اینٹوں کے چھتوں پر بیٹھیں کا کام کرتے ہیں، دیہات کے کھمکانات کے لیے مٹی کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں، شہروں اور قصبوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کیل اور ندے بیٹھ اور لڑکیوں کی کھالیں قرائلی ٹریاں، جڑی بوٹیاں خشک میوے، بینگ اور خشک گھوٹے ابرائی لمباں اور گرے ہانڈ شکاری کے فروخت کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں محنت جفاکش، معنی اور مزدور ہوتی ہیں۔ اس قدر آزاد اور بے باک ہوتی ہیں کہ غیر مردوں کے سامنے بھی ذرا حجاب محسوس نہیں کرتیں۔ پادریس اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ اونٹوں اور چھترس پر سوار ہو کر غنیمت اور سامان لاؤ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔ سفر کے دوران مرد اور عورتیں مل کر کوہستانی نغے الاتے ہیں۔ نغوں کیساتھ ساتھ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی بیل کی گھنٹاں بجاتی ہیں جو نغے کے لیے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ساز کا کام دیتی ہیں۔ قافلوں کی نگرانی کے لیے پائندے اپنے ہمراہ دوسری نسل کے کتے لکھتے ہیں۔ درختوں میں پت جھڑ گتے ہی پاؤںوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دیرانیہ سناہرہ عہد کر کے پہلے ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچتے ہیں۔ جہاں دو دروازے ملاؤں میں بکھرے ہوئے قافلے مختلف سمتوں سے آکر جمع ہوتے ہیں۔

لگا۔ دور فرماش کے درختوں کے پیچھے سے دھواں اُٹھ اُٹھ کے شام کے دھندلکے میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ وہ اسی طرف چل گیا۔ نزدیک جا کر اس نے دیکھا۔ ٹیلوں کے دان میں پتی کی طرح کاؤ بچا اور کھرا ہوا میدان تھا۔ میدان میں ایک میز کاؤنٹ کے کبابوں کے تھے جوئے نئے کے غصے لگتے تھے۔ ان ٹیموں کو پاؤںوں نے گری کی تھیں۔ نیچے پیچھے پرانے تھے اور بے تیرسی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اُن کے آس پاس اونٹ اور چترندے تھے۔ بیٹھوں کے ریز بھی تھے۔ ٹیموں کے باہر آگ مل رہی تھی لالی نے دوسری سے بجانب لیا کہ وہاں خانہ بدوش پاؤںوں سے پڑاؤ ڈالا ہے۔ میدان کے نشیب میں خشک نہری اور اس کے آگے تیلے تھے۔ ٹیلوں پر ڈھاک کے دوختن کا جنگل دھکی تھا۔

وہ میدان میں پہنچنے کے لیے ایک میز پر مڑا۔ اس نے جھٹ پٹے میں دیکھا کہ دو خانہ بدوش لڑکیاں آپس میں لکھ رہی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے بال نوچ رہی تھیں اور زور زور سے سچ رہی تھیں۔ اُن کے قریب ہی زمین پر سرکھی شاخوں کے گٹھے لکھے تھے۔ سامنے مٹی کے ٹوے پر ایک نوجوان پادریس نہایت سکون سے لیوٹوں کو ایک دوسرے کے چھوٹے کھسٹے دیکھ رہا تھا۔ لالی کی آہٹ سن کر نوجوان نے پلٹ کر اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا اور زور دیر بکا بکا بیٹھا رہا پھر اکہم اُٹھ کر میموں کی سمت بھاگا۔ لڑکیاں بھی دھونکا شتی چھوڑ کر لالی کو حیرت سے نکتے گئیں۔ اُن کے لباس اوسیدہ اور گندے تھے۔ بالوں کی چھوٹی چھوٹی میڈھیاں تھیں جو چھوٹے کھسٹے سے بکھر کر منہ پر لگی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں گہرا کابل تھا۔ زمار تازہ سبب کی طرح گلانی تھے۔ وہ بجز ٹیلوں پر اُگنے والے جنگل چھوٹوں کے مانند تھیں جن میں رنگ ہی رنگ ہوتا ہے۔ خوشبو اور رنگ نہیں ہوتی۔ نوز و نوا تھیں کیساٹھے جھج جاتی ہیں۔

ایک خانہ بدوش لڑکی بوڑھ کر لالی کے قریب آئی اور اس کے پہلے سے لگ کر اس طرح کھڑی ہو گئی کہ اس کے بدن کی تیز لولالی کی سانس میں گھل جاتی۔ لڑکی نے سر جھکا کر اپنے بکھرے ہونے والے دکھائے اور دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ اس نے نیچے اُٹھا ہے۔ کتے بولے وہ صحت کر لالی کے اس قدر قریب آ گئی کہ اس کی بھری چھاتی لالی کے بازو میں پیوست ہو گئیں۔ لالی نے بھر بھری سی لی اور بے رحمی سے اسے زور سے دھکا دے کر بولا۔ اُن نے لگی۔ پر سے ہٹ کر بات کر۔ لڑکی کے چہرے سے جھوٹے بال اور بکھر گئے۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے پچی۔ اس نے لالی کیشتے سے گھور کر دیکھا۔ دوسری نے زور کا قہقہہ لگا یا اور لالی کی آنکھوں

مذمتِ اسلام کی ایک جھلک



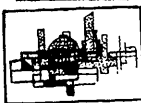
نہ۔ آئیے۔ اسم کو

اپنا نام اور صنعت کو فروغ دینے کے مقصد میں اس کی مسلسل کوششیں مستقبل قریب میں جاری رہیں گی

پیداواری گنجائش کا زیادہ سے زیادہ استعمال اور اسٹاک لمبولوں کے تحت ہنر مند افرادی قوت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے۔ آئیے۔ ایم کے مقاصد کا لازمی حصہ ہے۔ اس طرح توسیعی منصوبے بنانا اور انہیں مکمل کرنا بھی ہے۔ آئیے۔ ایم کے کارکردگی کا ایک اہم جز ہے۔

۱۹۷۷ء کے دوران ہے۔ آئیے۔ ایم کے جوئے منصوبے پر یہ تکمیل کو پہنچنے میں اس آرمی کاؤنڈری اینڈ فورج۔ سوات سرامکس اور جنرل ریفریکٹریز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قوی دولت میں اضافے کے لئے۔ آئیے۔ ایم سلسل کو شاک ہے۔



بورڈ آف انڈسٹریل مینیجمنٹ

● فیڈرل کیمیکل اینڈ سرامکس کارپوریشن ● فیڈرل لائٹ انڈسٹریزنگ کارپوریشن ● فیشنل ڈیزائن اینڈ سٹائل سروسز کارپوریشن ● فیشنل فریلائزرز کارپوریشن آف پاکستان ● پاکستان انٹرموبائل کارپوریشن ● پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن ● پاکستان ٹریڈنگز کارپوریشن آف پاکستان ● اسٹیل ملز کارپوریشن ● اسٹیل سسٹمز کارپوریشن آف پاکستان ● اسٹیل پیپرولیم ریفائننگ اینڈ پیٹرولیمز کارپوریشن ●

ADGROUP

بیان کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے۔ گرمی بڑھنے سے پہلے پہلے وہ درۃ
گول کے راختے جہاں سے آتے ہیں وہیں لوٹ جاتے ہیں پابند
میں جبرائیل پیٹھے بھی ہوتے ہیں جو ڈاکا زنی اور مویشیوں کی چوری کھنٹے
ہیں یا چرس کا ناجائز دھند کرنے ہیں لہذا پولیس ان کی نقل و حرکت
کی کڑی نگرانی کرتی ہے۔ وہ جہاں پہنچتے ہیں وہاں کے گھانے میں
انچی آمد کی باتا مداخلت دیتے ہیں۔

بوڑھے کی جانب سے صفائی پیش کرنے پر لالی نے
جلدی بیچنا پ لیا کہ پانے اس کی پٹون اور اعلیٰ نہیں سے سخت
مرعوب ہیں اور اسے پولیس پامی آئی ڈی کا افسر سمجھ رہے ہیں۔
لالی ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر انھیں ہراساں کرنا نہیں چاہتا تھا
مگر اس دیرانے میں اسے اپنی آمد کا بھی کوئی نہ کوئی مذنیہ پیش
کرنا تھا لہذا اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ محکمہ نگہات کی طرف سے سرکاری
کام سے ادھر آیا ہے لیکن اس کے عمل کے دوسرے لوگ ابھی پہنچ
نہیں کئے ہیں۔ اس کے بعد اس نے سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی کہ
وہ سخت جھکوکا ہے اور جھکوکا ہی سے بے قرار ہو کر اس طرف آیا ہے۔
وہ ان کے ہمراہ ایک جیسے کے اندگیا، ان کا حمان ہلکا کڑا

بھر بھرا کا دودھ پیا شہداد پٹیر لکھا ہوا تھرے کا ایک گرم گرم پالہ پیا
ڈھیریں روٹیاں لیں شہداد پٹیر لیا بھینزے ہیں بانی لیا۔ ہاتھ کاٹنا ہوا
ایک کھل، اور ایک مندا لیا۔ بھیر کی چربی سے جلنے والا چراغ لیا اور ایک تیز دھلا
چھری بھی لی تیس روپے میں یہ سودا کسی طور پر مان تھا۔ پانڈوں نے
اُسے جس بھری سرگرم بھی پلائی جس پر دم لگا کے لالی کے جسم میں
سرخوشی اور جولاہی آگئی۔ خانہ بدوش اس کے ہاتھ جس بھی فروخت کرنا
چاہتے تھے محروالی اس چکر میں نہیں پڑا۔ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھیرا بھی
نہیں بنام گرمی ہو گئی تھی، اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ راستہ نامہوار اور دھچچ پڑ
تھا اور چڑھائی بھی چڑھتی تھی۔ وہ جلد سے جرم داد کے پاس پہنچ
چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ جرم داد اس
کی ایک دم خبر فوری سے سخت پریشان ہوگا۔

دو پانے دوڑیک اس کے ہمراہ آئے۔ وہ اور بھی آگے ایک
اُس کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے محروالی نے ایک موڑ پر انھیں نصرت
کر دیا۔ وہ انھیں نہ تو اپنا ٹھکانا دکھانا چاہتا تھا، نہ اپنے بلے میں کسی
قسم کی اطلاعات پہنچانا چاہتا تھا اس لیے کہ پولیس والے برابر ان
سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے۔ انھیں نصرت کر کے وہ ایک ٹیلے کی
اُڑیں کھڑا ہو کر انھیں دوڑیک دالیں جاتے دیکھنا دیا۔ دونوں نظروں
سے اوچھل ہوئے تو وہ آگے بڑھا، اس نے نامہوار چڑھائی عبور کی اور
سامان سے لے لیا چند اعراب کے قریب پہنچ گیا۔

جرم داد اس کی آہٹ سن کر گھبرا ہوا باہر آیا۔ وہ سخت پریشان
تھا محروالی نے اس سے کوئی بات نہیں کی، وہ اسے ایک گنگا کر بیچے
گیا اور اپنے کے انداز میں گرمی گرمی سانس بھرے لگا۔ جرم داد دیکھ
میں ایک ایک چیز ٹوٹ کر دیکھنے لگا جب اس نے کبل کی تہہ کھولی اور
اندھے سے تازہ تازہ روٹیاں کی سونہری ہلک نکل تو وہ بچوں کی طرح جھک
کر بلاوا آہو، ہو یا، تو نے تو کمال کر دیا، روٹیاں کا تھپا تو باکل گرم
گرم ہے۔

”شہداد پٹیر بھی ہے۔“ لالی نے عجب سے اس نکالی جھک کر
چراغ اٹھایا اور اُسے روشن کر دیا مگر ہاتھ تھکی چراغ کی تو بار بار جھکتی۔
آخر لالی نے ادھر ادھر سے چکر کھنکے کر کے چراغ ان کی اوٹ میں لکھ دیا۔
اس طرح وہ ہوا سے بھی محفوظ ہو گیا اور دودھنی باہر جانے کے بجائے عذو
ہو کر رہ گئی۔ اتنی دیر میں جرم داد نے زمین پر مندا بچھا دیا۔ دونوں اس پر
بیٹھ گئے۔ لالی پانڈوں کے ڈبرے کا حال بتانے لگا۔ جرم داد نے
روٹیاں نکال کر بار بار کھیں۔ ہاتھ روٹیاں تھیں۔ موٹی موٹی اور بڑی بڑی۔
لالی کہنے لگا: یہ آٹھ دن کا راشن ہے۔ یہ کہہ کر اس نے پانڈوں سے
خبر دی ہوئی چھری نکالی اور ہروٹی کی چادر چاٹھوٹے کر دی۔

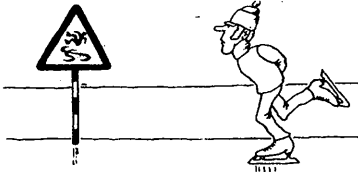
جرم داد لوالی روٹی تو چل جانے کی، پر پلائی تم ہے۔
لالی نے کہا: ”مشینہ تو اپنے پاس ہے اور نہ بھی زیادہ دوڑیں۔
پانی نہ رے آمانے گا۔ وہ مسکرایا: ”چڑھاد ن تک میاں کن پڑا ہے گا۔
اُس وقت تک تو جرم بہت آگے نکل جائیں گے۔“

جرم داد نے ٹکڑے کرنے کے انداز میں جھپٹنے لگا: ”یار بڑا
مان تیرا حال تو ایک دم فٹ کلاس بن گیا۔“ اس نے اپنا میلا کچلا لباس
دیکھا: ”یہ بل کی دروی نہ جانے اپنے جسم سے کب اترے گی اور جب
تک یہ نہیں اترے گی، میرے لیے تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔“

”پردار کر، جلدی تیرے لیے ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے ہر
وقت اسی بات کی محوڑ ہوتی ہے۔ عذو صرف تیرے لیے نہیں ہے کچھ
بھی تو ہے۔ یہ تو سوچ کر اور میں کیا آگ آگ ہیں۔“ اس نے جرم داد
کو ٹوکا دیا: ”دیکھ کر رہا ہے۔ شروع ہو جائے۔“

جرم داد نوٹوا شروع ہو گیا۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا،
اُس پر تھوڑا سا شہ داد، پیسہ کا ایک ٹکڑا رکھا پھر روٹی ٹکڑے کر ل
لیپٹ کر دانتوں سے چباتے ہوئے بولا: ”تو نہیں کھائے گا؟“

”نہیں۔“ لالی نے کہا: ”مجھے تو دھوٹ پانی پلا سے مجھے جانا
ہے۔ وہ لمبے جھروٹکا۔“ جس پر جرم داد نے لالی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”یار ڈو
نے تو پانڈوں کے ڈبرے پر بیٹھے عیش کیے۔“ لالی نے کوئی جواب
سے نہ



نہیں دیا۔ شکنجہ منہ سے لگا کر پانی کے کئی گھونٹ پی گیا پھر اس نے شکنجہ ایک طرف رکھا، ہاتھ سے منہ پوچھا اور کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے جلدی سے پوچھا: اکیلا ہی جائے گا؟

لالی نے آہستہ سے کہا: ہاں۔
”ٹاڈاں کے پاس تو نہیں جا رہا؟“

”جا تو رہیں رہا ہوں۔“

رحیم داد اٹھ کر لڑائی لیا جان پڑتا ہے، ٹاڈاں پر نیرا دل آ گیا۔

”چھڑو یا راکھا رکھا ہے ان باتوں میں۔ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ اپنے پاس دل ہے ہی کہاں۔ دل تو دل والوں کے پاس ہوتا ہے۔“

رحیم داد نے ہنس کر کہا: تو پاس ہے کچھ کسے۔ تیری ایل دیکھ کر تو مجھے یہی لگتا ہے کہ تو۔۔۔“

لالی اس کی بات کاٹ کر بزلری سے لڑائی شروع بازی چھوڑ کا م کی بات سن۔ یہ کہہ کر اس نے چھری پتلون میں اٹس لی اور اپنا چاقو نکال کر رحیم داد کو دیو۔ اسے رکھ لے۔ میں کل رات آؤں گا۔ واپسی میں دیر ہو جائے تو ٹھونڈ کرنا۔

رحیم داد نے اسے روکنا چاہا۔ ابھی گھورا اندھیرا ہے۔ چاند نکل آئے تب جانا۔

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، آگے بڑھا اور غریب کے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ جلدی پر جا کر اس نے دیکھا کہ ہر طرف ہبل ہاک مارا جی بھائی ہوئی ہے۔ دُور دُور تک کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے جھک کر عراب کے نیچے نظر ڈالی۔ رحیم داد چراغ کی مدھم روشنی میں بیٹھا روٹیوں کے محو سے گن رہا تھا۔ لالی زیادہ دیر ٹیلے پر نہ بیٹھا، آہستہ آہستہ دوسری طرف آکر گیا۔ چہرہ جو چڑھا بیٹوں پر چڑھتا دھلوانوں سے استرا تا، نامور راستوں سے گزرتا، پتلون سے گزرتا، نیچے جھنگریں بیچ گیا پھر جھنگریں سے نکلی جانے لگا۔

لالی ٹاڈاں کے پاس جانا چاہتا تھا اور اس سے وہ کپڑے لانا چاہتا تھا جو شاڈاں نے گاؤں کے درزی کو سلنے دیے تھے۔ کپڑے مل جاتے تو لالی رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا دیتا اور اس کے ہمراہ اشرف کے بتائے ہوئے راستے سے لالہ پور کی طرف نکل جاتا، وہ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ پھر ملتے ملتے اپنا ہک اسے خیال آیا کہ آج شاڈاں کے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہ ہو گا۔ کل ہی رات پولیس سے اس کی مدد بھیجی ہوئی تھی اور اب پولیس ٹائل سے پوچھ گچھ کرتی ہوگی، اس کے گھر کی بھڑائی کرتی ہوگی۔ گاؤں کے اندر اور

سب بنگ

باہر چلے جگہ ناکوں پر پولیس تعینات ہوگی۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ منہ اب زیادہ دُور نہ تھی مگر لالی نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ واپس مڑا اور اپنے ٹھکانے کی جانب روانہ ہوا۔ جب وہ جھنگریں سے گزرتا تھا تو اس کی طرف سے غامضی گزرتی تھی۔ ہر طرف گری ورنی جھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ ہی دُور چلا تھا کہ روشنی پھیلنے لگی۔ دُور فراش کے اونچے اونچے درختوں کے نیچے سے چاند ابھر رہا تھا۔ گول گول سونے کے بڑے سے تھال کی طرح چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس قدر خوب صورت نظر آ رہا تھا کہ لالی ہلکسی ہانڈے آئے کھڑا رہا۔ چاند ابھر کر اوپر آتا تو اندھیرے راستے روشن ہو گئے۔

آہلی اُجلی چاندنی میں چلنا ہوا لالی کچھ ہی دیر بعد عراب کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ تھریے راستوں پر لال کی آہٹ سن کر وہ گھبرا ہوا جھٹ بھٹ کر باہر آ گیا۔ لالی کو اس نے بھری ہوئی چاندنی میں دُور ہی سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ ”تو واپس کیوں آ گیا؟“

لالی نے کہا: اندر چل کر اطمینان سے بات کریں گے۔
دونوں عراب کے نیچے پہنچ گئے۔ لالی دُور سے پہل کر آیا تھا۔ وہ غلے پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ لگا پٹنے لگا مگر رحیم داد صحت کے پیچ تھا۔ غامض سن نہ ہو سکا۔ کہنے لگا: یاد رہے تو تباہ راستے میں کوئی گمراہ تو نہیں ہو گئی؟“

”درازم لے۔“ لالی نے کہا۔ سب کچھ بتا دیں گا۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ کچھ دیر غامض سن بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

”بات یہ ہے رحیم! میں نے خود ہی شاڈاں کے ہنڈ جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔“

رحیم داد نے دریافت کیا: ”کیوں؟“

”میں نے چلتے چلتے سوچا، وہاں تو ابھی پولیس لگی ہوگی، تفتیش کرتی ہوگی۔“

”یہ بات تو تجھے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھی۔ رحیم داد بولا۔“

”اوہ میں تو کتا ہوں جی شاڈاں نے ہمارے پاسے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“

”بتانا تو نہیں چاہیے۔“ لالی نے کہا۔ اس نے بالے کو فضل جو

کیا ہے یہ بات ہم دونوں جانتے ہیں۔ ویسے جہاں سے ہمارے پاس ہے وہ انتہائی قیمتی ہے، جتنا پریس کر سکیں گے۔“

”یہ بات ہے تو اس نے ٹھیک کو کیوں ہمارے پاس ہے؟“

”تو اس نے دو ہزار انعام کے لالچ میں کیا تھا۔ لالی بولا۔“

”اسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ بار! وہ اتنی بڑی عورت نہیں جتنی تو سمجھتا ہے۔“

رحیم داد کھنکھاتا ہوا بولا۔ ”دیکھ لے۔ دیکھ لے تو یہی کس کا کرتا ہے اس کے پاس جانا بھی نہیں۔“

”بار! میں تو میرے لیے کپڑے پہنے اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ لالی اسے سمجھتا ہے۔ لگا ہے تو بھی جانتا ہے کہ جب تک میرے

بلن پر چل کر دڑی ہے، ہم کہیں جا بھی تو نہیں سکتے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ہم دونوں جگہ سے جلد ہاں سے لالچ پور کی طرف نکل جائیں۔“

رحیم داد اس کی بات سن کر ڈر دیر خاموش بیٹھا رہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”میری ایک بات مان لے گا؟“

لالی نے پوچھا۔ ”کیا؟“

رحیم داد نے سر اٹھا کر کہا۔ ”لالچ پور کی طرف جانے سے پہلے میں ایک بار اپنے ہنڈا اٹھوٹ مڑو جانا چاہتا ہوں۔“

لالی نے سر اٹھا کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے، تجھے ابھی گھڑی ہفت یاد آ رہی ہے۔“ وہ چند ثانیے خاموش رہا۔ ”ایک بات تو بتا دیجئے۔“

پہلے تو میری گھڑی انجھ سے ملنے پہل آ کر تھی۔ پھر اس نے چاک آتا بند کیں کر دیا۔“

”شاید ہمارے پرگئی۔ رحیم داد نے کہا۔“ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ مجھے تو پتہ ہی ہے۔ جب وہ آتی تھی تو

مجھے دیکھ کر کتا روتی تھی۔ بالکل وہی پرگئی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میں بھی تو اس سے روتا ہی یاد کرتا ہوں۔ تو نے تو اسے دیکھا ہے۔

تنبی سوہنی سے اتنی ہی عمنی اور ابری ہے۔ یوں مجھ پر ایسا لگتا ہے جی جی وہ میرے پاس تو ہنڈا اٹھوٹ زمین ہے۔ اپنی زمین خود کاشت کرتا تھا۔“

لالی نے بے نیاز سے کہا۔ ”بار! یہ باتیں تو تو جیل میں بھی بتا کر کرتا تھا۔ کوئی اور کل کر۔“

رحیم داد کو لالی کی بات اچھی نہ لگی۔ وہ مزہ لڑکا کہ بیچ گیا لالی ڈر دیر خاموش رہا پھر رحیم داد کو منانے کے ایما ز میں بولا۔ ”تو میری بات کا بڑا مان گیا۔“

رحیم داد نے جھٹ کیا۔ تو پھر یہ بات سچی رہی کہ آگے جانے سے پہلے تو مجھے نوران اور بیچوں سے ملانے اٹھوٹ لے جانے گا؟“

اس کے انداز میں التجا تھی۔ دیکھ اٹھا۔ ذکر نوران کا کوئی بھی تو نہیں نہ بہن نہ بھائی۔ مال بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ باپ تھا وہ بھی دو سال پہلے سے گور گیا۔“

”تو احمد کوٹ جانا چاہتا ہے تو ضرور جانا۔ لالی نے کہا۔“

”اتنا سمجھ لے۔ احمد کوٹ جاتے ہی پکڑ لیا جائے گا۔ تیرے گھر کی تو پریس سخت بخاری کر رہی ہوگی۔ تو نے یہ بات نہیں سوچی؟“

اس کے بعد رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی۔ لالی بھی خاموش بیٹھا رہا۔ باہر چاندنی چھٹی ہوئی تھی۔ رات بھر کی جا رہی تھی۔ اب کبھی بھی بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رحیم داد چھپا لیتا ہوا بولا۔ ”بار! اٹھو تو کچھ

آ رہی ہے۔ میں تو اب سوتا ہوں۔“ یہ کہتا ہوا وہ کھل اٹھ کر منہ پر لیٹ گیا مگر لالی نے لٹا۔ اس نے پھر تک مار کر چراغ بجایا، باہر نکل کر کچھ دیر چاندنی میں ادھر ادھر ٹھٹھا رہا پھر واپس آ کر وہ بھی لیٹ گیا۔

رحیم داد پہلے ہی سوچا تھا۔ لالی ذرا دیر تک کر دین بدلتا رہا پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح آٹھ گھنٹہ دوپہر کے شہد کے ساتھ روٹی کا ایک ایک مٹھا کھا یا، پانی پیا پھر وہ رات کے بچے بیٹھے۔ یہ اس کے قریب ہی منڈلاتے۔ یہ بچے محروم نہیں گئے۔ شام کو انھوں نے پھر کھانسی کا

ایک ایک مٹھا کھا یا پھر اٹھوٹا پیر بھی کھا یا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے فوراً چراغ بجھایا۔ اندھیرے میں بیٹھے ادھر اٹھوٹ کر

باتیں کرتے رہے۔ چاند نکلا تو دونوں باہر نکلے اور کچھ دور جا کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بلندی سے انھوں نے گوم پھر کر ہر طرف نظر

دوڑائی۔ اعلیٰ اعلیٰ چاندنی ہر طرف پھیل گئی تھی محنت ثابت گرا تھا۔ وہ بہت دیر بعد واپس آئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ تیسرا دن بھی گزرا۔ گھر پر تھے ورنہ پانی ختم ہو گیا تھا۔ البتہ دریاں ابھی موجود تھیں۔ شہد اور پیر خاندان

بھرہ وہاں سے رہے۔ شام ہوئی اور اندھیرا پھیلنا لالی نے مشکینہ ٹھٹھا رحیم داد کو اپنے ساتھ لیلہ دونوں ٹیلوں سے اتر کر جھنگ میں پہنچے۔ اسے

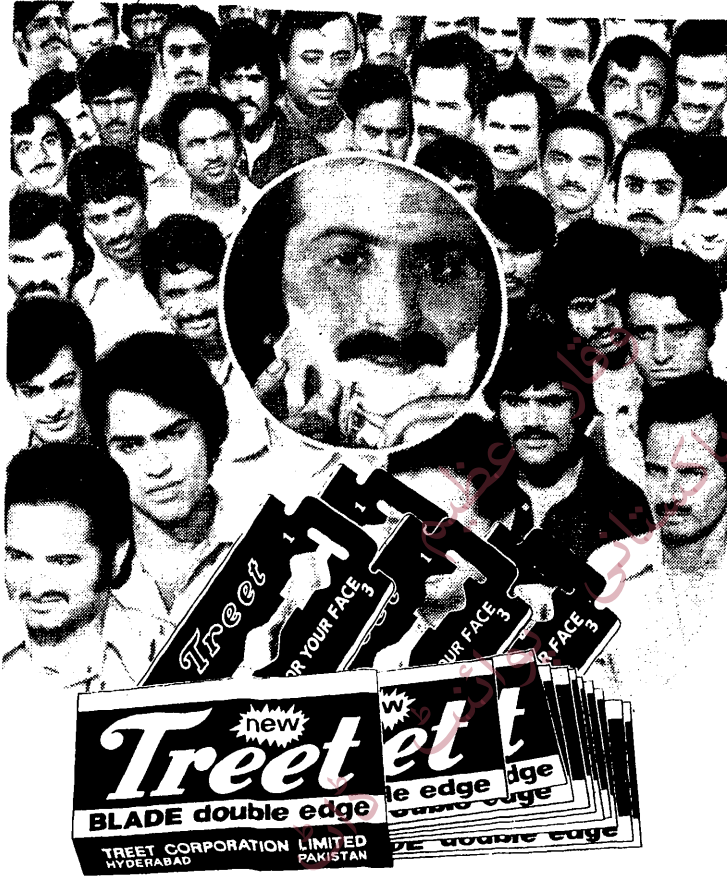
عبور کیا اور تیرہ سو پہنچ گئے۔ اب رات کا اندھیرا لگا رہا تھا۔ لالی نے نرے سے مشکینہ میں پانی بھرا اور مشکینہ رحیم داد کے حوالے کر کے بولا۔

”میں اب شادوں کے پتہ جہاں گھر مابوں کا گوشہ کر دے گا۔ مروج مکھن سے پہلے واپس آ جاؤں۔ آج نہ آ سکا تو کل آ جاؤں گا۔“

مان لے مجھے آئے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا میں آؤں گا ضرور۔ تو میرا انتظار کرنا میرے پاس ابھی چار درمیاں ہیں۔ شہد اور

پیر بھی ہے۔ یہ آٹھ دن کا راشن ہے۔ روٹیاں سوکھ جائیں تو پانی میں جھگو کر کھا لینا پھر صبح شام روٹی کا ایک ہی ایک چٹا کھانا۔ پانی ختم

سب تک



جانا پہچانا - آزمایا ہوا

سال ہا سال سے آپ کی طرح لاکھوں افراد
ٹریٹ بلیڈ سے صاف ستھرا اور آرام دہ شیو
کر رہے ہیں اور اس کے اعلیٰ معیار سے
مطمئن ہیں۔

ٹریٹ بلیڈ

بلیڈ سازی کا ہمارا وسیع تجربہ، آؤٹ کے طرح کے سب سے ٹریٹ بلیڈ کے اعلیٰ معیار کے ضمانت ہے۔

PRESTIGE TB 74.2.78

ہو جانے نورات کے اندھیرے میں نہرے لے آنا پردن میں ہرگز
لپٹنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلتا۔

رحیم داد اس کی باتیں خاموشی سے سننا دبا پھڑس کے بہن
ہو کر کہا یہ یاد! تو جلدی آجاتا دیر کے لیے کپڑے ضرور لے کر آنا۔
وہیں مجھے ساتھ لے جاتا تو اچھا تھا میں ادھر کے سب رستے جانتا ہوں۔
تو توپچن سے لاہور میں رہا، تجھے یہاں کا کیا پتہ؟

”پردہ نہ کر مجھے رستے کا سب پتہ ہے۔ میں جلدی آؤں گا اور
تیرے لیے کپڑے ضرور لاؤں گا۔“ لالی محبت سے اس کی پیٹھ تھپ
تھپا کر بولا ”اچھا اب تو جا۔“

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی
سے بھرا ہوا مینہ لٹکا کر بھنگری طرف چل دیا۔ لالی خاموش کھڑا
دیکھتا رہا جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نہرے کے کنارے کھائے
چلتا ہوا پل پر پہنچا اور لے کر نہرے کے دوسری جانب چلا گیا۔
وہ آگے بڑھا تو سرسٹک آگئی۔ اس نے دوسری سے دیکھا ایک لاری
تیزی سے سرسٹک پر دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرستانا
بھاگ لالی سرسٹک سے گزر کر ریل کی پٹری کی جانب بڑھا۔ ریل کی
پٹری کے آس پاس تانا اور زیادہ کمر تھا۔ ہر طرف ریلین تھی۔

وہ ریل کی پٹری کے کنارے کے کچھ دور تک چلتا رہا پھر
نشیب میں اتر کر جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آہستہ
آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ یہ دیر راستہ تھا جس سے وہ رحیم داد کے برابر
چند روز پہلے گزر رہا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ جاہذا بھر کر اوپر
اگیا۔ سامنے چھیلے اور تھمنے لگے۔ ورنے کی رات نہرے کا غن بن گئی۔
رات آجھی سے زیادہ گزر گئی۔ وہ گاؤں میں داخل ہوا اور

سنسان لگی کر چپ سے گزرتا ہر گھر پر سو نکلتا۔ ایک بار ہوشاواں
کے گھر کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ دروازہ خاموش کھڑا رہا پھر دیوار
پر چڑھا اور آہستہ سے اٹھن میں اتر گیا۔ اس نے چونکا نظروں سے ادھر
اُدھر لڑو دوڑائی پھر نیچی جھت والے سامان نوا والاں کی جانب بے
دیے قدموں بڑھا۔ اس نے پیچھا کر شاواں والاں کے ایک کونے میں فرش
پر لیٹی ہے۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے اٹھلی چاندی میں لالی کا سایہ دیکھا
تو گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ لالی اس کے قریب پہنچ چکا تھا شاواں کی آنکھیں
حیرت سے جھپکی کی جھپکی رہ گئیں۔ لالی نے کچھ کتنا جا تو شاواں نے ٹوٹ
بڑھا کر اس کے منہ پر رکھا۔ کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ
کیا اور لالی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھن میں آگئی۔ چوہہ آسے پڑھتی ہیں گئی۔

اور آہستہ سے پوچھا تو آیا کیسے؟

”دیوار چاند نہ کر۔“

وہ بھڑک کر بولی۔ ”مغزی زکر ٹھیک ٹھیک بتا۔“

لالی نے کہا۔ ”پتلہ یہ بتا کرے میں کون ہے؟“

”ہے کرنی۔ کیا کرے گا مہان کر شاواں نے گول ہل جاواب

دیا۔ لالی نے آنکھ مار کر بے تکلفی سے کہا۔ کوئی تیار پار چائیں لیا؟“

شاواں ایک دم شعلے کی طرح جھٹک اٹھی۔ اس نے قہر آلود

نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”میں کرنی جھٹال ہوں؟ تو مجھے جھٹکا کیسے

کنجریہ یہ کہہ کر اس نے غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی نے اس کی ناراضی پر ذرا بھی برا نہ مانا، ڈھٹائی سے سر کرنا

رہا کٹنے لگا۔ ”یہاں میں سے تو بھر چھپا کیوں رہی ہے؟ صاف صاف

بتا کرے میں کون ہے؟“ اس نے کچھ بے حرک کر پوچھا یہ تیرا خصم

تو نہیں ہو گیا؟“

”نہیں۔ شاواں کے لیے میں ٹھیراؤ اگیا تھا۔ وہ یہاں کیسے آ

سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں آسکتا۔ تو اس کی گھڑ والی جو ہے۔“ لالی نے بے نیگی

سے کہا۔ تو جھوٹ تو نہیں گئی؟ اس نے کچھ طلاق کا کاغذ بھی کب

دیکھ کر دیا۔“

”فے بھی نہیں سکتا۔ شاواں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ جب

بالے کے ساتھ میرے آؤٹھنے کا سہ چڑھا تو اس نے درپٹ کھائی

”تھلے لیا۔ سب نے بہت کہا پھر بھی نہ گیا۔ وہ ادھر ہی طرح کا کافی

ہے۔“ اپنی بات کتے کتے وہ درازا سرشاری اور دوپٹے کا پلہ سر پر ڈال لیا۔

اب بھی میرے لیے جھوٹا کرنا ہے۔ جان دیتا ہے مجھ پر۔“

لالی نے نظر بھر کر شاواں کو دیکھا۔ وہ پڑھتی کے کنارے پاس

طرح کھڑی تھی کہ کھل مکی چاندنی کی چھوڑ میں اس کا چہرہ اُبلے تیل کی

طرح دکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی روش آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔

لالی مسک کر بولا۔ ”مجھ پر جان مینے والے اور تیرے لیے تڑپنے والے تو اور

بھی بہت سے ہیں۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔ اس نے شاواں کی

دھنکی ہوئی پشانی اور آنکھیں بھر کر نظروں سے دیکھیں۔ تو تو ابھی تک

تھیلی مٹا رہی گئی ہے۔“

”اے دیا نا نہ کر۔“ وہ خرگاہی چوہے جھپٹے لیے میں بولی۔

”اب کیا رہا کچھ مجھ میں بل کر رکھ کر جوتی۔“ اس نے گری سانس جبری

بالا مجھ پر باد کر گیا۔“

”اس کی گل جھڑ۔“ لالی نے تیکے لیے میں کہا۔ ٹھیک ٹھیک

بتا کرے میں کون ہے؟“

”راض تو نہیں ہوگا؟“ شاواں نے جھپٹے ہوئے کہا۔ میرے

مگر یہ ہاتھ رکھ کر بتا۔“

”نہیں“ لالی نے اُس کے سر پر ہاتھ لکھے بغیر کہا۔

”ایسے نہیں“ شادان نے اصرار کر کے کہا۔ ”سر پر ہاتھ رکھ کر بتا“
”تو نہیں منائے گا؟“

”نہیں مناؤں گا، ہمیں مناؤں گا“ لالی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اب بتا“

شادان نے ذرا سا آگے جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا: ”ناجی ہے۔ اندر منجی پر سو رہی ہے۔“

”کون ناجی؟“ لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بولنے کی طرح شادان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

شادان ناک چڑھا کر تکیے لے بیٹھی۔ ”وہی کنبڑی جس نے بالے کو مجھ سے چھین لیا تھا۔“

لالی نے خطرے کے احساس سے خوف زدہ ہو کر کہا: ”وہ یہاں کیسے آئی؟“

”آئی نہیں میں خود جا کر لائی ہوں، شادان مطلق خوف زدہ نہیں تھی۔ لالی اُس کی بات سن کر سخت پریشان ہوا۔ ہنچا کر لولا۔ تیرا

مغز تو نہیں چر گیا؟ یہ مجھے سمجھو کیا؟“

”زرا نہ بڑبڑا۔ تو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔“ یکہ کہہ کر وہ اپنی صفائی پریشانی کرنے لگی۔ ”خدا ربا تھا اُسے۔ کوئی دوا دار ہو جی نہیں۔

میں شام کو حکیم جی سے اُس کے لیے دوائی لائی ہوں، اُس نے ذرا سا توقف کیا پھر تڑپ کر لولی۔“ اُسے مرسوں کے جھجول کی طرح پسلی

پڑ گئی ہے۔“

لالی اُس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا، نہایت رٹکھن سے بولا۔ ”مجھے کس نے کہا تھا کہ اُسے اپنے گھر لا، اُس کا علاج کرا۔

اور کوئی نہیں اُس کا؟ کوئی تو ہو گا؟“

”ہے تو۔ شادان نے جواب دیا۔“ ”ویر ہے۔ پر وہ کراچی میں کم کرنا ہے۔ جو ہر جاتی تھی وہ بھی پھیلے دنوں اُس کے پاس چلی گئی۔ وہ لے

بھر کر لیا تھا یہی ہوا۔ اسی منڈال تھی۔ ہائے، کیا باتوں۔ روز ناجی کا ہاتھ پکڑ کر نکلتی تھی، مارتی تھی، جھوٹے کھسرو تھی۔ یہی تو ناجی بالے کے گلے پڑ گئی کہتا تھا۔۔۔“

لالی شادان کی باتوں سے اکتا گیا۔ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”خدا غافل کی کوڑا بندوق۔ یہ بتانا ناجی بالے کو تو نہیں پوچھتی تھی؟“

”کیوں نہیں پوچھتی تھی؟ شادان نے کہا۔“ ”میں اُس کے پاس گئی تو اُس نے پہلے بات یہی پوچھی۔ میں نے جھٹ کہا میرے پاس تو وہ تین مہینے سے نہیں آکھا ہوا رہ گیا ہو گا بیکڑ بننے۔ وہ تو اپنے کو بڑا سوہنا میرا سمجھتا تھا۔“ شادان نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔ یہ غلط بات

”بات تو جھجک جی کسی تُو نے پر اُسے یہاں لے کہوں آئی؟“

”ذرا تو کیا کرتی۔ جارے اُسے۔ کھانے پیئے کبھی گھر میں کچھ نہیں۔“

”پسے کوڑی بھی اُس کے پاس نہیں۔ شادان نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ”تو چاہتا کیا ہے۔ میں مر جانے دیتی اُسے؟“

وہ لالی سے اور قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ لالی اُس کے بچہ کے مانند سخت جسم کی چھین محسوس کر سکتا تھا۔ شادان آہستہ سے بولی: ”ناجی کے

بہٹ میں بچے ہے، بالے ہی کا ہے۔ سچ جان اُسی کا ہے۔ شادان نے یہ بات ایسی لذت لے کر کہی کہ اُس کا چہرہ گلن اُٹھا، آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ لالی محم کھڑا رہا۔ اسے شادان پر غصہ بھی آ رہا

تھا اور اُس سے ہمدردی بھی تھی۔ شادان اُس کی آنکھوں کے بے نیاز کنتی رہی۔ جینا پسین ہو گا۔ بچے کو خود پالوں گی۔ اپنے ہی پاس رکھوں گی۔ ناجی بھی یہیں رہے گی۔ میرا کیا لے گی اپنے نصیب کا کھائے گی۔“

”تو تین دن کبھو کہیں تو نہیں ہے؟“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”اب تو جاگ جا۔“

شادان نے تکیے لے بیٹھی۔ ”بوجھا۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تو یہ سب کرے گی کیسے؟ لالی نے سنجیدگی سے کہا۔“



خبر عظیم حضرات متوجہ ہوئے

آپ کے کسی دوست یا عزیز نے گھڑی کی فرمائش کی ہو تو ہمیں اور جاننے کی ضرورت نہیں۔ اُلفت ٹریڈرز تشریف لے آئیے۔ جہاں خوب صورت اور نو بہ نو گھڑیوں کا ایک بڑا اسٹاک آپ کے حُر انتخاب کیلئے موجود ہے

اطمینان، اعتقاد اور معیار کے لیے

پوسٹ بکس ۳۰۷

البوظہبی

فون

۳۳۴۱۳



شاہان نے شعیبؑ کے چڑکے قریب پڑے ہوئے چھپرے کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ دھارا دیکھ رہا ہے؟ ادھر آؤ۔ وہ لالی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دھارے کے پاس لے گئی اور اس کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کتنی محبت سے سسلاتے ہوئے بولی: میری بوری دھری ہے۔ نیل بالہ کی مچھ بجاؤ۔ بچے کے بغیر صرف چالے پر صبح شام کا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے۔
لالی نے کہا: پرتیرا اس سے کیا بننا ہوگا؟

”لے، یہ بچہ ہے۔“ شاہان نے جبکہ کر کہا: ملک کی ماڈی بڑھی آتا ہے۔ رنڈے کے رنڈا دم چپکا کر دودھ لے جاتا ہے۔ شام کو چائی میں دودھ بھرا کر تھن نکال لیتی ہیں۔ وہ بھی بک جاتا ہے۔ شاہان نے ذرا سائل کر کے کہا: اور اس ماڈی کی فصل پر بھٹی کی چٹائی بھی کرتی ہیں۔ اچھی خاصی چوک مل جاتی ہے۔ ملک کی حویلی میں بھی کام کاج کرتی ہوں۔ محنت کرنے کے معاملے میں اہری ہوں۔ پروا نہ کر لالی، نکر کی کوئی بات نہیں۔

”جب تو بہت سے کام کر لیتی ہے تو ایک کام اور کرتے لالی مسکرا کر بولا: مجھے بچو والے۔ ایک اور جے آج مانے گی۔“
”گالی مت دے۔ وہ بچو کر لولی۔ میں نے جتنی ترے ہاتھ میں لے دی تھی۔ جتنی سے مار لے مجھے پر ایسی بات نہ کہہ۔“
”تو مجھے بچو والے کی تو مجھے تجھ سے کوئی گناہ ہوگا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔“
”مجھے انعام ملے گا تو مجھے خوشی ہوگی۔“ لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا۔ شاہان: تو بڑی زوروں کی عورت ہے۔ جتنی جانتے ہیں کہ تم کتنی جانتے ہو۔ بالے مجھے پہچان ہی نہ سکا۔ بالے تو ایک نمبر۔۔۔ شاہان نے اسے بات پر لندی نہیں کرنے دی۔ جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی مگر وہ فوراً چونک پڑا۔ شاہان کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: شاہان! تیرے ہاتھ کی چوڑیاں کہاں گئیں؟

”توڑ ڈالیں۔ بالا جو مر گیا۔“

”تجھے ابھی تک اس کا ہوگا ہے۔“ لالی نے تیکھے لیے میں کہا۔
”اس طرح اس کا کیا پارے گی تو ضرور جیل جلائے گی۔“
”اتنا راضی کیوں جوتا ہے۔ وہ بے نیازی سے بولی تو جوتا ہوتا ہے۔ میں راکھوں، نشیمن، پکڑے، پھول، سلاسی، باندھوں، دانقوں پر دنداس ملوں، آنکھوں میں کاہل ڈالوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“ اس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا: بتاؤ، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

”بتانا ہوں۔ ابھی بتانا ہوں۔“ لالی کے ہونٹوں پر زبردست خند تھا۔
”ایسا کہ بھائی سے چھپے ہو جا کر لنگ جاتا۔“ شاہان نے کوئی جواب

نہیں دیا۔ لالی ذرا دیر چپ رہ کر بولتا: مجھے سے کام لے بھیجے سے۔ تیری قسمت ماری گئی ہے۔ آج نہیں توکل چرچا ہوگا کہ بالے کہاں گیا۔ ایسی بات زیادہ دنوں پہلے نہیں رہتی۔ نمون سڑ پر چڑھ کر بولتا ہے توصات بچوڑی جالے گی۔ کچھ ترسوچ۔ لوگ تجھے کیا کہیں گے۔ مرنا ہی ہے تو ذلیل اور بدنام ہو کر کہیں مرنا چاہتی ہے۔ شاہان گم گم کھڑی اس کی باتیں سنتی رہی۔ لالی نے حیرت سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور شاہان کی طرف بڑھا کر بولا: لے، کل ماکر چوڑیاں پہن لینا۔ جبکہ ماکر چوڑیاں ویسا کرتے لالی نے نوٹ اس کی منجھلی پر رکھ کر ہاتھ بند کر دیا۔ سمجھ گئی ماہر سی بات کا مطلب؟

”سمجھ گئی۔“ شاہان نے سر ہلایا اور نوٹ لاپے کے ڈب میں رکھتے ہوئے پوچھنے کی تیاریاں اس وقت آیا کیسے؟ پھر کچھ سوچ کر لولی نے پکڑوں کے لیے آیا ہوگا۔ ہائے میں تو بھول ہی گئی جس رات سے تو گیا ہے اس کے بعد سے تو روز در نہک بھانے والے پوچھ پوچھ کر برا منہ خراب کر دیا۔

لالی نے جھٹ پوچھا: کیا بتانا توڑنے؟

”میں نے کہا، وہ دنوں بالے سے ملنے آئے تھے، اس کا دوست بتاتے تھے۔ وہ آہستہ سے مٹی میں سے غوب لے کر ہائے دروڑ کر کہا وہ مجھے جاتا تو دکھا کر ڈالتے تھے، وہاں سے مار بیٹے کر کہتے تھے۔“
”تو تو ایک دم قزاق نکلی۔ دیکھتے ہیں ایسی نہیں لگتی۔“ لالی نے مسکرا کر کہا: بالے کو پوچھتے تھے؟

”پوچھتے تھے۔“ شاہان نے نہایت مستعدانہ جواب دیا: پر میں نے وہی بات کہی جو ناجی سے کہی تھی۔ اس نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا: کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟

”ابھی تک تو تھیک ہی جا رہی ہے۔“

”بڑھکے ڈو لگتا ہے۔ وہ زیر لب سکرانی تیرا کیا بھروسہ۔“

چور اچکا جو ٹھیرا۔

لالی اس کی چوٹ اس طرح مسہ گیا جیسے گونگا چپ چاپ کڑوی دوا نگل جاتا ہے۔ وہ چند لمبے خاموش رہا۔ شاہان نے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: آؤ لے گا کہہ کر دیکھ لے۔ لے پل ملک کے پاس بچوڑا دے مجھے۔ بھگوان کا تیں۔ بھگ جانوں تو یہاں سے جو بچہ مندا دہا۔ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور آگے جھک کر بولا: ایک رات تیرے پاس آؤں گا اور اُدھاننا کر کے تجھے آؤ لے جانوں گا۔

شاہان ایک دم چھپر گئی۔ جل کر لولی: ”تو اپنے کونچر سے باز نہیں آئے گا۔“ اس نے غصے سے لالی کو گھور کر دیکھا۔ ”تو کیا میرا ادھاننا

سب بنگ

فارھنس ٹوٹھ پیسٹ کی قیمتوں میں حیرت انگیز کمی سے فائدہ اٹھائیے

اب فارھنس ٹوٹھ پیسٹ
پہلے کی نسبت کم قیمت میں دستیاب ہے

فارھنس فیملی سائز کی قیمت ۱۱ روپے
فارھنس لارج سائز ۷ روپے ۴۰ پیسے
فارھنس چھوٹا سائز ۵ روپے ۲۰ پیسے

اپنے مسوڑوں کو صحت مند اور دانتوں کو مضبوط رکھنے کے لئے
فارھنس ٹوٹھ پیسٹ استعمال کیجئے۔ فارھنس میں پائیریاکٹیم کرنے والا
رقیق مادہ شامل ہے جو آپ کے دانتوں کو سفید اور چمکدار رکھتا ہے۔



صحت مند مسوڑے
مضبوط دانت
فارھنس
مسوڑوں کے لئے



انٹرنیشنل لیبارٹریز لمیٹڈ

کرے گا مرقاؤں کی پرتیرے ساتھ نہیں جانوں گی۔ ہرگز نہیں مانوں گی۔
لالی ڈھٹائی سے سکر کر بلائی تو ضرور چلے گی بیرے سواتھے کوئی
جھگا کر نہیں لے جا سکتا نیز اڑھالا تو میں کروں گا۔ شرط بدلے مجھ سے۔
اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا، آء ہاتھ مارا۔

شاداں نے تیزی پر بل ڈال کر کھینچا کھنا چاہا۔ عین اُس وقت
کرے کے اندر آہستہ آہستہ کھانے کی آواز آجھری۔ شاداں نے سہمی
ہوئی نظروں سے اُس طرف دیکھا پھر سرگوشی کے انداز میں دھیرے
بولی: ”گلتا ہے ناہی جاگ گئی۔ ثواب جا“

لالی نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ چاند ڈوب گیا۔
اندھیرے میں صبح کا ہلکا ہلکا آجالا ابھر رہا تھا۔ اُس نے گھبرا کر کہا: ہاں
اب مجھے چلنا چاہیے۔ صبح ہونے والی ہے۔ تھوڑے کپڑے درزی سے
ضرور لے آنا۔ میں پھر آؤں گا۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔
شاداں نے اُسے روک کر کہا: ”تیرے بھی تیرے رنگ چلوں گی۔“

لالی اٹھ کر بلائی رہنے سے ابھی وہ رات نہیں آئی۔
”جکاس نہ کر۔ شاداں نے اُسے ڈانٹا۔“ تیرا یہ جانا ٹھیک
نہیں چلے گا۔ مجھے گاؤں کے باہر روڑے کے کھڑے ہو کر دیکھنا پڑے گا۔
کوئی مجھے ساتھ لے چلوں گی۔ کوئی بچھے گا تو کہہ دوں گی۔ پیار ہے اُسے
موت لگ گیا ہے۔ سوتیڑی کو دکھانے پر لے گاؤں لے جا رہی ہیں۔
لالی جانے جانے تک گیا اور چونکا نظروں سے کرے کے بند
دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ کھانسی کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔ لالی
نے جھینس کھول لی۔ اُس کی گردن میں موٹی دسی کا ڈھانچا ڈالا اور اُسے
منکھاتی ہوئی لالی کے پاس پہنچی۔ دونوں گھر سے نکل کر گلی میں آگئے۔
شاداں نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کٹڑی لگا دی۔ ہر طرف دو دھبیا
دھند پھیلنے لگی تھی۔ گھروں سے رک رک کر مویشیوں کی اڑاٹ
بڑھوں کے کھانے اور بچوں کے رنے کی آوازیں ابھری تھیں۔
شاداں نے گھروں سے ابھرنے والی ملی جلی انسان آبادوں
سے پریشان ہو کر کہا: ”جلدی کر۔ بول بولا شروع ہو گیا۔“

لالی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تیز قدم اٹھا
کر چلنے لگا۔ دونوں سنسان گلی کو چلے سے گزرتے۔ درختوں کی آڑ
لیتے آگے بڑھنے کے جتنیں اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شاداں
کبھی اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرتی، کبھی لاڈ سے اُس کی خوشنہنی سلاتی
اور اُسے ہنکانے کے لیے ”کڑک کڑک کر منہ سے تھت تھت“ کی آواز
نکالتی۔ لالی صبح کا کھینچا ہوا آجالا دیکھ کر اور زیادہ تیز قدموں سے چلنے
کر کرکشن کرنے لگا۔ اُس کے جوتوں کی تیز گرکڑ سے خاموشی میں
آہستہ آہستہ جھری تھی۔ شاداں نے اُسے پھر ڈانٹا: ”اے لالی! دھیرے

چل۔ ڈگر ڈگر کر۔“

لالی نے پلٹ کر شاداں کو دیکھا، اپنی رفتار سست کر دی
اور خاموشی سے شاداں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ چونکا نظروں سے
ادھر ادھر دیکھتا جاتا۔ دونوں گاؤں سے نکل کر باہر آگئے۔ اب روڑ
مُتروغ ہو گیا تھا۔ پہلے میلان تھا۔ اس کے ایک طرف ریمج کی فصلیں
تیار کھڑی تھیں۔ صبح کی نرم نرم ہوا کے جھونکوں سے گندم اور جوئی
بالیاں جھومتیں اور خشک پتوں سے سرسراہٹیں ابھرتیں۔ رُاس وقت
سنسان پڑا تھا۔ اُس کی زمین سخت اور ہموار تھی۔ کہیں کہیں بادش
سے زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ دن میں اُسے کھیل کود کے لیے
استعمال کیا جاتا تھا۔ مختصر صبح کے سائے میں وہ ٹھیل میلان نظر آتا تھا۔
دونوں کھیتوں کے ساتھ ساتھ روڑ سے گزرتے رہے۔ شاداں کے
بال ہول کے جھونکوں سے آؤ آؤ کر اُس کے مندریں ہرے پر بھر جاتے۔
وہ ہر بار اُنھیں سمیٹ کر پیچھے کرتی۔ اُس کی آنکھوں میں مینہ کا غار
تھا۔ وہ اس طرح گردن اور بچی کے چل رہی تھی کہ اس وقت بھی سرکش
اور طرح دار نظر آکر رہی تھی۔ لالی چپ چاپ شاداں کے پیچھے پیچھے چلنا
رہا اور اُس کے جسم کے دائرے اور پچ و دم دیکھتا رہا۔ اب وہ زخوف روڑ
تھا۔ نہ بے چین۔ وہ شاداں کی پناہ میں خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اور شاداں
ٹھیلے لاپے میں اپنے بھاری کولھے گھڑی کے پیڑ و لم کی طرح ہلاتی
آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ اپنی آبر آئی ہوئی گردن کو ہلکا سا قائم کر
ادھر ادھر دیکھتی جاتی۔ ایسے جیسے گلیا اپنے لیے کر رکھوا کر کرتے وقت
چوکس نظر آتی ہے۔ سو پر ادھر سے دھیرے بلند ہیں سے نیچے اتر رہا
تھا۔ ہر چیز خراب کے مانند دھندلی اور خاموش نظر آ رہی تھی۔ پھر
اُس خاموشی میں دور سے گھوڑے کی ٹاپیں ابھریں۔ شاداں گھبرا کر
بولی: ”ہائے سرگئی۔ یہ تو ملک جان پڑتا ہے۔“

لالی بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں خشک کر رک گئے۔ پھر دیکھ دیکھتے
کھڑی فصلوں کی آڑ سے ملک اللہ نواز خاں ایک پیسے سے نکلا اور عین
اُن کے سامنے آگیا۔ وہ اپنی سفید گھوڑی پر مرغ کی طرح اکڑا بیٹھا تھا۔
اُس کے آگے بدیق رکھی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی اُس نے گھوڑی کی لاس
زور سے کھینچی اور شاداں سے بڑھنے لگا: ”اتنے ٹوک سا کرنا چلی؟“
یہ کہہ کر اُس نے شاداں کے پیچھے کھڑے ہوئے لالی کو مستند نظروں سے
دیکھا اور اونچی آواز سے بولا: ”یہ کون ہے؟“ شاداں نے کچھ کہنا چاہا
مگر ملک پہلے ہی بول پڑا: ”یہ وہی جیل سے بھاگا ہوا قیدی تو نہیں ہے؟“
وہی جان پڑا: ”یہ ملک نے غصے سے ڈانٹ کر شاداں سے پوچھا۔“
”ٹھیک ٹھیک یٹا کون ہے یہ؟“

شاداں کچھ نہ بتا سکی۔ اُس کی آنکھیں خوف اور گھبراہٹ سے
سب نگ

چھکالے
منہ پر سدا طعنے ملک
کھڑے ڈاکے

درکے

ارسطائی پس فلسفے ہی کو اپنا اور مٹا

پچھونا سمجھتا تھا اور بال و مناسبت سے کیر سے یہ ناز تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ایک مختصر خط میں اس نے سگبہ مر کا مالی شراں محل شیار کر یا اور ارسطائی پس کو دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا محل میں کھوتے ہوئے معارف ارسطائی پس نے اس کے منہ پر ٹھوک مارا۔ جس سخت چوڑ ہو اور ارسطائی پس کہنے لگا کہ میں سگبہ مر کے شفاخت غرض یا اور اس کیلئے شکرانہ تھا جسے چہرے کے سوا کوئی مناسب جگہ دکھائی نہیں دی



آدمیان دیکھ جاسکتے ہیں، مٹولے جاسکتے ہیں تم نہیں پوچھ سکتے ہو، ان پر عمل کر سکتے ہو، انھیں قید کر کے ان پر قہر چلا سکتے ہو اور سختی وار پکڑ سکتے ہو لیکن خیالات پر اس طرح قابو نہیں پایا جاسکتا غیالات نامحسوس طور پر پھیلے ہیں، لغو کرتے ہیں، چپ جاتے ہیں اور اپنے مٹانے والوں کی نگاہوں سے مخفی ہوجاتے ہیں۔ روح کی گڑبڑوں میں چپ کر نشوونما پاتے ہیں، جھپٹتے پھولتے ہیں، جڑیں نکالتے ہیں، تم بے احتیاطی کے باعث ظاہر ہوجاتے والی شائیں جتنی کاٹو گے اتنا ہی ان کی جڑیں دوزخ میں مضبوط ہوجائیں گی (الہکوندر خدما)

اشکوں سے آشکار بن گئیں۔ لالی جلی آمستہ آہستہ چلتا ہوا جھینس کے قریب پہنچ گیا۔ شاواں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور سمجھ بھونے لہجے میں بولی بول تو کی انہیں؟

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا جھینس کو ترپتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ شاواں! تیری لوری ہو رہی ہے۔
”دیکھ رہی ہوں۔ وہ جین کر بولی۔ پرتو یہاں سے جا۔“ لالی چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں جھینس کے پیٹ سے اُبلتے ہوئے لال لال خون پر جمی ہوئی تھیں۔ کیا ایک شاواں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ غصے سے بولی۔ کھڑا کیوں ہے؟ چاہیاں سے ملک اپنے آہوں کو لے کر آتا ہی ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ لالی پر چھٹی اور اسے زور سے دھکا دے کر بولی۔
”جا جلدی سے محل جا یہاں سے“

لالی کو لڑھکاتے قدموں سے آگے بڑھا اور دھڑوڑ کر شاواں اور اس کی تڑپتی ہوئی جھینس کو دیکھتا رہا مگر جب وہ اس راستے کی جانب بڑھا جہاں سے گافن میں داخل ہوا تھا تو اس نے دیکھا غریب کی فصل کی جتنا فی کے لیے کھیتیں میں جاتے والے کئی ہل بنی خجالی لیے مانتے کھڑے تھے اور اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لالی کی آن پر نظر پڑی تو شہک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں دی ہوئی بندوق اٹھائی اور اس کی نال آن کی طرف کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹے اور ہل بنی خجالی چھوڑ چھاڑا جھاگے۔ لالی نے آن کی سراپائی سے فائدہ اٹھا یا اور جھٹ کھیتوں میں داخل ہو کر ایک پگڈنڈی پر تیزی سے دوڑنے لگا، اب

بھٹی ہوئی تھیں ہرنٹ پکچا ہے تھے۔ وہ بالکل ہوئی نظر آ رہی تھی۔ شاواں کو خاموش دیکھ کر ملک زور سے جینا۔ آج محل کر نہیں جائے گا۔ اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی بندوق اٹھائی اور لالی کو لٹکا کر بولا۔
”قدم اٹھا یا تو گرلی سے اڑا دوں گا۔“

”ملک جی! شاواں اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے لہجے میں عاجزی تھی لیکن ملک اس کی عاجزی سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا، فلمی ولن کی طرح زور سے دھاڑا۔ ہٹ جا میرے سامنے۔“

لال خاموش کھڑا سوچ رہا تھا، یہ ملک کون ہوتا ہے۔ مجھ پر گر لی جلائے والا۔ نہ یہ جھانے وار ہے نہ سی، آئی، ڈی کا انسر وہ اس کا قیدی ہی بھی نہیں تھا۔ اس نے ملک کے گھر ڈاکا ڈالا تھا، نہ اس کی بیٹی یا بیوی کو اسوا کھانا مگر ملک بندوق تانے لائے اسے خوں غوار نظر میں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گھٹی موچھیں غصے سے ابابیل کے پروں کی مانند پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس کی کلف اڑا پگے اُچھٹے پڑے کا بادبان ہوا سے لہرا رہا تھا۔ شاواں ابھی تک لالی اور ملک کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھی۔ چانک لالی نے پیچھے سے شاواں کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گر گئی۔ ملک کی نظر جھٹک گئی۔ لالی جھٹ قریب کھڑی ہوئی جھینس کی اوٹ میں جھک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔

ملک نشانہ باندھے ہوئے چلا کر بولا۔ باہر نکل نہیں تو میں گر لی چلا دوں گا۔

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپکلا سے چھری نکالی اور جھینس کی ٹانگوں کے بیچ سے ملک کی جانب تیزی سے پیسکی۔ چھری گھوڑی کی ایک ٹانگ چرتی ہوئی گوشت میں پیوست ہوگئی۔ گھوڑی نے ہنستا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ ملک بے قابو ہو گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ٹریگر دبا دیا۔ گول چلی اور جینتی ہوئی جھینس کے پیٹ میں اتر گئی۔ سرپ کچھ پک جھپکتے ہوا۔ ملک کی گھوڑی ہنستا پی ہوئی سر پیٹ بھاگی۔ ملک اس کی پیٹھ پر بیٹھا اُسے قابو میں کرنے کی کوشش کرنا رہا مگر گھوڑی نے نہ کھنکھنی نہ کر دی دوڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ ملک کی بندوق بھی ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

لالی نے تیزی سے دوڑ کر بندوق اٹھا لی۔ اس میں ابھی ایک کاڑوس موجود تھا۔ وہ بندوق اٹھی کر پلٹا۔ شاواں کی جھینس زور زور سے ڈکرائی۔ چند قدم بھاگی چھ لڑھکڑا کر گر پڑی۔ اس کے پیٹ سے خون نکل کر دوزخ زد زمین پر پھیل گیا۔ جھینس بے بسی سے گردن ہلا کر زمین پر منہ رکڑنے لگی۔ شاواں دوڑ کر غمی جھینس سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔ اس کے کپڑے خون سے لٹ پٹ ہو گئے، وہ لوٹ کر جھینس

سب بنگ

سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ سرک سے اتر کر نشیب میں آگیا لاری تیزی سے سرک پر دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ لالی چھر سرک پر آگیا۔ اس نے فلا لنگ سوار فلا لنگ کا راستہ طے کیا تو اسے سرک سے ایک کچا راستہ گاؤں کی طرف جاتا نظر آیا۔ یہی کچا راستہ سرک کے دوسری طرف بھی جاتا تھا مگر اس طرف لاکھا تھا جبکہ جگہ بیت کے ٹیلے تھے اور ان کے درمیان گندم اور جو کے پوسے للہا رہے تھے۔ چنے اور سرسوں کے کھیت بھی تھے۔ ہوا زور سے ملتی تو سرسوں کے پیلے پیلے چھل کسی آٹھ مٹیہار کے سبقتی دو پتے کے اچھل کی طرح لہراتے نظر آتے۔ ایک سا مٹی سوار تیلوں اور کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر گرو کے بگولے اڑتا تھا۔ دو جانا نظر آ رہا تھا اس تمام ایک پینچ کر لالی شخص میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کھر مٹنے اور کون سا راستہ اختیار کرے۔ وہ خاموش کھڑا سا مٹی سوار چلا کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس آٹا میں اسے اپنی پشت پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، ایک شخص آہستہ آہستہ اسی کی جانب بڑھ رہا تھا، وہ ادھر سے کراہی تھا۔ اس کا لباس آجلا تھا، آنکھوں پر بینک تھی۔ سر پر سفید بھڑی تھی۔ راولھی کے بال کچڑی تھے۔

قرب آکر اس نے لالی سے پوچھا: کیا تم لاری سے آتے ہو؟ لالی بات کا جواب فوراً دے سکا۔ اسے خاموش دیکھ کر وہ شخص مسکرائے۔ لگا تھے جی ای لاری سے جانا تھا۔ سینچے میں دیر ہو گئی۔ لالی کل گئی۔ لالی نے آہستہ سے کہا: ابھی ابھی کئی ہے جی۔

”یہ لاری تو کوٹ نگر سے آ رہی تھی۔ تم بھی وہیں سے آئے ہو؟“ یہ کہہ کر لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولا: ایسا لگتا ہے تم غلط جگہ آ گئے۔ لالی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ نہ اسے آگے کا پتہ تھا، نہ پیچھے کا۔ وہ پہلے کبھی اس طرف آیا ہی نہیں تھا۔ اسے خاموشی پر کراہی شخص بولا: تم آگے چلے آئے تمہیں پیچھے اترنا تھا۔ سر میں کبھی بھی ایسا بھی بولنا ہے۔ ایک بار ایسا ہو کر اس کی لاری سے میں چلی ہاڑ جا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا، جھوک آگئی۔ آنکھ کھل کر دیوال پور میں تھا۔ پہلی پاؤں بیت پیچھے رہ گیا تھا۔ اپنی بات کہتے کہتے وہ گئے بھر کو کراہی بھر واپسی کے لیے نہیں شام سے پہلے کوئی لاری نہیں ملے گی۔ اس سرک پر پچھلی باتوں کے بعد بہت کم لاریاں ملتی ہیں۔ سرک ٹوٹ چھوٹ کر بہت غراب ہو گئی ہے۔ پہلی لاری صبح نکل جاتی ہے۔“

لالی کوہ جھلا آدمی لگا۔ اس کے لیے میں نرمی اور شفقت تھی مگر لالی خاموش رہا۔ وہ ابھی تک جھونپٹا تھا اور خود کو فنی طور پر تیار نہیں کر سکا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرے۔ اسے سب کچھ

اسے خود سے ملی جلی انسان اور اوزوں کا بول بھالاسانی سے لہجہ ڈالیں لڑکی جانب سے آ رہی تھیں جہاں شادوں کی زخمی جھینس دم توڑ رہی تھی۔ وہ پلڑے بڑیوں اور بیسوں سے گزرتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا ہوا گیا۔ آواز میں مدھم اور مدھم ہوتی گئی۔

کھیتوں سے نکل کر وہ ایک پڑیل میں آگیا۔ پڑیل میں خود دوڑتے ہوئے جنگلی جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس تھی۔ زمین خشک اور ریتیلی تھی۔ اب صبح کا آجلا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ پڑیلوں کے غول کے غول جھڑانا مار کر جھاڑیوں سے نکلنے اور پھیلنے ہوئے فضا میں بکھر جاتے۔ لالی نے بند پڑ گئی جھاڑیوں کے نیچے ایک گڑھے میں ڈال دی اور اسے خشک پتوں اور پتھروں سے چھپا دیا۔ اب لالی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود رو پوسے روڑنا جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کے درمیان راستہ بناتا، جدھر نہ اٹھا اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کھر جا رہا تھا۔

جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے بھری ہوئی پڑیل ختم ہوتی تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سامنے سرک تھی۔ سرک صبح کے آجلا سے میں سانپ کی طرح بل کھاتی دوڑتے ہوئے چلی گئی تھی۔ سرک نیم پتھری تھی اور زیادہ کساد نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سرک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سرک کے دونوں جانب خیر اور غیر آباد علاقہ تھا اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں کہیں مٹی اور ریت کے ٹوٹے سرائے کھڑے تھے۔ اس نے دو ڈھائی میل کا راستہ طے کیا تو خود سے بریائی نظر آئی۔ آگے بڑھا تو کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نرمی۔ اب سوجھ بھل آجاتا تھا۔ نہر کا پانی ہلکی ہلکی دھوپ میں جھللا رہا تھا۔ سرک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی۔ لالی نے نرمی کوئی نوے فوار ہو کر سرک کے نیچے اترنا اور نہر کے قریب گیا۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے پلڑے میں پانی بھر کر پیرا۔ مینہ تھو دھوپ اور نہر کے کنارے لیٹ گیا۔ نرم اور خشک ریت پر لیٹ کر اسے بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے اسے نو تھندے اس کی آنکھیں بند ہوئے۔ لیکن مگر وہ سوا نہیں۔ ذرا دیر سے کہ بھر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر سرک پر آگیا۔ اس نے پل عبور کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اب دن کل آجاتا تھا اور اسے کسی ایسے شکار کے تلاش تھی جہاں وہ دھوکا ہو کر گزار سکے۔ سرک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دوڑتے ہوئے تھا۔ ایک چھپتا چلا گیا تھا اور ان کے پیچھے گاؤں کے مکانات نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ ہی دور آگے بڑھتا تھا کہ ایک لاری شور مچاتی دھول اڑاتی

چہرہ جیسے شبنم سے دھلا گلاب!



گرد آلود پھول، شبنم سے دھل کر صبح دم کیسے تر و تازہ
نظر آتے ہیں۔ بہت ٹائلٹ سوپ کے استعمال سے آپ بھی
اپنے چہرے اور جسم کو ماحول کی آلودگی کے اثرات
سے بچائیے اور ہمیشہ شاداب و شگفتہ نظر آئیے۔



حسن افزا بہت
ٹائلٹ سوپ

یک نظر انداز کرے یا اس کے جذبہ بھڑوسی سے فائدہ اٹھ کر راستہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ جب لالہ نے اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کہا اور گھم گھم کھڑا ہوا، تو وہ شخص کہنے لگا: "تم سبھی میں بڑھنے؟" آخر لالی کو لونا پڑا اس نے بات بنائی۔ بات یہ ہے جی، میں یہاں دوسری بار آیا ہوں، کئی سال پہلے آیا تھا، رات کا وقت تھا، یاد پڑتا ہے، اسی جگہ آ رہا تھا۔

اُس نے پوچھا: "لاری سے آئے تھے یا مانگے سے؟" "آؤ تو لاری ہی سے تھا۔ لالہ نے گاؤں کی طرف نظر ڈالی جس کے مکانات درختوں کے پیچھے سے نظر آ رہے تھے۔ پھر اُس نے پلٹ کر سڑک کے اُس بالاد گئے کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا، یہی جگہ تھی یا کوئی اور۔"

"کوئی بات نہیں۔" اُس شخص نے درختوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا: "یہ دہانچا گاؤں تم جاہو تو شام تک میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہو یہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے پریشان ہو گے۔ آؤ میرے ساتھ جہاں تمہیں جانا ہے، بیٹھا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

لالی انکار نہیں کر سکا، چُپ چاپ اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ دونوں کچھ دُور گئے راستے پر چلتے رہے۔ پھر وہ ایک پیسے کی جانب سڑگیا۔ لالی بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے اور جب پہاڑ کے باہر آئے تو گاؤں شروع ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ دُور نہیں گئے، ایک اونٹنر اپنے مکان کے سامنے ٹھہر کر اُس شخص نے کہا: "لو، یہ ایری اپنی مادی یہ گھوڑا گڑا ہے۔ ساتھ ہی میں ڈیرا ہے۔" بھنگ بھی اُسی طرف ہے۔ ادھر ہی چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر گنہ گشت ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ مکان کے ساتھ ساتھ چلا اور سیدھے ہاتھ کو سڑگیا۔ مکان کے آگے آکر اُس کے پیچھے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک چارپائی بھی تھی۔ اُس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا: "تم یہاں بیٹھو۔ میں ذرا دُور میں آتا ہوں۔ یہ کتابراہ وہ جس طرف سے آیا تھا، اُسی طرف واپس چلا گیا۔

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کے سامنے مکان کا جو حصہ تھا، اُس کے آگے کھلا ہوا بچی چھت کا براہ تھا۔ براہ آدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور اُس کے ساتھ ہی کھڑکی بھی تھی۔ براہ اُس وقت خالی پڑا تھا۔ مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اُس کے گرد و نواح میں صرف چند کچے مکانات تھے۔ لالی نے گاؤں صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ اُس کی اُسی اور بھی دُور لڑ مکانات تھے۔ گاؤں اپنی آبادی اور وقت کے اعتبار سے خاصا بڑا تھا اور جہاں گرو کے مقابلے میں نزہت بڑا تھا۔ مکان دیکھ کر لالی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا میزبان گاؤں کا کھانا پینا

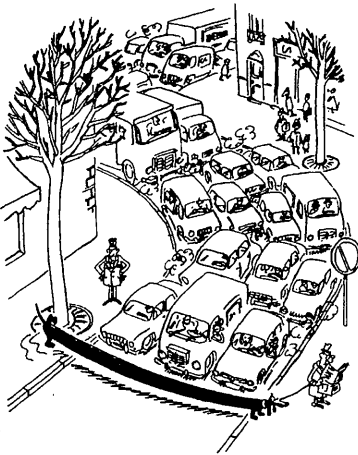
آوی ہے مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ درختوں کے نیچے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لالی بہت تنہا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اُس نے سکون ملائیں۔ دل میں کہا کہ دن گوانے کے لیے اچھا ٹھکانا مل گیا تھا۔ کم چملا جاتے گا۔ موقع ملا تو شاؤں سے مل لوں گا اور پچھلی رات کے باسے میں معلوم کروں گا کہ بعد میں اُس پر کیا بچی اور اگر وہ درمی سے کپڑے لے آئی ہوگی تو آج ہی رات رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا دوں گا۔ پھر آگے جانے کا پروگرام ہے گا۔ مگر شاؤں کے گھر جاتے ہوئے اُسے خطرے کا بھی احساس ہوا۔ اتنے سنگین واقعے کے بعد گاؤں بھر میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ملک اللہ نواز بہت غصے میں ہوگا۔ ہر سکتا ہے۔ اُس نے پریس کو بھی بلایا ہو۔

لیکن شاداں کے گاؤں کی طرف جانا اُس کے لیے ضروری تھا۔ رحیم داد کے پاس پہنچنے کا راستہ اسی طرف سے جانا تھا۔ کڑی اور آہستہ لالی جانا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی سوچ میں گڑن چکا ہے۔ خاموش بیٹھا تھا۔ ذرا دُور بعد اُس نے نظریں اٹھائیں تو دوکانیٹیل سامنے سے آئے نظر آئے۔ لالی لڑ کر دیکھا۔ اُس نے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور جھگ کر کسی گلی میں گھس جانے کا ارادہ کیا۔ مین اُس وقت دالان کی طرف سے آواز آئی: "ادھر ٹھیک میں آجاؤ۔ کچھ کھانے کی رقم نے صبح سے کچھ کھا بھی نہیں ہوگا۔"

لالی نے دیکھا کہ براہ آدے میں اُس کا میزبان دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ لالی تو اُس وقت چاہتا ہی نہیں تھا۔ فوراً اٹھا اور براہ کو ہٹ کر کے بھنگ کے اندر چلا گیا۔ بھنگ صاف تھی۔ تھی۔ ایک طرف اپنے پاؤں کا چنگ تھا، اُس پر اُجلا بستر تھا، فرش پر درمی بھی تھی، موٹھے تھے۔ دو تین کرسیاں تھیں اور ایک میز بھی تھی۔ میز پر لبب رکھا تھا اور اُس کے قریب ہی چند پرانے اخبار پڑے تھے۔ دروازوں پر رنگین پھرس لگے تھے۔ ایک پڑا سا آئینہ بھی میز کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ اُس شخص نے لالی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک موٹھا کھینچ کر بولا: "میں تو جی اُس کُرسے پر بیٹھوں گا۔ تجھے تو اسی پر بیٹھنے میں آرام ملتا ہے۔"

لالی کُرسی پر بیٹھنے ہونے لگا۔ بھنگ کا میزبان نے اصرار کر کے اُسے کُرسی پر بیٹھا دیا۔ ذرا دُور میں ادھر مگر ایک عورت دوپٹے کے آچہل سے سڑوٹا کھینچتی ہوئی اُس دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اُس نے حقہ مونڈے کے سامنے لا کر کھینچا۔ اُس شخص نے حقے کی لے بٹھالنے ہوئے عورت سے کہا: "بیٹھے! کھانے کا کچھ روٹی شونی لا۔ جلدی کر۔"

"ابھی لائی جی۔ یہ کتنی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔"



لالی خاموشی سے بیٹھا ناخن تر کرنا اور ماسٹر جی اُسے اپنے کاروبار اور زمین داری کے بارے میں اور ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا۔ ناخن سے فارغ ہو کر لالی پھر کمر پر پر بیٹھ گیا ماسٹر جی نے اٹھ کر میز سے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔ اُسے اکثر دسترخوان اور بٹن اٹھا کر لے گئی۔ ماسٹر جی نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور کہنے لگا۔ ”لو جی! یہ تو اپنے ہی ضلع کی خبر ہے۔ دو قیدی فناہ پور جیل سے نکل بھاگے۔ جتنے بھرتے آؤ پھر ہو گیا۔ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگے۔ دو ہزار کا انعام بھی نذر ہوا تب بھی نہ پکڑے گئے۔ وہ سکوایا۔ پکڑے بھی کیسے ہائیں سب مل جھگت ہے۔“ لالی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، وہ اپنی گھڑ بٹ پھپھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ماسٹر جی نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”مر فزاز! تربت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ سوچاؤ مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے لالی کو سونے سے منع کر دیا۔ ”بھئی! پہلے تم حجامت بنالو بیت بڑھ گئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”میں نانی کو بھیجتا ہوں تم حجامت بنالو پھر اڑے مولیوں کا کڑا ہے۔ دیوں کنواں بھی ہے۔ جی چاہے تو نہالو پھر اطمینان سے سو جانا۔“ ماسٹر جی کے اٹھنے ہی لالی بھی احتراؤ کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر جی گھر کے اندر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا پھر ترک کر بولتا۔ میں گھوڑی پر بیٹھ کر منڈی چلا جاؤں گا۔ دیسے سائنکل بھی ہے مگر مجھے گھوڑی کی سواری پسند ہے۔ تمام ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو منڈی کھٹکھا کر صفینہ کو بلا لینا۔ ادھر ڈیرے پر کئی اور کئی نوکر چاکر موجود ہیں۔“

ماسٹر جی گھر کے اندر چلا گیا لالی اُس کے جانے کے بعد بھی

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ وہ شخص زرا دیر چپ چاپ حقہ کڑا کڑا تار دیر بعد جتنے لوٹے میں پانی لائی۔ لالی نے باہر جا کر منہ دھوا پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ وہ شخص کہنے لگا۔ ”مر فزاز! تم سوچتے ہو گے۔ میں کون ہوں۔ یہ کہہ کر وہ سکڑا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ میرا نام فیض محمد ہے مگر لوگ مجھے ماسٹر جی کے نام سے جانتے ہیں۔ بات یہ ہے بر خوردار کہ میں پہلے سکول ماسٹر تھا۔ جب پاکستان بناتو میں ضلع حصار میں سکول ماسٹر تھا۔ خدمات اور پوسے ہوئے نوکٹ پٹ کر پاکستان آ گیا۔ کچھ دن ٹھوکر کی کھاتا رہا۔ پھر پاک پٹن میں سکول ہار لگ گیا حصار میں اپنی کچھ دعویٰ اراضی تھی۔ اُس کا ٹیکس داخل کیا، بھاگ دوڑ کی تو میرا کلیم منظور ہو گیا اور اس ملک میں الاٹمنٹ بھی مل گیا میں سکول ماسٹر چھوڑ چکا ہوں آ گیا۔ اب غلہ منڈی میں آڑھت کا کاروبار بھی کرنا ہوں۔ دوسرے کے لگ بیگ نہری زمین ہے اللہ کالا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ موت کے ساتھ گرد رہی ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر پلچے لگا کر بر خوردار، تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا؟“

لالی صاف جھوٹ بولی گیا۔ ”مر فزاز... جی میرا نام محمد مر فزاز ہے۔“ اچھا، اچھا۔ وہ سکڑا یا، زرا دیر بعد پھر اُس نے پوچھا۔ ”ادھر کیسے آنا ہوا؟“

”ایک دوست کے پاس آیا تھا۔“

”کیا نام ہے اُس کا؟“

”جی وہ لالی ذرا سا اُلجھا۔ اُس کا نام رحمت ہے۔“

ماسٹر جی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”وی تو میں جو محمد عقیف چواری کا بیٹا ہے؟“

”مجھے اُس کے باپ کا نام تو معلوم نہیں جی۔“

”اگر وہ وی رحمت ہے تو وہ اب اس گاؤں میں نہیں رہتا۔“

ماسٹر جی نے حقے کا کش لگا کر کہا۔ ”اُس نے ریلوے میں نوکری کر لی ہے کبھی کبھار گاؤں آتا ہے۔“ ماسٹر جی کچھ اور کنا چاہتا تھا، اسی اثنا میں جتنے ناخن تر کر گئی۔ اُس نے دلی پر دسترخوان بچھا یا اور ناخن کا سامان اُس پر رکھ دیا۔ ناخن میں پراٹھے تھے، اُنہوں نے انڈے تھے، مکھن تھا اور چائے بھی تھی۔ ماسٹر جی نے لالی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”لر خوردار! کچھ ناخن تر پانی کر لو۔ پرتنا براہ راست اور دسترخوان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔“

ماسٹر جی کہنے لگا۔ میں نے تو صبح ہی ناخن تر کر لیا تھا۔ تمہارا ساتھ دینے کے لیے صرف ایک پالیاں چائے پیوں کا تم میرا خیال نہ کرنا، اطمینان سے کھاؤ کسی تکلف و تکلف کی مطلق ضرورت نہیں۔“

سب نگ

ہیک جا پوچھو۔“

لالی بولا: ”میں صبح نوکل شام ضرور چلا جاؤں گا۔ میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتا جی!“

”میںی تمہاری مرضی۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا کہ تمہیں رحمت سے مل کر جانا چاہیے۔ یہ کہہ کر ماسٹر جی نے ذرا سا تامل کا اور کبھی تھک چکے ہوئے کہا: ”بھئی بڑا نانا، نانا، نانا، رحمت کا جال پلین کچھ ٹھیک نہیں۔ بازار سی عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔“

لالی نے فوراً کہا: ”مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو جی اس سے بہت دُور سے نہیں ملا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ ماسٹر جی نے کہا: ”وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ کوکری کے بعد اس نے پُر پڑے نکالے ہیں۔ برخوردار جی دیکھ تو لو کہ کو جوان ہونے ہی شادی کی دُخیر میں باندھ دینا چاہیے۔ زار دہشت بڑا ہے۔ حقہ حنیف نے یہی غلطی کی۔ میں نے سمجھا تھا بھی مگر عمری بات سن کر ٹال گیا کہنے لگا، ”لو کہ کی مرضی نہیں ہے۔“ بھئی اب دیکھ لو کہ کی مرضی وہ کھل کر سکرا یا، اس نے لالی کو غور سے دیکھا: ”تم نے تو اپنا گھر لیا ہو گا؟“

”نہیں۔“ لالی معصوم سی صورت بنا کر بولا: ”بات یہ ہے جی، ماں باپ تو اپنے ہیں نہیں۔ بھائی بہنیں بھی نہیں۔ باکل اکیلا ہوا وہ کا ادا رحمت سے بولا: ”کوکری چاکری بھی نہیں۔ رحمت کے پاس اسی لیے آیا تھا۔“

لالی کی بات سن کر ماسٹر جی نے کسی رتو عمل کا اظہار نہ کیا، خاموش بیٹھا رہا، کچھ دیر تھر تھکا کے سوچتا رہا۔ لالی نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو دل ہی دل میں پھٹتا یا کہ اس نے ماسٹر جی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ناختم ایسی بات کہی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی پریشان حالی بنا کر خود کو ماسٹر جی کی نظروں میں گرا لیا تھا۔ ذرا دیر بعد ماسٹر جی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے: ”کھانا آ جائے گا۔“ تم اکیلے ہی کھا لینا، یہ رات کا کھانا نہیں کھانا، عشا کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھنا ہوں۔ یہ میرا روزمرہ کا معمول ہے۔ اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔ فجر کی اذان سے پہلے میرے لیے حصار سے باہر نکلنے کا حکم نہیں۔ اس نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے چند لمحوں رتہ کر کہا: ”کھل کھول دینا، آہٹ اچھی ہو آتی ہے۔“ کمرے میں گئی، جوں تو باہر چاہا ہی پڑی ہے۔ ڈبرے سے رحمان کو بلا لینا، بستر لگاؤ گا۔“ لالی نے کہا: ”نہیں جی، یہیں ٹھیک ہے۔ میں کھڑکی کھول لوں گا۔ آپ پروا نہ کریں۔“

ماسٹر جی نے کہا: ”تم دن بھر سوتے رہے ہو۔ بندہ جلدی نہیں سب تک

خوف زدہ رہا۔ کانٹیلوں کو وہ پہلے ہی گاؤں میں دیکھ چکا تھا اور ماسٹر جی نے خبر جس طرح پڑھ کر سنا ہی تھی، اس نے اُسے طرح طرح کے دوسروں میں بٹلا کر دیا۔ باہر جانا خطرناک تھا اور کمرے میں بیٹھے رہنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ خاموش بیٹھا آنے والے خطرے کا انتظار کرتا رہا مگر خطرہ نہیں آیا۔ نانا آ گیا۔ اس نے لالی کی بڑھی ہوئی داڑھی صاف کی، مونچھیں کاٹ چھانٹ کر درست کیں اور سر کے بال بھی تراش دیے۔ اس نے حجامت بنانے کے بعد لالی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر لالی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی، خاموش بیٹھا رہا۔ نانی بھی خاموش دریا گھاؤں کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں بتاتا رہا۔

حجامت بنانے کے بعد نانی چلا گیا لیکن لالی سو رہا تھا۔ وہ تنہا کے لیے کوئی پر بھی نہیں گیا۔ بستر پر لیٹ گیا مگر بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ حنیف کھانے کے آگئی۔ کھانا پڑ لطف اور خوش فائدہ تھا۔ لالی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا کھا یا پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکا ہوا بھی تھا۔ لیٹتے ہی ایک گہری نیند سوا کر چلاخ چلے آ کر بچھ گئی۔

اس نے دیکھا کہ لمبپ روشن ہے اور فیض حتمہ عورت ماسٹر جی سامنے سو رہی ہے۔ اُسے بیدار دیکھ کر ماسٹر جی نے کہا: ”بخور دار! تمہاری لالی تو نکل گئی۔ میں دن بھر صبح ہی راہیں آگیا تھا لیکن تم اس قدر گہری نیند سو رہے تھے کہ جھگٹے کو جی نہ چاہا۔ اس نے ذرا سا توقف کیا: ”کوکری ضروری کام تو نہیں تھا؟“

”نہیں۔“ لالی نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ماسٹر جی اس کی بات سن کر لولا: ”تب تو ٹھیک ہے ویسے میں نے معلوم کیا تھا۔ رحمت تین روز بعد آ رہا ہے، کیوں نہ اس کا انتظار کر لو۔“

لالی پریشان ہو گیا۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ بات یہ تھی کہ وہ کمرے سے رحمت کو جانا ہی نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت اس کی زبان پر یہی نام آیا۔ وہ کوئی دوسرا نام بتا دیتا مگر اب رحمت اس کے لیے زحمت بن گیا تھا اور اس مسئلے کا وہ حل اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ رحمت کے پیچھے سے پہلے ہی وہ گاؤں سے نکل جائے۔ ساتھ ہی اُسے حیم داد کا بھی رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ حیم داد کا کیا تھا اور لالی نے رات تک اس کے پاس پیچھے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر ماسٹر جی نے کہا: ”بخور دار! تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ اب آئے ہو تو رحمت سے مل کر ہی جانا۔“

تین ہی دن کی تو بات ہے، بکلف چھوڑو۔ تمہارا پنا گھر ہے۔ جب

اُسے گنگڑا نکال کر باہر آدے میں ڈال کر بیچھا جاؤ۔ دروازہ ہل جائے گا پھر کھانا کھا کر سو جانا بھی تو سمجھو رات شروع ہوئی ہے۔ وہ چلا گیا۔ لالی چاہتا بھی یہی خنکار ماسٹر جی زیادہ دیر اس کے پاس نہ ٹھہرے۔ وہ بیٹھا رہتا تو باتیں بھی کر پڑتیں۔ نیت نیا جھوٹ بولنا پڑتا۔ ماسٹر جی سے بات کرتے ہوئے وہ بول بھی کرنا تھا ختم سے کم بولنا اور بہت سے نعلین سنبھل کر لوٹنا۔ اُسے ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا کہ اس کا بازو سی لب لہجہ کہیں اس کا جھرم نہ کھول دے ماسٹر جی کے ہانے کے بعد لالی کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے نیچے جا کر ٹھلنے لگا گاؤں کی گھنگھریاں آہرتی جا رہی تھیں۔ سناٹا رات رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا مگر وہ دو درختوں کے نیچے اندھیرے میں ٹھنڈا رہا۔ رات بھر دھیرے تا دیر تک ہوتی جا رہی تھی۔ سناٹا لگا رہتا جا رہا تھا پھر دالان سے کسی عورت نے اُسے مخاطب کر کے کہا: ”دنی کھالو باؤ جی!“

لالی خاموشی سے کمرے میں چلا گیا مگر وہاں چلتے نہیں ایک دوسری عورت کھڑی تھی۔ وہ دھلی عمر کی عورت تھی عمر نہیں سال سے زیادہ تھی مگر سخت غنت اور خوراک کی کمی نے اس کی جوانی کا چراغ وقت سے پہلے ہی بجھ کر دیا تھا۔ لالی جب چاہا درختوں کے قریب جا کر کھانا کھا لے لگا۔ عورت دروازے کے قریب چھب چاہا کھڑی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے متحرک لڑے دکھائی کیا نام ہے تیرا؟“

”رہا۔“ اُس نے جواب دیا میں رحمان کی گھر والی ہوں۔

”اچھا، ذرا پانی تو پلا۔“

رہبانے گلاس میں پانی بھر کر دیا۔ لالی نے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رہبانے بہت سی بیٹے، دسترخوان اٹھا یا اور چلتے چلتے لالی سے پوچھا: کوئی اور کام ہو تو کر بناؤں۔ مجھے گھر کھرا لیں اور کام کاج کرنا ہو گا۔

”نہیں اب تو جا۔“

رہبا خاموشی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ اُس نے دروازہ بند کر دیا۔ لالی ذرا دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا پھر اُس نے اٹھ کر برآمدے میں کھٹنے والا دروازہ بند کیا، کھڑکی کھول دی، چھونک باؤر لمپ بجھا یا اور بستر پر دلدا ہو گیا۔ وہ دو تک جاگتا رہا۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی پھر وہ پنگ سے نیچے اُترا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پر رات گزر چکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سنان گاؤں اور کھٹنا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اُس نے سوچا کہ اُسے یہاں سے جانا چاہیے۔ حیم داد اس کا انتظار کر رہا ہو گا مگر خالی ہاتھ حیم داد کے

سب نگ

پاس جا کر وہ کیا کرتا۔ جب تک حیم داد کے صدم پر چیل کی وردی تھی، لالی کا ہر مقصد اوروں کا تھا پھر کچھ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ اُس دروازے پر گیا جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اُس نے دروازہ ہولے ہولے بلایا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ لالی کسخت کوفت ہوئی۔ وہ چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا اور کڑبڑیں بولتے بولتے سو گیا۔

سویرے بہت تڑکے ماسٹر جی نے اُسے بیدار کیا اور اصرار کر کے باہر لے گیا۔ دالان سے نکل کر وہ لالی کے ہمراہ گھر کے پھوڑے گیا جہاں کمرے میں اُس کے موشی اور تو پھر تھے۔ وہ ایک مہینے کے پاس گیا جو کھڑکی میں منہ ڈالے چارہ کھا رہی تھی۔ اُس کا رنگ سیاہ تھا۔ ماتھے اور کھڑوں پر سفید نشان تھے۔ ماسٹر جی نے جھینس کی پٹلی پر ہاتھ پھر کر بڑے خسرے کہا: ہر خود دار یہ چلے ہے اس کے کھڑوں اور ماتھے پر سفید سفید چٹکیاں دیچھ رہے ہو۔ ایسی کج کو بیچ کیاں بھی کتے ہیں یہ دھری ہے۔ پکا بیس سر دودھ دیتی ہے۔“

پھر اُس نے قریب کھڑی ہوئی جھوری جھینس کی گردن جھک کر آہستہ آہستہ سمدانی کئے لگا۔ یہ بھی دھری ہے۔ اس کا تار مگر صرف چالے پر دودھ دیتی ہے۔ اس طرح اب یہ بھاڑ وہ گئی ہے صبح خنام اٹھا رہا میرا دودھ دیتی ہے۔ یہ بھی اعلان کی گج ہے۔ ماسٹر جی نے خسرے گردن اٹھائی۔ یہ نیل باؤر کی مشور ج ہے۔ بیچ کیاں کے ساتھ میں اسے بھی میلے سے خرید کر لایا تھا منہ مانگی قیمت دی تھی۔“

لالی نے جھوری جھینس کو غور سے دیکھا اور دو رنگ اُس کے پاس کھڑا رہا۔ بار بار اُس کی پٹلی پٹھیا اور گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ جھینس پر لالی کی شفقت دیکھ کر ماسٹر جی خوش ہوا۔ کتے لگا۔ ابھی کھا کھڑو نہیں ہوئی پھر بھی اس کا دودھ گاڑھا ہوتا ہے اور اس سے عجیب طرح کی جھک آتی ہے۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو کہ دودھ کا گلاس منہ سے نکلا تو نہانا تو کجی نہ چاہے۔“

ماسٹر جی دونوں جھینسوں کے پاس کھڑا اُن کی خصوصیات بتاتا رہا۔ پھر وہ دوسری دو جھینسوں اور گائے کے پاس گیا اور اُن کے پاس میں جاتا رہا۔ آخر میں وہ گھوڑی کے پاس گیا اور اُس کی خوبیاں گمانے لگا۔ جب دھوپ درختوں سے نیچے اترنے لگی تو دونوں کڑے سے واپس کمرے میں آئے۔ ناشتہ تیار تھا۔ دونوں نے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ ناشتے پر بھی ماسٹر جی اپنی جھینسوں اور گھوڑی کے بایں میں باتیں کرتا رہا۔ لالی اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتا رہا۔ اُس نے ناشتہ جان بوجھ کر تاخیر سے کیا۔ وہ صبح کی بس سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ماسٹر جی نے بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی بلکہ بار بار یہی کتار رہا کہ اُسے رحمت سے مل کر مانا چاہیے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ

غرق تھا اب فجر کی اذان سے پہلے اس کے باہر نکلنے کا امکان نہیں تھا۔ گھر پر گھراٹا چھایا ہوا تھا۔

لالی بستر سے اٹھا، چھوک باکر لمپ بچایا اور اپنے منصوبے کے مطابق بیچک کا دروازہ کھول کر خاموشی سے باہر نکلا اور بے قدموں چلتا ہوا گھر کے پچھڑے گیا۔ وہ موشوں کے کڑے پر پیچھا کرنا، موشیوں کے عام دھواں ڈھانے کی طرح کا نہ تھا جس پر پادش اور سردی سے بچاؤ کے لیے چھتر ڈال دیا جاتا ہے۔ کڑے کے گرد قد آدم چار دیواری تھی، اس کا چھانک بند تھا اور چھانک کے مین سامنے موشیوں کا کھوکھلا اچار پائی ڈالے اس طرح سو رہا تھا کہ لالی کے لیے کسی موش کو باہر لانا بہت دشوار تھا۔ چاندنی چمکی ہوئی تھی۔ لالی ایک وضعت کے نیچے اندر سے میں کھڑا بیٹھ کر کھولے کا کاٹا کس طرح راستے سے صاف کیا جائے۔ وہ اسی اوچھڑ بن میں تھا کہ اپنے اپنی پشت پر تھم کر اس کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے پاٹ کر دیکھا تو ہوش آؤ گئے۔ ماسٹری آہستہ آہستہ اس طرف آ رہا تھا۔ لالی جہاں تھا وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ ماسٹری قریب آ کر ٹھیک لگا مگر نہ اس نے کسی شک کا اظہار کیا، نہ حیرت کا۔ سب معمول نرم لیے میں بولا: ”برخوردار تم یہاں ہو۔ بیچک میں تعین نہ پاؤ طبیعت پریشان ہوئی۔ حیرت تو ہے؟“ تم اتنی رات گئے ادھر کیسے آ گئے؟“ وہ دم بھر کے لیے رکا پھر ملد ہی بے لکھی سے سکرایا: ”سبھی گیارہ گھنٹہ کی طلب نے تپا ہو گیا۔ باتیں نہیں ہوگی۔ دینے کے پاس ماہیں لینے آئے ہو گے۔“ یہ بات ہے نا؟“ لالی کو ماسٹری کی نیک نفسی اور سادہ دلی پر پیرا آ گیا۔ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا: ”ہات تو مجھ کچھ ایسی ہی تھی“

”میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا“ وہ بدستور سکرانا رہا۔ ”مجھے یہ وقت یہاں دیکھ کر نہیں بھی سخت حیرت ہوگی۔ مجھے تو اس وقت حصار کے اندر وظیفہ پڑھے میں مشغول ہونا چاہیے تھا۔ بار کیے آگیا۔ یہی بات تانے تھا۔ اسے پاس آیا تھا۔“ دھندلوں کی باتیں سن کر بیدار ہو گیا تھا اور بڑا پریشان اٹھیں پھاڑے۔ انھیں دیکھ کر دیکھا مگر ماسٹری نے اس کی توجہ کو توجہ نہ دی۔ لالی کو غافلہ کر کے بولا: ”آؤ، بیچک میں اینٹنیاں باتیں ہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ لالی کے ہمراہ چپ چاپ چلتا ہوا بیچک میں آ گیا۔ لالی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ گھر کے اندر گیا اور باجیہا ہاتھ میں لیے واپس آ گیا۔ اس نے لمپ روشن کیا اور مزے کے قریب ایک کرسی پر بٹھل کر بیٹھ گیا۔ لالی بستر پر پیر لٹکا کر بیٹھا تھا۔ دروازہ خاموشی رہی مگر ماسٹری نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”سنے لگا۔“ غور غور آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں وظیفے کا درد کر رہا تھا۔ خلاف معمول غم کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ آنکھ لگی۔ کیا دیکھتا ہوں ایک بزرگ

زیادہ دیر لالی کے پاس نہیں ٹھہرا ہوا یہ کہ اس کے کچھ ملنے والے آ گئے۔ اس نے انھیں کمرے کے اندر نہیں بلکہ دروازہ کھول کر بیٹھے میں گیا اور ان کے ساتھ درختوں کے نیچے پڑی ہوئی چار دیواری پر کچھ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرنا رہا پھر ان کے ساتھ ہی آنکھ کر لیں چلا گیا۔ دوپہر کو ماسٹری لالی کے پاس آیا اور اس کے لیے سگریٹ کے پیکیٹ اور ایک کنٹھا بھی لایا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھا یا مگر خلاف معمول ماسٹری چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ اڑتا ہوا تھا۔ اس نے کھانا بھی زہمت سے نہیں کھا یا، چند لقمے کھا کر ہاتھ لہچ لہچایا پھر اس نے خود ہی اپنی پریشانی کا سبب بتایا: ”میرے منشی کا آج صبح انتقال ہو گیا۔ کل شام تک ہانکل چلا چکا تھا۔ رات کو ٹھیک ٹھاک سو یا، فجر کے وقت پریش میں ایسا شدید درد آٹھا کہ چپ چپ ختم ہو گیا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو جھرا کر بولا: ”اللہ اس کی مغفرت کرے۔ بڑا ایک اور غمتی بندہ تھا۔“ عرصی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی مینیس سال کا ہو گا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ چند لمے غامض رہا۔ انھیں میں اپنے پاس لے آؤں گا مگر ان پر تپتی کا جو داغ لگ چکا ہے اسے کون مٹا سکتا ہے؟

لالی چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا۔ ماسٹری آہستہ آہستہ بولتا رہا: ”قریب ہی کے گاؤں میں وہ رہتا تھا۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ شاید شام تک واپس نہ آ سکوں۔“ دیر ہو جانے تو میرا انتظار نہ کرنا۔ شاکر جاننا تو چھٹنے یا کسی نوکر کو بتا دینا۔ ویسے میں جانتا تھا کہ تم آج کے بجائے کل صبح کی لاری سے جاؤ۔“ اس نے ذرا تامل کیا۔ ”بولو، کیا ارادہ ہے؟“

لالی نے آہستہ سے کہا: ”آپ کہتے ہیں جی تو میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔“

ماسٹری نے اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی چپ چاپ آٹھ کر چلا گیا۔ لالی دیر تک خاموش بیٹھا سگریٹ پیرا رہا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا اور شام تک سو رہا۔

عشا کی نماز سے کچھ دیر پہلے ماسٹری تھکا ہارا واپس آیا۔ لالی سے اس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ چند منٹ ٹھیک کر وہ وظیفہ پڑھنے اپنے حجرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر لالی کمرے سے باہر نہیں گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے لمپ کے کمرے میں آ کر بیٹھ کر لیٹ گیا مگر سو بائیں میٹھ مائے خاموش پڑا۔ پھر رات کو گزشتہ گاؤں کی پہل پہل آج گئی، گلیاں ویران ہو گئیں مگر لالی جاگتا رہا۔ رات آدھی ہو کر ڈھلنے لگی ماسٹری جی اس وقت بند حجرے میں اپنے گرد حصار کھینچ کر وظیفہ پڑھنے میں



ماسٹری نے لالی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ گھر کے اندر جانے کے بجائے بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ لالی نے سوچا تھا کہ ماسٹری کے جانے کے بعد چپکے سے نکل جائے گا مگر اب اس کی گنجائش بھی نہ تھی۔ صبح ہونے والی تھی اور ماسٹری ابھی باہر ہی تھے۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر بے چین رہا۔ بیٹھک سے نیند نہیں آئی۔ دن میں بھی وہ بے چین رہا۔

شام کو ماسٹری کی واپسی ہوئی۔ وہ روز کی طرح سکڑا، لالی کے پاس آیا اور نہایت شفقت سے پوچھا: کچھ تھکے تھکے نظر آ رہے ہو؟ اس نے ذرا توقف کیا اور لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہنے لگا: مہات یہ ہے کہ تم کہیں آتے جاتے ہو تو میں ہر تمام وقت تو کمرے میں رہتے ہو۔ ذرا باہر نکلا کر دیکھو سوال یہ ہے کہ کس کے پاس جاؤ، کہاں جاؤ۔ تمہارا کوئی ملنے جلنے والا بھی یہاں نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہاں رہو گے تو سبھی سے میل ملاپ پیدا ہو جائے گا۔ لالی چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ماسٹری کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا: بر خورد دار! تم بہت کم گو ہو مجھے تمہاری یہ ادائیگی بھی ہے مگر تو جوانوں کو اتنا خاموش نہیں رہنا چاہیے ہوتا بولا کرو۔ کوئی بات نہیں میرے ساتھ رہو گے تو بولنے کی بھی عادت پڑ جائے گی۔ بھئی! میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ سہت آج بھی ہوتی ہے اور تم سے باتیں کر کے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے تین روز نہیں بیٹھا ہے ساتھ تین برس بہت گئے۔ ماسٹری بولنے لگے تو لالی خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا مگر ماسٹری سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا۔ وہ صرف مطلب پوچھا: ”بر خورد دار! کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ پھر خود ہی بولا: فیصلہ کیا کرنا ہے بھئی! میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میرا کوئی مہاشا نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں مجھے بیٹھا دیا میری دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی تو بیاہ کر شادی ہو چکی تھی۔ سال دو سال میں آتی ہے سمجھو وہ تو غیر ہو گئی۔ اس نے قد سے تو قف کیا پھر لالی سے پوچھا: ہاں تو بر خورد دار! تم نے کیا سوچا؟“

لالی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پچھلی رات سے جس سوال نے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا، وہ ہنڈ جواب کا حنا تھا۔ لالی میں نہ صاف انکار کرنے کی جرأت تھی نہ وہ اپنے باپ سے یہاں حقیقت سے ماسٹری کو اکاٹھ کر سکتا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں ماسٹری کے

سائے کھڑے ہیں۔ سفید براق لباس پہنے کے گرد نور کا ہالہ آنکھوں میں ایسا جلال کہ نظر میں خود بخود جھک گئیں۔ کہہنا بادل کیا شان تھی ان کی! اس نے ذرا سا تامل کیا۔ چند لمحوں خاموش کھڑے میری جانب دیکھتے رہے پھر حکم دیا، فیض تھا، اپنی بیٹی طاہرہ کو اس نوجوان کے حوالہ عقد میں دے دے جو درود سے تیرا اصرار ہے۔ نافرائی کرے گا تو زائدہ درگاہ ہوگا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اب تک وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

لالی جو بچہ بچکا رہ گیا اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ماسٹری نے اسے خاموش دیکھا تو نہایت شفقت سے کہا: بھئی! اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ضرور ہے۔ میں نہ بہت غور کیا تو یہ نکتہ ہاتھ آیا تھا۔ اسے میری کسی کامیابی نہیں۔ پریشان حال بھی ہو مگر نیک اور سعادت مند ہو۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے بھی بیٹی کے فرض سے ملک و دل ہولنا ہے کسی نہ کسی کے ساتھ تو اس کا بدلہ ہونا چاہی ہوگا۔ ویسے خاندان میں کوئی لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے اور برسرِ روزگار بھی ہیں۔ لیکن مجھے تو تمہارے لیے حکم ملا ہے۔ بیٹھیں اپنی فردی میں بیٹھیں۔ پدمجھے خوشی ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے، کاروبار میں ہاتھ بٹاؤ گے، میرا سہارا بنو گے۔ میرے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر کھنکھار کر کلاصاف کیا۔ عزیزم! میری طرف سے تو ہاں ہے۔ رہ گئی تمہاری مرضی! جو چاہو اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ہم دونوں ہی کے لیے ناخوشی نہیں ہے۔ لالی پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کہے میں کچھ دیگر گری خاموشی چھائی رہی پھر ماسٹری کی آواز ابھری۔ ”بر خورد دار! کیا یہ خاموشی میں تمہاری مرضی سمجھوں؟“

اب لالی کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ گھبرائے ہوئے لیے میں بولا: میں کیا بتاؤں گی، میں تو کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ ”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں“ ماسٹری نے اس کی دل جڑی کرتے ہوئے کہا: سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں حق حاصل ہے کہ جو چاہو اور جیسا چاہو اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔ یہ کہہ کر ماسٹری نے لالی سے پوچھا: تمہاری گھڑی میں کیا بج رہا ہے؟“

لالی نے کان پی بندھی ہنسی گھڑی دیکھ کر بتایا: ساڑھے چار۔ ماسٹری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب تم سو جاؤ۔ میں اب سو نہ سکن گا۔ کچھ ہی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ مسجد میں فجر کی نماز پڑھوں گا اور صبح کی بس سے منڈی چلا جاؤں گا۔ تم سے شام کو واپسی پر ملاقات ہوگی۔ تمہارے پاس خاصا وقت ہے۔ اچھی طرح غور کرو۔ جو بھی فیصلہ کرو مجھے بے جھجک بتا دینا۔“

سب نگ

دل کو زبردست نہیں گنتی۔ لال اسے کسی طور دکھ پہچانا نہیں جانتا تھا۔ اسے اپنے جرائم پیشہ ہونے کا کبھی انہی شدت سے احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ دلدل میں گر گیا تھا۔ اسے اس دلدل سے بھٹکنے اور صاف تھری زندگی بسر کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا مگر وہ اس دلدل میں اتنا دھنس گیا تھا اس قدر لذت پت ہو گیا تھا کہ وہ اس موقع بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ جس زندگی کے اس نے کبھی سہلے خواب دیکھے تھے وہ خود چل کر اس کے آگے لڑی ہے مگر وہ درانے کے پت کھول کر اس کا تیر مقدم نہیں کر سکتا۔

لال کو خاموشی اور گم دیکھ کر ماسٹر جی نے کہا: "برخوردار! جو کمنا ہے صاف کہہ دو تم انکار کر دو گے تو میں یہی سمجھوں گا کہ گنجی میں کوئی خامی ہوگئی تم کو میں اچھا سمجھتا ہوں، ہمیشہ تمھارا ہوں گا۔ اس نے گری سال بھری تھی جو حکم ملا، اس کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔ اپنی بچری تھی اسے سامنے ڈال دی۔ بیٹی باپ کی عزت ہی ہوتی ہے اس کی آواز گھر گھر ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے پلنے جھلک اٹھیں گے۔ لال تو پک اتھا۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر ماسٹر جی کے پیر پوجے اور انھیں اپنے باپ سے میں سب کچھ صاف صاف بتائے۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر جی نے دل گرفتہ ہو کر کہا: "معلم ہوتا ہے میری باتیں نہیں ٹانگا کر گزریں؟" لال کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا: "مگر میں جو آپ کا فیصلہ کوئی برا فیصلہ ہے جی۔"

ماسٹر جی تو پک کر اٹھا اور لال کو گلے سے لگا لیا۔ وہ چند لمے تک لال کو گلے سے لگائے کھڑا رہا۔ لال کو ایسا محسوس ہوا جیسے ماسٹر جی وہ رہا ہے۔ اس کے جسم کی حرارت میں باپ کے پیار کا لاڈ تھا۔ اس نے شفقت سے لال کے سر پر ہاتھ پیراؤں کی پیشانی چوٹی۔ تم نے میری لاج رکھ لی۔ مجھے حکم عدلی کے عذاب سے بچا لیا۔" لال سر جھکائے نہایت سعادت مندی سے کھڑا رہا۔ ماسٹر جی نے لمے بھر خاموش رہ کر کہا: "تیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے کسی دھم دھم کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ دیکھنے سے فارغ ہوتے ہی مسجد کے تلاجی کے پاس جاؤں گا نمازیوں میں گواہ اور وکیل بھی مل جائیں گے۔ فجر نماز کے بعد نکاح ہو جائے گا دیکھیے یہ بتا رہی تھی۔ یہ باتیں کہنے کے بعد ماسٹر جی لال کے پاس زیادہ دیر نہیں بٹھرا۔ ویٹنے کا وقت ہو چکا تھا وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

لال نے چینی سے کمرے میں بیٹھ لگا۔ اس نے ماسٹر جی کا دل دیکھنے کے لیے حافی تو بھری تھی مگر وہ اسے فائدہ نہیں دے سکتا تھا۔

اب وہ جلد سے جلد اس گھر سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس نے بھٹکی بھٹکی نہیں پڑنے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی کسک سے ماسٹر جی بدلا اٹھے اور تیک دلی اور قدر تری سے اس کا افتدار اٹھ جائے۔

اس رات لال سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ وہ چار نقوں کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پلنگ پر دونوں پیر لٹکائے خاموش بیٹھا رہا اور بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ اسے رات تاریک اور گلی کو بچے سنان ہو جانے کا انتظار تھا۔ کوئی دس بجے کا ٹیک ہوگا۔ مہرٹ ہو گا عالم طاری تھا۔ لال نے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت گھر کے اندر جانے والے دروازے کا ایک پت آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ لال نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں ایک ساہیہ لہراہ کوئی دروازے کی اوٹ میں دیکھا تھا۔ لال جیڑان ویشیان بیٹھا اس جانب دیکھتا رہا۔ دروازہ پر بعد لال کو جڑان لڑکی آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی اور سر جھکا کر لال کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنا بدن سفید چادر سے چھپائے ہوئے تھی، صوف پر وہ نظر آ رہا تھا۔ گھٹنا ہوا چمچی رنگ تک نقش و نگار ابھری ہوئی سیاہ آنکھیں۔ وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔ لال نے اس سے اسے پہچاننے کی کوشش کی: "تم طاہرہ تو نہیں ہو؟"

اس نے آہستہ سے جملہ دیا: "ہاں میں طاہرہ ہوں ماسٹر جی کی بیٹی۔"

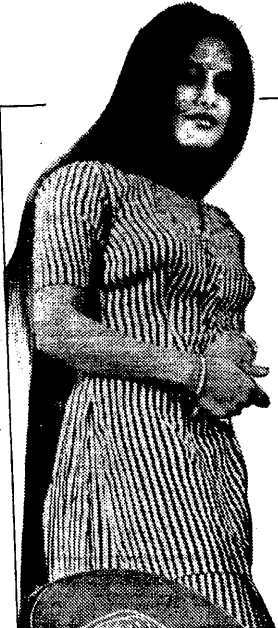
لال نے گھبر کر پوچھا: "تم اس وقت یہاں کس لیے آئی ہو؟" اس دفعہ طاہرہ نے گردن اٹھا کر لال کو دیکھا۔ تجزیہ پر پل ٹٹلا اور ایک دم پھٹ پڑی: "تجیہ کہنے آئی ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

لال اسٹپا کے رہ گیا۔ جڑان ہو کر لولا: "کیوں؟" "اس لیے کہ میں تمھارے ساتھ شادی وادی کا ڈھونگ لچانا نہیں چاہتی۔ وہ ویسے ہی تینکھ لیمے میں بولی۔ تم مجھے بالکل پسند نہیں تم صورت سے آجڑا نور لگتے ہو۔ اس نے غصے سے لال کو گھور کر دیکھا: "ماؤ کیا اس سے نکل جاؤ۔"

لال نے پیشانی پر ہر کہا: "دھیرے بولو۔ ماسٹر جی آجائیں گے۔" "آجائے دور۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے، نہ تمھاری نہ اباجی کی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ تمھارے۔"

لالی مل کر لولا: "مجھے نالنے کیوں آئی ہو۔ جاؤ، جا کر اپنے آجائی کو سناؤ۔"

"میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔" طاہرہ نے گھور کر لال کو دیکھا سبے تک



لیٹلی

زیادہ خوبصورت۔ زیادہ دلکش
 ہنسے و سادگے کا ایک نیارُوپ
 لیٹلی۔ دلکش و دیدہ زیب
 لیٹلی۔ آرام دہ اور پائیدار
 لیٹلی۔ خوبصورت ڈیزائن
 لیٹلی۔ مضبوط بناوٹ
 گھر میں پہننے یا گھر سے باہر
 ہر جگہ۔ ہر قدم آپ کا حسین ساتھی۔ لیٹلی

سروس چیل



قدم قدم حسین قدم قدم

trends

”میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔ یہ بتانے آئی ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ نہیں چاہتی۔“

لالی بے نیازی سے بولا: ”ذکر وہ میں نے تمہارے آگے ہاتھ نہیں جوڑے پیروں پر پچھڑی نہیں ڈالی۔ نہ کبھی تمہیں راستے میں پھینکا۔ نہ آنکھ ماری نہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”اوے سو منہ! ہم تو کسل ہو گئے۔ میں نے تو۔۔۔“

”اے اے! ظاہر اس کی بات کاٹ کر حیرت سے بولی۔
”تم تو بالکل لنگھ ہو“ وہ ایک بار دھچک دھاڑی۔ تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ جاؤ، اچھی چلے جاؤ۔“

پہلی نظر میں وہ ظاہر کو ایک بھول بھالی شرمیلی لڑکی سمجھا تھا۔ اس کے دہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز اور طرار ہوگی مگر جب وہ اپنی تمام تیزی اور طراری کے ساتھ کھل کر سانس لے گئی تو لالی نے دل ہی دل میں کہا: ”جیوہیری تو زرد دار ہے۔ اب اسے ظاہر کو چھپنے میں خیر ازانے لگا۔ میں تو نہیں جانتی کہ میں یہاں رہوں گی۔ یہ کہہ کر وہ انگلیں پکڑ کر ستر پر لیٹ گیا اور ظاہر کو مخاطب کر کے بولا: ”کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرو۔“

وہ اسی طرح ناراضی سے بولی: ”میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ تم سے صاف صاف یہ کہنے آئی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔“ چند ثانیے رک کر اس نے کہا: ”ذرا اپنی شکل تو دیکھو کسی خطر کا غنڈوں کی سی موچھیں ہیں۔ اونہر! ظاہر نے تمہارا سر سے منہ بچاؤ۔“

مگر لالی ذرا نہ بگڑا۔ مسکرا کر لالی کوئی بات نہیں کہ صبح منڈوا دوں گا تم چاہو تو آسترا لاکر ابھی مونڈ دو۔ لے آؤ اسی بات پر آسترا۔ ظاہر نے غصے سے گردن ہلا کر کہا: ”گویا مونچھیں منڈوا کر تم گل ناگین جاؤ گے اور میں تمہیں اپنا ستر تاج بنا لوں گی۔“ چند لمحے کہیں کا۔

”دے لو دے لو جتنی چاہے گا لیاں دے لو۔ کل صبح کے بعد تم سے پوچھوں گا۔“
”کیا روگے تم؟“

لالی اٹھ کر ٹیگ پر بیٹھ گیا مگر دن دسری اکر انکسرت سے بولا۔
”کل صبح میں تمہارا خنجر میں جاؤں گا۔“

”نصہ! وہ تمہارے بولی تم غنڈے ہو۔ بالکل تھوڑا کلاس غنڈے۔“
لالی نے کوئی ناگاری ظاہر نہیں کی۔ قمیص کی آستین پر پھانی اوڑھ لیا۔
”ظاہر کو اپنے بازو کی تھری ہوئی پھلیاں دکھاتے ہوئے بولا: ”یہ دیکھ رہی ہو۔ قریب آ جاؤ۔ چھو کر دیکھو۔“

”دیکھ رہی ہوں دیکھ رہی ہوں تم دوسری سے اچھے خاصے منڈے نظر آتے ہو۔“

”میں تمہیں اپنے بازو اس لیے دکھا رہا ہوں۔ لالی نے بغیرہ چہرہ بنا کر کہا۔ ”کل صبح کے بعد تم نے کوڑا کی تو چھ لینا۔ ایک ہاتھ ابھر سے دوں گا، دوسرا دھر سے۔“ لالی نے ہاتھ گھاگھا کر تباہی اور پر ایک لالت بھی لگا دی۔ گاہ۔ گاہ جاکو گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی ساری کوڑا نکل جائے گی۔“

”کیا کہا؟ تم مجھے مارو گے؟ اس نے تہہ آلو نظروں سے لالی کو دیکھ کر کہا: ”جی! دوزخ سے! بے غیرت! تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟“

لالی نے مصالحت کرنے کے انداز میں کہا: ”چلو، نہیں ماروں گا۔ اب تو عقد جھوٹا۔ دو جو تم کو گاہ کروں گا میری غیبت بھی منڈوا دوں گا۔ ایک دم مصفا چٹ۔ بال بھی نئے اسٹائل کے بنائیں گا۔ قمیص اور تپلون تو سینے ہی بیجا ہیں۔“ وہ لمبے میوڑے کا تہہ لبو۔ اب تم میری گھر والی بننا منظور کروں گی؟“

ظاہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھکی ہوئی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دفعہ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا: ”کیا واقعی تم مجھے ہر گز کھلا ساتھ میری شادی ہو جائے گی؟“

”سمجھا لیا، سہلہ آئے کچھ بات ہے۔“

ظاہر دھچک دھاڑا۔ ”میں ابھی رہی چھرا ہاں ایک اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔“
”اچھا تو چھری میں ہی لیٹا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ جی لو، اس نے اپنے بدن سے چادر اتار کر کمر پر رکھ دی اور نہایت بے باکی سے اپنا چھرا ہرا پیش دکھا کر لولی پر کسی کی امانت ہے اور جس کی امانت ہے۔ میں اس کی امانت ہوں۔“

لالی جو پتہ نہ لگا گیا۔ چند لمبے خاموش رہا چھرا اس نے منہ بھل کر آہستہ سے پوچھا: ”کیس کا ہے؟“

”کسی کا بھی ہے۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”کیوں نہیں ہے بالکل ہے۔“ لالی نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔
”زیادہ کوڑا نہ کرو صاف صاف بتاؤ۔“

”چلو جی میں سو۔“ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ ”میں لاہور میں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی۔ وہاں ایک کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج کے ایک پروفیسر مجھے گھر پر پڑھاتے تھے۔ مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مجھ سے دیوانوں کی طرح محبت کرنے لگے۔ یہ کہتے کہتے وہ یادوں کے سارے بہت دودھ بھل گئی۔ ایک لمحے کی بدلتی ہوئی برداشت نہ ہوئی۔ گو لڑا لڑا کہے! ہر بھی ہم چھپ چھپ کر ملتے کبھی۔۔۔“

سب بنگ

لالی بات کاٹ کر لولائے قابلہ مارا غ میں اس کے ساتھ ٹھک ٹھک کر گائے بھی گاتی ہوگی؟“ وہ ملے بھر کے لیے رکاز یہ تو نسلی باتیں ہوئیں۔ آگے کا بتاؤ؟“

”آگے جو کچھ ہوا وہ مختارے سامنے ہے۔“
”اسے بھی دیکھ لیا اُردا آگے بتاؤ۔“

ظاہر بتانے لگی ”پرڈیفسر کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے ایک بچہ بھی ہے مگر مجھے اس کی دوسری بیوی بننا منظور ہے۔ میں اس کی جنت میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں لیکن ابھی تیار نہیں ہیں۔ وہ میری تعلیم ادھوری تھی اور کچھ گھر لے آئے اب تمہارے سر منڈھنا چاہتے ہیں مجھے تاکہ ان کی بدنامی نہ ہو۔“

لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا پھر لولائے میں توجہ تم سے یہی کہوں گا، تمہیں بھی چاہیے کہ ماسٹر جی کی بدنامی نہ ہو۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ فرشتے ہیں فرشتے۔ اتنے نیک اور پھلے ہنس کر جی جانتا ہے ان کے پیرو ہر کر تھیں۔“ لالی نے دل کی بات صاف کہہ دی۔

ظاہر کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس میں عیاں بھی تھا اور بادیا کرک بھی تھا۔ وہ ذرا دیر تک اسی عالم میں بیٹھی رہی پھر غم کا سایہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے ہٹ گیا غصے اور نفرت کی دھوپ چھا گئی۔ وہ بڑے تھکے لمبے میں بولی ”تم نے مجھ پر بھی کچھ بھی پڑ نہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ میں اب بھی کبھی منع جانتی ہوں۔ نہ وہ فرشتے ہیں نہ اتنے پھلے ہنس جتنا تم نہیں سمجھ لے ہو۔“ اس نے ذرا سا ناٹل کیا۔ وہ ایک ہنر فزاؤ میں۔ پہلے تو انھوں نے چارو ہنسی کر کے لوگ کلیم منظور کرایا، پھر پرائی اسکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے زمین دار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑھت کا کاوا باد شروع کر دیا۔ اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”میں لے رہا ہوں؟“

”ہاں ہاں بالکل سچ لڑا ہوں۔“ لالی نے جواب دیا۔ ”تم کتنی جاؤ۔“
وہ کہنے لگی۔ ”اچھا تو اب یہ بھی سن لو۔ آڑھت کا تو صرف ہانا ہے۔ وہ سہل گنگا کرتے ہیں۔ باہر سے ٹنک اور مینی بیٹھے ہیں۔ ادھر سے ہندوؤں کی مہار اور لڑکی گائیں بھیجیں لاتے ہیں۔ تصابوں کے ہاتھ بیچ کر ان کا مرشل گزشت لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ دن بھر سہل گنگا دھندلا کرتے ہیں۔ رات کو دھنپے پڑھ پڑھ کر لپٹے گناہ بٹھارتے ہیں۔“ اس کا لہجہ اتنا دلچسپ ہو گیا۔ ”میں لیا نہیں ہے۔ تھکے نیک اور فرشتے ہیں؟“
لالی کو ایسا عسری ہوا جیسے وہ قلا بازی لکھا گیا ہے۔ اسے دیکھ بھی ہوا، حیرت بھی ہوئی مگر ظاہر اس کے ذہنی خلفشار سے بے نیاز رہتی رہی۔
”اب تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ تمہیں اپنے سہل گنگا کے دھندے میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کریں گے تاکہ رنجش اور بار بار پولیس کے سبب نہ لگ

ساتھ گولی چلے تو تھی اسے جاؤ اور پڑے جاؤ، تھی جیل جاؤ مگر یہ سلسلہ بھی چند ہی مہینے چلے گا میرے بچے کی بدلتش کے بعد وہ تھیں کسی مقدمے میں پھنسا کر تم سے طلاق لکھوا لیں گے اور میرا مایہ اپنے پیچھے سے کر دیں گے۔ وہ بد ضرورت بھی ہے اور ایک ناگہم سے فکر دا بھی مگر بہت بڑی زمین داری اور جاؤ کا اکلوتا وارث ہے اپنی یہ سکیم وہ آج ہی شام ہاں جی کو تپا چکے ہیں۔ وہ چند لمے خاموش رہی پھر اس نے نظر میں بچی کے آہستہ سے کماؤ تم نے سب کچھ سن لیا۔ اب بتاؤ، کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جس کے پیٹ میں کسی اور کا بچہ ہے؟“

”کتنے دن کا ہے؟“ لالی نے اس کے چھوٹے ہوئے پیٹ کی جانب دیکھ کر کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“

لالی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”چھ مدت مہینے سے زخم کا نہیں لگتا۔“

”ثابہ؟“ ظاہر نے غصہ سا جواب دیا۔

لالی مسکرا کر بے نیازی سے لولائے رفیق تین مہینے کی تو بات ہے۔

پھر توبہ کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“

ظاہر نے نظر اٹھا کر لالی کو نکلے خوارانہ لولے سے دیکھا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ ”تم عجیب بے غیرت انسان ہو تم ایسا بچہ قبول کر لو گے؟“

”قبول کر لوں گا ضرور کر لوں گا۔ ہر جی کیا ہے جی؟“ وہ نہایت ڈھٹائی سے لولائے ویسے سچ لہجہ تو یہ میرا معاملہ بھی نہیں۔ اولاد کے بارے

میں صرف مل جاسکتی ہے کہ اس کا باپ کون ہے میں کس کا بیٹا

ہوں؟ بات بری ماں بتا سکتی تھی تم کس کی بیٹی ہو؟ بات بھی ماسٹر

جی نہیں تمہاری ماں بتا سکتی ہے۔ غلط تو میں کہہ رہا ہوں میں؟“

ظاہر نے زنج ہو کر کہا۔ ”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، تمہیں ہی کہہ رہے

ہو گئے۔ وہ بڑھال ہو کر پھر کسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کھوٹی کھوٹی بیٹھی رہی۔

لالی بھی خاموش رہا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب لالی کو

دول سے چلا جانا چاہیے تھا اس نے ظاہر کو پھر چھوڑ دیا۔ تم یہاں کیوں

بیٹھی ہو؟ اندر جاؤ۔ وہاں نماز، خوش رکھاؤ، ریشمی پٹا نکل پہنو،

سرخ جھٹی اور ڈھوسہ گھگھار کر سویرے سویرے سامنے ایسے نہ آنا۔

وہ بیٹی بن کے آنا۔ میں تمہارا گھوٹ گھٹاں گھٹا کھائی دوں گا۔“

ظاہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر ہکا کے ٹم ٹم بیٹھی رہی پھر

اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اس

تے لالی کے آگے دو لیں ہاتھ جوڑ دیے۔ کو تو تمہارے پیروں پر سر رکھ

دوں۔ خدا کے لیے میرے ساتھ شادی کا خیال چھوڑ دو۔“

”پاپے آج ہی سے کہیں نہیں کہیں؟“ لالی نے بے نیازی سے

کے لیے مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟

لالی نے اُس کا پریشان چہرہ دیکھا اور سکرایا، تم مجھے بے وقوف
بغداد، امتحان دہانے کا کیا کہہ سکتی ہو، پر تم نے یہ بھی سوچا، خود تجھ سے
میں کتنی نکلے۔ اگر تھکاسے پاس بھیجا ہوتا تو اس وقت تم کبھی
مجھ کی طرح پوٹ پھلائے نہ دیکھتی ہو، میں نے اُس نے کچھ تامل کیا پھر تھک
سے منہ بگاڑ کر بولا، باسٹری وغیرہ پڑھتے ہیں، بیٹی عین لڑاتی ہے
اور میں بے وقوف ہوں، امتحان ہوں۔

ظاہر غامض شش مہینے اس کی جگہ تھی بائیں سنٹی نہ ہی لالی اُسے
مخاطب کر کے بولا اس طرح یہاں بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔
یہ بتاؤ اس پاس کے کسی پرنسپل کو یا تھکاکوئی مگر بتا دینا، وہ اسے
چاہا، مورا، تاؤ کوئی نہ کوئی تو ہوگا؟

ظاہر نے جھٹ جواب دیا، ماموں ہیں چھیل اڈھرایک
گاؤں میں بہتے ہیں مگر وہ ہمارے گھر تک آتے ہیں۔ سگے ماموں ہیں۔
لالی بولا، سگے سوتیلے کی چھوڑ دھڑل سے کام لے رہا ہے۔
مال جی تو تھکادی ہی طرف دار ہیں نا؟

”بالکل ہیں“ ظاہر نے بتایا، انھوں نے ہی تو مجھے تھکارے
پاس بھیجا ہے۔
لالی بولا تو بس تم ہی سہی اُن کے پاس جاؤ، ان سے کہو کہ وہ
رکھو لے کر مارا کر لائے بھیج دیں۔ وہ اُدھر جاوے اور دھڑل بکری جی
نکال کر لاؤ، میں کیا دونوں کا کام۔

ظاہر نے خوش ہو کر گون بلائی، یہ ترکیب ٹھیک ہے گی، بس
نے موم میں آکر کچلی بجائی، بالکل ٹھیک۔

لالی نے نیکیے لیے ہیں کما، خالی پہلی ٹھیک کہنے سے کام
نہیں چلے گا، جاؤ اور بکری جی کے کرٹا فٹ آ جاؤ، ظاہر جانے
کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے ٹوک کر کہہ
سے کما، اور دیکھو باسٹری کی ایک ٹیبل چوڑی اور ایک دھوئی بھی لیتی
آنا۔ ایک ڈانگ بھی لانا۔

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی، وہ کس لیے؟
”جیسا کہتا ہوں ویسا کرو۔ بیچ میں ٹانگ نہ لٹاؤ۔ سچ ایسے ہی نہیں
لے جاؤں گا۔ اُس کے ساتھ چاک یا گڑھریں کر جاؤں گا۔ یا مافز میں؟
اور ہاں دیکھو جاتے ہی باسٹری کے جبرے کے زنجیر باہر سے چڑھا کر
اُس میں پکے سے نالا ڈال دینا۔ ہر کام چوکس ہونا چاہیے۔“

ظاہر چل گئی۔ لالی بے چینی سے اُس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ
منٹ بعد ظاہر واپس آئی، سیکڑے ہوئے بولت، رکھو لاپلا گیا۔ تم بہت
بڑی شکل سے گیا۔ جب میں نے اور مال جی نے اُسے تو کُری سے نکال
سب گپ

کہنا، وہاں گناہ اترا انھوں نے ہی طے کیا ہے۔

”کہہ سکتی ہوں اُن سے بار بار کہہ سکتی ہوں۔ اُن کے سینے میں دل
نہیں پھنچے۔ مال جی کو بھی یہ رشتہ تسلیم نہیں جب سے سنا ہے
بے چاری بھی زیادہ قطار دور ہیں، ظاہر تیری سے بولنے بولنے
اچانک دھیمی پڑ گئی۔ اُس نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا اور غم زدہ ہو کر
بولی، تم اتنے سنگ دل کیوں ہو؟ تم مجھ سے شادی کرنے پر کیوں تکلے
ہوئے ہو، تمہیں مجھ سے محبت بھی نہیں ہے۔“

”مگر تمہیں؟“ لالی نے انکار میں گون بلائی۔ یہی یہی معاملے
کی بات ہے کہ اب تو میں باسٹری سے اپنا نہیں وصول کرنا چاہتا
ہوں۔ انھوں نے مجھ سے چار سو روپے جو کی ہے۔“

ظاہر ہنسی پڑی۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی جھٹ اپنے کانوں
سے سونے کے جھکے اُٹائے، انھوں نے کنگن اُٹائے اور انھیں لالی کی
طرف بڑھا کر بولی، لڑیہ لے لو یہ تھکا کر نکلیں۔ اب یہاں سے چلے
جاؤ، لالی نے ہاتھ میں بڑھا، ظاہر تھکا کر کہنے لگی، تم کبھی کبھی ہوں، ہر
کھالوں کی عود کشتی کروں گی، مگر تھکاسے ساتھ شادی نہیں کروں گی، نہیں
کروں گی۔“

”زور میں رو تھیں، زور بھرانے اور خود کشتی کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔“
لالی نے نہایت سہید گے کما، میں یہاں سے ابھی چلا جاؤں گا، پر ایک
شرط پر۔“

وہ جلدی سے بولی، کیا شرط ہے تمھاری؟ ظاہر کے چہرے پر
خوشی سے پھول اُٹھے۔

”مجھے تمھاری نہیں، تمھاری بکری جی کی ضرورت ہے۔ وہ پتکا
اٹھا، سیو دھڑکتی ہے اور تھکے پوٹ میں.....“

ظاہر بات کاٹ کر کہنے لگی، ایک منبر، تم دو بیٹیں لے جاؤ، مجھے
کوئی اعتراض نہیں۔ جاؤ، جا کر نکال لاؤ، دونوں کو اور یہاں سے چلے جاؤ۔
لالی نے کما، میں صرف بکری جی لے جاؤں گا، سچ لے جاؤں گا، سچ لے جاؤں گا،
میں جانوں گا۔ وہاں رکھو، الاموجود ہے، تم خود جاؤ اور مجھ لے کر آ جاؤ۔
وہ پریشان ہو کر بولی، یہ سکر تھیں تو مجھ سے بھی نہیں لے جانے
سے گاہیں اُس سے کہوں گی کیا؟

لالی اپنی ضد پر اڑا رہی تھی، یہ میں نہیں جانتا، جنھیں نکال کر تھی لاؤ
گی اور میرے ساتھ ساتھ پرنسپل کے آخری سرے تک جاؤں گی، بولو، ایک
کتنی ہو گیا، یہ کام کر سکتی ہو تو جلدی کرو، میں تورا نہ جاؤں، مجھے سونے دو۔
صبح نکاح کے بعد تم سے ملوں گا۔“

وہ پریشان ہو کر بولی، اُس کا کہنا ہوا چہرہ ایک بار جھپٹنا پڑ گیا۔
تم یہ تو سوچو۔ میں جنھیں کیسے نکال کر لاسکتی ہوں۔ وہ گوگردا کر بولی، خدا

خان



کی والدہ مندرستان کی ایک مشہور خاتون گزری ہیں سرسید کے کمالات اور اوصاف انھی کی ترسبت کا نتیجہ تھے وچتر کے لاوارث پوتہ ہیں کی خصوصی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ان کی وسیع و عریض حوصلہ مستحق عورتوں کی پناہ کا تھی۔ زریا نام کی ایک ضعیف خاتون ان کے ہاں رہتی تھیں۔ اتفاق سے سرسید کی والدہ اور زریا ایک ہی نوعیت کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ جن حکیم صاحب سے سرسید کی والدہ کا علاج کرایا گیا، زریا بھی اسی کے زیر علاج رہیں صحت ہو گئی تو حکیم صاحب کی تجویز پر سرسید کی والدہ کے لیے ایک قیمتی عیون تیار ہوئی۔ یہ دوا صرف ایک مریض کے لائق تھی۔

سرسید کہتے ہیں: ”میں اس زینے میں دلی پی منصف تھا۔ میں دوا تیار کر کے لے گیا اور کہا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے، اس کو استعمال کر دیجئے۔ انھوں نے دوا لے لی اور اس خیال سے کہ وہ عیون زریا کے لیے بھی ایسی ہی مفید ہوگی جیسی مجھ کو ہے، ان کو یقین نہ تھا کہ زریا کے لیے بھی ایسی عیون تیار کر دی جائے گی اس لیے خود انھوں نے وہ عیون نہیں کھائی اور خیر خفیہ زریا کو کھلا دی۔ اس عیون سے زریا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی۔ چند روز بعد میں نے ان سے کہا کہ اس عیون سے آپ کو بہت فائدہ ہوا۔ ہنسیں اور کہا وہ تمھارے نزدیک بغیر دوا و اضافت نہیں دیتا، میں متعجب ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ عیون ان کے عیون زریا نے کھائی اور خفیہ نے دونوں کو صحت عطا کی۔ ایک کو بہت جلد دوا، ایک کو محض اپنے فضل پر کم ہے۔“

الاس کی رسی چمک کر چلنے لگا۔ طاہر بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنا بدن چادر سے چھپا رکھا تھا۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا چاندنی دھندلی دھندلی اور پہلی پہلی تھی۔ طاہر بہت خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ وہ سبھی نفسوں سے ادھر ادھر بھجتی ہوئی مل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر کانپ اٹھتی۔ کسی قریب کی گلی میں ایک کتا زور زور سے جھونکنے لگا۔ اس کی آواز سن کر طاہر ایسی ہراس ہوئی کہ گرتے گرتے بجی۔ لالی نے جھٹ اس کا بازو پکڑ کر اسے سنبھال لیا اور تھک کر ٹک گیا۔ دونوں گھر سے گک جھگ سو قدم کے فاصلے پر گئے اور ایک درخت کے نیچے ادھیر میں کھڑے تھے۔ طاہر آہستہ آہستہ ٹانپ رہی تھی۔ لالی کراں پترس آگیا۔ کہنے لگا: تم فلاں چل جاؤ۔ زبان کی تم جس قدر ڈوٹ ہو۔ دل کی اتنی ہی بزدل اور ڈر لوگ ہو، بالکل بھچھو بزدل کی طرح آہٹ ہوئی اور چرچر کرتی بھاگی۔ طاہر نے اس کی بالوں کا بالکل براہ مانا۔ سکر کر لولی۔ یہ خفا را بہت بہت شکریہ نہ بہت اچھے آدمی ہوئے

لالی نے اس کی جانب ذرا سا جھک کر دھیر سے کہا: میں بالکل اچھا آدمی نہیں ہوں۔ میں تم بہت اچھی ہو۔ نہ شادی ہوئی، نہ فیاد اور بیچ میں میرے لیے بچ لے آئیں اور دوسروں پر نفرت۔“

زینے کی دھمکی دی، تب گیا۔ یہ کہ کراں اس نے بغل میں دبے ہوئے پرٹ لالی کو سے دیے۔ وہ ایک لالچی بھی لانی تھی، وہ بھی دے دی۔

لالی نے ساری چیزیں لے کر کمات اب اندر جا کر تھوڑی دیر انتظار کروا۔ اتنی دیر میں رکھلا لگاؤں سے دوڑ چلا جائے گا۔ جلدی نہ کرنا، ورنہ سارا کام گن بڑ ہو جائے گا۔ سمجھ گئیں؟ اب ہم جاؤ۔“

طاہر کے جانے ہی لالی نے جھٹ پرٹ کپڑے تبدیل کیے۔ اپنی پتلون اور قمیص تنہا کر کے بغل میں دبالی پھر کچھ سوچ کر اس نے وہ جوتی بھی کپڑوں کے اندر رکھ لی جو ماسٹر جی نے عام استعمال کے لیے دی تھی۔ لالی نے گھڑی دیکھی ماڑھے دس بج رہے تھے۔

طاہر دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس نے لالی کو دیکھا اور حیرت سے بولی: ”اے! تم تو بالکل جاہنگی لگ رہے ہو۔ یہ کہ اس نے لالی کو دوڑے کے ٹوٹ دیے۔ کتنے گلی ٹوڑے رکھ لو تمہیں غزوت پڑے گی۔“ لالی نے رپے لے کر دھوکے کے ڈب میں رکھ لیے۔ طاہر ذرا دیر خاموش کھڑی رہی پھر اس نے چادر کے اندر سے چڑے کی چادر گول گول شیلیاں سی نکال کر لالی کو دیں۔ یہ کھتے ہیں۔ ماں جی نے کہا ہے، انھیں جھینس کے چادر میں پیدیں میں پھانسا نا۔ اگر کبھی جھینس کا مارا لگائے نکلین تو کھڑوں کے نشان پہچان نہیں سیکیں۔ سمجھ گئے؟“

”بالکل سمجھ گیا۔ لالی نے کسی قدر حیرت سے کہا: ”اچھا تو پانے ماسٹر جی رساگری کا دھندا بھی کرتے ہیں؟“

طاہر نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کمات اب جاؤں تمھارا ساتھ نہیں جاؤں گی جھینس سامنے درختوں کے نیچے کھڑی ہے اے لے جاؤ۔“

لالی آؤ گیا۔ نہیں، تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے ہر آدمے میں کھلنے والا دروازہ کھولا اور طاہر کو غافل کر کے بولا: چلو آگے بڑھو۔ چلے رہے ہو، وہی ہوگا۔ اس نے ذرا توقف کیا پھر کسی قدر تھکے لیے میں کمات تمہیں جھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔ ایسا ارادہ تمنا تو یہاں سے جاتا ہی کیوں۔ طاہر نے گھر کو دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کی اوٹ میں اس کی ماں کھڑی تھی۔ لالی نے طاہر کو خاموشی سے پکار کر کمات خاماں کا نچرا نہ کر دے۔ طاہر نے مڑ کر لالی کو دیکھا۔ وہ بے رحمی سے بولا: آگے بڑھو۔ میرا تمہیں ایک کام رہی ہو۔“

طاہر جھمکتی ہوئی آگے بڑھی اور لالی کے ساتھ بیٹھک سے باہر نکلی جھینس درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ لالی نے اسے دودھ ہی سے پہچان لیا۔ وہ بھوری جھینس تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ جھینس کے چادر کھڑوں میں چڑے کے کتے چڑھا دیے، رسی کھولی اور جھینس کو آگے بڑھانے کے لیے دھیرے دھیرے تھت تھت کی آواز نکالی۔ جھینس آگے بڑھی۔ سب گنگ

تھاواں والاں کے قریب آگئیں میں چار پائی پر سوار ہی تھی مگر کچھ دواڑ
بند تھا۔ لالی نے قریب جا کر دھیرے سے شاواں کا کندھا جھنجھوڑا۔ وہ
بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور دھڑکی بیٹھی آنکھوں سے آسے دیکھنے ہوئے بل۔
”اسے تو رہے تو تو راکھ جٹ لگ رہا ہے۔ میں تو ڈر گئی تھی“
کون آگیا پر تو آگیا کس؟ ”وہ گھبراہٹ ہوئی نظر آ رہی تھی۔

لالی نے مسکرا کر کہا۔ ڈوست میں مجھے آدھلائے نہیں آیا ہوں
”اُس نے ذرا توقف کیا۔ یہ بتا تیری بوری کا کیا بنا؟“
”مرگئی، ملک نے اسے مار ڈالا“ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی، ذرا دیر
فاکھوش رہی پھر شعل کی طرح بھوک اٹھی، غصے سے ہونٹ دانوں
کے نیچے دوڑا کر کھٹے گئی میں ملک کا خون لپی نہ لی۔ اُس کی بوٹیاں
چھاواں ڈالیں گی“

لالی سر کر کر بولا۔ بوری کو ملک نے نہیں میں نے مارا ہے۔ لے پیری
بڑیاں لوچ کر چب“

شاواں جھجھلائے ہوئے انداز میں بولی تو لالی! تو یہاں سے چلا جا۔
مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا“ اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میں نے بوری کی
خاطر ملے گا گلکا دیا“

لالی نے جھٹ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہستہ سے پوچھا
”تا جی تو کمرے میں نہیں ہے؟“

”نہیں شاواں نے کہا وہ آج سویرے بھجے لو کر اپنے گھر
چلی گئی“

لالی نے شاواں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا میرے ساتھ آؤ
شاواں ہاتھ چڑانے ہوئے بڑا رے بولی تو لالی مجھے نہ سنا۔
میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے کھو یا توڑی ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے
اپنا بدن لوچ ڈالوں“

انکار کے باوجود لالی نے کھینچا ہوا آگئیں کے دوسرے سرے
پر لے گیا مگر جب وہ دروازے کی جانب بڑھا تو شاواں نے جھٹکا
دے کر اپنا ہاتھ پھیرا لیا اور آنکھیں نکال کر بولی کہ کیا چاہتا ہے تو؟ میں
تیرے سنگ نہیں جاؤں گی“

”پاکل نہ بن۔ لالی نے مسکرا کر کہا۔ تیری مرضی کے بغیر تجھے کوئی
اپنے نگ نہیں لے جا سکتا۔ بات تو سچی جانتی ہے۔ پھر کہیں ڈونتی
ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر دروازے کی کندھی کھول دی تو دروازے
تک توڑا جا رہی تو تیرے ہی گھر کی دیوچ ہے۔“

شاواں آہستہ آہستہ دروازے تک چلی گئی۔ لالی نے دروازہ
کھولا، باہر گیا اور بھینس کے ساتھ گھر میں داخل ہوا شاواں حیرت سے
آنکھیں پھاڑ کر بولی تھانے! یہ عجیب تو کہاں سے لے آیا؟

سب بنگ

طاہر نے کوئی جواب نہیں دیا صرف مسکرا کر رہ گئی۔ وہ واپس چلنے کیلئے
مڑی تو لالی نے اسے ٹوکا اور اس کے سر پر ہٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
”پہنچے پہنچے کا نا لال رکھنا“

”لالی! وہ حیرت سے بولی یہ کیا نام ہوا؟“

”میرا بھی لالی ہے۔ لالی نے کہا۔ میں بھی اپنی ماں کے پیٹ
میں بائیں طرف آ یا تھا۔ معلوم نہیں میرا باپ کون تھا میری ماں کی
شادی کے بعد جو میرا باپ بنا، وہ مجھے ہمیشہ حرامی کہتا۔ ماں کو گا لیاں
دیتا اور گھر سے مار کر باہر نکال دیتا۔ مجھے اُس سے ملنے نہ دیتا۔ وہ ایک
لٹے رک رک کر لولا۔ میرے ساتھ تھا اور دیا ہوا مائتا تو میں تھارے نیچے کر
کبھی حرامی نہ کہتا، تمہیں مار کر کبھی گھر سے نہ نکالتا۔ پھر میرے ہاتھ میں تو
شادی کی کیر رہی نہیں ہے۔“

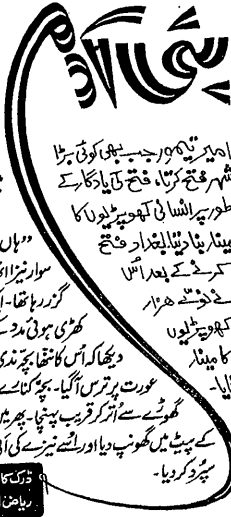
طاہر نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا اور واپس چلنے کا ارادہ بدل دیا۔
”میں تھارے ساتھ چلوں گی تمہیں گاؤں کے مخمڑ پر جا کر خدمت کروں گی۔“

لالی نے مسکرا کر کہا۔ اتنی جلدی جلدی فیصلے نہ دلا کر۔ ایک
گڑھے سے نکل کر تودہ سرے میں گر جاؤ گی“ معانات کے ساتھ میں
قدوس کی آہٹ آجھری۔ لالی نے ہر لے سے طاہر کو دھکا دیا۔ مابا
کوئی آ رہا ہے۔ جلدی کو“ طاہر تیز تر قدم اٹھاتی اپنے گھر کی جانب
چلی۔ اُسے والا درواہ نہیں آیا کسی اور سمت چلا گیا۔ لالی اندر سے
کھڑا نظر ہی اٹھائے طاہر کو اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ
گھر کے اندر نہ چل گئی۔

لالی بھینس کو آہستہ آہستہ ہٹکانا ہوا گاؤں سے نکلا اور ملک پر
آگیا۔ ملک بائیں سنان تھی۔ وہ بھی مرکز سے اتر کر کچے میں آگیا، ابھی
مرک پر چلتا بھینس بھی سیدھی تھی۔ اُس نے راستے میں لالی کو پریشان
نہیں کیا مگر راستے آسے ایک ہی بار لاٹھی استعمال کرنے کی ضرورت
پیش آئی، وہ بھی اُس وقت جب نہر کا پل عبور کرتے ہوئے کتوں کا
ایک غول کھینڈوں سے ٹکل کر زور زور سے جھونکنے لگا۔ بھینس بدکلی مگر
لالی نے اسے لاٹھی سے تالیاں کر لیا۔

مرک ختم ہوئی تو وہ بھینس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بڑبڑاں میں اتر
گیا۔ یہ دور ملک پھیلا ہوا۔ خیر اور بران میدان تھا۔ دھندل جاندی میں
اُونچی اونچی گھاٹ اور جنگل جھاڑیاں سیاہ جیتوں کے مانند نظر آ رہی تھیں۔
وہ اُن کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ وہی
راستہ تھا جس سے وہ تین روز پہلے بھی گزرا تھا۔

جب وہ جانچ کر وہیں داخل ہو کر قناداں کے گھر کے قریب پہنچا
تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اُس نے بھینس گھر کے دروازے
کریب ایک دھوت سے باندھی اور دیوار پچا نہ کر آگئیں میں اتر گیا۔



ایک دفعہ تاتاریوں کے سردار
چنگیز خاں سے کسی نے پوچھا۔
”اے خاں تاتار، تو نے زندگی
میں کبھی کسی پر رحم کیا ہے؟“

چنگیز خاں نے جواب دیا۔
”ہاں۔ ایک دن میں اپنے کھوئے پر
سوار نیزا اٹھائے ایک ندی کے قریب سے
گزر رہا تھا۔ ایک عورت ندی کے کنارے
کھڑی ہوئی مدد کے لیے پکار رہی تھی میں نے
دیکھا کہ اس کا ہاتھ پیر میں دیں لٹکیا ہوا ہے مجھے
عورت پر ترس آ گیا۔ پھر کانٹے سے زیادہ دھڑکنے لگی
کھڑکی سے اتر کر قریب پہنچا۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر نیزا اپنے
کے پیٹ میں کھوپ دیا اور اسے نیڑے کی آبی پر اٹھائے اس کی ماں کے
پیر پڑ کر دیا۔“

”ذکر کائنات کے لیے
ریاض احمد کی طرف سے“

سوچ کل سب پوچھیں گے یہ غ کیاں سے آئی، تو کیا کہے گی؟
وہ گھبر کر بولی ”اے! تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ تو کیا کیا کروں؟
” نیزا غم کھینچ کر کہے گی کہ یہ غ کیسے آئی ہے؟
وہ بڑے اعتماد سے بولی ”کہہ دے گا ضرور کہہ دے گا جو برسوں کی
دہی کہہ دے گا۔“

”وہ تجھے اتنا پیار کرتا ہے تب بھی تو اس کے پاس نہیں جاتی۔
تو اس سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟“
شادان بتانے لگی ”تو جانتا نہیں مجھے وہ کیوں اچھا نہیں لگتا۔
مجھے وہ کبھی اچھا نہیں لگا۔ وہ خیالوں میں کھوئی۔ دوا در فاکشس رہ
کر بولی ”میری ماں مرگئی تھی سو تیل ماں تھی۔ وہ مجھے بہت تنگ کرتی
تھی لڑتی تھی کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ تنگی تنگی کالا نکالتی تھی۔ میں
چھوٹی سی تھی تو اس نے خیر دین سے ہر بیاہ کر دیا میرے گھر دلے کا نام
خیر دین ہے۔ تو نے اسے نہیں دیکھا۔ بالکل ادھکڑا ہے۔ آدھے سے زیادہ تو
اُس کی داڑھی اور سر کے بال چٹے ہیں۔ ہائے ایسی خراب شکل ہے
اُس کی تجھے کیا بتاؤں۔ یہ لمبا مزداد باہر نکلے ہوئے ہے بڑے بڑے
دانت۔ بالکل دند ر کہے۔ غصہ ڈاڑھے آتا ہی نہیں کبھی لڑائی جھگڑا
نہیں کرتا۔ کوئی اٹھ دیکھائے تو مجھ پر ڈھکڑا ہوتا ہے سب
کہتے ہیں۔ ہائے! خیر دین کتنا یک ہے کتنا بھلا ہے۔ فرشتہ ہے
فرشتہ۔ شادان ہی بڑی ہے۔“ وہ غصے سے ایک دم پھر گئی۔ ایسا ہی بھلا
ہے تو اس فرشتے سے اپنی بیٹی، اپنی بن کیوں نہیں بیاہ دی؟ شادان
کیوں اُس کے گلے میں ڈھول بنا کر ڈال دی۔ ماں نے اُس سے

لال نے دروازہ بند کیا اور نہس کر بولا ”اچھی طرح دیکھ لے تیری
سے اور دھری بھی ہے۔ پکا اٹھا سیر وودھ دیتی ہے۔ نیلی بارہی
کی کھولی ہے۔ اب نہس نہس۔ تیری لہری داپس آگئی۔“
شادان نے بھیٹیں کی گردن اور بیٹھ پر ہاتھ پھیرا سکر کر لہری لگتی
تو یہی ہی ہے۔ پھر اس کی خوشخبری سنانے سے بولی ”اٹھا رہی سیر
وودھ دیتی ہے نا۔“

لالی جھک کر بولا ”بیٹھ جا، غصوں کے نیچے۔ وہ کہہ دیکھ لے۔“
”اس وقت؟“ وہ بولی ”تیرا غم تو نہیں پھر گیا، اچھا ہے بتا کہاں
سے لایا؟“ اُس کی نظر جھینس کے کھڑوں پر پڑی، پوچھنے لگی ”پوری کج
تو نہیں لایا؟ اس کے کھترے میں کتے کیوں بڑے ہیں؟“
”اے! لیے کہ کھوجی اس کی تریڈ۔ وہ لگا سکتے۔ وہ نہایت ڈھمائی
سے بولا ”دیسے۔ تجھے ڈر ہے۔ گھر وال تو نہیں ملے اس کی بجھے
ضرورت بھی نہیں تھی۔“

”ٹھیک ٹھیک بتا؟“
”میں نے کبھی تجھے سے جھوٹ بولا ہے۔ لالی نے اسے بتایا۔ اسے
لانا تو گھر والے گلے پڑ جاتی تھی تو ابھی تو بھئی کیا بتاؤں۔ لاہور کے
کاغذ میں پڑھتی ہے پردہ گھنٹ ہے۔ اُس کے پیٹ میں بچہ ہے۔“
”تیری باتیں اپنے پلے نہیں پڑتیں۔ وہ بیزاری سے بولی ”صاف
صاف بات کر۔“

”امینان سے تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ لالی نے کہا۔ پہلے یہ بتا۔“
اُس روز میرے جانے کے بعد کہا ہوا؟

شادان بتانے لگی ”تیرے جانے ہی ملک اپنے ہماشوں کو لے
کر آ گیا، مجھے زبردستی بچہ کر اپنی ہوئی لے گیا۔ بڑا لال پیلا ہوا بہت کھڑا۔
مارنے کو بار بار اٹھا۔ مجھے دھکی دیا کہ یہ بات کسی سے نہ کہوں کہ تو میری
اُس کی گولی گھٹے سے مر گئی۔ ہر پٹا میں یہ بات سب کو معلوم ہے۔ وہ
اپنی بات کہتے کہتے دم بھر کوئی کہ تو میری کو اس کے کئی اور کو کو اس وقت
پر بڑھے میں ڈال کر لے گئے تصانی کو دے دیا ہو گا کسی کو بے شرط
میں دودھ ڈال دیا ہو گا۔ اُس نے گری سانس بھری۔ تنگ مجھے سوڑے
دیتا تھا۔ میں نے اُن پر تھوک دیا خالی ہاتھ گھلی آئی۔“

لال نے کہا ”اچھا یہ کیا تو نے پراس نے پراس میں شلیس تو
نہیں بکلا؟“

”نہیں۔ تیری کے مرنے سے وہ ڈر گیا۔ شادان نے کہا ”پر اپنی
بندوق کے بالے میں بار بار پوچھتا تھا۔ تو نے اُس کا کیا کیا؟“
”اُدھر پٹیل کی ایک جھاڑی میں چپک گیا۔ لالی نے بے نیازی
سے کہا اور چند لمحے حکم فاکشس کھڑا ہوا پھر آہستہ سے بولا ”اب یہ
سنگ

چپکے سے تین سو روپے بھر لے لیے تھے۔ ہائے کہنے سنستے دامن بیچ دیا جھٹھے۔

وہ جانے اور کیا کیا کستی نگر لالی نے اسے روک دیا۔ تو اپنی ہی کہہ جانے گی یا دوسرے کی بھی سنے گی؟
”کہہ لیا کہتا ہے؟“

وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”یرکما مان بکل سویرے ہی سویرے اپنے خیم کے پاس چلی جاؤ جو سکے تو اسے اور بچل کو چند روز کے لیے یہاں لے آ۔“
”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ ثناء داں نے صاف انکار کر دیا۔ ایک بار اس کے گھر سے چل آئی اب اس کی دلچسپی تدم نہیں رکھوں گی۔ اس نے پہلے بھی بڑی دشمنیں کیں پر میں نہیں گئی۔ اب کیسے جا سکتی ہوں۔“
”نہ جال لالی مل کر بولا۔ چوٹی جانے گی؟“

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ ”تو کیا سچ بی بیج چوری کی ہے؟“
”ہاں کی طرف سے چوری کی ہے ماں اور بیٹی کی طرف سے وی بیج میں ملی ہے۔ یہ دوسو روپے بھی ملے ہیں۔“ لالی نے دھوتی کے ڈب سے روپے نکالے اور ثناء داں کو اسے کر بولا۔ ”لے لے کر رکھ لے ماں لے لے پولیس کوئی چکر شکر چلائے تو کچھ فے دلا کر معاملہ بادینا اور ویج کل ضرور خیر دین کے پاس جانا۔“ دنگو بیچھے اپنے بڑے بڑے دانوں سے کاٹ تو نہیں کھائے گا۔ وہ بچے بھی بیچھے بھول کا شمار ہے۔ چند روز اور کاٹ لے گا تو تیر کا تیر کا بچھ جائے گا۔ پھر لالی نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ ضد نہ کر، یرکما مان درنگ نہ آئی جی مجھ ماتھ سے جانے گی اور تو بھی پیچھے نہیں بڑھ جائے گی بولی کیا کستی ہے؟“

”تو کتنا ہے تو ملی جاؤں گی۔“ ثناء داں نے کہا۔ ”سویرے ہی سویرے چلی جاؤں گی۔“

لالی نے کہا۔ یہ بتاؤ دڑی سے کپڑے لے آئی؟
”نہیں۔“ ثناء داں نے کہا۔ ”دڑی سے بیٹھو ڈر کر شہر چلا گیا اس نے فلاں توقف کیا۔ بڑا دن بل کل شام تک ٹھیر گیا میں ضرور تیرے لیے کپڑے سلا کر لے آؤں گی۔“

”اب مجھے ان کی ضرورت بھی نہیں۔“ لالی نے کہا۔ ”اب میں چلا گیا۔“ ابھی رات باقی ہے۔ اندھیرے میں کل جاؤں گا۔ دیکھ سویرے دڑی کے لیے چٹا دھنسا کر کے ابھی طرح چارہ پائے کی خیر دین کے پاس چلی جانا۔

”تجھے سے کہہ تو دیا ملی جاؤں گی ضرور ملی جاؤں گی۔“ ثناء داں نے جھینس کی رتی چوڑی اور لالی کو روک کر بولی۔ ”ٹھیر جا۔“ دڑی کو باندھ لوں۔ تو اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔“
لالی مسکرا کر بولا۔ ”آج نہیں۔ اب تو میرے ساتھ اس روز چلے گی

جس روز میں تیرا ادھلا کر اس گنڈھے جھگا کر لے جاؤں گا۔ تیار رہنا۔“
”بھوس کر۔“ ثناء داں مزہ کھا کر بولی۔ ”تو تو اڑل مٹو ہے۔“

لالی کھل کر مسکرائی۔ دیکھ آنا تو ہوا کچھ سے تو نے مجھے اڑل مٹو بنا دیا۔ بیٹی بیٹی میٹھی میٹھی آؤ ہی ہے۔ یہ کہنا ہوا وہ آگے بڑھا اور دھارہ کھول کر باہر چلا گیا۔

گاؤں ابھی تک سو رہا تھا۔ ہر طرف دہرائی چھائی ہوئی تھی لالی نے لاشی کندھے پر رکھی کپڑوں کی گھڑی اس کے سر سے پر لٹکا لی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر وہ ایک موڑ پر ہوا تو ایک شخص کو کانٹا اپنے سامنے پایا۔ لالی خوف زدہ ہو کر ٹھٹھا مٹو وہ شخص اس سے کچھ نہ بولا۔ آگے بڑھا اور ایک مکان کی دیوار کے نیچے بیٹھ کر اطمینان سے پیشاب کرنے لگا۔ لالی نے آگے بڑھتے ہوئے کئی بار پلٹ کر بیچھے کیسیک کسی کو نہ پایا۔

وہ گاؤں کے سامنے کاٹڑ عبور کر کے اس راستے کی جانب بڑھا جو دیل کی پٹری کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے وہ پہلے بھی جاتا ہے۔ آج کا تھا اور اب اس سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ جملہ سے جملہ زیم داد کے پاس پہنچ جانا جانتا تھا۔ زیم داد نے اسے پار ٹیلوں کے درمیان چھپا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لالی اپنے وعدے کے خلاف تاخیر سے کوٹ رہا تھا مگر مطمئن تھا کہ وہ زیم داد کے لیے کپڑے لائے ہیں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ زیم داد کو جیل کی دڑی سے چھٹکارا اور لالائی پور کی جانب بکل سکتا تھا۔

لالی اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ابھی اسے دس بارہ میل طے کرنے تھے۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹہ گئے تھے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی مگر وہ گاؤں سے کوئی دو ڈھائی فلاں گاگے گیا تھا کہ ایک موڑ پر قریب سے آواز آئی۔

”چودھری! تیرے پاس ماچس تو ہو گی؟“
لالی سنی اس کی آواز کے آگے بھل جانا چاہتا تھا لیکن اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک آدمی اندھیرے سے نکل کر یہاں ہوا اس کی جانب بڑھا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ وہ سامنے پر

سوار تھا۔ لالی نے دھندلی دھندلی چاندنی میں فوراً اٹھنا چاہا لیکن یہ سادہ لباس میں پولیس کا کانسٹیبل ہے۔ وہ لمبے قد کا ڈھلا ہوا آدمی تھا۔ دھلتی عمر کے باعث اس کی گرد زاسی جھک گئی تھی۔ لالی نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں سگرت ٹکرت نہیں پیتا۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا لیکن کانسٹیبل نے اسے جانے نہیں دیا، بیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”چودھری! بات تو سن۔“

نیا پولی کلر بہتر فارمولے کے ساتھ
اب انٹرنیشنل پیک میں دستیاب ہے



بال ہر ایک کے لئے قدرتی حُن کا عطیہ ہے۔ ان کے قدرتی حُن کو برقرار رکھنے کے لئے
پولی کلر ہیئر ڈائی اور کلرنگ ہیئر شیپو استعمال کیجئے۔ پولی کلر میں کیڑا بین شامل ہے۔
جو سالہا سال کی جرمین سائنسی تحقیقات کا ماحصل ہے۔ کیڑا بین کنڈیشنر
بالوں کی جڑوں میں داخل ہو کر ان کی نشوونما کرتا ہے۔
دنیا بھر میں معیاری پولی کلر مقبول عام ہے۔

**POLY
COLOR**

GERMANY

این۔ جے۔ مینیف ایسٹریکپی کراچی

پاس اب صرف دہل گاڑی کا کاریہ رو گیا ہے۔ وہ میں تجھے نہیں دے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے ذرا توقف کیا اور نیچے لہجے میں بولا ساتھ ہی یہ بھی سن لے۔ ہیلر سستہ روکا تو ہمیں لٹا دوں گا۔

لالی نے جھپٹ کر اس کی گردن دو بچ ل اور ہلکا سا جھکا کر کرناٹھ کاٹنے کا نوادھسٹر عسکر کا ڈبلا پت لاکا نشیمل نہیں نہیں کہنے لگا۔ تیری گردن تو چھوڑے۔ میں نے کب تیرا ستر دکھا لالی نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن سسلانے سے لڑائی تیرے ہاتھ تو لوہے کے لگتے ہیں۔ تو نے تو میری گردن ہی توڑ دی تھی۔ وہ ذرا سا زکاٹ جائے گا کہاں اس وقت؟

”بیکار کی ٹرڈوکر“

کانٹینیل نوعی سے بولا نراض نہ ہو۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ پولیس کی ایک پاڈی ذرا دیر پہلے اور سترے گزری ہے سب کے سب سبج ہیں۔ صوبے دار بھی اُن کے ساتھ ہے۔

”راؤنڈ پر نکلے ہیں؟“ لالی نے دریافت کیا۔ اُس کے لیے سے نشوونید جھلک رہی تھی۔

”ہیں۔“ کانٹینیل ابھی تک ڈک ڈک کر اپنی گردن، سسلانہ تھا ”پرسوں رات پوسٹ والا رابطے کراننگ پزیر دست ڈاکا ڈار ڈاکوں نے میں لوٹ ل گئی تھی چلائی۔ ایک زخمی اسپتال میں ملے راتے ہیں میں جل با جب سے یہ واردات ہوئی ہے پولیس ہر طرف جھانک دوڑ کر تھی چہرے ہی۔ ویسے میں تو اس وقت اپنے جانی کے گاؤں جا رہا تھا، وہ سخت بیمار ہے۔ اُس نے ذرا سا توقف کیا۔ غبروں نے بتایا ہے ڈاکو اسی علاقے میں پھپھے بیٹھے ہیں۔“

لالی نے پوچھا۔ ”صوبے دار کدھر گیا ہے؟“

کانٹینیل نے شمال کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ پوری پاڈی اچھر گئی ہے۔ لالی کو بھی اسی طرف جانا تھا۔ وہ لہجہ میں پڑ گیا۔ اُسے کوئی دوسرا سستہ معلوم نہیں تھا۔ کانٹینیل اُسے خوش دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”تجھے کدھر جانا ہے؟“

لالی نے آہستہ سے کہا۔ ”میرا پولیس پاڈی گئی ہے۔“

”پوٹو تو تیشن جائے گا؟“

”ہاں۔“ لالی نے انکار میں کیا حالانکہ اُسے ایشن ہرگز نہیں جانا تھا مگر وہ ضرور جانا تھا کہ فاداد باڈا ایشن کے قریب پہنچ کر اسے لینے ٹھکانے پر پہنچے گا۔ راستہ مل جائے گا۔

کانٹینیل کہنے لگا۔ ”میری مان تراس طرف سے نکل جائے اُس نے اُس راستے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف انشاؤ کیا۔ یہ رستہ چھڑنا بھی ہے اور تیرے لیے ٹھیک بھی ہے۔ گا۔ ایسا کر سیدھا سیدھا چلا جائے گا۔“



”ہمارا قدیم گاہک“

لالی بیٹھ گیا مگر خاموش رہا۔ کانٹینیل نے سائل ایک طرف کھڑکی اور جھک کر اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ایسا لگتا ہے تجھے کہیں دیکھا ہے کہاں دیکھا ہے؟ وہ سوچنے کے انداز میں لالی کو مشتتبہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

لالی نے جھٹکنا تھا۔ ایسے ہی شبہ ہوا ہے۔ میں تو اس پنڈ میں پہلی بار آیا تھا۔ یہ کہہ کر اُس نے چاکا کر بڑھ کر آگے نکل جائے۔ لیکن کانٹینیل نے اُس کا بازو تھام کر روک لیا۔ بات تو سن۔ وہ لمبے بھر کے لیے رکھا پھر اُس نے پوچھا۔ تو لالی نہیں ہے؟ ”ہیں۔“ لالی نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے کانٹینیل کو کبھی شہد ہوا ہے۔

”میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔“ کانٹینیل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ تو لالی ہی ہے پچھلے دنوں میں سے نکل کر بھاگا ہے۔ لالی نے کہا۔ ”تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں لالی ہوں؟“ اُس نے تیوری پر بل ڈال کر خفا ہو کر اُسے دیکھا۔ خالی پہلی اپنی تھانے داری جملے کھڑا ہو گیا۔

”میں نے کل ہی تھانے میں تیری تصویر دیکھی ہے۔ تو لالی ہی ہے۔“ کانٹینیل نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ تو میری نظروں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ تیس سال ہوتے پوئیں کی گوری کرنے۔ ایک سے ایک اونچا بچم دیکھا ہے اور ایک ہی نظریں پہچان لیا ہے۔ لالی نے اُس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب چاب دس روپے کا ایک نوٹ دھونی کے ڈب سے نکال کر کانٹینیل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے رکھ لے۔ یہ تو میری پتوں کو میلے کی سیر کر دینا۔“ کانٹینیل نے دس روپے کا نوٹ تو لے لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

”تیرے لیے تو وہ ہزار کا انعام رکھا گیا ہے۔ تیرا دوسرا ساتھی کہاں؟“ لالی نے ایک نوٹ اور نکالا اور کانٹینیل کو دے کر بولا۔ میرے

”تلاش میں ہے۔ دو ہزار کا انعام میری گرفتاری پر رکھا گیا ہے“

”دو ہزار کا انعام؟“ دوسرے نے حیرت سے کہا۔ اُسے پھر پوچھا یہ تو کوئی اونچی چیز معلوم ہوتا ہے۔“

پھینو نے لالی کے بازو کا گوشت ٹٹولا اور اُس کی چونچھ مڑو کر اونچی کی چھرسو کر لولا۔ لگتا جان دار ہے۔“

لالی نے عاجزی سے کہا: یار! میری کمزور چھوڑے میں جگا نہیں جاد ہا ہوں۔“

پھینو نے اونچی آواز سے کہا: دالم! چھوڑے بسے، دالم نے لالی کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

لالی کہنے لگا: جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ ابھی اندھرا ہے، میں نشین نکل جاؤں گا۔“

مگر انھوں نے لالی کو جانے نہیں دیا، اسے اپنے نرغے میں لے کر ایک طرف چل دیے۔ انھوں نے خشک برساتی مالہ عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ کر کھینے دھنوں کے ایک بھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

قریب جا کر لالی نے دیکھا، وہاں بھی دو ڈالو موجود تھے۔ ان میں سے ایک مٹی کے ٹوٹے پر درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کے پاس دسی ساخت کی کاربین رکھی تھی۔ اپنی آن بان سے وہ اُن کا غنہ لگتا تھا۔ اُس نے لالی کو دیکھ کر دودھ سے بوجھتا ہوا کہ ہے یہ؟“

پھینو نے جواب دیا: ٹھیک سے پتہ نہیں کہتا ہے، چل سے نکل کے بھاگے۔“

دالم بولا: یہ بھی کہتا ہے کہ اس کی گرفتاری پر دو ہزار کا انعام ہے۔ مرغز نے لالی کو اوپر سے نیچے ٹھک مگر فورے دیکھا نہ سنا تو میں نے بھی ہے کہ پچھلے دنوں وہ قیدی جیل سے نکل بھاگے ہیں۔ اُس نے لالی کو مخاطب کر کے پوچھا: جیل کس پتھر میں کیا تھا؟ اُس نے ذرا توقف کیا: قتل کیا تھا؟“

لالی نے جواب دیا: نہیں۔“

”دیکھتے کی تھی؟“

”نہیں۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

وہ بھنگا کر بولا: پھر جیل کیوں ہوئی تھی؟ کوئی چھو کری دوکری بھگا کی تھی؟“

”نہیں جی میں ایسا کام نہیں کرتا۔“ لالی نے اُسے سے کہا: سا نکل چڑا کی تھی۔“

”اُسے چٹو! اتنی بڑی توپ چلائی تو نہ۔“ وہ کھل کھلا کے ہنس پڑا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: لو سن لو اس نبولے کے جیل سے جھانکے پر دو ہزار کا انعام رکھا ہے۔ پھر بس کی مت مادی گئی پتہ۔“

پھر اُس نے ڈانٹ کر لالی سے کہا: اُسے نبولے! اور ہر ایک کو سب لالی اُس کے پاس جھانکا۔ وہ شخص اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کر کے بولا: لے ذرا میری ٹانگیں دیا۔ لالی خاموشی سے اُس کے نزدیک بیٹھ کر ٹانگیں دہانے لگا۔ وہ شخص ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا پھر دالم کو مخاطب کر کے بولا: رشید بھلا ابھی تک نہیں لوٹا؟“

دالم نے جواب دیا: اب تو جی مشکل ہی جان پڑتا ہے اُجالا ہو گیا ہے۔ تمام کو اسے گا وہ۔“

مرغز اونچی آواز سے گرج کر کہنے لگا: تم سبھی یہاں چلے آئے۔ چاروں طرف پورے پھیلے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہو۔ جاؤ، جاکر پوشیداری سے ادھر ادھر دیکھتے رہو۔ خطرہ ہو تو فوراً سیٹی مارو۔ پھر وہ پاس کھڑے ہوئے ڈاکو سے مخاطب ہوا: فکر ہے، تو بھی جاکسی اونچے درخت پر چڑھ کر دو دو ایک نظر ڈال لینا۔“

وہ سب چلے گئے صرف لالی رہ گیا۔ وہ گردن جھکا کر غنہ کے پر دیا مارا۔ ذرا دیر بعد مرغز نے لالی سے کہا: اُسے نبولے!“

اس دفعہ لالی جھک اٹھا، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: دیکھو جی! مجھے فیلا شیلا لست کوٹ ڈاکو نے جھٹ کا زمین پر پتھر رکھا۔“

وہ تندی پر لالی ڈال کر پتھر کیا کیا؟“

لالی مرعوب نہیں ہوا۔ گردن اونچی کر کے بولا: میرا نام لالی ہے، نبولا نہیں۔“

”چل لالی ہی سہی۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور کاربین پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرنے بیٹھ بولا: یہ جی جان لے! میرا نام دا محمد کا کر ہے۔ چھ قتل کر چکا ہوں، پورے رات والا ساڑاں تھا تو چوڑی چکاری کرنے والا مجھے کیا جانے۔ پورے جانتی ہے مجھے بیرے سر کی بولی پانچ ہزار رکھی گئی ہے۔“

”ابھی بات نہیں ہے کہ کر کہ میں تجھے نہیں جانتا۔“ لالی اُس کے ہر زبانے ہونے بولا: مجھے کون نہیں جانتا مگر مجھے گلہ ہے کہ پورے تو مجھے جانتی ہے، تو نہیں جانتا جانتا ہوتا تو میرا رستہ نہ روکنا۔ مجھ سے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں۔“

کا کر ہنس کر بولا: اب تو اچھا بھی پھیل گیا۔ اس وقت نکل کے کہاں جائے گا؟“ اُس نے لالی کو تکبھی نظروں سے دیکھا: ٹوٹے تو اچھا ٹھکانا بھی دیکھ لیا۔ ابھی تجھے نہیں جانے دوں گا۔ میں دین کا لے۔ رات کو اپنے ساتھ نکل چلا کر رشید بھلا آجاتا تو میں آج ہی نکل جاتا مجھے کسی کا انتظار ہے۔ تمام تک ابھی جانے گا۔“

لالی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا خاموشی سے کا کر کے پر دیا مارا۔ ذرا دیر بعد کا کر درخت سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ لے ذرا سب بنگ

”سرف یقیناً باکفایت ہے!“

میں بارہ چائے کے چمچ سرف سے ملے جُلے پنڈرہ کپڑے دھو لیتی ہوں۔
اگر آپ بھی ڈبے پھپھی ہوئی ہدایات پر عمل کریں تو سرف کے ایک بڑے ڈبے
سے ملے جُلے ۱۲ کپڑے دھو سکتی ہیں۔ آزما لیجئے سرف یقیناً باکفایت ہے۔“

مسوٰر ضوان کہتی ہیں



کوئی بات نہیں کی۔ چشیاں کرنے کے بعد اپنی جگہ اکڑ لیت گیا محض اسے
یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی بھرائی کی جا رہی ہے۔ اس بھرائی سے لالہ سخت
پریشان ہوا۔ رات کا مہاجا بھی اسے مشکل نظر آیا۔

اسی پریشانی میں شام ہو گئی۔ کاکڑ بیدار ہو گیا مگر اس نے بھی
لالی سے کوئی بات نہیں کی کچھ پر بیٹھا انگڑائیاں لیتا رہا پھر اس نے
غیر سے بانی مگر کر بیاہ کار بہن سنبھال اور اندھیرے میں غائب
ہو گیا۔ غیر سے جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ لالی اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
درختوں کے نیچے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد کاکڑ واپس
آیا۔ اس کے سمرہ پھر دھبی تھا۔ دونوں کیسی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ
باتیں کرنے لگے۔ وہ اس قدر آہستہ بول رہے تھے کہ لالی ٹھیک سے
کچھ نہیں سن سکا۔ البتہ ان کی باتوں سے اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ رشید
بلا اچھ تک واپس نہیں آیا ہے اور اس کے نہ آنے سے کاکڑ بہت
پریشان ہے۔

اندھیرا غروب گرا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی تھی
پھر دھوپ کا چاند فقیر سے بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ کاکڑ اکیلا بیٹھا
تھا اور سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ دھوئیں کی تیز بو
سے لالی ناگوار لگا۔ کاکڑ جس جھری سگریٹ پی رہا ہے۔ لالی اور کاکڑ
ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھے تھے مگر دونوں خاکوش
تھے۔ اسی دوران نالے کے اس پار سے ایسی آوازیں سنائی دہی میسے
کوئی اونچی آواز سے بول رہا ہو۔ کاکڑ نے سگریٹ بجادی اور فوراً اٹھ
کر کھڑا ہو گیا۔ کابلین اس کے ہاتھ میں دہی ہوئی تھی۔ زرا دیر بعد اندھیر
میں کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آیا۔ یہ دالم تھا۔ کاکڑ نے پوچھا۔
”دالم! یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟“

”رشید بٹے نے مراد دیا“

کاکڑ نے ڈانٹ کر کہا بات کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتا؟“
”پولیس نے چار دنوں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ انکسٹر
منز سے بھی پتہ لگا کر بول رہا ہے۔ کتا ہے ہتھیار ڈال دو۔ یہ کہہ کر
دالم زکا پھر گھٹے سے جھپٹا کہاں گیا وہ عرا کا تخم؟ میں نے پہلے ہی
کہا تھا؟ یہ پولیس کا خبر ہے۔ یہ کتا ہوا دالم اندھیرے میں اٹھل
سے آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ کر اس نے زور سے اس کی کہ
پر رات داسی۔ لالی بلبل کر زمین پر گر پڑا۔

وہ لالی کو اور ماتا مگر کاکڑ نے اسے روک دیا۔ یہ سننے دے دالم
اس سے بعد میں سلسلہ لیں گے، مجرورہ لالی سے مخاطب ہوا۔ دیکھ
میاں سے جلاؤ تیرے لیے فغول ایک کاکڑوں خواب کرنا پڑے گا۔
دالم بولا۔ مجھے ایک کاکڑوں خواب ہی کر لینے دو۔ میں اسے
سب بنگ

کر دے بھی دبا دے میں بہت تھک گیا ہوں۔ رات بھر لڑاؤ نظر پر رہا۔
پولیس گھات میں ہے۔ اپنے کبھی جو کس رہنا پڑتا ہے۔ وہ چند
لے آئیں بند کی چپ بیٹھا رہا پھر بولا تو لنگا تو ہی دار ہے۔ کہاں
پڑ گیا چوری چکاری میں کیا دھڑلے اس میں۔ پوچھو پچھو کیا، صرف
ایک سا کل، ملا، دوسو سے بھی کم اور سزا دوسال سے اوپر ہی ہونی
ہوگی۔ اس نے ذرا توقف کیا۔ جی چاہے تو گنگ جاپا نے ساتھ لیں
میں۔ ذمہ داری کا مزا بھی دیکھ لے۔ لومڑی سے ایک دم شیر بن جائے
گا، شیر کیسے سمجھا؟“

لالی نے آہستہ سے کہا۔ ڈاکے تو میں نے بھی ڈالے ہیں۔ راشن
ڈپو لٹا ہے، ایک پٹرول پمپ بھی لٹا ہے۔ وہ دارا کا یہ پراس
وقت مجھے رحم وادے پاس جانا ہے۔“

”کون رحم وادو؟“ کاکڑ نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
”دوبی جو میرے ساتھ چیل سے بھاگا تھا۔“
”گولی مارا ہے۔ اپنی سوچ۔“

”پریشان ہو سکتا۔ لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ میں اس سے
دفا نہیں کر سکتا۔“

کاکڑ بولا۔ میسیری مرضی لیکن جب تک اپنا ادھر پڑا ہے
تو نہیں جاسکتا، دن تو مجھے ہیں کاٹنا پڑے گا۔ رات کی رات کو
دیکھی جلتے گی۔“

ایک بار پھر خاموشی چھ گئی مگر ذرا ہی دیر بعد لالی کو اس بریگاد
سے نہایت دل گئی۔ کاکڑ بولا۔ بس کر نیندا آ رہی ہو تو میں لیٹ جسا۔
پرواز دے دو پھر کاکڑ نے اٹھنے بھی لے گا۔“

لالی چپ چاپ اٹھا اور کچھ نالے پر ایک درخت کے نیچے گھڑی
مرحلے لکھ کر لیٹ گیا۔ رات بھر کاکڑ کا جوا تھا۔ نرم نرم جھونکوں سے انھیں
خود بخود بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کو لالی بیدار ہوا۔ کاکڑ کیسی بچا ہے خبر سو رہا تھا۔
سامنے فقیرے بند قینچا لے چکس بیٹھا تھا۔ لالی ذرا دیر لیٹا رہا پھر اٹھ
کر بیٹھ گیا۔ فقیرے اس کے لیے کھانا لے آیا۔ باسی روٹی تھی اور اس کے
ساتھ صرف پیاز اور ہری مرچ تھی۔ البتہ پینے کو پانی گلاس بھر کر رکھا۔ کھانا
کھا کر لالی چھ لیٹ گیا مگر اسے نیند نہیں آئی، وہ پڑا کر وٹیں بدلتا رہا۔
نہ اس نے فقیرے سے بات کی نہ فقیرے نے اس سے۔ فقیرے چپ چاپ
بیٹھا لالی کو گھوڑتا رہا۔ دالم ایک بار آیا مگر کاکڑ کو سوتا پا کر چپ چاپ
واپس چلا گیا۔

لالی چشیاں کرنے اٹھا۔ اس نے کچھ دور آگے جانا چاہا تو فقیرے
بھی بند قینچا لے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ اس نے فقیرے سے

نہیں چھوڑوں گا۔

کاٹنے ڈانٹ کر کہا، بیکواس نہ کر اس پوری چور کو گولی مارا گاکی بات کرے اس نے ذرا سا ٹٹا کیا۔ شید بلا جانے کس چیز میں جپس گیا۔ راشن پانی اپنے پاس ختم ہو چکا ہے۔ میں جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہو گا ورنہ کل پولیس کا گھیراؤ کر سکنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بتا انیسٹر کھر ہے؟

”جر کے اس پار جھاڑیوں کے پیچھے ہے۔ والہ نے کہا۔ آواز دیں سے آ رہی ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے۔“

کاٹ کر کٹے لگانا ایسا کر فکیر سے کو میرے پاس بھیج دے تو ملنگی کے ساتھ مورچا لگا کر انیسٹر کی پانی پر فائر کھول۔ پھر سے کہہ کر دو اور دارا تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مارے گا دیں۔ دیکھ سمٹ کر رہنا۔ دودھ دھونے بچھ جانا۔ فائر ایک ساتھ کھولنا۔ ایسا لگے جیسے چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے۔

والہ کہنے لگا: اب میں چلوں؟

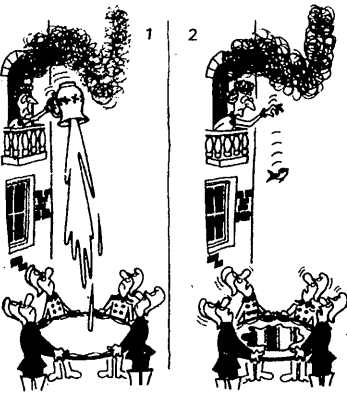
کاٹ زور سے دھاڑا۔ پوری بات تو سن زیادہ جلدی دکھائی تو مروانے کاٹو۔ اس نے ذرا سا توقف کیا پھر کہنے لگا: میں فکیر سے کے ساتھ پیچھے سے پولیس کا گھیراؤ کر سکے گی کو شش تن کوں کلہ مال پانی اپنے ساتھ لینا جاؤں گا۔ جب میری طرف فائرنگ ہوگی پڑ جائے تم چاروں نیز فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کر دینا اودا اندھا دھند گولی چلاتے ہوئے نکل جانا۔ میں نہ کی کہنا کہ پس تھا اور انتظار کروں گا۔ ہر بات پوری طرح سمجھ گیا؟

”بالکل پروانہ نہ کرو۔ پولیس سے پہلی بار مقابلہ نہیں ہے۔ پہلے بھی بہت گولی چلی ہے۔ اس دفعہ صاف نکل جائیں گے۔ کارٹوس بھی کافی ہیں۔“

کاٹ نے کہا: اب تو جا۔ فکیر سے کہہ بھیج دے۔ والہ چلا گیا۔ کاٹ کاربین سے بھال کر آہستہ آہستہ ٹھٹھلے لگا۔ لالی زمین پر چپ چاپ سما ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور کاٹ کے قریب جا کر کہنے لگا: سچ کہتا ہوں میں لالی ہی ہوں، جیل سے بھاگا ہوا قیدی۔ میں پولیس کا خیر نہیں ہوں۔ نہ جانے کیسے میرے بالے میں تھیں شبہ ہو گیا۔ تم میری بات کا یقین مان لو۔ میسی چاہو، مجھ سے قسم لے لو۔ اس کے لیے میں التجا کرتی۔

کاٹ نے نیازی سے بولا: میں کب کہہ رہا ہوں تو لالی نہیں ہے۔ پولیس کا خیر تو مجھے والہ کہتا ہے۔ پتہ نہیں، کیسے اسے تجھ پر خیر پڑے کا شبہ ہو گیا۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔

”میں تو صبح سے تمہارے سامنے ہوں کہیں کیا بھی نہیں۔“ کاٹ بولا: یہ تو کوئی بات نہ ہوئی تیرا ادھر آنا ہی تم شے



کی بات نہیں۔ تو کہتا تھا شیٹن جانا ہے۔ کن سا شیٹن؟ ادھر کوئی شیٹن نہیں ہے۔ تو نے خود ہی شبہ پیدا کیا۔

لالی عاجزی سے بولا: سچ کہتا ہوں، میں لالی ہوں جیل سے... کاٹ نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا: سن لیا، سن لیا، تو لالی ہے، جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ میں نے تیری بات سچ مان لی، اس نے ذرا سا توقف کیا تو میرا مغز نہ کھا، جو اس بند کر اور چپ چاپ بیٹھ جا۔

لالی نے اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا۔ خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا، ذرا ہی دیر بعد فیکر سے آ گیا۔ اس کے پیچھے ہی کاٹ درخت کے تنے کے پاس اندھیرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ماتھے پر ایک گھڑی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھ کر غصے سے کہنے لگا: پھر باندھی ہوئی ہے۔ اس نے اس کے پیچھے سے لالی سے کہا: ادھر آ۔ تو میرے ساتھ چلے گا۔ لالی لرز اٹھا۔ اکا دکا کی گھنٹی نہیں جھی۔ اس نے اٹھی وہیں چھوڑ دی مگر اپنی پٹلی نہیں چھوڑی۔ اسے بھل میں بابا اور کاٹ کے پاس پہنچ گیا۔ تینوں درختوں کے نیچے گھپ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ گگ جھگ سوگڑے کرنے کے بعد کاٹ ٹھہر گیا بلانا اور مدد میں انگلیاں ڈال کر اس نے زور سے سٹیج بھائی سٹیج بلند ہوتے ہی رات کے سائے میں نالے کے قریب گر لیاں گونچے گئیں۔ کاٹ اور فیکر سے چپ چاپ کھڑے تھے۔ لالی بھی دم بخود کھڑا تھا۔ غصہ میں تار تار ٹوٹو گولیاں چلتی رہیں۔ لالی نے کاٹ کی پشت پر ٹکل ماری فاضل بندوق دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا: تمہارے پاس کاربین ہے، مجھے بندوق دے دو۔ میں بالکل ہنسا ہوں۔ تمہاری مدد بھی کر سکوں گا۔ کاٹ نے اس کی جانب دیکھ بغیر کہا: دے دوں گا۔ مگر اس نے بندوق دی نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے

لالی کو آہستہ سے دھکا دے کر کہا: ”آگے چل“

لالی آگے بڑھا مگر وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انھیں اپنے ہمارے پاس نہ لانی ٹھنکا اور پلیٹ کر دیکھا۔ کاکڑ نے ڈانٹ کر کہا: ”دیکھنا کیا ہے۔ آگے بڑھ“ یہ کہہ کر اس نے لالی کو کادین کی زد پر لے لیا۔

لالی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ آگے پولیس بھی پیچھے کاکڑ اور فیر سے تھے۔ ادھر بھی بندوبست نہیں۔ ادھر بھی بندوبست نہیں۔ لالی دونوں کے بیچ میں تھا اور بالکل غیر مسلح تھا۔ بھاگنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی پشت پر کاکڑ اور فیر سے بندوبست مانے کھڑے تھے۔ وہ دنگ لگاتے دھم سے آگے اور آگے بڑھنا گیا۔ خشک پتے اس کے پیروں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ آیا، سامنے سے پولیس نے بندوبست سے ہاٹھ ماری۔ گولیاں جھپٹی ہوئی چلیں۔ لالی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ فائرنگ مسلسل ہوتی رہی۔ گولیاں لالی کے سر پر سے سینے پر سے ہاتھوں پر سے سناتی ہوئی گزرتی رہیں۔ وہ دم سادے پڑا رہا موت اس کے چاروں طرف منڈلائی رہی۔ وہ رک رک کر سانس لیتا رہا۔

کاکڑ اور فیر نے جو ابی فائرنگ نہیں کی کچھ دیر بعد پولیس نے گولی چلانا بند کر دیا لیکن نالے کے آس پاس فائرنگ پہلے سے زیادہ تیز ہوئی۔ لالی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کوئی گولی اس کے جسم کے کسی حصے میں لگی بھی ہے یا نہیں۔ اسے صرف اس قدر ہوش تھا کہ وہ زندہ ہے۔ لالی کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی کہ کاکڑ نے اسے نسا آگے کیوں بڑھایا اور اسے پولیس کی گولیوں کی بوچھاڑ میں بالکل سامنے کیوں کر ڈیالیا۔ منہ بولے کے مطابق نہ اس نے جو ابی فائرنگ کی نہ ہی پولیس کا گیارہ لڑنے کی کوشش کی۔ لالی ڈاؤن ہو کر سادے پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ کھٹکھٹا ہوا درختوں کی جانب بڑھنے لگا۔ خوفہ درختوں تلے لندھکے میں آگیا۔ پولیس نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔ مگر اب لالی فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ کاکڑ اور فیر نے اسے اس بار بھی پولیس کے جواب میں گولی نہیں چلائی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ وہ فائرنگ کی زد سے زیادہ سے زیادہ دور چلا جانا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد وہ پھیر گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یہ دیکھ کر سخت جرت ہوئی کہ پولیس ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ہے۔ پولیس رک رک کر فائرنگ کرتی رہی پھر لالی نے اپنے بہت قریب دھم کی آہٹ سنی۔ ساتھ ہی تدمج لہجے میں باتوں کی آوازیں بھی آتھیں۔ ”لالی مالو گیا“ یہ فیر سے کی آواز تھی۔

فیر سے کے ساتھ کاکڑ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: ”اسے تو مارا ہی جانا تھا۔ آگے بھیجا اسی لیے تھا۔ دیکھ پولیس کیسے پکڑ میں آگئی۔“

فیر سے بولا: ”پولیس ابھی تک اسی طرف گولی چلا رہی ہے۔“

”چلائے دے۔ چلائے دے۔“ کاکڑ نے کہا: ”اپنے لیے ادھر کا راستہ صاف ہو گیا۔“ وہ چند لمبے خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا: ”چلا“

فیر سے پیچھے پیچھے: ”

دونوں قبلے دھم سے آگے بڑھ گئے۔ لالی سانس بند کر کے کھڑا رہا۔ اس کی آہٹ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی پھر ختم ہو گئی۔ پھر تیزی سے بعد اس طرف بھی گولیاں گونجیں۔ جہر کاکڑ اور فیر سے گئے تھے۔ لالی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے، کدھر جائے، ہر سمت گولیاں نڑتا نڑتا جی رہی تھیں مگر پھر ناہنجی خطرہ نکلا۔ اسے ملے سے جلد دھم سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ چونکا۔ نظروں سے اڑھار ادھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھا اور کچھ دور تک بڑھنا گیا پھر اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گرنے لگا۔ بچا۔ اسی وقت دوسرے مارچ کی روشنی ابھری۔ لالی نے دیکھا کہ پھیر خون میں لت پٹ پڑا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ ناہنجی کچھ گئی مگر اس کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ لالی بھٹ زمین پر گر پڑا۔ گولیاں سناتی ہوئی اس کے برابر سے گزرتی رہیں۔ قریب ہی پھیر کی لاش پڑی تھی۔

چاند نکل آیا تھا مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی بہت جھیلی اور دھندلی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ لالی زیادہ دیر اس جگہ نہیں ٹھہرا۔ جیسے ہی فائرنگ بڑھ گئی، وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے بھاگا اور دوسرے بھاگنا چلا گیا۔ پھر وہ درختوں کے نیچے سے نکل کر باہر آگیا مگر یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا کہ دھندلی چاندنی میں ایک کانٹیل من اس کے سامنے کھڑا ہے۔ کانٹیل بھی اسے دیکھ کر جھنجھکا رہا تھا۔ لالی ٹیک کر کدھر پھر نہایت تیزی سے دوڑتا ہوا سامنے کی جھاڑوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں وہ کچھ دور آگے آیا تھا کہ اس نے سنا، کانٹیل کہہ رہا تھا: ”نہیں دیوان جی! وہ لالی ہی تھا۔ کانٹیل ملے سے پڑے تھے، وہی پتے پتے تھے۔“

فیر سے سامنے بالکل اس طرح کھڑا تھا جیسے تم کھڑے ہو۔“

”تم نے جھپٹ کر اسے دلوچ نہ لیا؟“

”موقع ہی نہیں دیا اس نے۔ پھلاٹے کی طرح نکل گیا مگر تیرے جلے گا کہاں؟“

لالی ان کی باتیں سننا، جھاڑیوں میں دیکھا، گھبرا ہوا اندھیرے میں تیزی سے چلتا رہا۔ چپاس ساتھ تو اس نے ملے سے ملے کر لیے۔ اس کے آس پاس گہری خاموشی تھی لیکن نالے کی طرف ابھی سب ٹیک

ہبک رُک رُک کر گولیاں چل رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک طرف مڑا تو قریب سے بھاری قدموں کی آہٹ آنجھری ساتھ ہی آواز بھی آئی تو محض اُدھرا اندھیرے میں جھاڑیوں سے کوئی سفید سفید چیز ہلکی نظر آتی ہے۔

لالی نے جھٹ راستہ بدل دیا اور تیزی سے بھاگتا ہوا ایک جھاڑی سے اُس کی دھوٹی ایسی اُلچی کر دے گا کہ وہ بھاگتا ہوگا اور وہیں دیک کر بچھ گیا۔ اُس نے بولے بولے دھوٹی جھاڑی سے علیحدگی کر ڈب سے نکل کر لوٹ کر گئے تھے انھیں ٹھول ٹھول کر اکٹھا کیا اور دھوٹی کے پلوں میں باندھ لیا مگر دھوٹی دوبارہ نہیں باندھی بلکہ جلدی جلدی فیص بھی آداری نہیں اور دھوٹی کا رنگ سفید تھا اور اُن کا اعلان اندھیر میں دُور سے جھلکتا تھا۔ لالی نے جو تھے بھی اُتار دیے۔ بڑوں سے آہٹ پیدا ہوتی تھی اور بھاگنے میں بھی دقت ہوتی تھی، اُس نے فیص اور جھٹ جھٹ پٹ پٹلی میں باندھ لیے۔ اب وہ ماڈلز اور ہنسٹھا۔ کچھ پردہ جھاڑی کے نیچے دیکھا بھلا۔ اب سب قدموں کی آہٹ دُور ہو گئی تو اُس نے پولیٹین میں دو باقی اور جھاڑیوں کے درمیان چھپتا چھپتا آگے بڑھا۔ اُسے پولیس والوں کے لوڑوں کی چاپ برائو سانی سے رہی تھی کبھی چاپ قریب آجاتی کبھی دور ہو جاتی۔ کئی منٹ تک وہ اسی طرح جھاڑیوں کی اورٹ میں چلتا رہا بار بار راستے بدلتا رہا۔ کس قدموں کی رفتار تیز کر دیتا، کبھی جھاڑی کی آڑ لے کر دیک جاتا جھاڑیوں میں کانٹوں کی بنناٹ تھی۔ لالی کے برہنہ جسم پر کانٹوں سے جگہ جگہ خراشیں پر گئیں اور خون رسنے لگا مگر اُس برہنگی سے آسے یا نازہ ضرور ہوا کہ وہ اندھیرے میں گھل گیا۔ پولیس کے لیے اُس کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں جھنگل ختم ہو گیا تھا اور ساتھ ہی جھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ سامنے چیل میدان تھا اور اُس سے آگے کسی قدر بلندی پر درختوں کا ایک بھند تھا۔ درختوں کی آڑ سے زرد زرد روشنی کا ایک دھبہ نظر آ رہا تھا۔ لالی نے ادھر ادھر دیکھا اور سر پٹ بھاگا۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی جانب لپکا۔ دُور سے کوئی چٹخا پٹخا صا لالی، "مگر لالی بھیرا نہیں۔ دوبارہ اور زیادہ زور سے چھینے کی آواز آنجھری۔ بھیرا نہیں تو گولی چلا دوں گا۔"

لالی بھیر نہیں بھیر۔ گولی گریے سناتے ہیں زور سے گولی اڑا دینا کہ نہ ہر نیکل گئی۔ لالی بلندی پر پہنچ گیا اور دُور کرد درختوں کے نیچے چلا گیا۔ اُس نے کچھ فاصلے پر کچھ لوہوں کی جھٹ والا، پُرانی وضع کا ایک بنگلا دیکھا۔ بنگلے کی ایک کھڑکی سے بلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی

سب نگ

تھی۔ وہ چند لمحے فائوش کھڑا رہا۔ اُسے اپنے مقب میں بھاری بھاری لوٹ دوڑنے کی آوازیں صاف سناؤں سے رہی تھیں۔ وہ جھٹ ایک دھڑکتے ہوئے بندکے طرح پھرتے سے پڑھ گیا اور ایک شاخ سے جھول کر بنگلے کی چار دیواری کے اندر کود گیا۔

لالی درختوں اور پردوں کی آڑ لیٹا ہوا سبھا اُس کھڑکی پر پہنچا جس سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اُس نے شیشے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ چٹخا ہوا تھا۔ لالی نے اگلے چندا کر شیشہ نصف سے زیادہ توڑ دیا۔ اُس کی اگلے کٹ گئی خون سے لگا۔ لالی نے اگلے ہونٹوں میں داکر خون جو سا پھر جلدی سے ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھولی اور کھڑکی کے راتے اندر چلا گیا۔

سامنے میز پر علیپ رکھا تھا، اُس کی دھڑکی میں سر چمڑا دھندلی نظر آ رہی تھی۔ لالی سر میز کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چار دیواری کے اُس پار بھاری بھاری قدموں کی آہٹ آنجھری تھی ساتھ ہی زرد زور سے پٹیاں بھی بکے گئیں۔ لالی اور سر میز ہو گیا۔ زور پر یہ اُس نے چار دیواری کی آہٹیں بھاگ کھٹنے کی آواز سنی۔ وہ مدحاس ہو کر آگے بڑھا اور ایک کرسی سے ٹکرا کر گرنے لگا۔ کرسی کی آہٹ گئی۔ کرسی اُلٹنے سے آواز پیدا ہوئی اُس کے ساتھ ہی سامنے کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص دھاری دار کانٹوں پہنے باہر نکلا۔ وہ گول چٹا ہرے جسم کا آدمی تھا۔ چہرے پر بھوری بھوری شان دار مونچھیں تھیں۔ عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ دوسرا ہاتھ کانٹوں کی جعب میں تھا۔ اُس نے جیت سے انھیں بھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ لالی اُس کے سامنے بالکل تنگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ سر کے بال گرد سے اُٹے ہوئے تھے اور جسم پر بھی گرد ہی گرد تھی۔ جگہ جگہ آویز تریجی خراشیں بھی تھیں۔ ہونٹوں کے نیچے نازہ نازہ خون کا دھبہ تھا جو چھوڑی سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ شخص لالی کی یہ ہیئت دیکھ کر گھبراتے ہوئے لمحے میں لڑا۔ توں ہونٹم؟ اندر کیسے آگئے؟

ابھی اُس نے اپنا جامہ پورا ہی کیا تھا کہ بنگلے کے بڑے دروازے پر زور سے بولنے کی بل جلی آوازیں آنجھریں۔ لالی دہشت زدہ ہو کر لڑا۔ وہ وہ پولیس گھبر مٹا۔ وہ پوری بات نہ کہہ سکا خوف اور بھاگ دوڑ سے اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی، وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

اُس شخص نے پوچھا کیا پولیس تمہارا تعاقب کر رہی ہے؟ لالی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اُس شخص نے دریافت کیا پولیس تمہارا تعاقب کیوں کر رہی ہے؟

دونوں کمرے کا ایک دروازہ کھول کر راہ داری میں داخل ہوئے اور کچھ دیر جا کر ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ حیات نے لالے سے کہا: "اندھا کمرہ سوجاؤ۔ دروازہ بند کر لو اب ہم باہر محفوظ ہوئے۔"

لال چپ چاپ اندھا چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ یہ مختصر سی کوٹھری تھی ساویرہ بھندری پر روشن دان تھا۔ اس پر لوہے کے موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ روشن دان سے ملنے والی روشنی اندھا آہستہ چلی۔ لال دروازے کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ توٹھری یہ بعد اس کی نظر کی کوٹھری کے اندر سے آنوس ہو گئیں۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کے سامنے آؤ چھا چوڑا لمبے۔ لال نے اس پر ہاتھ پھیرا، چوڑا صاف ستھرا تھا۔ وہ خاموشی سے چوڑے پر جا کر بیٹھ گیا۔ چھڑاں نے گھڑی سر کے نیچے رکھی اور انگلیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ گھڑاں نے ہینڈ نہیں آئی۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ کھینٹے سوا کھینٹے بعد وہ چوڑے کے نیچے آؤ گھڑی بغل میں دانی، ہولے ہولے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور کان لگا کر باہر کی آہٹ لینے لگا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ دروازے تک دروازے کے قریب دم بخود کھڑا رہا پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کر دروازہ کھولا۔ چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ لال نے پریشان ہو کر دروازہ دھکے مارے۔ ہلایا۔ باہر سے زور سے کسی کی کھنکھار بھری۔ لال الیا ہشت زدہ ہوا کہ لڑکھڑاکر کرتے کرتے بچا اس نے دروازہ کا سما لیا اور گری سانس بھر کر دروازے سے سر نکال دیا۔



لال نے گڑ گڑا کر کہا: "مجھے بچا لیجیے۔ میں سب کچھ بنا دوں گا۔ ننگا، خاک سمے اہو لال دھندل روشنی میں بڑا مسکین نظر آ رہا تھا۔ اس شخص نے مسکرا کر اسے دیکھا اور تسلی دینے کے انداز میں بولا: "اچھا، اچھا۔ اس نے ذرا سنا لیا۔ تم نہیں کھڑے رہو میں ابھی آتا ہوں۔ وہ جس کمرے سے نکلا تھا چھڑاں میں چلا گیا۔"

لال ایک کونے میں دیک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں ہر طرف اونچی اونچی اماں ہیں۔ اماں کیوں کے شیشوں کے پیچھے ترتیب سے رکھی ہوئی طرح طرح کی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی جھلکتی ہوئی میز تھی۔ میز پر لیوے روشن تھا اس پر دو دیوارنگ کا گہرا شیشہ تھا۔ اس شیشے پر روشنی دھمک کر دی تھی میز پر کائنات اور ہندو کوئی مونی کی کتابیں رکھی تھیں۔

اب بنگلے کے بیرونی دروازے پر آواز بند ہو گئیں تھیں۔ لال کو لے میں سما ہوا خاموش کھڑا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لال نے اس کھڑکی کی جانب دیکھا جسے چاند کو دھکے کے اندر پانچ کھڑکی کا ایک پٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس آتما میں بنگلے کا بیرونی دروازہ کھلے اور بند ہونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لال کھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دم بخود اور سما ہوا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گھڑ گڑا لال کو دیکھا اور غصے سے بولا: "بیوقوف! کپڑے تو پہن لے۔"

لال نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ گھڑی کھول اور جوتی نکال کر کمرے کے گرد بانٹنے لگا۔ اس شخص نے پوچھا: "کیا تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو؟"

"ہاں! لال نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

وہ کھنے لگا۔ میں نے نہیں پوچھا۔ میں نے پوچھا ہے۔ اس لیے کہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ اس نے ذرا سا توقف کیا۔ میں میاں حیات محمد جیل میں اس وقت میری پناہ میں ہوں۔"

لال نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا: "آپ نے جی مجھ پر بہت بڑا احسان کیا۔" وہ کمرے بھر کے لیے نکلا اور عاصی سے بولا۔ "ہات یہ ہے جی۔۔۔"

حیات نے اس کی بات نہیں سنی، رعب سے بولا: "تم سے صبح بات ہوگی۔ یہ میرے سونے کا وقت ہے۔" وہ چند لمبے خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اٹھنے کے اشارے سے لال کو اپنے قریب بلایا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" وہ آگے بڑھا۔ لال اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

جہاز گلوں سے

خدا اکوے یسحق کے خالق ہے
شوکت صہبہ یقین کے قلم ہے
ایکے تارے تربیت تحریر
باقیے واقعات آئندہ شمار ہے
مدیت ملاحظہ فرمائیے۔



ریلوے اسٹیشن پر دوشناسا اتفاقاً مل گئے پہلا بولا۔ ”آٹھ! آپ سے تو اب ناطہ ہی نہیں رہا۔ آج برسائرس میں زیادہ ہوتی۔ کہاں سے آرہے ہیں؟“ دوسرے نے بتایا: ”ایک بارات کے ساتھ میری لڑکی تھا“ وہیں سے آ رہا ہوں اور آپ؟“ پہلا کھل اٹھا۔ ”میں بھی میری پورے آ رہا ہوں کراچی کی یکسانیت سے الٹا کے کبھی بھی چلا جاتا ہوں۔ وہاں بھی ایک رہائش گاہ ہے، اللہ کے فضل سے“

اس قسم کے مکالمے اردو میں آپ نے اکثر سنے اور پڑھے ہوں گے۔ یہ عام فہم، ڈاں دو ال اور بیک نظر بے عیب معلوم ہوتے ہیں مگر ان صرف تین مکالموں میں پوری چھ خامیاں ہیں۔ ایک مکالمے میں دو خامیاں۔ ناطہ، برسائرس، بارات، یکسانیت، رہائش گاہ اور ہی ”ہی“ کا استعمال میرے پورے عین درمیان میں ہوا ہے۔ ”میں بھی میری پورے آ رہا ہوں“ یہ ایک دل چسپ غلطی ہے۔ اسی طرح ناطہ دراصل ناطا ہے۔ بارات، بارات ہے اور یکسانیت، یکسانی ہے۔ اب دیکھئے برسائرس اور رہائش گاہ برس اور رہتا ہندی الفاظ ہیں، انھیں فارسی طریقے سے سالہا سال اور آزمائش باز رہائش کی طرح استعمال کرنا درست نہیں۔ بولتے اور سمجھتے وقت ہم نادانستگی میں نہ جانے کتنی غلطیاں کر جاتے ہیں غلطیوں کی یہی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اگر کوئی غلطی سے صحیح لفظ بول جائیں تو وہ نامانوس بلکہ غلط معلوم ہونے لگتا ہے۔ ”سب رنگ“ میں لسانی اغلاط سے بچنے کی بساط بھر کو شش کی جاتی ہے۔ یہ کوشش بعض فانیوں کے لیے بجا طور پر تجسس کا باعث ہوتی ہے لہذا آئیے، اس جائزے کے ذریعے ہم ذرا اپنے صحیح و غیر صحیح کی آزمائش کریں۔

زبان نہ صرف بولنے والے کا مبلغ علم ظاہر کرتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، کتنا مذہب ہے اور کن لوگوں میں اٹھا بیٹھا ہے۔ ایک صاحب خود کلامی و خود نویسی کے مبلغ ہونے کے علاوہ غلط کلامی و غلط نویسی کے بھی پُر زور مؤید ہیں۔ ان کا کتاب ہے ”زبان محض ایک ذریعہ ہے خیالات کی ترسیل کا۔ اس کی لوک پاک سنوائے اور اسے نیک مسک سے درست کرنے میں سرکھینے کی کیا ضرورت ہے“ یقیناً زبان ایک ذریعہ ہے مگر کیا ذریعہ کوئی غیر اہم چیز ہوتی ہے؟ محبوب محب ایک دوسرے کے لیے ذہنی یا جسمی اسودگی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ رنگ، روشنی، خوشبو و حصول راحت کے ذرائع ہیں۔ آؤٹ گاڑی، سائیکل، اسکوٹر، کار، ریل، بحری جہاز، طیارہ، خلائی سیارہ، یہ سب بھی ذریعے ہیں۔ کیا ان کی کوئی اہمیت نہیں؟ جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے، جب تک منزل قدموں میں نہ پہنچ جائے، ذریعے اور راستے کو مقصد و منزل پر فوقیت حاصل رہتی ہے۔ آپ کسی معزز مہمان کو بلاؤ کھلانا چاہیں تو مقصد بلاؤ کھلانا ہوتا ہے لیکن آپ برتنوں کے اہتمام میں بھی اسی نفاست کا خیال رکھتے ہیں جو پلاؤ کے اجزا گوشت، چاول اور مسالے وغیرہ کے انتظام میں آپ کے پیش نظر رہتی ہے۔ حالانکہ برتن، گوشت چاول اور مسالے، یہ سب ذرائع ہیں۔ ان کے علاوہ ترقی کیا ہے؟ تنخواہ کیا ہے؟ مکان کیا ہے؟ کیا یہ سب بجائے خود کچھ عین یا محض ذرائع ہیں؟

خیالات کی ترسیل تو اشاروں اشاروں میں بھی ہو جاتی تھی بلکہ اشاروں کی زبان آج بھی بلاغت کی معراج ہے اور بسا اوقات ایک اعجاز ثابت ہوتی ہے پھر یہ زبانیں کیوں تشکیل میں ہوں گی؟ ان کے قواعد کیوں مرتب کیے گئے؟ لغات کیوں

قطع کلام

پچھانی جاتی ہیں؟ خیالات کا تبادلہ تو پرندے، درندے اور حشرات بھی کر لیتے ہیں۔ نباتات، جمادات اور ستارگان بھی فطرت و صورت سے محروم نظر آتے ہیں مگر ہماری سماعت اُن کی سرگوشیوں سے کھن گرج سے اور اُن کی کراہوں سے نا آشنا نہیں۔ اِس کے باوجود مخلوقات میں جو ان فطرت و برتر سمجھا جاتا ہے اور اُس کی برتری حقیقت میں اُس کے ذریعے کی برتری ہے۔ زبان ایک ذریعہ ہے خیالات کی ترسیل کا مگر خود خیالات کی ترسیل کیا ہے؟ کیا یہ بھی محض ایک ذریعہ نہیں؟ ورنہ جسے اسباب ہے، اسباب سے مراد ذرائع۔ یہاں کی ساری رونق، ساری جلوہ آرائی ذرائع ہی کی کرشمہ کاری ہے۔

مروج	صحیح	سہمت	سہمت
موجودگی	موجودی	موسم	موسم
گفت اور یہیے یا گف، الف او فون کا استعمال صرف		میکل	میکل
اُن الفاظ میں ہوتا ہے جو ہلے پوز پر ختم ہوتے ہیں مثلاً لغزہ،		مبارک	مبارک
زندہ، رفتہ، دل زدہ وغیرہ۔ منجی، زندگی، رنگاں،		احساق	احساق
دل زدہ گان۔		اسرار	اسرار

جہاں کسی واحد لفظ کی جمع استعمال ہونی چاہیے وہاں جمع الجمع کی اِزرائی بھی قابلِ غور ہے۔

واحد	جمع الجمع	جمع
لازمہ	لوازمات	لوازم
نادر	نوادرات	نوادیر
حکم	احکامات	احکام
رکم	رسومات	رسوم
رقم	رقومات	رقوم
وجہ	وجوہات	دجہ
عجیب	عجائبات	عجائب
عمدہ	عمامدین	عمائد
اکبر	اکابرین	اکابر
جوہر	جوہرات	جوہر

موجودگی، موجود کے لیے متصل ہے، موجود کے لیے نہیں، مثلاً ”میں اُس کی موجودگی میں وہاں پہنچا“ مطلب یہ ہوا کہ ”میں اُس وقت وہاں پہنچا جب وہ موجود تھا۔“ لہذا یہاں موجودگی کے بجائے موجودی استعمال کرنا چاہیے۔ اس اصول کا اطلاق مندرجہ ذیل لفظوں پر بھی ہوگا۔

موجودگی، موجود کے لیے متصل ہے، موجود کے لیے نہیں، مثلاً ”میں اُس کی موجودگی میں وہاں پہنچا“ مطلب یہ ہوا کہ ”میں اُس وقت وہاں پہنچا جب وہ موجود تھا۔“ لہذا یہاں موجودگی کے بجائے موجودی استعمال کرنا چاہیے۔ اس اصول کا اطلاق مندرجہ ذیل لفظوں پر بھی ہوگا۔

مروج	صحیح
کرخشی	کرخشی (درخت سے)
درستی	درستی (درست سے)
ادائیگی	ادائی (اداسے)
ناراضگی	ناراضی (ناراض سے)

بعض الفاظ میں اعراب یعنی زیر، زیر، پیش کا غلط استعمال بے حد رائج ہے۔ مثلاً:

مروج	صحیح
بین الاقوامی (نون پر پیش)	بین الاقوامی (نون پر زیر)
حق الامکان	حق الامکان
مابعد الطبیعیات	مابعد الطبیعیات
ما فوق البشر	ما فوق البشر
بین السطور	بین السطور
عطر	عطر
عجمن	عجمن
خودکشی (کاف پر پیش)	خودکشی (کاف پر زیر)
معزز (ئے کے نیچے زیر)	معزز (ئے کے نیچے زیر)

وہ ترکیب جو لفظوں کی ترتیب اُلٹ کر بنائی جاتی ہیں، اُن میں اضافت باقی نہیں رہتی مثلاً پس منظر۔ یہ ترکیب منظر پس کی ترتیب اُلٹ کر بنائی گئی ہے۔ ایسی ترکیبوں میں اضافت ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

مروج	صحیح
پس منظر	پس منظر (منظر پس سے)
سردق	سردق (دوق سر سے)
شادی مرگ	شادی مرگ
شہرہ آفاق	شہرہ آفاق

(جادو سے ہے)



مغربیوں سے اپنے آرتاؤں کے تحریر
مختص، تازہ متن، عبثت انگز
نہ عہد کے ایک کھانے ترجمہ * طارقہ حبیب

آزادہ کنجہ اپنے شخصیت کے مدد کیجیے

ایکے صاحبِ اولاد کے رُوداد

میں خاصی گرمی تھی۔ باہر درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے تھا۔ کمرے میں صرف چار درز باقی تھے۔ کمرے کی مصروفیات میں کیڑے اور بیج کا ڈبا کسے یاد رہ سکتا تھا، اُسے ٹھلا دیا جاتا اور کوڑے کا ڈھیر اُس کا آخری ٹھکانا ہوتا۔ این کی توجہ کس اور دلچسپی کی طرف مبذول ہو جاتی۔ رات کو سونے کے وقت این غائب تھی۔ میں نے اُسے گھر کے ہر کمرے میں تلاش کیا۔ وہ نہیں ملی۔ میں تہہ خانے میں گیا وہ وہیں تھی، مجھے ڈبے کے اندر جھانکتی ہوئی ملی۔ میں نے پوچھا: اب کیا ہو رہا ہے؟

اُس نے کہا: ڈبیری، میں پورا اگلنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اُس کے لیے میں خود اعتمادی تھی۔

”خوب“ میں ہنسا۔ مجھے اُس کی گرمی دلچسپی پر حیرت تھی۔ میں نے اُس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا: پورے جلدی نہیں آگئے۔ کافی وقت لگ جاتا ہے۔ تم کب تک جاگتی رہو گی۔ پتہ ہے، سوئے گا وقت

میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ میری پانچ سالہ بیٹی این میرے پاس سے گزری۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک ڈبا تھا۔ میں نے ڈبے میں جھانک کے دیکھا۔ آدھا ڈبا مٹی سے بھرا ہوا تھا۔ مٹی میں ایک موٹا نازہ بچہ پڑا تھا۔ میں نے این سے پوچھا: ڈبے میں یہ کیڑے کیوں ہے؟

”تمہی بچہ کی حفاظت کرے“ اُس نے جواب دیا۔

”بیج؟ کیسا بیج؟“ میں نے پوچھا۔

”مالٹے کا بیج“ این نے بتایا۔ وہ مٹی میں دبا ہوا ہے۔ اُس نے جا کر نکال کھولا اور مجھ سے پوچھا: ڈبیری، کتنا پانی ڈالتے ہیں؟

”بہت تھوڑا سا“ میں نے جواب دیا۔

وہ خاصا پانی بھری تھی۔ اُس نے ڈبا ترچھا کر کے فالتو پال گرا دیا پھر احتیاط سے ڈبا اٹھا کے اُسے حفاظت سے رکھنے کے لیے تہہ خانے میں آکر رکھی۔ ڈبا اُس نے تہہ خانے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ کچھ فاصلے پر آتش دان روشن تھا۔ آتش دان کی وجہ سے تہہ خانے

سب نگ

ہو چکا ہے، چلو، اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔

کرنی پڑتی ہے؟

”جی ہاں۔“ اُس نے ہمدلی سے کہا۔

”لہذا خدا نے دنیا کا نظام آسان بنانے کے لیے کچھ طریقے بنائے ہیں تاکہ جان دار، درخت اور جاندار سے اُن طریقوں کے مطابق چلیں اور کائنات میں افراتفری پیدا نہ ہو۔ افراتفری نہیں ہوگی تو دوسرے اہم کاموں کو بھی خدا کی توجہ نہ ملے گی۔ سمجھ رہی ہو نا؟“

”جی ہاں“ اُس نے جواب میں کہا۔

”اچھا تو اب دیکھو۔ سوچ کے لیے یہ طریقہ بنا دیا گیا ہے کہ وہ روز صبح طلوع ہو، شام کو یا دھوپ کو طلوع نہ ہو۔ اسی طرح پودوں کے لیے بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ بہت آہستہ آہستہ پیدا ہوں، اُن کے بڑھنے کی رفتار بے حد کم ہو، حتیٰ کہ انسان کی آنکھ اُسے محسوس نہ کر سکے۔

سمجھ گئیں؟ اس کا مطلب یہ ہو کہ تمہارا مالے کا پودا اگر سس تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب تم خود سوچو، صرف تمہاری ضد سے تو قدرت کے طریقے میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن ہماری سڑے اسکول کی میجر نے کہا تھا کہ اگر تم خدا پر پورا بھروسہ کر دو تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ خدا ہر چیز پر قابض ہے۔ افسوس نے کہا تھا کہ تمہیں صرف بچے کے دل سے دعا مانگنی پڑے گی، بچے کے دل سے مانگی ہوئی ہر دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ ڈیڈی، کیا آپ اس بات پر یقین نہیں رکھتے؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میری بھی یہ خیال ہے کہ بچے کے دل سے مانگی ہوئی ہر دعا قبول ہوتی ہے لیکن میں چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے خدا کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے اپنے لیے کچھ بھی بن کا اندازہ ہوا۔ میں میری گود سے اُتر گئی۔ ڈیڈی، یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔“ اُس نے غم سے کہا۔ کچھ ہی ہو جائے میں آج رات بچے کے دل سے زور زور سے دعا مانگوں گی تاکہ خدا اس لے اور میرا مالے کا پودا اگر سس سے پہلے پیدا ہو جائے۔“

ابن چلی گئی۔ میں سخت ڈشواہی میں پڑ گیا۔ مجھے خیال آ کر کل وہ اٹھ کر بہت اُمید سے بلکہ یقین سے تہہ خانے میں جانے لگی مگر اُسے مالے کا پودا نظر نہیں آئے گا۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ ممکن ہے تو بوری ہی میں، خدا سے اُس کا اعتماد اٹھ جائے اور وہ مذہب سے برگشتہ ہو جائے پھر اُس کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا وہ دنیا اور آخرت سے بے نیاز ہو کر محض مادہ پرست بن جائے گی؟ یا بیبیوں کی صحبت میں عمر گزارے گی؟ میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

دن ڈھلنے تک میں غنچے کاموں میں مصروف رہا۔ مصروفیت میں ابن کا مسئلہ میرے ذہن سے نکل گیا پھر ابن کی ممتی نے مجھے اُٹھانے سے روکا۔

”اے بچی، یہیں اسکول میں پودوں کی ایک فلم دکھائی گئی تھی۔ اُس میں تو پورے ہمدلی ہمدلی آگئے تھے۔“

”بھئی ایسی فلمیں خاص قسم کی ہوتی ہیں۔“ اُنھیں سائنسی طور پر بنایا جاتا ہے۔ ایک چار سالہ بچی سائنسی باتیں کیسے سمجھتی ہے اس میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ایسی فلمیں چیزوں کی حرکت یعنی چیزوں کی رفتار پر مرکوز ہیں۔ فلموں میں ایسا ہو جاتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”جوکر؟“ اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”بڑا اچھا کیڑا ہے ڈیڈی، میں نے اس کا نام جوکر رکھا ہے۔“

”بہت اچھا نام رکھا ہے، شاباش۔ اب جوکر کو شب جوکر کو اور چل کے سو جاؤ۔“ میں نے اُسے تہہ خانے سے نکلنے پر رضامند کر لیا۔ ”میں نے پہلے ابن دعائیں مانگ رہی تھی۔ کرسس کا تہوار قریب تھا اس لیے اُس کی دعائیں غلوس سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ گزشتہ دو روز سے اپنی ایک ہم جماعت مارگریٹ سے لڑی ہوئی تھی مگر آج اُس نے مارگریٹ کے حق میں بھی دعا کی۔ مارگریٹ کے علاوہ اُس کی دعاؤں میں حتیٰ اور ڈیڈی کا ذکر بھی آیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس کی آخری دعا یہ تھی۔ ”بیابانے خدا! میرے جوکر بھی اپنا کریم کرنا کہ وہ اطمینان سے میرے بیج کی دیکھ بھال کر سکے اور اسے خدا! ہم ربانی کر کے میرا بیج کرسس سے پہلے اُگا دینا۔“

”ابن! میں نے دخل دیا۔“ کرسس میں صرف چار روز گئے ہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ کوئی چیز اتنی ہمدلی نہیں آگ سکتی۔“ میں نے خدا سے دعا مانگی ہے، آپ سے نہیں۔“ ابن نے یقین سے کہا۔ ”خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔“

کرسس میں ایک دن رہ گیا تھا۔ دفتر سے واپسی پر مجھے ابن نظر نہیں آئی میں سیدھا تہہ خانے میں گیا۔ میری توقع درست نکلی۔ وہ وہیں تھی اور بہت صبر سے پودا اُگنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”بیج چھو نا؟“

اُس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”ڈیڈی! شاید خدا نے میری دعا نہیں سنی۔ آج رات خوب زلزلے سے دعا مانگوں گی تاکہ وہ سُن لے۔“

میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”سونین؟“ میں نے اُسے گود میں اٹھانے سے روکا۔ ”میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے نا کہ خدا کو ایک بہت بڑی دنیا کی دیکھ بھال

کیجیے ہمارے پاس صرف کرسٹس کے درخت ہیں۔ کوئی پودا وغیرہ نہیں ہے۔“
 ”کیا آپ کوئی ایسی دکان بتا سکتی ہیں جہاں پودے ملتے ہوں؟“
 ”غیر ملے۔ ابھی آئی ہوں۔“ لڑکی غائبانہ معلومات کے لیے منہ پر کمرے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے باہر آکر کہا۔
 ”آپ منہ پر صاحب کے کمرے میں انتظار کیجیے ہم پودے کا بندوبست کرتے ہیں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک معنی نیر جھپک نظر آئی۔ جھپک کی وجہ میری فہم سے بالآخر میں منہ پر کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ منہ پر فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے چنچلے نہیں نے بھی سن لیے۔ غصے سے میرا عجیب حال ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
 ”ہیلو دامنی اسپتال؟ ہمارے پاس ایک آدمی آیا ہے۔ وہ آدمی رات کو ملنے کا پودا خریدنے پر بضد ہے۔ جی ہاں، برف باری کے اس موسم میں۔ ٹھیک ہے، میں کسی بہانے اسے روکتا ہوں۔ آپ ایمبولینس بھیج دیجیے۔“

میں نے ہتھکیاں جھینگیں لیں۔ یہ لوگ مجھے بالکل سمجھ رہے ہیں؟ یہ معلوم لڑکی نے منہ پر سے کیا کہا ہوگا۔ میں دانت پیستا ہوا منہ پر کمرے سے نکل کے لڑکی کی طرف بڑھا۔ میرا چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھ میں خوف نظر آیا۔ اس نے مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو دہشت سے چلائی اور دھچک کر مجھ سے ہٹتی ہوئی منہ پر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کی چیخ سن کر لوگ ہماری طرف متوجہ ہونے لگے۔ بہت نازک وقت تھا۔ میں نے فرار ہونے کی جی میں خیریت سمجھی اور دھچک کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ آٹھ دن آدمی میری طرف اشارے کر کر کے ملنے آوازیں میں کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید وہ مجھے کوئی چور سمجھ رہے ہوں گے جس نے اسٹور کی لڑکی کو سپرٹول و سٹول دکھایا ہوگا۔ میں اپنی کار تیزی سے تین روڈ پر لے آیا میں عام حالات میں اس قدر تیز رفتاری کا قائل نہیں ہوں لیکن آج مجبوری تھی۔ خاصی ڈوراکے میں نے کارایک لگی میں موٹی اور عقب نما آئینہ دیکھا۔ یہ دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ دو روڈ تک کوئی گاڑی نہیں آئی۔ میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں مجھے ایک نرسری کا بورڈ نظر آیا۔ بورڈ پر تیر کا نشان تھا۔ نشان سے معلوم ہوا کہ نرسری تلی مرٹک پر ہے۔ مجھے خیال آیا کہ مالٹے کا پودا نرسری سے ضرور مل جائے گا۔ مجھے انسوس ہوا کہ میں دوکانوں پر ناسحق تھا۔ میں نے کار ڈیلی مرٹک

ضرورت کی ایک خدمت بھادی۔ آٹھ بج رہے تھے لیکن تھوڑا رات تھی اس لیے موکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں موکانیں بازار چلا گیا۔ نرسری بہت تھی، برف بھی پڑی تھی۔ اس کے باوجود دوکانوں پر انتہائی ترش تھا۔ میں خریداری سے رات گئے فافش ہوا۔ گھر واپس آتے ہوئے مجھے مرٹک پر کچھ ہنگامہ نظر آیا میں قریب پہنچا۔ دوکان شیل ایک ہتھی کو کچھ بیچ کھانچ کر پولیس کی گاڑی میں بھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہتھی نرسری اور برف باری سے بے نیاز فٹ پاتھ پر دبھون پڑا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بہت انسوس ہوا۔ میں نے سوچا کہ نوجوان نسل روز بروز لامذہب ہوتی جا رہی ہے اور اخلاق سے ذرا حاصل کرنے کے لیے منشاں کا سارا تلاش کر رہی ہے۔ مجھے ان کا خیال آ گیا۔ میں نے دل میں کہا، وہ بھی ایک دور ہے پر کھڑی ہے۔ اگر کل تک اس کا پودا کسی دیکس طرح لگ جائے تو اس کے دل میں خدا کی محبت راسخ ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں اس کے مذہبی عقیدے کو شدید خفیس لگ سکتی ہے۔ کیا پتہ؟ وہ بھی بڑی ہو کر اسی طرح مرٹکوں پر ماری ماری پھرے۔ میں اس کے مسئلے پر غور کرنے لگا۔ غور کرتے کرتے ایک کل میری سمجھ میں آگیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ مل پہلے کیوں ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں نے کاموٹی لیں۔ اب میرا رخ دوبارہ بازار کی طرف تھا۔ بازار تینچ کے میں نے کار بھولوں کی ایک دکان کے باہر روک دی اور اڑتے دکان میں داخل ہو گیا۔ دوکان دار نے میرے قریب آکر کہا۔
 ”فرمائیے کیا خدمت کی جائے؟“

”آپ کے پاس مالٹے کا پودا ہوگا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
 ”آپ غالباً مذاق کر رہے ہیں۔“ دوکان دار نے خشک لہجے میں کہا پھر وہ مجھے چھوڑ کے دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”نہینے تو۔“ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ میں بخوبیہ ہوں۔ مجھے پودے کی شدید ضرورت ہے، مالٹے کے پودے کی۔“

اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”جناب، یہ صرف بھولوں کی دوکان ہے، یہاں پودے نہیں بیچتے۔“

باہر کرکس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایک دیوار منٹنل اسٹور نظر آیا۔ وہاں میری شکل حل ہو سکتی تھی۔ میں دیوار منٹنل اسٹور میں گیا اور سیدھا اس کاؤنٹر پہنچا جس پر کرسٹس کے پودے وغیرہ رکھے تھے۔ دوکان کی ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا چاہیے جناب؟“

”مالٹے کا کوئی چھوٹا سا پودا مل سکے گا؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”جی؟“ لڑکی کی مسکراہٹ کا فور ہو گئی۔ ”مالٹے کا پودا؟ معاف

دیوار پر چڑھ کے دوسری طرف کود گیا۔ میرے قدم جیسے ہی زمین پر
 ٹپکے، اچانک ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ گھپ اندھیرے سے دو
 پولیس والے نکلے، انھوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ساتھ ہی
 کوئی آدمی زور زور سے کچھ چیخنے لگا۔ میرے اداں خفا ہو گئے پھر
 جب اداں بچال ہوئے تو میں نے دیکھا کہ چیخنے والا شخص بھی
 تک شب خولی کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ وہ پولیس سے میرے
 متعلق کہہ رہا تھا۔ اس نے پہلے گھنٹی بج کر اٹھ گھنٹہ کے
 میں کوئی نہیں ہے پھر خاموشی سے دیوار چاند کر گلاس ہاؤس میں
 داخل ہو گیا۔ وہاں سے اس نے قیمتی استوائی پونے چلے گئے
 گے۔ کانسٹیبل اس کی تلاشی لو۔ ابھی ثبوت مل جاوے گا۔
 میں نے گھبرا کر اس کا شبہ در در کرنے کی کوشش کی۔

”دیکھیے جناب، آپ کا خیال قطعی غلط ہے۔ میں نے گھنٹی اس
 لیے بجائی تھی کہ آپ سیلا رہو جہاں میری بدتمنی کہ آپ سیلا
 نہیں ہوئے۔ مجھے خود دیوار حاصل کرنا پڑی اسے چڑا نہیں چلیا
 تھا۔ میری نیت یہ تھی کہ کرسس کے فوراً بعد آپ کو پونے کی قیمت
 ادا کر دوں گا۔“

نرسری کے مالک کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ کانسٹیبل
 سے بولا: ”کانسٹیبل اس کی تلاشی لو۔ یہ ہمارے کر کے اپنا جرم
 چھپانا چاہتا ہے۔“

”جرم کر کے سبھی بے قصور بننے کی کوشش کرتے ہیں۔“
 کانسٹیبل مجھے سے مخاطب ہوا: ”تم نے پورا تو ابھی چڑا لیا ہے مگر
 قیمت کرسس کے بعد ادا کرنا چاہتے ہو، خوب۔ ذرا اپنی تلاشی تو
 میں خاموش رہا بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے
 میری تلاشی لی۔ آخر میں اس نے میری جیب سے رمال نکال
 لیا اور اسے نہایت احتیاط سے کھولنے لگا۔ شاید اسے یقین تھا
 کہ رمال سے کوئی ہتھیار یا دھرمونے والا ہے۔ رمال کھل گیا۔
 تینوں کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ کانسٹیبل نے مجھ سے
 کہا: ”سوار اس کا کیا مطلب ہے؟“ اس نے مالٹے کے پونے کی
 طرف اشارہ کیا۔

”دراصل مجھے کرسس سے قبل اس پونے کی شدید ضرورت
 تھی میں اسی کو حاصل کرنے یہاں آیا تھا۔ میں نے جواب دیا۔
 ”اچھا ہوا کہ نرسری کے مالک جاگ گئے ورنہ مجھے قیمت ادا
 کرنے کے لیے دوبارہ آنا پڑتا۔“ میں نے نرسری کے مالک کو
 ایک ڈالر کا نوٹ چھٹایا اور اپنی کاسک طرف بڑھا۔
 ”مسٹر اسٹیبل؟“ کانسٹیبل میری راہ میں جاں ہو گیا۔ ”یہ
 سب بگ

پروک لی۔ وہاں سے ایک پگ ڈنڈی شروع ہو گئی۔ میں نے کالے
 اترتے وقت ٹانج بھی ساتھ لی۔ یہ ٹانج ٹانج غیر بدلتے میں مد
 دتی تھی۔ میں پگ ڈنڈی پر آگے بڑھتا رہا۔ کوئی ڈرنا گ بھر کے جھاڑ
 جھنکار کے بعد پگ ڈنڈی نرسری کے سال خوردہ دروازے پر ختم ہو گئی۔
 میں نے ٹانج کا رخ دروازے کی طرف کیا۔ بورڈ کے ساتھ گھنٹی کا بٹن
 نظر آیا۔ میں نے گھنٹی کئی بار بجائی مگر دروازہ کھلنے کے آثار پیدا نہیں
 ہوئے۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ظاہر
 ہے، نرسری کا مالک کب کا سو گیا ہوگا۔ دروازہ کون کھولتا؟ فرض
 کیجیے، اگر وہ دروازہ کھول بھی دیتا تو آدھی رات کو مالٹے کا پورا خرچ
 والے کے متعلق کیا رائے قائم کرتا؟ میرا دل جاکہ کہ لوٹ جاؤں

لیکن اتنی دور کرنا ہی ہاتھ بانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے نرسری
 کی چند نٹ اونچی دیوار پر نظر ڈالی۔ میرا اندازہ تھا کہ دیوار کے پیچھے
 سینکڑوں پونے رکھے ہوں گے، یہی ممکن ہے کہ ان میں سے کئی پونے
 مالٹے کے ہوں۔ ایسی صورت میں کیا میں خالی ہاتھ لوٹ جاؤں؟ یہ
 قطعی ناممکن ہے۔ میں نے ٹانج جیب میں رکھی اور ادھر ادھر دیکھا۔
 دُور دُور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے احتیاط سے دونوں ہاتھ دیوار پر
 لکھ کر اچانک راد پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کوڑنے میں مجھے کوئی
 دشواری نہیں ہوئی میں نے ٹانج نکال کر چلائی اور اندر کا حائرہ لیا۔
 نرسری کے مالک کا مکان ایک کونے میں تھا، اس پر تیار کی مسلو
 تھی۔ دوسری طرف گلاس ہاؤس تھا۔ اسے سردی میں ہتھکڑوں کے
 ذلیعے گرم رکھنے کا پورا بندوبست تھا۔ آگ بے موسمی پھول پونے بھی
 ہتیارہ مکین۔ میں دیے قدموں گلاس ہاؤس کے دروازے پر پہنچا۔
 دروازہ غیر مقفل تھا۔ میں نے آہستہ سے اسے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔
 ٹانج کی روشنی سے چھوٹے چھوٹے بورڈ چڑھنا ہوا میں آگے بڑھتا گیا۔
 صرف چند بورڈوں کے بعد میری نظر بوسہ بورڈ پر پڑی۔ مالٹے کے
 چھ چھاپچی پونے رکھے ہوئے تھے۔ اجازت کے بغیر پورا نکالنے پر
 میں نے دل میں نرسری کے مالک سے معذرت کی پھر جیب سے
 رمال نکال کر اس میں کچھ کھادھی اور پودا بھی رکھ لیا۔ رمال اچھی
 طرح لپیٹ کر میں نے جیب میں رکھا اور واپسی کے لیے مڑا۔ میرا
 ارادہ تھا کہ کرسس ختم ہونے ہی پہلی فرصت میں نرسری کے مالک
 سے مل کر اسے اپنی جھوری بتاؤں گا، معافی مانگوں گا اور پونے کی
 پوری قیمت ادا کر دوں گا۔

گلاس ہاؤس سے باہر نکل کے میں نے دروازہ احتیاط سے
 بند کر دیا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نرسری کے مالک کا مکان بھی
 بدستور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے زیر لب اسے الوداع کہا اور

معاملہ ایسی آسانی سے حل نہیں ہو سکتا۔ آپ کو تھلے چلنا ہوگا۔
 نرسری والے کاؤن ہمارے انسپکٹر صاحب نے خود رسید کو کیا
 تھا۔ وہ اس طرح مطمئن نہیں ہوں گے۔ آپ دونوں کو ہمارے
 ساتھ حل معاملہ کی وضاحت کرنی ہوگی۔
 ہم تھلے پہنچے۔ معلوم ہوا کہ انسپکٹر گشت پر گیا ہوا ہے۔
 مجھے اور نرسری کے مالک کو مجبوراً کھوسوی کی ایک بیچ پر بیٹھ
 کے وقت گزارنا پڑا۔ سردی لمحہ لمحہ پڑھتی جا رہی تھی تھلے میں
 اس سے بچنے کے لیے کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ نرسری
 والے پر نرسری بہت اثر کر رہی تھی۔ وہ بیلاری سے بڑھڑا رہا تھا
 اور مجھے بڑا جھلا کہہ رہا تھا۔ میری وجہ سے اُس کی نیند پر خراب
 ہوئی تھی۔ انسپکٹر دیکھ کر قریب آؤنا۔ میری جان میں جان
 آئی کہ وہ نرسری پر یہ معلوم کب تک رہنا پڑتا۔ کانسٹیبل نے
 انسپکٹر کو پورا واقعہ سنایا۔ انسپکٹر نے میرا ستر اچا بازو لیا لیکن نیریت
 گزری، میری حالت دیکھ کر اسے داعی اسپتال ڈون کرنے
 کا خیال نہیں آیا۔ پھر وہ نرسری والے کی طرف متوجہ ہوا۔ محتاج
 کیا آپ ان کے خلاف کوئی رپورٹ درج کرانا چاہتے ہیں؟
 نرسری والے کا بس چلنا تو وہ مجھے جلی کی کرسی پر بیٹھ کے دم لیتا
 لیکن نرسری نے اُس کا بڑا حال کر دکھا تھا۔ وہ یہ سوچ کے کانپ
 گیا ہوگا کہ اگر رپورٹ درج کرائی تو نہ جانے کب تک ٹھیرنا اور
 ٹھٹھہرنا پڑے۔ اُس نے فوراً انکار کر دیا۔
 ”اس صورت میں آپ دونوں جا سکتے ہیں۔“ انسپکٹر نے
 جواب دیا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ وہ مجھے کھولنا دکھاتا
 ہوا دہاں سے روانہ ہو گیا۔ اُس کی بڑبڑاہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔
 میں نے کام میں بیٹھ کے ٹھہر کر راہ لی۔ ٹھہر بیچ کے میں نے دیکھا
 کہ میری بیوی پریشانی سے ادھر ادھر ٹھل رہی ہے۔ مجھے دیکھ
 کر اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ”غضب ہے۔ رات کے تین
 بجنے والے ہیں۔ تنہا ہی غریب داری اب ختم ہوئی ہے؟ آخر اُنکی
 دیر تک تم کہاں تھے؟“ اُس کی آنکھوں سے شہامت جھلک
 لے رہے تھے۔

میں اُسے کیا بتانا کر کن مشکلات سے دوچار ہو گیا تھا۔
 میں نے اُسے سیدھے ہالوں سے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش
 کی۔ وہ پہنچتی ہوئی خواب گاؤں گئی اور روشنی گل کر کے سو گئی۔
 میں موقع قیمت سمجھ کے اپنا منصوبہ مکمل کرنے لگا۔ سونے
 کی باری بہت دیر میں آئی۔

دوسری صبح میری آنکھیں بند نہ تھیں۔ کمرس کا دن تھا۔ دوسری
 مصروفیات کے علاوہ مجھے اپنی دروسری کا نتیجہ بھی دیکھنا تھا۔ میں
 نے اُسکے کا ارادہ کیا۔ اچانک کسی کی چاب نے مجھے چونکایا۔ میں نے
 اُسکے دیکھا۔ این ہمدخانے کی طرف جا رہی تھی۔ میں اُس کا منتظر تھا۔
 تھوڑی دیر بعد وہ فاحشانہ انداز میں مالینے کا پودا اٹھائے ہوئے تہ خانے
 سے باہر آئی۔ پودے کی ایک جھلک دکھائی دے رہی تھی۔
 ”ڈیڈی! ڈیڈی! خدا نے میری دعا سُن لی۔ رات کو میں نے بہت زور
 سے دعا مانگی تھی۔ وہ دروازے کی طرف مڑ گئی۔“

میں نے حیرت سے پوچھا: ”کہاں جا رہی ہو؟ صبح صبح؟“
 ”مارگریٹ کے پاس“ اُس نے کہا۔ ”میں اُسے پودا دکھانے گئی۔“
 مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا یہ بات اسے ہمیشہ یاد
 رہے گی اور یہ عقیدہ نہیں ہوئے پاس لگے گی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر ناشے کی میز پر جا بیٹھا۔ این مجھے دوبارہ نظر
 آئی لیکن اب وہ خالی ہاتھ تھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا: ”پودا کھاتے؟“
 اُس نے جواب دیا۔ ”وہ میں نے مارگریٹ کو دے دیا ہے،
 ڈیوڈ کے بدلے۔“

میں چونک گیا۔ میرا خیال تھا کہ ڈیوڈ مارگریٹ کے کتے کا
 نام ہوگا۔ ”کہاں ہے ڈیوڈ؟“ میں نے پوچھا۔

”بنائی ہوں۔“ این نے کہا۔ ”پہلے اُس کی ایک بات بتا دوں۔
 بہت خاص بات ہے۔ مارگریٹ کہتی ہے۔“ اور دوز کے مشن پر ڈیوڈ
 ننھے ننھے پیارے پیارے ٹپوں کو جنم دے گا لیکن اس کے لیے بہت
 ہی زور سے دعا مانگنی پڑے گی۔ میں آج ہی سے دعا مانگنا شروع کر
 دوں گی۔ بہت زور سے۔“

میں گھبر گیا۔ ڈیوڈ اگر زندہ ہے تو اُس سے پتہ پیدا کرنے
 کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ این اپنی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ مجھے اُس کی
 حرکات پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ ایک خالی ماپس نکال کے کھولنے
 لگی۔ ”ماپس میں ایک کھٹل بند تھا۔ وہ خوشی سے چلائی۔“ یہ ہے
 ڈیوڈ۔ ”میں سر ہچکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں ڈیڈی! این
 نے مجھے تسلی دی۔ ”ہماری سٹوے اسکول کی ٹیچر کہتی ہیں کہ کچھ
 بھی ناممکن نہیں ہے البتہ اُس کے لیے خدا پر بھروسہ کرنا ضروری ہے۔“



جہانگیر آباد کے قواب، غالب کے رفیق و ہم دم، مومن کے مقلد، مفتی صدر الدین نے آرزو اور امام بخش صاحب کے ہم صحبت، عالم، شاعر، تاجدار اور عاشق تھے۔ دہلی کے بڑے ہزار ادا کے سرستار، خوش رو، خوش خلق، خوش کن، ان کے مغرب تہذیب و شرافت کے مثالی تھے۔ قریب لکھنؤ کے باغی، جاگیردارانہ کے نظیر اکبر آباد کے خوشاعر تھے۔ دربار میں بہ تکلف جگہ تو دیتے تھے، تسلیم نہ دیتے تھے۔ قافلیہ ایسے کے عالیجہ کو ان کے حواس انتقاد پر راز، غالب کے نظائر ان کے پسند و ناپسند کو معیار ٹھہراتے۔ عالم ایسے کے آرزو، صہبائے اور مومن کے ہم چشم، ہم سر، شاعر ایسے کے حالت ان کے ربط پر متغیر اور عاشق ایسے کے شہر عاشقانہ مہذب و فدا کے علامت، تازہ بردار سے اور نان بردار کے شہوہ آشتیا، راہ سلوک کے کوچہ جیسے شخص صہب سحر انگیز۔ میر و مومن کے امکانات، بولتے والے۔ جندیہ غزل کے امام، حالت کے آرزو اور امام ملت غزل لہجے حسرت کے پیٹھے روئے۔ ان کے شمار رنگینوں کے امیر کیجئے تو شہر تہذیب کے تمش و شمع کے ہو گئے، نواب مصطفیٰ خاصہ کی جنت تھیں، والہ و راجہ کے شہر تہذیب تھے۔ دیر نظر تحریر کے العارف

اسے آتش نادیدہ کے کمانے جواز سے روشنی ہے

سوختہ جہانگیر کے بے ایک سوختہ جانے کو دار ستار
بھونے بھونے و نوٹ تھکے ایک، یاد گار دستاویز
* مقبول جہانگیر



نہرائے کا داغ آسمان پر پھینکا دیا۔ اسے کسی کی پروا تھی نہ ہی تعلق معلوم
میں ایشین نامی ایک انگریز پرنٹنگ اسٹیشن قائم تھا۔ بادشاہ اس کی
منظوری کے بغیر کوئی عروج جاری نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن ریز پرنٹ اور
مرزا جہانگیر کا آمناسامنا ہو گیا۔ نہرائے نے سامنے کہا: "لوہے سے کوئی بچہ"
ایشین شہزادے کی بات سمجھ لو گی کہ اُس نے نہایت کے ساتھ
اُس کے حواریوں سے پوچھا: صاحب عالم کیا کہتا ہے؟
"لوہہ کا ایک طلب موتی بھی ہے۔ شہزادے کے ساتھیوں نے
بات بنائی۔ حضور! صاحب عالم آپ کو کوئی یعنی موتی فروتے ہیں۔"
"اچھا! ایشین نے نہ رخنہ سے جواب دیا۔ ہم صاحب عالم کو
نوٹوں سے لے گا۔"

صاحب عالم کا خیال تھا، والہ گرامی بادشاہ ہیں، حکومت
ہماری ہے، اس فرنگی کی کیا مجال کہ ہمیں لوٹو نہائے۔ اُس نے آؤ بکھا نہ
تاؤ۔ ایشین پر تمسوار داغ دیا۔ اتفاق سے ایشین بچ گیا۔ اُس نے ہمیں ہمارے
سے شکایت کر دی۔ انگریزوں نے مرزا جہانگیر کو لالہ بھجیج کے
نظر بند کر دیا۔ بادشاہ سلامت سے کہا گیا: شہزادے کو تربیت کی ضرورت ہے۔
سب نگ

دلی میں میلے کا سماں تھا۔ شہر کی آرائش دیکھنے کے قابل تھی تھے
دلی وین کے طرح سیما گیا تھا۔ لال تلے سے شہر نہایت نکار و
تیل کے چراغ مل رہے تھے۔ نعل شہزادے صاحب عالم مرزا جہانگیر کی
آمد تھی۔ شہزادہ الہ آباد سے واپس ہو کر دلی آ رہا تھا۔ لال تلے کا گوشت گوشہ
موتور تھا۔ عمل سے دیوان عام تک اور دیوان عام سے دیوان خاص تک
روشنی ہو رہی تھی۔ جھاڑ، فالو، کمول، وغدغول اور شمعوں نے رات کو
دن سے بدل دیا تھا۔

مرزا جہانگیر کو بادشاہ ثانی کا جہینا بیٹا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ
اُسے اپنا ولی عہد بنائے مگر انگریزوں نے اس رائے سے اختلاف کیا۔
بادشاہ کو انگریزوں کی ہمت مانتی پڑی کیونکہ ہندوستان پہلے مگرانی تھی
کی تھی نیز بادشاہ کو ان سے دھاکہ روپے مالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ بادشاہ نے
مرزا جہانگیر کے بجائے بادشاہ ظفر کو اپنا ولی عہد نامہ ذکر دیا۔ اس کی
حاضرت میں یہ جہری نام زد مرزا جہانگیر کی حق تھی مگر انگریزوں نے اس
کی حمایت اور پرکھ گئی۔ وہ شہزادے کی ہرجا نزد ہما جو خواہش
پوری کرتا اور اُس کی ہرجا و بے جا بات برداشت کرتا۔ اس لالہ پیار نے



تحریت عمل پر مجاہدے کی گواہی آداسے واپس آجائیں گے۔ بادشاہ کو عیار و
ناچار بیٹے کی جدائی گوارا کرنی پڑی۔ مرزا جہاں گیر کی ماں نواب ممتاز علی
سے نفرت مافی کدرا نہ چھوٹ کر آئیں گے تو قطب صاحب میں حضرت خواجہ
بختیار کاکی کے ملازم پھولوں کا کچھ کھٹا اور غلات بچھاؤں کی تھ۔
مرزا جہاں گیر کئی برس کی نظر بندی کے بعد آلاہاد سے مل آئے تھ۔

مدد کا یہ گناہ شاہی خیمے جیسے ہوئے تھے۔ جملی، باقی، اہلسی، سہر
مرغ، زرد، ریشمی، ملا تونی اور سونی طابوں نے انھیں رنگات رنگ اور چٹکے
بنادیا تھا۔ ان کے منہ سے کس اور شیشے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آسمان
پر نیل باد اور زمیں پر سرسبز کا فرش طاسات کا عالم تھا۔ خیموں سے قطب
صاحب کی دلگاہ تک دو دریا بہاؤں میں کھڑی تھیں کہ کدو ملک و دلاں مرزا جہاں گیر
کو لے کر منت ادا کرنے کے لیے دنگاہ میں جائے اور انھیں صبح سے انتہام
ہو رہا تھا۔ دن کے تین بجے غلطی سمجانی نے کہا۔ تھک چڑھنے کا وقت آگیا۔
ملکہ دھلاں نے اندر سے گلوں اور چھینروں کے بجائے خزان اور سونے کے پاندی
کی ایک سخی میں کدو کا پیکھا لکھا، پیکھے میں بنا، بھرجا، بٹیل باقوت اور
پتے موتی جڑے تھے۔ پیکھے کی باشت بھر بھی بھال سکے نہ تھوچی کی کلیں
سے خود کو دھو بھی مرزا جہاں گیر کو دھلا بنایا کیا۔ سہرا بیٹی کو غلط میں بنا
کر اس کے سر پر بندھوا لیا گیا۔ ملکہ نے سہرا لکھ کر پیکھے کی کشتی اس کے سر پر
رکھی اور بکلیاں لے کر کہا۔ تھک جان میں، مرزا بندہ خنیا کر تم فرنگیوں کے چنگل سے
نکل کر شاہ جہاں آباد آؤ اور میں تمھیں دیکھوں یہ سب حضرت کا صدقہ ہے
تمہاری کشتی سیف حال کر سرداب میں آواز سے جھکا کر دگاہ چلو آؤ۔

بادشاہ نے اپنے سر پر بھلائی کی سینی بیگم نے اپنے سر پر بھلائی اور
عظردان اور بادشاہ زادوں نے اپنے سر پر شیرینی کے خزان لکھے اور
آستانے کی راہ لی۔ بیگمات اور شہزادوں لاکھوں روپے کے زکواریت سے
لدی ہوئی تھیں۔ شاہی کا خزانوں کے دھنچے اور تہل لباس زینت تھے
پلو اور میں نارنوں کی مندی رچی ہوئی تھی۔ پر شاہی عورت کے ڈھیلے پانچنے
دودو لوڑیل آٹھانے ہوئے ملتی تھیں، دو ہاں میں بچھے سے دو پٹا سبائی
تھیں۔ آگے آگے گزرتے ہوئے چوکی اور نقیری بجانے والی عزیزیں مل رہی تھیں۔
چوڑیوں جھانچاں اور بازرب کی جھنکار سے لہریں لیتا ہوا شہر اٹھ رہا تھا۔

● دلی کی ساری خلقت معرویل میں آمد آئی تھی۔ یہاں امر کے پٹکے
مکانات تھے۔ وہ اپنے مکانات میں بیٹھے غریبوں کو جہاں جگہ ملتی پڑ
گئے۔ شہزادوں کے ساتھ عورتوں کے غول تھے۔ گوشت کی چمک اور عابر
کی دھک سے انھیں چمکا چوند ہو رہی تھیں۔ نقیری کی آواز نہ دھاری تھی۔
کوٹھوں پر چٹ کے چٹ گئے تھے۔ تالاب جھرنے اترتوں اور ناظر کے
باغ تک زنا دھند ہو گیا۔ باجماں پر لے کھج گئے۔ سپاہ کے پرے گئے۔

کرہا ہاں چڑھ گئیں پکوان ہونے لگے اور باغوں میں جھڑے پڑ گئے۔
ایک نیچے کی آواز سنگی قابل دید تھی۔ اچھل فرس زربتی نہ
تھیں چاندی کے پنگ باقی ہوئے، بچوں اور کم کرے، منڈیاں دہار
گیراں آئینے اور عیار ٹائوس بخش مذاق اور خوش ادا امان گارنگین
کے سہارے بیٹھے تھے۔ اٹے اور بیجوان گئے تھے، جھرنے کی لٹیں اٹھ ہی
تھیں۔ گلاب پاشی سے گلاب چھڑکا گیا، موتیا کے کدوے گلوں میں ڈالے
گئے چاندی کے خاص دالوں میں لال فند کی صافیں میں لٹھی ہوئی دھیری
پالوں کی گوریل کھی تھیں۔ یکا یک پہلو کے کدوے سے ہر شہزاد اپنے اٹے
رنگ کی ایک بین عورت خزاں خزاں آئی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر
کھڑی ہو گئی۔ اس نے غل پر ایک لفظ ڈالی پھر نہایت ادب سے عدا
عزیز کیا۔ یہ دراصل شہر کی بھارتی تھ۔ پیچھے دوسرا لڑکی والے ایک ملہ نواز
اور ایک میرے والا آمل پوٹا شیں اپنے کھڑے ہو گئے۔ طبل پر تھاپ پڑی
سارنگین پر لہر شروع ہوا۔ طبل نواز نے پیش کار لگا دیا، بھارتی لے گت بھری۔
ایرا معلوم ہوا کہ اندر کے کھڑے کی پری آت آئی ہے۔ تین سلامیں پر
چکو واکت ختم ہوئی سب کے منہ سے سبحان اللہ نکلا۔ بھارتی نے تسلیات
عزیز کی۔ رات بھر تھی تھنی ناچ ہونا رہا۔

ادگر کر کے دوسرے معرویل میں بھی ایسی ہی رنگین خلیں پر پائیں۔
شہزادہ گل اندام کے خیمے میں ناچ رنگ کے ساتھ ہما ویا بھی کرکوش میں
تھے۔ جہاں گیر کا دوا کو جوان میں زلفہ مصطفیٰ خان شہزادے کے پلہ میں بیٹھا
تھا۔ سامنے اس کا بچھری دوست عباس علی خان تھا۔ مصطفیٰ شاپ پر تھی۔ اتنے
میں اطلاع آئی شمش تالاب پر لٹن بازی چھٹ رہی ہے مصطفیٰ خان
پر معرقل سے اجازت لے کر خیمے سے نکل کر خزاں خزاں شمش تالاب کی
طرف روانہ ہوا۔ اس کی عمر سب بائیس سال کے لگ بھگ ہوئی۔ جوانی اور
دولت نے دل کشید ہو میری اور عاشق مزاجی کا ٹوٹ دھار لیا تھا۔ اس نے
جھونے کی صفت پائی تھی کسی تھا پر کرکے تھنے کا قائل نہیں تھا۔ ایک
دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور دل نکلے۔ اس میں بھی دلی کی کوئی
ڈیرے وار طواف ایسی نہیں تھی جو اس کے دل حاضری نہ تھی۔ ہو کر تھی
بالا خاں ایسا نہیں تھا، جہاں وہ جا نہ سکا ہو۔ وہ اپنے وقت کا ایک معرو و
مقبول شامو بھی تھا۔ اس کے دو غل تھے شیفقت اور سترقی۔ غالب کے ہم
عصر حکیم مرقن خاں کی شاگردی اور صحبت نے مصطفیٰ خان شیفقت کی طرف مزاجی
اور شہیدہ میری میں اضافہ کر دیا تھا، متون خود بھی شفیق و عاشقی میں خاصی
شہرت رکھتے تھے۔

شیفقت ابھی تھوڑی دودگ تھا۔ راستے میں قریب کے ایک چھوٹے
سے خیمے کا پردہ ہلا اور ایک ہوشیار بیا صورت زربانظر آئی۔ سہرغز، ہمر
عشوہ، عمدہ زربتی پڑی انھیں سیاہ زلفیں روشن بنگا، بڑی برگ کی سے
سب بنگ



فوٹو گرافی سیکھیے

بذریعہ ڈاک
لٹر پیچر طلب کیجیے

آسان اُردو میں

چار ماہ کے باتصویر کوئرس

جس میں فوٹو لینینا، دھونا پرنٹ کرنا، افلاچ کرنا، ڈارک روم بنانا، اسٹوڈیو بنانا، سیٹا سلائیڈ پناٹ فوٹو گرافی، واٹر کورڈر، فوٹو میٹنگ پیرس ڈی پلا راسٹڈ فوٹو گرافی مکان جانی ہے۔ یہ کوئرس کر کے آپ اپنا فوٹو بھی کھول سکتے ہیں۔ داخلہ فارم و لٹر پیچر بذریعہ ڈاک منگائیے یا خود تشریف لائیے۔

مٹاھانڈہ فیشیہ : بیسٹھ روپے

پاکستان سے باہر بھی طلباء کو کوئرس ایک ساتھ بھیجا جاتا ہے اور ان سے پورے کوئرس کی فیس ۲۵ ڈالری جاتی ہے

ایٹ انسٹیٹیوٹ فوٹو گرافی کی عملی تربیت لینے سندھ بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن حکومت سندھ سے منظور شدہ ہے

پرنسپلہ : زیدۃ لغوی ایم اے

اوقات : بجے ۶ تا ۹ بجے رات تک

فونٹ : ۲۰۱۲۳

لندن انسٹیٹیوٹ

۳۵۶ لے نیشن ہائی وے، ملیر کالونی، کراچی ۷۴۰۰۳

زیادہ نازک ہونٹ، چھوٹوں جیسے رخسار، سنہاں، ناک، ٹخنہ و ہین گول گول نشانے، بلور کی کھالیاں، پنجنہ خائیں یا قوت کی صفائی، سر مندر، سولہ برس میں لڑکی لباس میں سینے سے گردن تک ایک بار کی نظر آرہی نہیں شیفقت کے قدم میں پرگڑ گئے۔ دل پاک باگی زور سے دھڑکا جیمہ کا نام غول کھنکر چہرے پر لگا گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس پری ڈس کے یا تو قی بلوں پر جبا اور جرت کی ملی صلی سکر امٹ انجہری۔ چند لمحوں تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، نگاہوں میں نگاہوں میں دیوانہ ترتیب ہو گیا۔ اتنے میں نیچے کے اندر کسی نے کہا باہی اکاں؟ شیفقتہ چونک گیا۔ لڑکی ہنسی کی طرح کود کر غائب ہو گئی جاتے جاتے اس نے ایک خاص اوجاسے سلام کیا تھا۔ شیفقتہ کے دل کی دیبا ز پر زبانی کیسی تفریح، کیسی ٹالاب کماں کی خوش اعلیاء۔ وہ پھر سے بازار میں لٹ گیا تھا اور ہنر کا نام نشان نہ تھا شیفقتہ کھٹکے کھٹکے دھڑکن سے شہزادہ گل اندام کی مغل میں واپس پہنچا اور خاموشی سے ایک طرف لیٹ گیا۔ دل میں صدی خیالات آ رہے تھے۔ نہ جانے کون تھی؟ ممکن ہے کوئی شہزادی ہو لیکن شہزادوں کے خیمے اس طرف کماں؟ شکل و صورت اور اطوار سے کسی اچھے کھل معلوم ہوتی تھی کس سے پوچھوں؟ کماں جاؤں؟ عباس علی خاں نے پوچھا یہ شیفقتہ، پیر تو ہے۔ طبعیت کیسی ہے؟ شیفقتہ نے جواب دیا۔ سر میں دوپے کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک الگ خیمے میں گیا مگر آرام اور چین کا فوریہ نہ کچکا تھا۔ وہ صورت نہ بہا بار بار نگاہوں میں پھرتی تھی۔ آخر شیفقتہ اٹھ کر پھر اسی طرف گیا کہ شاید دوبارہ دیدار ہو جائے لیکن واپس باہیں آگے پیچھے سینکڑوں خیمے نصب تھے سچ میں نہیں آیا کہ وہ خیمہ کون سا تھا۔ مایوسی اور مطالب کی انتہا نہ رہی۔ وہ دوبارہ وار ایک ایک خیمے کے گرد چکر لگنے لگا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خواب دیکھا تھا شیفقتہ خیمے میں واپس آ گیا۔ اس کی حالت غیر تھی سب کو جرت تھی کہ شیفقتہ کو دیکھتے جھانکے یہ کیا ہو گیا؟ عباس علی اور شہزادہ گل اندام نے بہت سر ہنسا کر راز دل معلوم کر لیں لیکن شیفقتہ کے ہنڑوں پر کالا تھا، اپنے سے زیادہ کسی اور کی رسوائی کا خیال مایوس ڈالنا تھا۔ وہ دیکھنے کوئی نہ دیکھ سکتی کسی کا خیال بار بار نہ خندا اور ڈونڈا۔ اس انجہری اور ڈوب جاتی رات مجرب بے عین میں گزری رات کا سامنا قیامت کا سامنا ثابت ہوا۔

شاہد اسی کا ہم جیت ہے شیفقتہ اک انگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ایک سال گزر گیا یہ سال شیفقتہ کے لیے ایک صدی کے برابر تھا۔ عشق کی جھگڑا میں کائنات ہونے کے بجائے شعلہ بوزال ہو گئی تھی۔ وہ عینوں گوشہ نشین رہا پھر بعض اس خیال سے مغل میں آ جانا شروع کیا کہ شاید کہیں اس پر لعل الجہاں کی دوری جھلک دکھائی دے جائے مگر مایوسی کے سروا سب تک

کچھ مانتے نہ یا نہ مزادہ گل انما اور عباس علی شب روز کے جلسہ دہم تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شیفقتہ کس ازاد میں مبتلا ہے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے سب کچھ اگلا لیا اور جہان تک ممکن ہوا، اس کو ہر باب کی نکاش میں گھومتے دوڑائے گئے۔ باہر فن گشتیاں بھی مقرر کی گئیں۔ وہ مختلف گھرانوں میں جا تیں اور اس کے ٹوٹتیں۔ اس گم دوہیں روپیہ پانی کی طرح بہا یا گیا لیکن کبابی کی کوئی صورت نہ نکلی شیفقتہ ہزار سو کے ایک بارچہ گوشہ نشین ہو گیا۔ اپنے کلید احزان میں بند ہو کر وہ ہر وقت شعر و سخن میں غرق رہتا۔ ایک برس اور بہت گیا جاڑے آگئے، دلوں کی نیگھتیاں گرم ہو گئیں۔ ایک روز شیفقتہ اپنی عالی شان عویلی کے دیوان خانے میں تنہا بیٹھا تھا۔ عید الفطر کی رات تھی۔ عباس علی آگیا شیفقتہ نے اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ عباس نے کہا: میں بیٹھنے نہیں آیا ہوں، تمہیں لینے آیا ہوں۔ اٹھو دیوان جی کے پاس چلیں گے۔

”دیوان جی کے پاس؟“ شیفقتہ نے بھروسہ نہ کیا۔ ”وہاں کیا ہے؟“ ”اٹھو تو سہی والدہ لکھت آجائے گا۔“ دیاں نصیر نے دلوں کی محفل ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ وہاں ہر عید پر محفل ہوتی ہے؟ سننا نہیں اس سربہ نارول کا ایک طائفہ آیا ہے۔“

”نارول کا طائفہ؟“ شیفقتہ نے عقارت آہستہ سے کہا۔ بھلا اسے کیا آتا جانکا ہوگا رعایت کرنا مجھے قصباتی طائفوں سے کوئی دل چاہی نہیں ہے۔“

”تمہیں نہ سہی مجھے تو ہے۔“ عباس علی خاں نے نہیں کرکھا۔ ”وہاں غامے شرفا آ رہے ہیں کوئی ایسی ویسی طوائفیں نہیں ہیں۔ سارا ہنر کھولنے میں دلی میں رہ کر کیا ہے۔“ دلوں خاں مرزا غالب اور صاحبہ کے مہربان صدالین آرزوہ جیسے نقد لوگ بھی محفل میں شریک ہوں گے۔“

”تو ان اور غالب کا ہم ایسا نہ تھا کہ شیفقتہ کرکشتش نہ ہوتی۔“ اسی وقت اٹھ کے ہاتھ منہ دھو کر پڑے۔ بے ادب و ساری میں بیٹھ کر دیوان جی کی محفل میں طرف روانہ ہوئے۔ محفل میں دل نکلا ہوا غلام بھی میں تین سرور چلانا کھڑے کیے گئے تھے۔ والاں دلالان دروں پر پڑے پڑے تھے۔ غالبین کے کرکشتش زربفت اور کم خواب کے گاؤں جینچے چادریں طرف

گلوگ جی نفرتی گلاب، ہوجان اور حقے ترینے سے لکھ ہوئے تھے سب میں کھنکھو کا عسری خیمہ بھرا ہوا تھا جو سونوں میں عود مل رہا تھا۔ دوردور تک تک بارہا بھی جھگڑا جھگڑا تھا۔ کبھی نہیں ان پر کار کا پتہ پتہ پڑے تھے کشتیوں میں سونے پستے، الہامی دانے اور فضل دیکھے تھے۔

محفل کے لیے تیزی چائے تیار ہو رہی تھی چھت پر بھاؤ لنگے تھے۔ بلو کہ نہیں محفل میں محفل کر رہی تھیں۔ دیواروں پر دیوار گریبان آویزاں تھیں۔ فز پرچاندی کے دو شانے سر شانے تھے تمام محفل رجا رجا کر رہی تھی۔

ان کے عکس سے تو آدم آئینوں میں عجیب نظارہ تھا۔ معزز زمان ایک ایک کر کے آرہے تھے۔ نیزبان نے انھیں صوبہ مرتب بٹھا یا مصطفیٰ خاں شیفقتہ اور عباس علی خاں پیچھے ہی تھے کہ شہزادہ گل انما کی سواری آ گئی۔ دیوان جی شہزادے کے استقبال کے لیے ایلے اور اسے لے جا کر صوبہ میں بٹھا یا شیفقتہ اور عباس علی خاں پیچھے ہی تھے۔ پھر مرزا قیام بگ ساکت آئے۔ بالا فامات مرغ و سفید رنگ۔ وہ مرزا غالب کے ناکور شہزادے تھے۔

سب کو آداب کہہ کے ترینے سے بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد اطلاع ہوئی کہ مرزا غالب تشریف لے آئے ہیں۔ غالب نہیں میں سو رہا تھا۔ ترکانی لباس زیب تن تھا۔ سر پر کلاؤں و جواہر اور جسم پر آنکھ کا تھا۔ آنکھ پر پیرتیں کی تھیں۔ دیوان جی لب لباب کرشمہ پر کلاؤں کے لیے گئے اور انھیں اپنے برابر لاک بٹھا یا ان کی مزاج پر کسی اور مرید کی مبارک بادوی۔ اتنے میں دیوار اور دیوار پر بھگڑ کر کے نوران لوہاں اللہ بن خاں کی سواری آ گئی۔

نصیر اللہ بن خاں کا جسم ایسا سادہ دل تھا کہ باوجود شاید دلی میں اس کی وجاہت کی نظیر نہ تھی۔ سر پر چوکر کشیدہ لٹری تھی اور جسم پر ان موسم میں عام دلی کا کاجکھا، داغ کھلے کے اوپر کھراب کا سینہ بند۔ اس کا دنگ میرہ و شہاب کے مانند تھا۔ بات کرنے میں منہ سے پھول پھوٹتے تھے۔ وہ بات بات پر کھرا دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا کی خوشی اسی کے حصے میں آگئی ہے۔

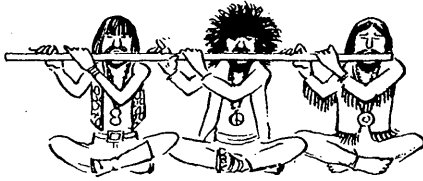
کچھ دیر بعد حکیم حسن خاں اسے سب کی نظر میں ان کی طرف آٹھ گئیں۔ ایسے خوب اور اور صاحبہ زیب آدمی دلی میں کم ہوں گے۔ کشتہ قاتر مرغ و سفید رنگ بڑی بڑی روشن آنکھیں دلاؤں بکلیں کھینچتی ہوئی جھولیں بیسی سنواں تاک

تیلے تیلے میوٹ، آن پران کا لاکھا جا ہوا۔ ستیہ کا کردہ دانت، ہلکی ہلکی مریخیں خفگی داؤھی، ہرے ہونے ڈنڈ تیل کی مڑا سینہ اور لمبی آنکھیاں سر پر کھنکھو گڑا لے لیے لیے بال کاٹوں کی شکل میں۔ غالب نے اٹھ کر دلوں سے

معافہ کیا اور انھیں اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ کچھ دیر میں نصیر اللہ بن خاں آرزوہ بھی آ پیچھے۔ گلے سے گھٹنوں تک کرنا تھا۔ اس پر مرزا قیام اور صاحبہ اور کچھ صاحبہ نے مسرت کھڑے ہو کر انھیں تعظیم دی۔ دیوان جی نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ نصیر و سرور شروع ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جایاں گے۔ ایسی محفل میں شرکت ان کے عہدے اور تقدس کے خلاف تھی۔ دیوان جی کے ہاؤس پر نصیر ان کی خاطر آگئے تھے۔

خام چائے کا سامان چھینے گئے۔ دیوان جی نے میرکون منظر کا اشارہ کیا۔ میرکون دوسرے کمرے میں گئے۔ چند لمحوں بعد لٹری پرودہ ہٹا، دو نور و نور طوائف محفل میں نمودار ہوئیں۔ ان کے عقب میں ناکہ تھی۔ دونوں آفتاب ہاں تھیں۔ نقد گویا مصور کے قلم نے کھینچا تھا۔ موتی میں آب کی کی ہو

کھتی تھی شکران کے رنگ میں کوئی کی نہیں تھی۔ شہابی رنگ کی چھت پر فز جیشانیان ان پر سات لڑی کا بھرم۔ نظر اٹھانے میں آٹھتی تھی۔ فز سب بنگ



موتی کہنے لگے : بائی جی ! دل میں خرد دانوں کی کمی نہیں ہے۔
دلی والے خود جو برتال کی تماش میں رہتے ہیں، امید یہی ہے کہ آپ
کا نقشہ خوب بنے گا۔

رجوئے ہنس کر جواب دیا : سرکار ! ہماری کیا سادہ لوحت چاہیں یا
ادھر ادھر کا رخ کر کے سب قیمت کا کھیل ہے۔ آپ تو فرمائیں گے تو نقشہ
مجی جم جائے گا اور مجال بھی ابھی بچے گی۔

”کیا کہنے ہیں“ عباس علی نے خوش ہو کر کہا : ”میرے لڑانا خوب
مہانتی ہوگی سمجھ لو، یہاں بھی انٹرویو نہیں کھلاؤ بیٹھے ہیں، ایسا نہ ہو کہ
مات کھا جاؤ۔“

”آپ تو غواہ خواہ شہرہ دیے جلتے ہیں معلوم ہوتا ہے کھلاؤ ہیں
سے کبھی بالائیں پڑا ورنہ ہیں دعا نہ کرتے۔ اس آرزو میں کہ ہم سے بالا
ماریں نہ جانے کتنوں پر پالا پڑ گیا۔“

”ہم بالامانے کا حقوق پالتے ہی نہیں۔ ماں ضرورت پڑے تو
جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔“

”چیز آپ جتنے بندی باری۔ ہم لوگ تو آپ ہی کے محکوموں پر
پلتے ہیں۔ ہمارا کیا جواب کے منہ نہیں۔ اپنے فن میں جناب بھی بڑے
نٹ کھٹ معلم ہوتے ہیں۔ برادرین کو کھڑا کر کے آپ کے خیال میں ہے۔
عباس علی اس ضلع جگت کا دار نہ سہر کے بغلیں جھانکنے لگے۔

غائب نے سرکار اکرامتہ میاں ! بولونا اب کیوں بے سرے ہو گئے۔
تو کی تمام ہو گئی؟“

عباس علی فاس نے جھنجھری لی : ”اُٹاؤ ! یہ کیا فرماتے ہیں میں اور
بے سرا؟ یزید اگے تو مری دنی بے مری ہے۔ بولوں کیا، بول تو مال مری
ان سے نہیں ملتا، ان کے ساتھ سخت کتنا پستے میں ہیں۔“

خوش گدیاں ہوتی رہیں۔ رجو کی شرمخیاں پیٹے ہوئے تالین کی
طرح گھلتی جا رہی تھیں سرمدی خانم نے اسے آکھ کا اشارہ کیا۔ وہ تانات
سے خاموش ہو گئی۔ یہ محض ایسی دھمکی کہ وہ اپنی خوشی طبع میں آزماتی۔

دیوان جی نے لوگوں کا اشارہ کیا کہ سارنڈے نکالے جائیں سارنڈے آگئے۔
انھیں نے سب کوسلا کیا، سارنگیے نے سارنگیوں سے غلات آٹا کر لڑپیں
ملائیں طبلہ نواز نے بھی اپنی گھڑی کھولی اور ملائم کو چھوٹی جھنڈی سے
ملا کر شروع کیا سارے سارنڈے لگے۔ دونوں سارنگیے دائیں بائیں پیٹھے طبلہ
نواز پیچھے بیٹھ گیا۔ ایک خادم نے ان پر دلا کر پیش کیا۔ بی جان نے نزاکت

سرور خان ! چال ملاؤ سی لباس کی تراش خراش میں بگمیں سے بھی بڑھ کر۔
آسمانی دوپٹوں میں شائے بھرے ہوئے تھے۔ وہ بانچے ماتھوں میں اٹھا۔
اٹھلا ہوتی محفل میں آئیں۔ ساری محفل پر ان کے سخن کا رعب سا چھا گیا۔
تھیفقہ نے نظر اٹھا کر دیکھا اس کے قلب کی حرکت بند ہوئے گی۔ اس نے
کا پتی ہوئی انگلیوں سے عباس علی کا بازو تھام لیا۔ عباس علی آنے والوں کے
جلوسے میں گم تھا۔ اس نے تھیفقہ کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ لوکیں
’جھک کر خراج بجالائیں۔ دیوان جی نے سرکار اکرامتہ اٹھا یا : پیچھے جائیے دونوں
نے نہایت تہذیب سے پھر سلا کیا اور محفل کے بیچ میں بیٹھ گئیں نوکر نے
ان کے سامنے لنگا کھجی خاص دان رکھ دیا۔ دیوان جی کے ہاں کا پان معمولی
پان نہیں تھا چھاپا ہوا وہ ہیں پتی ہوئی تھی۔ ڈل ڈلی رابر کی کتری ہوئی،
کچھ آگلاب ہیں، ابا ہوا رست کی گولیاں بھی خاص دان کے دھکنے میں
موجود تھیں، پر گولیاں خاص دیوان جی کے لیے کھنڈ سے بن کر آتی تھیں۔
زیادہ تر نہیں تھیں مگر خوشبو اس کی کھل کرنے پر بھی مزہ ملتا ہے۔ لوکیں
نے بڑے انماز سے ایک گلدی اٹھا لی، اس میں سے لوگ نکلی اور چھوٹا
سامنہ کھول کر ماتھ پر لگا کر گلدی منہ میں رکھ لی۔ پھر سرت کی گولی نکال کر
منہ میں ڈالی۔ دیوان جی کہنے لگے : ”دوہین کھاؤ، یہ تیرہ تھیں نہیں ہیں۔“
ان دونوں میں سے ایک نے نہایت دل پرانہ انماز سے آکر کیا۔
”حضور میرے سر میں پچر آجائے گا۔ مانچنے کے قابل نہ رہوں گی اور پھر
طبیعت بھٹکا نے نہ آئے گی۔“

موتی کی نگاہیں تارہ کن کر رہی ہوئی تھیں معلوم ہوتا تھا، نظروں نظروں
میں ان کا سخن پی رہے ہیں تھیفقہ نے ایک مرتبہ دیکھا تھا، دوبارہ نگاہ
اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بار بار دہانے سے چہرہ پوچھتا تھا۔ عباس
علی نے لوکیوں سے کہا : سبحان اللہ ! آپ تو انگلیوں پر پنجابی ہوں گی۔ ہم
تو آپ کو دیکھ کر ہی پھول گئے، پھر اس نے ماکہ کی طرف رخ کیا۔ سرمدی
خانم ! آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ ہم تو سمجھے تھے، اب دلی کا رخ نہ
کریں گی۔ یہ نچیلان تو آپ نے خوب تیار کریں۔“

سرمدی خانم نے آداب کیا : ”آپ کا سخن نظر ہے۔ لڑکی کہاں
جاتی؟ ملا کی دودھ سمجھ کر بھی کبھی وطن کے کوچوں کی یاد دلاتی ہے تو
کچھ دن وہاں آتی ہیں مگر ان لوکیوں کا دل وہاں کھلا ہے۔ یہ ہیں
بل پڑھی ہیں آپ حضرات انماز دیکھا، کبھی تو میں ہمارے لیے
سب کچھ ہے۔ بڑی کامیاب راجو ہے، چھوٹی کا جھنگو۔“

رجو اور جھنگو نے اس تعارف پر ادب سے کھڑے ہو کر حاضرین
کو سلام کیا تھیفقہ نے نگاہیں رجو کی نظروں سے ملاں۔ ایک تخت رجو نے
مجی تھیفقہ کو پہچان لیا۔ اس کے لبوں پر ضعیف سکراہٹ پلید ہوئی۔ اس
سکراہٹ میں چاروں معنی پراشار سے اور گھٹے شکوے نہ پناں تھے۔

سب بنگ

سے پہلے دایاں کان چھڑا، پھر زمان کوہ مرکز نہ گئیں۔ سارا گلیوں نے شہر
ٹھاٹس ملایا، بنی جان نے نیچ کا تان چڑھ لایا جب چاروں ناول گئے تو
سب نے کہا: سائل اللہ طبع والے نے خواب دی۔ دونوں کے دل
گئی۔ بنی جان نے سب سے اجازت چاہی اور وقت کا راکر ہاگ الاپنا
شروع کیا۔ میری آواز۔ درو دیوار سے مرتبہ سے لگے۔ الاپ تم کر کے
بلبت خیال چار دم کے تلوڑے میں گا یا سب نے سانس کی تریف
کی۔ اس کے بعد ذرت خیال نہیں آئی میں سنا یا۔ ایک تان آئی، ایک تان
جاتی۔ یوں نے وجد میں آکر کہا ہے

اُس خیرت نامید کی ہر تان ہے دیکھ شعلہ سا ایک جائے پئے آواز تو بکھو
آسانی دکانے کے بعد ٹھری اور دلوڑے کی فرائش ہوئی۔ کھاج کی ٹھری
شروع کی گئی ہاگ صاحب بولے۔ اگر زحمت نہ ہو تو بتائیے بھی۔ لوگوں
نے جھانپنا شروع کیے مصل تڑپ اٹھی۔ آخر میں انھوں نے غائب
کی طرف اشارہ کر کے اُن کی ایک منزل گائی۔ ایک ایک ہل سوسوزن
سے ادا کیا۔ اگر کوئی زبان سے ناواقف ہوتا تو جس سارا مطلب زرت سے سمجھ
جاتا۔ ہر زرت پر غائب کی طرف اشارہ ہو رہا تھا۔ عین د آفریں کا غلغلہ تھا۔
سلا کرتے کرتے لوگوں کے ہاتھ تھکے جا رہے تھے۔ کچھ دوا گانے کی تھی۔
کچھ غزل کی۔ سماں بندھ گیا تھا۔

رجو کا پرکشش رہا کا ختم ہوا۔ نئے دایاں پر سحر طاری تھا۔ غائب
اپنی غزل سن کر سکیاں لینے لگے تھے۔ جانے کون باگیا تھا تو بہت
تھے۔ اُن کی نگاہ رجو کے سینے پر جمی ہوئی تھی۔ شیفقتہ بھی رہ رہ مکتا
تھا لیکن اُس پر شہد بہ جرت طاری تھی۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ اس شب
چراغ کی نکلاش میں ہے۔ وہ کیسے ادا کرمان لے گا۔ محبوب کی ہر تان پر
دل کے سوسو کوڑے ہو رہے تھے۔ رجو کا بولنا، مسکانا، لہانا، مٹنا، شرمانا۔
شیفقتہ اُس کی کس کس ادا پر فدا نہ ہوتا۔

رجو کے بعد سردی خانم نے جنگجو کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر دوسرے
کمرے میں گئی۔ وہاں سے چند لمحوں بعد لپٹا زپن کر ایک ایک ہنگلو
ہر یوں میں باندھ کر خاص ناز ادا سے برآمد ہوئی، ناچنے کے لیے کھڑی ہوئی
تو عباس علی نے تاب ہو گیا۔ ویسے بھی اُس کا تخلص بے تاب تھا۔ شہزادہ
گل اندام نے بھی بے جا میں پورک پورک بولا۔ جنگجو عجب ہمارت سے چل رہی
تھی، ایک ہنگلو کی آواز بھی نہیں نکلی۔ دو شعلہ شعلیں روشن کیے حاضر ہوئے
شعلوں کی روپیل ڈنڈیاں شروع کی گئیں۔ اُن میں آڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے
ایک ہاتھ سے شعلہ تھا، کبھی تھی، دوسرے ہاتھ میں تیل کی کٹی تھی۔ اُس
پر بڑی لمبی روپیل شاخ چھٹی ہوئی تھی۔ جنگجو ناچتی ہوئی جدھ جاتی، شعلہ
اُس کے ساتھ ساتھ جاتے۔ پیچھے دو سائز سے تھے، ایک کے پاس طبلہ
تھا، دوسرے والے مجرے بجار ہے تھے جنگجو کی رفتار بے حد تھک

تھی، تاہم پچھا دیے جانے تو ایک ہی نہ لڑتا۔ گھنگروؤں کا یہ عالم تھا کہ شیفقتہ
گھنگرو چاہتی بجاتی، باقی سب بند رہتے۔ کسی اچھے ٹھک کی شاگردی کی تھی
ناچ میں ایک ایک ایسی ادا کہ سوسول قریان۔ زبکی کی پینل اچھی رات
تھک جاتی رہی۔ اس کے بعد رجو کا گانا دوبارہ شروع ہوا۔ اس مرتبہ اُس
نے تو کئی کی غزلیں گائیں سب جھجھکتے رہے۔ آخر میں کسی نے کہا۔ بنی رجا
شیفقتہ کی بھی کوئی چیز یاد ہے؟

رجو نے کہا۔ سیکون نہیں گئی غزلیں یاد ہیں۔
غائب کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی۔ منہس کر بولے۔ بنی جان اکیلا
کبھی شیفقتہ کی زاریت بھی کی ہے؟

رجو نے جواب دیا۔ آج تک یہ حسرت دل میں ہے۔
عیاس ملی بے تاب نہ جلدی سے بتایا۔ لاج تھاری نہ حسرت
پوری ہو گئی۔ نواب مصلحا خاں شیفقتہ تھارے سامنے بیٹھے ہیں۔ جی بھر
کر دیکھ لو انہیں۔ رجو کا دل زور سے دھڑکا۔ عارف تھی تو کیا ہوا، تھی تو
کس کی تھک کی گئی، جیسا کا اثر باقی تھا۔ اُس کا چہرہ گھٹا ہو گیا۔ تمام کی نفق
ایک دم بھول گئی۔ انھوں میں شروع شروع دوسرے پڑ گئے۔ اُس کی آواز شیفقتہ
کی نگاہیں چار ہوئیں۔ رجو کا دل بے قرار ہو گیا۔ شیفقتہ کی انھوں کے
پیغام اُس کی انھوں میں ملنے لگے۔ یہ پیغام کسی نامرد فاصد کے بغیر لکھے
تھے۔ سوال و جواب ہوئے۔ گئے۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی
کوشش میں تھے۔

رجو نے پلے بے پلے شیفقتہ کی کئی غزلیں گائیں۔
پڑانہ وار جلدی نہ ہو رہے ہمارا۔ اُس قمع و پرمزنا مشورے ہمارا
یہ کیسا فرقہ ہجران نے ڈالا
نہ پوچھو شیفقتہ کا حال صاحب یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے

ملنے کا برسے اوتارے چھوڑا کر گئے گدوست ہیں انیالو سوزا نہ کریں گے
تزی عویاں غیر کیا جانتا ہے توصیلا ہے جس میں ملا جانا ہے
لئے کچھ خلوت کی کیا ہے ضرورت ہو مصلحت نہ مل جاتا ہے
لے شیفقتہ اس فن میں ہل لک رہی تھی۔ گھر سے میری اچھی آئیں برس کی
ہر غزل کا انداز نیا تھا۔ رجو نے جھانڈا زرت کے ساتھ کلام کا
نشد و آئندہ کیا۔ شیفقتہ نے لفظ بدل دیا۔ پلے میں زرت کے بیٹھا تھا۔
دوسروں کی دیکھا دیکھی اُس نے اُس آئندہ ایمان پر اشرافیاں نکالیں اور
سب تک

men demand
CAPSTAN
the world over

world famous long size

filter tipped

CAPSTAN 20

Rs. 4.40 for 20 Rs. 2.20 for 10

PTC71 CA1

آفریں باقوت کی سریش قیمت انگوٹھی آگاہ کر اس کے دلوں میں رکھ دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے کسی اور دنیا میں ہے۔ حاذق کو اس کے داد و پیش پر تعجب نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس معاملے میں اس کا ہاتھ کھلا ہوا ہے مگر ظالموں سے دل لگانا اور ان پر اس طرح داری صدمتے ہر نام اس کی افتاد و طبع کے خلاف تھا۔ اس پر لوگوں کو تعجب ہوا۔ نواب ٹمس الزبن خاں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ شہیدت سے بچا دکھانے کے لیے ایسی عداوت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ دونوں نواب تھے بلکہ ابن نواب۔ دونوں کو ان کے داد و پیش نے اپنی زندگیوں ہی میں راسخوں کا ملک بنایا تھا۔ دونوں پیش و عشرت کے دل دادہ اور نہایت کھلے تھے۔ آپس میں ملنے جھلنے اور بے لگنی کے باوجود ایسے معاملوں میں کبھی بھی رفا نہایت پتہ پتہ جاتی تھی۔ چند روز تک طبیعتوں میں طال رہا، اس کے بعد پھر پہلے کی طرح ملنے جھلنے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ دل آئینے کی طرح صاف اور سینے کے لیے نہ ہوجاتے۔ نواب ٹمس الزبن خاں نے دیکھا کہ رنجو کی نظر میں بار بار شہیدت کا طواف کر رہی ہیں۔ شہید کا اور طاقت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اس نے اس کا ایک ہی علاج دیکھا تھا۔ ایسے موقعوں پر فرارے کا مہم نہیں دیکھنا چاہیے۔ ان عدوتوں کی نفرت ہی سے دولت پر پھیلے جھگڑتی ہیں۔ شمس اور دن پر پید میں مگر جو کے معاملے میں ٹمس الزبن خاں جو کا دکھا گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہاں دولت اور شرف کا تقابل نہیں ہے بلکہ فتنے میں سے مگر آگیا ہے۔ رنجو شرف کی دولت سے بالامال ہونے کے علاوہ ناچ گانے کے فن میں طاق تھی اور شعر بھی اناجواب کہتی تھی بڑے بڑے اساتذہ اس کا کلام سننے سے حیرت میں آجاتے۔ اس نے شہیدت کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ شہیدت کی بہت سی فریادیں اسے باور تھیں۔ اکثر تمنائی میں وہ دوسری تھی کہ شہیدت کیسے ہوں گے؟ اس نے دل کے نال خانی میں ان کی سینکڑوں تصویروں میں سجا رکھی تھیں۔ ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے وہ اسے چاہتی تھی اور اس وقت تک اسے یہ علم نہیں تھا کہ شہیدت شاعر ہونے کے ساتھ ایک بڑی رباہت جہاں گیر آباد و طاقتور خیرے مالک بھی ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں ٹمس جہاں گیر آباد اور شہیدت نے اس کے لیے ایک الگ شخصیتیں تھیں۔ رنجو مولیٰ کی باگشاہت بھی نہیں بھولی تھی۔ اس شب پچھلے پر وہ مرزا جہاں گیر کے غم سے خرا کہ تھکی باغی لونی تھی اور تازہ ہوا کھانے کے لیے اپنے ڈیرے سے نکلی تھی۔ اچانک ایک جہان رننا، شریف صورت آنکھوں میں غم بیلری کے صدر چڑا کر بیٹھے پرستان کے قہار نے اس کی طرح سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کی لکھلا ہٹ، بد سماوی اور جرمیوت ہو کر نکلا۔ یہ سب باتیں رنجو کے دل پر نقش تھیں۔ اپنا قرار سے سلام کرنا بھی اسے یاد تھا۔ وہ اس نوجوان کو دلی دیکھ نہیں بھولی تھی۔ نہ جانے کون تھا، اس کی آنکھوں میں کیسا

اضطراب تھا، کبھی چہچہا اور بے چینی تھی جیسے کسی غم زدہ دولت کی تلاش میں لاپرواہی چہچہا ہو رہا ہو۔ وقت کی گزیرش نے یہ تقویٰ بھلا کر لوٹے تھے لیکن غم نہیں کے تھے۔ آج اتنے دن بعد وہ ایک انجی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ رنجو کا ایک رات تھا جیسے وہ صدمت اسی کے لیے گامی ہے اس نے اپنا رافنی اس کے قدوں میں رکھ دیا تھا۔

آخر میں جھگو کے جہانے خود رنجو نے ہاتھ میں لکھ کر داندے اور ہاتھ کے لیے کھڑی ہوئی۔ حاضریٰ تھیں کر بیٹھے۔ پہلو بدلے گئے اور گاہیں دقاہ کے پردوں پر چم گئیں۔ ان حسین نازک بدوں کی دل فریب حرکت کے ساتھ چلنے کے کس کس کا دل ڈانڈا ڈول ہو گا۔ رنجو نے پھر کا شروع کیا تو رنجو کے سامنے میں ڈھیل ہوئے بدن کا ایک ایک عضو چمکے لگا سٹاں نے پر ہم کھٹک تھیں۔ اس شکل سے مشکل توڑے سے نکالے پھر کے کی تقسیم ایک سولہ تک دکھائی۔ آخر میں تنکا کا کمال دکھا یا۔ سب نے یہ کھول کر داد دی۔ جھگو کا ناچ بھیج ہو کر گیا۔ پھر جرمیوت رنجو کا ناچ شروع کیا اور غفل کی فطرت لٹی ٹمس الزبن خاں صدمت سے خود ہو کر جھم ہو رہا تھا۔ رنجو پر دودھ جاری تھا۔ غالب اپنے بوش میں تھے شہیدت گردن جھکا کر بیٹھا تھا۔ بے جان تہ کی طرح۔ اس کی آنکھیں غم تھیں۔ ناچ ختم ہوا تو دیوان بی نے داد دیتے ہوئے کہا۔ بی رنجو جی خوش کر دیا یہ فتنہ پر ختم ہے، ہماری اتنی عمر ہونے کو آئی، بڑے بڑوں کا ناچ دیکھا ہے لیکن مور کا ایسا ناچ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ چاہنے، مانچنے جب مور اپنے پر دیکھا ہے تو اس کی آنکھوں سے آسموں داں ہوجاتے ہیں یہ کیفیت جس خوبی اور چٹائی سے تم نے ادا کی، تمہارا ہی حصہ ہے۔

رنجو رنڈ کھڑے ہو کر آداب بجالایا اور شان سے بولی۔ آپ کا شرف نظر ہے لوڈی کے باجے میں یہ ارشاد فرماتے ہیں، آپ حضرات کی داد میرے لیے باعث فر ہے۔ آپ ڈرے کو آفتاب بناتے ہیں۔ اس نے پھر تھک کے سلام کیا۔

غفل اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ سازندوں نے ساز باندھنے شروع کیے۔ سردی خانم نے ایک گوشے میں رکھا ہوتوں کا جٹا بغل میں دیا یا اور آداب و دیلیمات کے بعد جانے کی اجازت طلب کی۔ شہزادہ گل خانم نے اسے جھپٹ لائی جی، اپنا جوڑا مجلس میں بھی بغل میں ڈرائے کھتی ہو۔ سردی خانم بھیجی ہوئی عورت تھی۔ بے ساختہ انھیں بے صاحب حال خدا سلامت رکھے۔ لوڈی اپنا جوڑا ہمیشہ اپنی بغل میں رکھتی ہے۔ جیسوہ بی کا جوڑا ہے جو فر و شب خدمت کار کی بغل میں رہتا ہے۔

شہزادہ اب شہیدت کے سامنے ایک نئی آنکھ منزل تھی اسے سر کرنا بھی بہر آسان لیکن حقیقت میں بہت دشوار نظر آتا تھا۔ اضطراب میں تسکین کے ڈھونڈ



شہر کے گلی کو چے اور بازار مسلمان تھے لیکن جاوڑی بازار میں ہن
نکلا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنی تھی ان کھٹوں پر سبز آواز کا ہنگامہ تھا۔ بازار میں
سب بنگ

کسی سے راہ پر چھے بغیر میرے سروروی خانم کے دروازے پہنچ گئے۔ یہ گلی کا سب سے آخری مکان تھا۔ یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ شیعہ تہذیب کی جان میں جان آئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر دل کی بیرونی کھڑکیوں سے روشنائی بھاگتا ہی نہیں اور گائے بجلانے کی بگلی گلی ٹاڑیل آ رہی تھیں۔ ریکالوں کی پھٹیں ملی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے چاندنی میں ایک عجیب سرگورام نظر پھیلا ہوا تھا۔ سروروی خانم کے کھلے دروازے میں ایک چھوٹی سی ڈوبوھی کے اندر طاق میں مٹی کا دیبا جل رہا تھا۔ بان کی گھڑی چار بائی پر ایک بوڑھا شخص تختہ گواڑا رہا تھا۔ آہٹ پا کر اس نے تختے کی نمد سے لکالی اور دو شریف صورت آدمیوں کو دیکھتے ہی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ "تشریف لائیے۔ کیا حکم ہے؟"

چاندنی سے کہیے کہ صطفی خان کس جہاں گیا اور تشریف لائے ہیں۔ اگر نعمت نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بات کر لیں، عباس علی خان نے کہا۔ جو حکم ہو۔ دربار نے ادب سے سلام کیا اور اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد سروروی خانم سر پر دوپٹا سنبھالی، کچھ گھبراہٹ، کچھ خوش ہوئی، سردار ہوئی اور ان دونوں کو مکان کے اندر لے گئی۔ "زپے نصیب کہ حضور نے قدم رنجہ فرمایا اگر کسی ملازم کے ذریعے سرکار پہلے سے اطلاع فرمادیتے تو آپ کو زیادہ زحمت نہ ہوتی۔ بہر حال آئیے خاٹہ لے کر نکلتے ہیں۔"

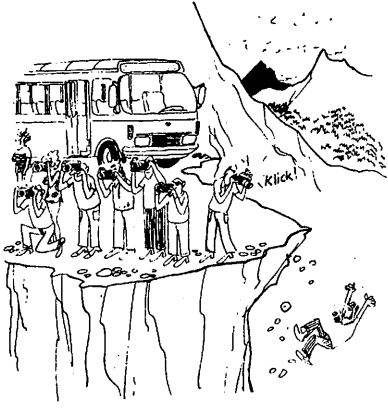
انہیں ملنے منزل کے ایک سبے جہانے پہنچ کر سے پہنچا گیا۔ کمرے کی اترائش دیر بائیں میں سادگی اور انعامت تھی۔ شیعہ تہذیب خوشی ہوئی اور دو دربار پر عمدہ سفیدی تھی، اس پر روشن کے رنگین مائے، جا بجا قدیم تعلیمی نعرے اور کتبتے تھے چھت میں دو خوش نما بھانڈا، فانوس تھے۔ دلیز میں پائے پتالوں کی جگہ مرگ جھالیں تھیں اور دروازوں پر کھارے کے ٹاپی کے پرے تھے۔ زمین پر سردی اور سردی پر ترقی چاندنی تھی۔ چاندنی پر وہاں میں اور زمین میں نرم ہوشیاریت ایرانی قالینوں کا فرش تھا۔ دونوں طرف دیواروں کے سہلے پھول دار نقاشی والے گول تیکے رکھے تھے۔ پان دان بیک دان اور تختے بھی فرینے سے رکھے تھے۔

"کل دیوان جی کی فضل میں تو آپ نے کمال کر دیا۔ واللہ آپ تک اس کے تصور سے بھرم رہا ہوں۔" عباس علی نے بات شروع کی۔ بی رحمی نے غضب ڈھکا اور اب صاحب اسی وقت سے مضطرب اور بے چین ہیں۔ "مگر کالی فہ لازمی ہے۔ ہم لوگ تو آپ ہی کے ہاتھ تختے والے ہیں۔ سروروی خانم نے غور سے شیعہ تہذیب کو دیکھا۔ وہ شاید اپنے شکار کو بھاگ رہے ہیں تو اب یہی تھی کہ اسے کس طرح فریاد کیا جاسکتا ہے۔ ایک خندہ بگڑی سانس بھر کے وہ بولی تو اب صاحب اکیا عین کرکوں میں نے ان لوگوں پر کتنی غمت کی ہے اور ان کی تربیت پر زہر پیسے پانی کی طرح بہا رہا ہے لیکن اب نواز نے کاڑگ دھنگ ہی کچھ ادا ہے۔ زور جسے کام نہیں چلایا۔

رحمونی جب سے دل آئی ہیں میں نے بہت کہا کہ مرثیا، دیوں کا کم کب ہم چلے گا؟ تم بہت وقت خود شاعری میں گم رہتی ہو کچھ انھیں کھولو، ہوش کے ناخن لو۔ بڑے بڑے شیس اور جاگیر دار آگے پیچھے بھرتے ہیں بخود کسی طرف متوجہ ہی نہیں کرتی۔ مرزا جہاں گیر ملازم رکھے کر فرماتے تھے، اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں تو دھک سے روگئی کہ یہ کیا غضب کیا جہاں کی رعایا میں، بادشاہ زادوں کو یوں کر جواب نہیں دیا کرتے لیکن دھوکے کا ان پر سچوں نے نہ رہی۔ ابھی آپ کے تشریف لانے سے آدھ گھنٹے قبل ہمارا احبابا کے چھوٹے بیٹے کنوارا محبت سنگھ آئے تھے انھوں نے میرے تہذیب میں بڑا اثر نہیں کا تو لڑا رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کے قدم پچھڑے اور عرض کیا، سرکار! یہ کیا کرتے ہیں۔ لڑائی کی یہی عادت افزائی کیا ہم ہے کہ آپ تشریف لائے۔ میں بڑا حاضری خدمت ہوں۔ انھوں نے رخو کا سوال کیا میں نے عرض کیا، مجھے جھلا انکار کیا۔ کجاں لیکن حضور! یہ بات اسی سے کہیں انھوں نے اس سے بات کی تو وہی ہوا جس کا ڈرتا۔ رحمن نے صاف انکار کر دیا۔ پچھون ترسوں ایک صاحب کہیں رام پور پرفصل ملی خاں صاحب کا بیٹا ہے کہ اسے تھے کہہ رہے تھے۔ بڑا درویدہ روز دیں گے رام پور چلا ہوگا مگر اس کو لڑنے کے سر پر تو نہ جانے کون سا محبت سوار ہے اس کی بی بی طرح بے چارے کو ڈانٹا کہ میرے اسرار خطا ہو گئے۔ میں نے کہا میں اگر آدمیوں اور دیسیوں کو یوں دھتکار دوں گی ایک دن سر پر ہاتھ رکھ کر دوں گی۔ ہمارا کیا ہے آج میرے کل دور رس۔ یہ جن وصال یہ نازا داسد اساتھ تہذیب کے؟

شیعہ گردن جھکائے کہتا رہا۔ بجا ارشاد! بے شک و زنت جو فرمایا۔ عباس علی خاں دل میں کھول رہا تھا۔ وہ اس میدان کا باران پھینکتا تھا۔ خوب جانتا تھا کہ نازک میں اپنی نوچیوں کی قیمت بڑھانے کے لیے کیا کیا باتیں کرتی ہیں۔ سروروی خانم ایک ہی سانس میں مرزا جہاں گیر سے کنور اجیت سنگھ اور اب یوسف علی خاں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا قصہ شیعہ تہذیب کو یہ جانا تھا کہ صاحب زادے رحمن پر ہنر رکھتے ہوئے ذرا اپنی حیثیت کا خیال بھی رکھنا، باتیں کرنے کرتے وہ بیکاک کھڑی ہو گئی۔ اے لڑکیں باتوں میں گگ گگ گئی۔ فریاد کیا کیا کرکوں؟ بخیر یہ لڑکھو کہ جتنی ہوں۔ آج اس کا جی اچھا نہیں ہے۔ مرثیام اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی۔ مرثیہ دھویا کنگھی چوٹی کی۔ اتنے میں آپ اس سے باتیں کیجیے گا مجھے اجازت دیجیے۔ وہ چلی گئی۔

عباس علی نے زانو پر ہاتھ مارا۔ اچی نواب صاحب! اسنا آپ نے؟ یہاں آپ کی دال نہیں لگے گی۔ مانا کہ آپ بھی ریاست کے مالک ہیں مگر یہ محنت جانتی ہے کہ ریاست چھوٹی ہے اور ابھی آپ کے والد بزرگوار نواب مرثیہ خاں زندہ ہیں۔ بے شک انھوں نے اپنی حیات سب تک



ہیں کہ چپ رہوں ملو صاحب ہم اب ریلوئیں گے بلکہ کو تو یہاں سے اٹھ جائیں، وہ اٹھنے لگا۔

ثقیفہ کہنے لگے کہاں جاتے ہو؟ بیٹھو بیٹھو ہم نے کب اتنا دے کیے ہیں۔ ہاں اگر چاندنی رات میں کسی اور کٹھے پر جانے کا ارادہ ہے تو ضرور جازمگر ذرا جلدی لوٹ آنا۔

عباس ہنسنا ہوا چلا گیا۔ پھر لٹھوں تک خاموشی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر جو کچھ زمان کھلی تیر کاڑا آپ نے لڑائی کو نواز کر کم فوائی ہے آپ کی۔ میرے پاس تو آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

”موجودہ شہقت نے کہا تہم سے کچھ لینے نہیں آئے ہیں اور ہم تمہیں منس بازار بھی نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہوتا تو جاؤڑی میں بے شمار لالا خانے ہیں کہیں اور چلے جاتے تمہیں دیکھنا ہمارے لیے قیامت ہو گیا۔ دو سال کس انتظار میں کٹے یہ ہمیں جانتے ہیں۔“

”میں سبیلہ کرتی ہوں۔ موجودہ منسی۔ شاید اُسے یقین نہیں آیا تھا۔“ ثقیفہ نے کہا تہا میں تھکے لیے زلی نہیں ہیں۔ یہاں آنے والے اکثر لوگ رسوا ایسی باتیں کرنے میں مگر ہمیں یقین ہے تہم زسی اور غیر زسی ہوں میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ جلدی کے سچائی عشق اور رشک کے مانند ہے، جھپٹانے نہیں جھپٹی ہم تہم سے تنہائی میں آج پہلی مزید ملے ہیں اور میں معلوم ہے کہ بیت سی بائیں پہل ملاقات میں کرنے کی نہیں ہوتیں لیکن رجو اگر سچ ہو چھو لوگو نشہ دو دروس میں تہم سے صدا، چار ملاقاتیں کر چکے ہیں تہم سے کم صدا چار ملاقاتوں کے بعد تو ہیں یہ کہنے کا حق ہے کہ ہم تہم سے محبت کرتے ہیں۔“

رجو مگر ہو گئی ثقیفہ نے فراری سے اس کی صورت لکھا رہا نہ جانے کتنی دیر کی خاموشی کے بعد جو کچھ میں آواز نکلی۔ اس کے مڑٹ کپکپا رہے

ہی ہیں رایت آپ کے ہاں کڑی ہے لیکن نکلان بہ حال وہی ہیں اور وہ آپ کو زیادہ اللہ نکلے نہیں کرنے دیں گے۔ یہی سبب ہے کہ روری حس نام نے دوسرے دن کا کیا بل سدا ویر اخیال ہے یہ فرست ابھی ہا مکمل ہے۔ اس میں لوہا اور فیروز پڑا بھر کے ہانکے جھیلے لڑاٹھس التین خاں کا نام نانی بھی ضرور شامل ہو گا۔ لڑاٹھس علی اور کنواریت سلگھ سے آپ کا یار نہ ہے ممکن ہے وہ آپ کو آگے بڑھنا دیکھ کر پیچھے ہٹ جائیں مگر نفس التین خاں کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ ضد پرا جائے تو آگیا جھپکچہ نہیں دیکھنا۔ لاکھ لاکھ خاک کر ڈالے گا۔ میں کل ہی دیوان جی کے ہاں بھانپ گیا تھا کہ اس کی نگاہ رجو پر پڑی ہے۔“

ثقیفہ نے کہنے میں ٹوٹ کر اٹھی۔ یہی شہ اسے بھی پرا تھا، اب عباس نے اس کا شہد یقین میں بدل دیا۔ جواب میں وہ کچھ کہنے والا تھا کہ ایک جھوٹ کا آیا جھوٹے میں جس کے عطر کی آمیزش تھی۔ رجو کو میں مائل ہوں۔ آج کل رنگ روپ میں اور تھا چہرے پر شوخی اور بے باکی کے بجائے حناٹ اور زلی تھی۔ چال میں دل کر ہال کرنے کی اور فوری لیکن دفا کے ساتھ جس کی بناٹ کے بغیر تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ جھلک۔ جھیل کی گہرائی تھی اور ہلکے ہلکے مترج دورے بڑے ہوئے تھے جیسے ابھی رو کر باسکو کرادی ہو پرمترج ڈوڑوں میں عجیب زہر اور شوخی تھی کہ کیا یہ تمہیں کسی کوٹوں میں توڑ لگے ہیں زہر اڑا جائے۔ لباس کی ساوگی لفاست بچ اور فوری لیم کی گراہ تھی۔ آٹا باجرا، چکن کا کرنا اور کلکٹ واپس ہوا ملل کا گلانی دوپٹا دوپٹے میں کہیں کہیں آبنی کے ڈوڑے قانون کی روشنی میں جھل مارا ہے تھے بھلا ہوں میں سونے کے نقش لگن تھے اور الیل ممتی کے نازہ چھوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ رنگ اور ٹٹوں ناک میں ہیرے کی۔ لوگ نالائے کی طرح جگر جگر کہہ رہی تھی۔ ہاتھ بیروں میں ہندی رچی ہوئی تھی اور لباس سے جس کی لٹیٹ اٹھ رہی تھیں ثقیفہ اور عباس کھڑے ہو گئے۔ رجو نے نہایت نزاکت سے جھک کر سلام کیا اور ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ اس نے مسکرا کر ثقیفہ سے کہا۔“ دیکھیے کیا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے ایک نذرہ مرولی میں آپ کو رکھا تھا اور کل دیوان جی کے ہاں دیکھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ آپ ہی ثقیفہ ہیں۔“

عباس نے نفرت یا صرف ثقیفہ نہیں یوں کیے کہ والو ثقیفہ ہیں۔ رجو نے خاصا ہوا اپنے ثقیفہ کی طرف دیکھا اور ہنرٹ کاٹنے لگی۔ اچھا؟ یہ نذرہ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ آپ ثقیفہ کے ساتھ والہ بھی ہیں بھلا کس خوش نصیب پر؟“

ثقیفہ کے چہرے پر ایک رنگ اڑا تھا، ایک جبار لانا تھا۔ اس سے پہلے کہ عباس کچھ اور بولنا، ثقیفہ نے اس کے اشارے سے اسے غلوٹ رینے کی ہلاکت کی۔ عباس نے کہا ات۔ فواب صاحب مجھے اشارہ کر رہے

تھے۔ نواب صاحب، امبادا آپ کی محبت محض پسندیدگی پر ہے۔
 شفیقتے نے بے ساختہ جواب دیا: میں رنجو اجبت اور چیز ہے
 پسندیدگی اور چیز جو چیز آہستہ آہستہ نمودار ہوا اس وجہ سے بدلوئی ہو کر
 ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی کے لیے ضروری اور مفید ہے وہ محبت
 نہیں پسندیدگی ہے۔ لوگ پسند اور محبت میں تفریق نہیں کرتے جس طرح دوستی
 اور غربت میں یا پرستش اور عزت میں تفریق نہیں کرتے۔
 رنجو بھی خاموش ہو گئی شفیقتے وارفتگی سے مختلف پہلوئیں میں محبت
 کا انوار کو نظر آسکے گا گفتگو میں شاعری کا لطف تھا۔ رنجو اشتیاق و محبت
 سے سخن رہی تھی اس کا چہرہ کچھ ہنستا تھا، ابھی چھپکا پڑھا تھا شفیقتے نے
 اپنی جمہوری مخموری اور شوق کی تمام رد و ادراک کی طرح اس کے کانوں میں گھول
 دی پھر اس کا ہاتھ تھا کہ کما ہر دم سے بھی کچھ سننے کے شائق ہیں رنجو
 تم بھی تو کچھ بولو۔

رنجو اس پر گہمی، اس نے ابھگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھڑکی ہوئی
 آواز میں بولی۔ شفیقتے! آپ جانتے ہیں۔ اس کائنات میں سخن و شتاب
 سے زیادہ بڑی حقیقت انسان یا مخلوق کی زندگی میں ہے۔ یہ سب کے تقدیر میں
 خراں ہے، جوانی رخصت ہو جاتی ہے، حسن کے قوا مضل ہو جاتے ہیں، رنگ
 مر جاتا ہے، پھر کوئی بلٹ کر میں دیکھتا۔ یہی حال عورت کا ہے خصوصاً
 وہ عورت جسے معاشرے نے طوائف کا درجہ دے دیا ہو۔ وہ تو ایک نسلی
 ہو چکی ہے اس میں نہ بوسے نہ باس۔ وہ دیروالوں میں کھلتی ہے وہیں
 کھلا جاتا ہے پھر اس پر کسی کی غلط انداز نگاہ نہیں پڑتی۔ یہ شمع بھی ہے تو
 وہاں بھی مل کھانا پڑا اٹھتا ہے۔ اس وجہ سے زمین و آسمان ایک ہو
 جاتے ہیں۔ ہمارا گھر بھی نہیں ملے ہے۔ یہاں مسافر آتے ہیں فحش دور
 کرتے ہیں اور ازادہ دم ہو کر کسی نئی منزل کی تلاش میں روانہ ہو جاتے ہیں۔
 اب اس مسافر کو کیا کہیے جو ملے والوں سے دل لگا بیٹھے۔

شفیقتے نے سنبھل کر کہا: رنجو! یہ بالواسطہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھ
 لیں؟ تھا واسطہ تو ابھی شروع ہوا ہے زندگی میں کسی باتوں کے لیے نہیں
 ہوتی۔ اپنے متعلق دنیا کی بلکہ ذرات فریاد و داغ سے نکال دو تھوڑی
 مثال ملے گی میں کسی پر ہل حوا میں ایک غلطان کی ہے ہل گری سے
 گونگھلا ہے ہونے کا راد اس آکر دم لیتے ہیں تم اندھیری رات میں ایک روشن
 چراغ ہو جو بھی لے چھلکوں کو منزلوں کا سرخ دینا ہے یا تم وہ ستارہ ہو جو
 سونچے طلوع ہونے سے پہلے آسمان کی بلندی میں نمودار ہو تا ہے اور
 ہمیشہ آفتاب کا پیش رو ثابت ہوتا ہے۔

رنجو کی آنکھیں لم آلود تھیں اس کے ہونٹوں پر تلخی اور مسکراہٹ
 بدلوئی نہ گئی تھی کے لیے دست راستہ معافی کی خواست کا گارہاں۔ مجھے اپنی
 حقیقت کا خوب واقف ہے میں نے غلطان ہوں نہ روشن چراغ، نہ آفتاب

نہ آفتاب کا پیش رو نہ اندھیری زندگی شروع سے آخر تک ایک نل فریب
 اور رنگین سرب ہے۔ حادہ ہے نہ منزل جو خود کم کردہ راہ ہو وہ دوسرے
 کی کیا بدلتا کیسے کا؟ یہ بھی آپ کا حسن ظن ہے ورنہ میں آگم کہ نہ انم۔
 میں تو وہ شمع ہوں جو باقی آگ میں خود مٹتی ہے اور خود ایک روک بھڑک
 کر خاموش ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے بارے میں نہ کوئی خوش فہمی ہے نہ
 کوئی مغالطہ۔ میں ابتداء سے یہ سکھا جاتا ہوں کہ تمہیں صرف دولت کمائی
 ہے اور نہ مائیں کو طرح طرح کے غمزوں سے گرفتار بلا کر ماہے اس
 کام میں ہم نیک و بد کی تفریق نہیں کرنے۔ اگر کریں تو یہ دکان ایک دن
 بھی نہ چلے۔

شفیقتے نے رنجو سے پھر جو کا ہاتھ تھا لیا۔ رنجو اگر کم دفا کا
 عند کریں اور تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا مانا جائے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟
 رنجو دالسی ہو گئی: میں عرض کر چکی ہوں کہ مجھے اپنی ذات پر ذوق
 برابر اختیار نہیں ہے۔ میں اپنی ملکیت نہیں ہوں۔ مجھے پورے دن کا قبضہ
 ہے جس پر بھی روح ہو۔ میں ان کے لیے سزا چاندی سینے والی کرکٹ
 یا رست کی بنی ہوئی ایک کب ملوں۔

اگر وہ تمہیں قربت لگا کر ہمارے حوالے کر دیں تو تمہیں کیا اعتراض
 ہو سکتا ہے۔ شفیقتے نے عرض کے کما ہر دم جانتے ہیں مغایر سخت ہے۔
 بہت سے شمس کا گرد اور دولت مند خاں کا رولہ و معلا کے سلاطین بھی ہمارے
 حریف ہو سکتے ہیں محرم حصار نہیں پائیں گے۔
 رنجو تلکائی: تو آج آپ مجھے ہمیشہ کے لیے کہیں اپنا مانا جاتے ہیں؟
 اس لیے کہ میں تم سے محبت ہے اور ہم اپنی محبت میں کسی اور
 کی شرکت برداشت نہیں کر سکتے۔

رنجو! آپ مجھے بوی بنا کر رکھیں گے؟
 شفیقتے نے انہماک میں گردن ملائی: بے شک بوی نہیں اس نے رنجو
 کے ہاتھ کو روک دیا۔ اور مطالبہ دل و نظر بھی۔

رنجو نے پان دان اپنی طرف کھسکا کر نازک نازک گولیاں بنانے
 لگی شفیقتے کا دل دھڑکنے لگا۔ رنجو کی خاموشی اسے بہت کھلی تھی۔ رنجو
 نے گوری بڑھائی شفیقتے نے جبکہ رنجو کی کلائی چم لے تھوڑوں کے
 دو قطرے کلائی پر گرے۔ جواب دودھو! کیا تم ہمارا ساتھ دو گے؟ ہم تمہارے
 لیے اپنا سب کچھ لگا سکتے ہیں۔

رنجو نے درد بھری آواز میں کہا: میں آپ کے قابل نہیں ہوں میرا
 نفع ہی ہے مجھے نہیں پڑا جیتے دیجیے۔ میں ایک حقیر بڑائی ہوئی ہوں
 آپ ایک محترم رئیس زادے ہیں جانا آدمی آخر اسے آپ کا نام لیتے
 ہیں مجھے اپنی بنا کر آپ کیسے رکھیں گے؟ میں تیروں لائیں میں کسی لاکھ
 کی خواتین کے پیروں کی برابری کر سکتا نہ کبھی ان مہیسی حیثیت مجھے حاصل
 سب بنگ

ایک شخص پاگل خانے سے شفا یاب ہو کر آیا۔ اُس کے دوستوں نے اُسے گھیر لیا۔ کو بھائی اب کیا حال ہے؟ اُس شخص نے جواب دیا۔ ”میرا حال تم سب سے بہتر ہے۔“ وہ کہے؟ ”کسی نے دریافت کیا۔“ ”وہ ایسے کر میری جیب میں داعی صحت کا سر ٹھیکٹہ موجود ہے۔“

ہو رہی تھیں۔ وہ بے نانی سے رنج کے سیاہ بلبے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھرنے لگا۔ رنج کسما کسما تھر تھل کے شیفقت کے سینے سے لگ کے سکریاں بھرنے لگی۔



شیفقت نے رنج کا دل کیا جینا، گرا باجفت تعلیم کی دولت لی گئی۔ گوشہ دہر میں کئی ناکام آؤڑوں کا عرض لی گیا تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھا لیکن کبھی رات کس اُداس تنہائی میں اُسے رنج کی باتیں یاد آتی تھیں وہ گھٹنوں سوجھا کر مایہ بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اُس کی محبت میرے دل سے نکل جائے؟ جو اب ہمیشہ نفی میں تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ رنج کی محبت اُس کے دل پہلے میں آکر ٹپتی ہے۔ اُسے اُن لمحات پر لبوس ہوتا جو رنج سے دوری میں بسر ہو گئے تھے۔ وہ رنج سے روز ملنے لگا۔ صرف ایک نفع لے گیا تھا۔ ہر قیمت پر رنج کی خام ادا رنج کے دوسرے نفع لے کر خوشی حاصل کرنا۔ راجست کے معاملات سے بھی اُس کی دل چسپی محدود ہو گئی۔ کارندوں سے ہٹنا زیادہ دیر بہ وصول ہو سکا، وصول کیا اور محروم کے درجہ کے لٹا دیا۔ البتہ رنج نے اُس سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ فرمائشیں عوامی زندگی میں اُس کی طرف سے ہوتی تھیں۔ اُس نے فرمائشوں کا ایک انبار لگا دیا تھا۔ سبھی بڑا لوگوں کی ضرورت چڑھاتی، کبھی کبھی شادوں کی کبھی شہداد اصفان سے آئے ہوئے فالینوں کی اور کبھی مکان کی آرائش کے لیے شیشے کے آلات اور ظروف کی شیفقت اپنی استطاعت کی حد تک تمام فرمائشیں پوری کرنا لیکن اُس کی خواہش تھی کہ رنج بھی اپنی زبان سے کچھ کہے۔ کبھی مرتے اُس نے رنج سے کہا کیا بات ہے تم مجھ سے کوئی فرمائش کہیں نہیں کریں؟ رنج بے بسی سے کہتی ”دوسرے فرمائش کہنے کے لیے کیا کم ہیں؟“ شیفقت اکثر اچھی رات کے بعد رنج کی حویلی کو ملتا لیکن اُس کا دل کھٹے یاد ہی میں رہتا۔

کئی بار شادوں اشاروں میں اُس نے رنج کی خام کاغذ پر لینا چاہا۔ جسے شمس تھا کہ اس جہاں دیدہ صورت نے رنج کی تعظیم مقرر کر رکھی ہے۔ رنج کی خام ہمیشہ ٹال جاتی۔ دلال وہ ایسے داؤ پیچ آمار ہی تھی۔ اُس کا قصہ یہ تھا کہ شیفقت سے جن تہ وصول کیا جاسکتا بڑا وصول کر لیا جائے، اُس کے بعد وصول کر کے بڑھنے کا موقع ملے۔ اُس کی نگاہ ابتداء ہی سے ریاست فیروز پور جھکر اور لوہاڑ کے نواب محس الدین میں پڑتی تھی۔ وہ جاتی تھی

ہو سکتی ہے آپ بے شک محبت کرتے ہیں کرتے ہیں گے لیکن میں آپ کو وہ محبت نہ دے سکوں گی جس کے آپ حق دار ہیں۔ بروی بن جانے کے بعد میں اپنی موجودہ قیمت، اہمیت اور حیثیت سب کچھ کھو بیٹھیں گی۔ میں آپ کی نہیں، ایک مرد کی ملکیت ہو جاؤں گی۔ آپ جب چاہیں گے جس حالت میں چاہیں گے مجھے دیکھ سکیں گے۔ پھر مجھ میں وہ حرا کو دشمن نہیں رہے گی جو صرف یہ معاملہ ہونے والی چیزوں میں ہوتی ہے یا جین حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی یک لگائی جڑتی ہے۔ تو خیر انسان فطرت ہے۔ خصوصاً مرد ایک ایسی عورت میں جو اس کی بیوی نہ ہو یا سبے خاص تلاش کرتا ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی خواہیہ طاقتیں بیدار کرتا ہے، اُس کی ذرا سی توجہ اور ایک غلط انداز نگاہ کے لیے جسم و روح کو تمام کرنا ہوتا۔ غبار کرتا ہے لیکن عورت مرد کی ملکیت میں آنے کے بعد خود مردی آؤڑ منہ ہوتی ہے۔ وہ میں قدر اپنی بروی ہواں کی دل کشی اتنی قدر کم ہو جاتی ہے۔ مرد اور عورت کا مستقل تعلق دونوں کا اشتیاق جھین لیتا ہے۔ وہ مرافقا ہو جاتا ہے جو صل کے بعد ذراں میں ادا آؤڑ کی تکمیل کے بعد صرٹ اداں میں ہے۔ یہ نیا دن گزرتے ہوئے دن کی فصل ہو جاتا ہے۔ ہر نئی گفتگو نئی ہوئی داستان سے زیادہ موثر نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ وہ محسوس وقت آ جاتا ہے جب مرد اپنی عورت سے بات کرتے ادا اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بھی گھبرا تے ہیں۔

رنج کی اس تقریر سے شیفقت کے بنداشت کو خفیں لگی، اُس کا چہرہ صرٹ گیا، دل بھرا باکین وہ سنبھل کر لولا۔ اُس نے دست کما لیا یا ہی ہونا ہو گا۔ ہم اپنے بارے میں کچھ ادا دینیں کہیں گے۔ دلال ہیں کسنا، کچھ ادا دیا جائے گا۔ شاید ہم اپنی بات واضح نہیں کر سکے۔ میں ایک خرم کی ضرورت ہے جو ہماری سرت سے مراد اور ہمارے غم سے معزوم ہو، جو ہماری خواہیہ طاقتیں بیدار کرے اور ہمارا بھیدل محبت کی حرا سے گلاؤ کر دے۔ ایسا خرم بروی کی صورت میں نہ ہو، خواہ کسی صورت میں ملے ہم ہر طرح اُسے قبول کر لے پر آمادہ ہیں۔“

”کیونکہ آپ بات اچھی طرح سمجھ گئی اب آپ مجھ سے جواب مانیں گے جواب میں ابھی نہیں دوں گی۔ اس کے لیے مجھے ادا آپ کو وقت کا انتظار کرنا ہو گا۔“

”ہم قیامت تک انتظار کریں گے شیفقت! جیسے آؤڑ نہ روک سکا۔ اُس نے نہ پر دہمال کر لیا۔ اُس کا ہم کنا پ رہا تھا اور کون جھکی جا رہی تھی۔ رنج پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ شاید وہ بھی رو پڑتی لیکن اُس میں مضبوط تحمل ایک مڑ سے زیادہ تھا۔ شیفقت کی حالت اور گڑبگڑ گئی۔ خدشہ تھا کہ رنج کی خام یا گھر کا کوئی اور فرد دلال نہ آجائے۔ رنج ایک ایسی آنکھ کہ شیفقت کے پلوں میں جا بیٹھی۔ اس نے اُس کے چہرے سے دلال بٹایا۔ شیفقت کی آنکھیں سُرخ۔“

سب بنگ

کشمکش لڑیں خاں موٹی اسامی اور دل چھینک نور جان ہے۔ آسے آسانی سے
 دام میں لایا جا سکتا ہے۔ قہر لڑیں کے بعد اس کی نظروں پر کے نواب
 بسعت مل خاں پوچی اگرچہ بسعت مل خاں ابھی سند نشین نہیں پرانٹھا تاہم
 کچھ عرصے بعد سیاست اس کے زیرِ تحکیم آنے والی تھی نیز سرے سے پریشانی
 کا تصور اجیت نہ تھکا۔ اجیت جب کبھی چاؤسی میں آسکتا، ہزاروں کے
 نہیں لاکھوں کے والے تیار کئے کو جانہ بڑے بڑے بالاخانہ کنوڑا اجیت
 کی اہمیت کا نگاہ سے مدینوں منظور تھے اور اسے بھلا جھلا کر اپنی اپنی
 طرف کھینچنے کی کوشش کرتے۔ رنجو اور جھگڑ کی شہرت دلی میں بڑے کل
 کی طرح پھیل رہی تھی ان کے فن کا چرچا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں نہیں
 چاؤسی کی روضہ تیرن شمعیں بن گئیں۔ ہر دالوں کا جوہم منڈلانے لگا۔ ان کے
 عرس نے ہر طرف آگ لگا دی جسے دیکھ کر انھی کا دم جڑا۔ ایسے دیوں کی طرف
 سے جڑے کا بلاناو سروسری خام نہایت متحیر سے کر رہا جواب دے دیتی۔
 روضہ روضہ اسے شیفقت کی شب برون کی آمد بھی پوری طرح کھلنے لگی۔ اس نے
 رنجو کو روضہ سے بھلا یا۔ رنجو نواب کے ساتھ تعلقات ضرورت سے زیادہ
 نہ بڑھاؤ، کچھ اور رئیس بھی تھے اسے طالب ہیں انھیں یا بوس نہ کر دیا۔
 یہ وقت بہت نازک ہے۔ یاد رکھو کہ عشق و عاشقی کے لیے پیدائش کی
 گئی ہو، تھار پھیلان انھوں سے صرف مال بولنا ہے۔ اگر عشق وغیرہ کے
 پتھر میں پڑو تو بڑھاپے میں سر پر ہاتھ رکھ کر دنا پڑے گا۔ ان میں سے
 کسی کو اپنا منت بھجو سب کو دشمن جانو۔ اگر تھالے پاس حسن کی دولت اور
 دھن سرور کا فن نہ ہو تو کوئی تم پر قہو کہنے کے لیے بھی تیار نہ ہو۔ یہ شرط داغ
 سے نکال دو کہ ان میں سے کوئی نہیں چاہے گا یہ منب جھالے شباب کے
 عاشق کا کہ میں بطلب نہکتے ہی طوطے کی طرح آنکھ پھیل گئے۔ ان
 کی کھانی چوڑی بالوں پر کان نہ دھرنا۔ بھٹا رکمال ہے یہ کہ سب کو اپنی بچت
 کا یقین ملا اور انھیں آپس میں حسد رقابت اور تلک میں خنک کر کے
 دولت میٹھی ہے اس باران میں دولت ہی بچھاؤ کر کے آئے ہیں۔ اگر تم نہ
 لوگو تو یہ اپنی دولت واپس نہیں لے جائیں گے، میں کسی اور کی فکر نہ
 دیں گے۔ سروسری خام کی کہ باتیں مٹی نہیں تھیں۔ رنجو اور جھگڑ کم سنی سے
 یہی کچھ سن رہی تھیں۔ یہ ان کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم حصہ تھا۔ رنجو
 کرتی تو اسے اپنی ماں کی ایک ایک بات میں ستانی دکھائی دیتی۔ وہ خوب
 جانتی تھی کہ طوائف محبت کرنے کے لیے پیدائش کی گئی، اس کا کام ہنر
 اپنے پاس آنے والوں کا دل بھلانا اور ان سے مزہ مٹھی قیمت وصول کرنا ہے
 بار بار اس نے عہد کیا کہ اب وہ شیفقت پر زیادہ التفات نہیں کرے گی اس سے
 نہیں ملے گی، طبعیت کی ماسازی کا قدر کر کے اسے مال دے گی محو ریا
 اسے عمل کو نظر میں نہ آجائے۔ شیفقت نے آجائے وہ بے مین رہتی کسی کام میں اس
 کا جی نہ لگتا۔ نگاہ بار بار دواڑے کی طرف اٹھتی شیفقت کے کہنے میں جبر ہو

جاتی تو اسے طرح طرح کے دوسو سے ملنے لگتے۔ وہ سوجنی شیفقت کیس ہمار
 نہ پڑ گئے ہوں انھیں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ ہوسکتا ہے اپنی بیاہری
 دیکھ بھال کے لیے چلے گئے ہوں مگر بھلے جانے بغیر وہ کبھی نہیں جاتے۔
 ضرور کوئی بات ہے بھن ہے درست اسباب انھیں کسی اور جگہ لے گئے
 ہوں یا۔۔۔ یا کوئی اور ان کی بنگاہ میں آ گیا ہو۔ رنجو کسل بندی سے اپنے کمرے
 میں بند ہو کر بیٹھ جاتی۔ اس کی آنکھوں سے الٹک جاری ہو جاتے۔ شیفقت
 کی آمد تک یہی کیفیت رہتی شیفقت آتا تو رنجو اسے دیکھتے ہی سب کچھ
 بھول جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ اس وقت سب چلے جائیں صرف وہ وہ
 جائے اور شیفقت۔ پھر وہ شیفقت کے زمانہ میں اپنی تازہ غزل سنائے اور شیفقت
 کی تازہ غزل سنے۔ دونوں گھنٹیں شعر و سخن میں کھوئے رہیں، شہر میں کسی
 اور سے کوئی اچھی غزل کسی ہوشیار پر شیفقت و منہ کر کے شیفقت کو غم نہ تو
 رازہ نیاز میں غم ہو جائیں، خاموشی کی زبان میں بھی گفت گو ہو کر، ایک دوسرے
 کی دھڑکنیں شمار کریں۔ بالآخر ملا کر سکرنا لے رہیں۔

عموماً ایسے عالم میں جب وہ معوشی کی انتہا پر ہوئے، بیکار
 سروسری خام کرے میں داخل ہو جاتی۔ شیفقت اس کی بہت تعظیم کرتا تھا۔
 وہ کھڑا ہو کے ادب سے سلام کرتا۔ سروسری خام نہایت اور عاجزی سے
 کہتی۔ حضور! آپ کیوں بندی کر مرنہ کرتے ہیں۔ تو رنجو سے یہ
 کہنے آتی تھی کہ نیچے نواب شمس الدین خاں کا پیغام بر کھڑا ہے۔ نواب
 صاحب نے حجرے کے لیے پوچھا ہے۔ کیا جواب دوں؟

رنجو تودہ پر بل ڈال کر کہتی۔ آں جان! یہ بات آپ خود طے
 کر سکتی تھیں۔ میں حجرے کے لیے حاضر ہوں لیکن دلی سے باہر نہیں چاؤں

گن غانا نواب صاحب کی فرمائش ہو گی کہ میں فخر پور بھکر جاؤں؟
 ”اے بیٹی! عقل کے ناخن لے، کچھ ہوشن کی دوا کر۔ سروسری خام نہایت
 ہر ہاتھ مار کر کہتی۔ مرنہ کر بھلاؤں جواب دیا کرتے ہیں؟“ پھر وہ شیفقت
 سے مخاطب ہوتی۔ حضور! کچھ ہی اسے سمجھائیے۔ میں تو بک بک کر کے
 عاجز آ گئی۔ اس کے کان پر جوں میں رہ گیتی۔ نواب شمس الدین خاں کوئی وفد
 طلب فرما کرچے ہیں پیغام بھیجا ہے کہ ہزار روپے حجرے کے دیں گے اور انعام
 اکرام الگ۔ یہ لڑکی ہزار روپے پر اپنی بھیرے دیتی ہے۔“

شیفقت شمس کے کہناں میں واقعی انکار تو نہیں کرنا چاہیے۔ ہزار روپیہ
 بڑی رقم ہے۔ وہ ادم شمس الدین خاں کو خوب جانتے ہیں ان جی ہدیٰ نہ کر کے
 والا کوئی اور رئیس نہیں ہے۔“

رنجو کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے، وہ شیفقت کی طرف ایک خاص
 انداز سے دیکھتی گویا کہ یہی ہوا آپ بھی یہ مشورہ دے رہے ہیں؟ پھر وہ دل
 کھا کر سروسری خام سے کہتی۔ ”ہزار روپیہ کیا، وہ دس ہزار بھی دیں تو نہیں
 جانوں گی۔ انھیں میرے حجرے کا شوق ہے تو نہیں تشریف لائیں کیا انھوں

بس اتنی دُور جیسے شہر کا آنگن



زری قرضوں کی اسکیم پر عملدرآمد کے لئے پوبی ایل کا عملہ
فلک بھر میں جگہ جگہ تعینات ہے، تاکہ کسان کو پوبی ایل کی اس
اسکیم کے تحت تمام سہولتیں گھر بیٹھے ہی میسر
ہو جائیں۔ مفید مشورے بھی
اور مالی امداد بھی۔ اور

اس کے لئے کسان کو بس اتنی دُور جانا ہے جیسے
اس کے اپنے گھر کا آنگن۔

ابھی فصل پیدا کرنے کے لئے کسان کی جو بھی ضرورت ہو۔ عمدہ بیج،
کیڑے مار دوائیں، کھاد، بیوب دہل۔ یہ سب ضرورتیں پوری
کرنے کے لئے دیہات میں تعینات پوبی ایل کا عملہ ہر وقت مستعد رہتا
ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرغیاں اور روٹھی پالنے یا سکھانے اور دودھ دہی سے
دوسری چیزیں تیار کرنے کے لئے جدید سازوسامان اور مشینوں کی ضرورت
ہو تو ان کے حاصل کرنے میں بھی یہ عملہ کسان کی ہر ممکن امداد کرتا ہے۔



یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
مشرق حصار اشعار



ماں ٹار مہاجروں کو کہہ رہی تھی اور ادا کیا میو کو ساتھ لیا۔ دلی کی طرف گھوڑوں کی بائیں اٹھادی گئیں۔



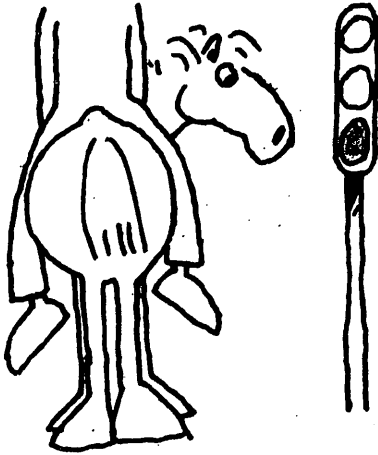
درجو کو کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ سب معمول اپنے نواب کے انتظار میں تھی۔ بار بار کھانسی کا پردہ سر کا گنگلی میں جھانکھی نظریں مایوس ہو کر لڑکتی سی تھیں۔ کئی آمد کا وقت کھاجار لا تھا اور اس کا دور دورہ نہ نہیں تھا۔ درجو انتظار کی لذت سے خوب آفتابھی کسی مشتعل میں انتظار میں لطف نہیں آتا بلکہ یہ لطف تو وعدہ وفا ہونے میں بھی تیسر نہیں ہے خصوصاً کسی جین مہربان کو کسی کا انتظار تو لوگوں کا قیامت کا سامنا ہے اور غضب یہ کہ جس درخت پر تھیں کا پاس اتنی ہی خطرناک ہے۔ درجو کی نگاہ اپنے دوست کی برکت پر تھی کہ چین میں کسی طرح کسی کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہے۔ درجی با پیچھے کی دھاری دھاری کا خیال تھا کہ بے موقع تو نہیں ہے۔ وہ قدر آدم آئینے کے سامنے سے غصی قدر بھگتی دیکھ کر دنگا گیا۔ اس کے گول گول بھرے بھرے بازو جن کی پٹائی لپٹے کی طرح چاہے بالوں کا ہزار دست کرنے کے لیے تھی بار اٹھے۔ ایک تو بار دھکی کر حمل فریب تھے، اس پر ان کا قد جمان کی طرح اٹھا، کچھ نہ چھپے۔ درجو نے ان دان پیلے سے رکھا، غلاف اٹھا کر دھکا۔ بھیکوں کو لے کر غریبوں کی کوئی آنے والا ہے۔ ہر چیز میں جان انگلی اور جان کے ساتھ زبان گنگی۔ ہاتھوں کی ہندی نے کہا بھگت انتظار سے غن پکنا مشکل نہیں جس کا انتظار ہے اس سے آواز ہے کہ دروازہ آہستہ سے کھولنا، اس خیال میں دروازہ آہستہ آہستہ پرکھ لگے تھے۔ درجو نے کانوں کی بالیاں آٹا ڈالیں تاکہ بالیاں آنے والے کی چاب سنے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ یہ اعتدال کا غلطی سے مگر دور جوت میں غفلت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگرچہ عورت کو زبردستی اور آرائش کا شوق ہوتا ہے مگر درجو کی سب سے بڑی آرائش اس کی بہت تھی اس کا شوق تھا۔

نے برسوں میں ہندی لگا رکھی ہے؟ سردی خانہ پر طوطی ہوتی چلی جاتی۔ نفس الدین خاں کو پے لپے انکار میں جواب ملا تو اس نے پھر بری ل۔ انکار سنا اس کے آتشیں مزاج کے خلاف تھا۔ صاحب کتے نہ سکرنا درجو کی کیا مجال جو مجرے سے انکار کرے یہ سب کیا دھڑا نواب مصطفیٰ خاں شیعہ کا ہے۔ انھوں نے جانے کیا سر جو بھلا ہے کہ درجو بھی کا کھڑی پر معنی ہے وہی اسے یہاں نہیں آنے دیتے۔

نفس الدین خاں بچ ذاب کھاتا۔ یہ میری اس کی تو رین تھی۔ آخر اس کے پاس کیا نہیں تھا؟ دولت رایت عزت شہرت، جوانی، بائیں سبھی کچھ تھا۔ جاوڑی میں اس کی صوم تھی۔ کن سی پری تھی ہے اس نے سرفراز نہیں کیا تھا؟ درجو کو یوں ہی کی غفلت میں دیکھنے کے بعد اس کا دل ٹانوں وصل تھا۔ اس نے طرار پارے کے خوف درجو کو بھرائے تھے اور خود بھی کئی مرتبہ اس کے در پر آچکا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ وہ جب بھی رجو کے بالا خانے آیا یا شیعہ کو دیاں پایا یہ پست معیوب تھی لیکن جو نفس الدین خاں کی طرف مطلق التفات نہیں کیا اسلام کر کے مزاج پرسی کی اور پھر یک صو ہو کر شیعہ کو اپنی منزل شانے لگی یہ صورتیں اس الدین خاں کے لیے نامال برداشت تھی مگر بالا خانہ اس کی جاگیر نہیں تھا۔ دیاں شخص اسکا تھا جس کے بھی پاس زر مال ہر بڑے شک شیعہ اس کی بکڑ کا چین تھا لیکن ہر حال ایک رایت کی عود تھی اسے بھی حال تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے ایسے دوست جو کئی بار قریب بھی بن چکے تھے، راز دار بھی۔ بالا خانے ان وقت کی لڑائی کیلئے نہیں تھے۔ اس نزاکت کا شمس الدین خاں کو کبھی طرح اسکا تھا۔ چنانچہ وہ ہر غصہ پی کیا اور مسل تو رین کے باوجود اس نے مخالف کا زور بازو دیا۔ ایک روز سردی خانم کو اس کا یہ بیٹا پچھا: ہم درجو کی خانا نے کے لیے سوال لاکھ روپیہ دیتے ہیں۔ درجو صرف ایک شرب فروز لاکھ کر میں کیا کر لے سوال لاکھ روپیہ اس کی نذر۔

یہ بیٹا نواب کے گولے کی طرح جاوڑی میں پھندا۔ طاقوں کے منگھلے کے کھلے ہوئے سوال لاکھ روپیہ؟ بڑی بڑی طعنے والی ٹانگ میں رال پٹکلے لگیں۔ سردی خانم اور جو کہ بھاگ کھل گئے مہارک با دوں کا تانا بانہ لگا۔ برادری کی طرف سے دھوکے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ سردی خانم کی رکون فروغور سے تن گئی۔ وہ بدھ مہر مہر سے بات نہ کر پی میس سوال لاکھ روپیہ لپی گیا ہو اس نے شمس الدین کو جواب بھولا کر منظور ہے۔ تنہا آنے کے قریب ایسی محوم ہے جو کہ برسوں تک پہنچے کے زبان پر اس کا ذکر ہے۔ جواب ملتے ہی شمس الدین خاں کی ہاتھیں کھل گئیں۔ زنبیر دیا کو رک دینے کا عذر موقع ڈالتا گیا تھا، سوال لاکھ روپیہ کیا چیز ہے رجو کے نام دونوں باتیں کبھی جا سکتی ہیں۔ اس نے اسی وقت اپنے

سردی خانم بہت خوش تھی اس کے قدم زین پر نہیں تک ہے تھے۔ اس نے دوسرے دنے بالوں آکر درجو کو بھاگ کھلا تھا۔ پھر ایک دفعہ اطلاع دینے آئی تھی کہ نواب پرفت علی خاں آئے تھے۔ جین دو گھر میں ان کے پاس جا بیٹھو۔ درجو نے تک کہ تھا ناں جان، اس وقت مجھے تنگ نہ کیجیے۔ نواب صاحب کو تا دینے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے معافی جانہی ہوں، وہ کچھ کچھ تشریف لائیں۔ سردی خانم کو کسی جواب کی آمد تھی کہ کوئی اور موقع ہوتا تو درجو لے جاؤ کی پڑتیں لیکن وقت کی نزاکت دیکھ کر سردی خانم غصہ پی گئی۔ نہ جانے اس نے پرفت علی خاں کو کیا پتی پڑھا تھا، وہ خوش خوش جھٹک جھٹک دوسری مرتبہ سردی خانم پر کئے آئی کہ قلعے سے مڑا جمان کر کا آدمی آیا ہے شہزادے نے در لایت فرمایا ہے کہ اجالات مجرے کی ہائی بھر تو ہم آئیں۔ درجو نے لال پیلے ویدے نکال کر سردی خانم کو گھوڑا سب تک



آنا جواب بہت تھا سرودی خان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کہنے کے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رنجو کے جھونٹے پکڑ کر دوڑتا ہے مارنا چاہتی ہے۔ اتنے میں اُستاد شجاعت علی خاں اندر آ گئے۔ وہ بھی یہی بول پھینے آئے تھے کہ شہزادے کو کیا جواب بھجوا جائے اُستاد کے احترام میں رنجو نے گونجھکالی اور بولی بولتی ہوئی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دور دراز پھیر جائیے پھر پھر فرمائیں گے، مان لوں گی۔

شجاعت علی خاں نے رنجو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سرودی خان کو انکھ کا اشارہ کیا کہ یہاں سے چل جاؤ۔ وہ چلی گئی شجاعت علی خاں دیر تک رنجو کو دیکھا کی اونچی آنچ بھجھانے سے بھر مجرور کا دھیان تو شہنشاہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ دل میں ہزار اندیشے پیدا ہو رہے تھے کسی دشمن نے چال نہ مہل ہو، ورنہ وہ کہنے والے نہیں ہیں۔ رنجو سرور کا ہاتھ کر کے چنگ پر چالیشی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شجاعت علی خاں چلے گئے۔ رنجو اونچی اور کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد روٹیاں پکانے والی ماما اندر آئی۔ اس نے پوچھا۔ کھانا لاؤں؟ رنجو نے اسے بھی ٹال دیا۔ بولی۔ رات زیادہ ہو گئی ہے جاؤ سو رہو۔ کھانے کے لیے ایک دوپان کافی ہیں۔ ماما کوٹ گئی۔ رنجو جانے کیا سوچ کر باہر نکلے۔ اس نے معتد پان لگا ڈالے انتظار میں بیٹھا۔ دل کو بہت بھلا لیکن جلد ہی اس سے بھی طبیعت اکٹا گئی۔ آہستہ آہستہ اسے کوفت ہونے لگی۔ اگر خود نہیں آ سکتے تھے کسی کے ذریعے اطلاع کر دی ہوتی۔ رنجو نے وہ خیال علی خاں سے تاب کماں کر کے ہم سے ہم دی اگر خبر نہ دیتے تو آج نواب صاحب نہیں آئیں گے۔ رنجو بے اختیار اپنی بائیں نکال کر دھن کر دانی کرنے لگی۔ اس دن اس نے دوستی فرمایا کی تھیں۔ وہ نزاکت کا خلیفہ تھے۔ علاوہ نزاکت کے شعروں کی داد کرن دیتا؟ اور کسی دوسرے کی داد رنجو کو کیا سرور کرتی تھی اس کے لیے نزاکت تخلص تھی۔ یہ تھیں رنجو شاعری کا بے حد متحرک مذاق رکھتی تھی وہ دل اس کی اسی خصوصیت نے شہنشاہ کو اس سے اس قدر قریب کر دیا تھا محبت صحیح معنوں میں رفاقت اُسی وقت بنتی ہے جب محبوب و معجب میں ہم دوستی و ملازمتی ہو۔ شہنشاہ اُسے دلی دیکھی کا یہ شعر اکثر سنا تھا۔

ہر اک ہر دوسے ملنے کا نہیں ذوق

سخن کے آتش کا آشنا ہوں

یہ ایک رنجو ہوئی۔ دروازے کا پردہ آہستہ سے ہلا اور شہنشاہ خاں اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر تنہا کن کے آثار تھے۔ جیسے دور کا سفر کر کے چلا آ رہا ہو۔ بال گرد و غبار میں آئے ہوئے آنکھوں میں مینہ کا گداغدار لیکن اندر کی خوشی سے چہرے پر خاصی رونق اور چمک دمک بھجھکھڑی ہوئی اور جھک کر آداب، بجالائی۔ نواب صاحب آپ؟ اس وقت؟ بے اطلاع کہیں کر شہنشاہ لے آئے؟

سب بنگ

”بے اطلاع آنے کا لطف اطلاع سے کر آنے میں کہاں؟ شہنشاہ خاں تالین پر گناؤ سمجھنے کے سہارے بھجھ گیا۔ اس کی نظریں رنجو کے سر پر لپکا جانے لے یہی تھیں۔ رنجو سب کچھ سمجھ گئی تھیں۔ شہنشاہ خاں کی پھیلی ہوئی مسکراہٹ نے بھی یہی پیغام دیا کہ آج کوئی انکار کوئی عذر نہ خالی سماعت نہیں ہے۔ رنجو کا چہرہ لال بھجھکا ہو گیا۔ اس کے اندر کی خفا و سوکھنی، طوائف جاگ اٹھی۔ اس نے طے کر لیا کہ آج شہنشاہ خاں کے سامنے آئینہ رکھ دے گی۔ اس نے ایک بار پھر رسمی انداز سے شہنشاہ خاں کو آداب کیا اور قدرے بڑی سے پرے بیٹ کر بھجھ گئی۔ آپ کا گھر ہے۔ آپ کو یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے۔ ماشا اللہ آپ رئیس الدین رئیس ہیں۔ ہماری آپ کے سامنے حیثیت ہی کیا ہے۔ نہایت کرم اور قدر دانی ہے جو آپ شہنشاہ لائے۔ کیسے اس کا حکم ہے؟“

شہنشاہ خاں نے خفت حیرت اور غصے سے پہلو بدل کر رنجو کو دیکھا۔ یہیں شہنشاہ میں مل ہونے کی مذمت ہے۔ اس نے نہایت سے کہا۔ بہت دلوں سے جی چاہا کہ دیکھیں کئی وزیر ہتھاری ماں کے پاس پیغام بھیجا کہ فرزند پور جھک کر آئیں ہم سے جہاں تک ممکن ہو گا منا کریں گے لیکن معلوم ہوا کہ ہم نے براہ کئی عذر پیش کر کے بات ٹال دی۔ ہماری ذمہ داری تو یہی ہے کہ ہمارے مقابلے میں ہم نے ایسے صاحب کو نوازا ہو ہماری حیثیت سے کم تر ہیں۔ کیا ہم اس بے اعتنائی کا سبب بن سکتے ہیں؟“

رنجو نے کھل کر جواب دیا۔ نواب صاحب اگر آپ ایسا خیال فرماتے ہیں تو مجھے رنج ہے۔ یہ ایک کوٹھا ہے۔ یہاں ہر وہ شخص آ سکتا ہے جس کی جیب میں چار پیسے ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ آتے ہیں کھل کر زور پٹتے۔

آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟“

”ہر ذمہ دار کو اپنی طرف اشارہ مصطفیٰ خاں کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر ذمہ دار کا پتہ چھپا دیا ہے۔“
آخر مصطفیٰ خاں انہیں کیا دے دیتے ہیں جو ہم نہیں دے سکتے؟ ہم ان سے کس بات میں کم ہیں؟ مال و دولت میں؟ شان و شوکت میں؟ اخلاق و سیر میں؟ یا شکل و صورت میں؟ معلوم ہوتا ہے انہوں نے انہیں سب مل گیا ہے۔
ہیں اور ہم سے بظن کیا ہے؟“

”اب صاحب! رنجو کی آواز بلند ہو گئی۔ یہ گفتگو آپ کو زیب نہیں آتی۔ گناہی معاف تھے مگر مصطفیٰ خاں نے تو نہیں دکھائے اللہ! آپ دکھا رہے ہیں؟ لیکن یاد کیجئے گا اسی کا پائل اکثر نہیں جاتا ہے۔ مصطفیٰ خاں نے بھی اپنے منہ میں اٹھو گئے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ ایک سلجھ ہوئے صاف ستھرے انسان ہیں۔ بے لوث اور سچے سے مل کر خوش ہوتا ہے۔“

”منا اللہ! غصے میں ضلع جگت نوب الونتی پر طبیعت بری ہو گئی۔ شمس الدین خاں نے طنز کیا۔

”بیابان بھی دل کے زخم پر ہو گئے ہیں۔“ رنجو نے ایک گہری سانس لی۔

”اللہ پاک کو تیرا تیر ہیں۔ خدا کی قسم تم بھاری اچھی اداؤں پر توفیرا ہوئے ہیں۔ یہ بارش سبزیوں کی ضرورتیں ہم کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہو۔“

”آداب عرفی کرتی تو اس قدر انفرادی پر یکساں معاف کیجئے آپ میرا کا طبقہ ہے بڑا ہی چمک۔ آج ہم پر دم دیے دیتے ہیں کل کسی اور پر نہیں۔“
شمس الدین خاں کا غصہ کافر ہو گیا۔ اس نے ایک تہقیر لگا یا۔

”مصطفیٰ خاں کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ کہیں تو ہم جیسے بڑے نہیں؟“
”خدا نہ کرے اور میں نے یہ کب کہا کہ آپ سب بڑے ہیں۔ آپ کی پزیرائی کے لیے اس کوچے میں نہ جانے کتنی آنکھیں ہر وقت فوجی راہ رہتی ہیں۔“

سرور خاں کمرے میں داخل ہوئی شمس الدین خاں سے ملنے دھڑکی سے اٹھ کر آداب بجالا کر سرور خاں نے دعاؤں کا بار بار دہرایا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ کہہ کر وہ کمرے کے باہر کھڑی ہوئی رنجو اور شمس الدین خاں کی گفتگو سن رہی تھی۔ وہاں کے بعد اس نے لال لال دے دے نکال کر رنجو کو گھورا تو لڑکی! تجھے کبھی عقل بھی آئے گی؟ معلوم ہوتا ہے داغ پر کمری بہت چڑھ گئی ہے۔ یہ خیرازی کی گفتگو سنیں گے تو میرے جہم میں تھکیں گے کہ خوب لو لکھیں کہ اٹھا یا ہے۔ بڑے دارنیوں کے ہاں کیا ایسی ہی مذہب ہوتی ہے؟ تجھے اشراف کو پہچان نہیں سچا بھلا

اپنے قدر دانوں سے بھی کوئی لڑنہ ڈرو ہوتا ہے۔ کم بہت خبر بھی ہے،
نواب صاحب نے تجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ آج ایک دنیا تیرے نصیب پر رشک کر رہی ہے۔ مرنوی خانم تھوڑا کاپ رہی تھی۔

ماں کی یہ حالت دیکھ کر رنجو کا رنگ اڑ گیا۔ شمس الدین نے لقمہ دیا۔
”چلیے جاتے دیکھیے۔ آہستہ آہستہ سبھی جانیں گی۔ ابھی ان کا ہی کیا ہے؟ ہم نے ان کی باتوں کا قطعی جزم نہیں مانا۔ جلیے کچھ خورد و نوش کا انتہا کیا کیجئے۔ آج شب ہمیں ہیام کیا کریں گے کہ ہم کیا دیکھیں گے۔
کر وہ اب جانیں اور جانندی جو کہ حلے مکان میں پھریں۔ چھوٹی بچہ دیاں موجود ہیں۔ وہ ان کے تیاہ کا انتظام کر دیں گی۔“

شمس الدین خاں ناخاندانہ انداز میں مسکاکر رنجو کی طرف دیکھنے لگا۔
رنجو کی سانس حق میں اٹھنے لگی اور ہاتھ پیروں سے جان نکالنے لگی۔ اس نے بے بسی سے سرور خاں کی طرف دیکھا۔ سرور خاں کی نظروں میں یہ جاہلانہ حکم تھا کہ رنجو! تجھے شمس الدین خاں کو قبول کرنا ہوگا، اس کے سوا کوئی

چارہ نہیں ہے۔ رنجو نے اعتبار و دلوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رٹنے لگی۔ اس کا ہلکا خشک پتے کی طرح کاپ رہا تھا۔ سرور خاں نے ہتھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ بیٹی! یہ بیٹی ماں ہوں تیرا مبرا بھلا جتنی ہوں۔
تیرے لیے جو کچھ میں نے مناسب سمجھا، وہی کیا ہے۔ اری تجھے تو اب

صاحب کے ہاتھوں سے ہو کر رہنے چاہیے۔ انہوں نے اسی تدریسی کہ ہے کہ ہر طرف تیرا نام گونج رہا ہے۔ اسی نعمت جھکرائے گی تو ہمیشہ بچھتا ہے گی۔
رنجو اب جھکے سے الگ ہو کر دوڑا کھڑی ہوئی تھیں نہیں برگز

نہیں ہیں ماں سے دوں گی لیکن آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے والی۔
گی۔ میں نواب صاحب کے آگے بھی ہاتھ جوڑتی ہوں کہ خدا بار بھڑکے فرمائیں۔
اس بازار میں ان کی دل بستگی کے بہت سے سامان موجود ہیں۔ مجھے سے زیادہ

جسین و جیل لوڈیاں ان کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ اللہ مجھے معاف کر دے۔
سرور خاں نے کہا جانے والی نظروں سے رنجو کو دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں غمی۔ اس کی ہچکچاہٹ میں سوا لاکھ کے ٹوٹے گوشے کر رہے تھے، سونے اور جانندی کے گھٹتے دیکھتے سچے۔ رنجو کی بے جا حسد اسے انہی

خیلوں سے ایک فلمی عزم کر دے گی۔ یہ بات سرور خاں کے لینا قابل برداشت تھی۔ اس نے بھر جو کچھ مانگو سمجھا کہ منور جو بڑے بڑے جاہلی تھی۔ رٹتے رٹتے اس کی ہچکچاہٹ شمس الدین خاں کو بھی رنجو کی طرف دیکھتا کبھی سرور خاں کی طرف۔ آخر عاجز اور سرور خاں نے اپنا منہ پیٹ کر کہا۔ اسی بے وقوف، معلوم بھی ہے کہ نواب صاحب نے تجھے کیا عطا کیا ہے؟ سوا لاکھ روپیہ۔ اتنی رقم تجھے کون قدر ملانے کا کب

مصطفیٰ خاں میں اتنا دم ہے؟“
رنجو کی ہچکچاہٹ رک گئی۔ اس کی آنکھیں اٹکلا اور ہی نہیں بڑی سب گنگ

مشافق آجملہ یوسفی کی کتاب ”خاک بہ بن“
سے اسرارِ حجاز معرکہ کے اقتباسات



مزا کوڑی کی فوقیت کے بعد گئے
دنیا کے دوسرے شہروں پر شہادت

کرنے لگے۔

اٹھو کہ کیسٹ ڈر سے اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست اور ستمبر کے
مہینے خارج کر دیے جائیں تو والہ اللہ لاہور کا جواب نہیں۔

مردمکدہ کاسمری، صاحب جلوہ گری میں کوڑی سے کم نہیں
دی ویش نقشہ ہے اسے اس قدر آباد نہیں

اور دہلی، شہر برائیں میں خطر ملک میں آباد ہے۔

جتنی آدمیت کا وہ نام صاحب امرنے کے لیے اس سے زیادہ پُر فضا مقام
رہنے زمین پر نہیں۔

کراچی کے متعلق کیا لکارتے تھے حضور کی؟

”بہت اچھی۔ اگر آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دیکھیں تو کراچی کی ہر
چیز میدی نظر آتی ہے“ پھر کوڑی کی برتری ثابت کرتے کرتے بے
دھیانی میں کہنے لگے۔ ”ہائے یہ عظیم شہر اگر کراچی میں ہوتا تو کیا بات تھی“

اپنی وابستہ کی رباہت میرے قدموں میں ڈھیر کر دیں مگر نہیں تھے اسے
زیادہ بیش قیمت نہ لے سکتی تھی۔ وہ ہے آپ کے نصیب میں نہیں ہے۔
جانیے محمد یوسف تیسری سادہ کار کی بیٹی چھوٹی بیگم سے جی بھلائیے اُسے آپ
نے زردی کے خرید بٹھا۔ اُسی سے لو لگائے۔ یہاں کوئی اُمید نہ کیجیے۔ یہاں
تو مال کی بچکاسے بازار بند ہو چکا ہے۔“

شمس الدین خاں کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جانا، اتنی
تو بہن وہ بھی ایک بازاری عورت کی زبان سے۔ سرورِ خانم، منشا جماعت
ملی خاں اور جنگلو، سب پتھر، مچھکتے تھے۔ عجب برابر تھکتے لگا دی تھی۔ اُس
کی آواز سارے مکان میں گونج رہی تھی۔ پاس پڑوس کی کونکریاں ایک ایک
کے کھٹے کی تھیں۔ بیٹے بگلی کی بھی منشا خاں کا ہنسی کر رہے تھے۔ دفعۃً
شمس الدین خاں گرجا، کوڑی خاں، دال، آواز دینے کی دیر تھی تو ہی بگلی
بیابانہ فاکریم خاں ہاتھ میں تنگی تھلا رہے آگیا شمس الدین خاں کا دوسرا جان نثار

غلام دال بھی اُس کے ساتھ خاتون شمس الدین نے اشارہ کیا کہ یہ خاں نے
پک کر بھجوا کر ایک بچھول کی طرح اٹھا کر اپنے کندھے پر لاد لیا۔ سرورِ خانم
اور جنگلو بیچ اٹھیں۔ رعبو نے کیر خاں کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش
کی مگر کہاں وہ دو اور کہاں ایک نیم و نازک پری سرورِ خانم، خاتمہ استناد
شہادت علی خاں اور جنگلو کو کیر خاں کی ایک ہی ڈپٹی نے پرے بٹا دیا۔
کیریم خاں نے شمس الدین خاں سے پوچھا کہ روبا رہے کونساں آناؤں؟“

چاندنی چوک والے مکان میں اور دیکھو اُسے کوئی گز نہ پہنچے یہ
مال ہم نے پوسے سوالا کے عوض خریدا ہے۔ اور اوسے کرے لے چھوٹی بیگم

خانم و منیت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی، بیکابک استناد شہادت علی خاں اور
جنگلو دیے پاؤں کرے میں آگئے۔ عجب دوڑ کر جنگلو سے لیٹ گئی۔ رستاؤں نے
جنگلو؟ نواب صاحب تیری بہن کو تختہ آزادی کا سوالا لکھ دو یہ دے دے ہے
ہیں؟ رستاؤں نے استنادی، سوالا لکھ دو یہ۔ اُن کا کہہ ہی ہیں کہ نواب
صاحب یہ سوالا لکھ دو یہ پیچھے دیں گے۔“

”ہاں بیٹی یہ سچ ہے۔ نواب صاحب نوڑے اپنے ساتھ لے کر
آئے ہیں۔ جی چاہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔“ استناد شہادت علی نے
کہا۔ خاندانہ ہم سب کے دن چھپ رہے ہیں۔ اتنی قدردانی کوئی نہ کرے گا۔
نواب صاحب نے تھیں ملازمت بھی مٹا کر دی ہے۔ ایک ہزار روپیہ ملاز
جیب خرمی علیہ۔“

دو چھٹی چھٹی نگاہوں سے شمس الدین خاں کی طرف دیکھ رہی تھی۔
اس کی ”تھیں خشک ہو چکی تھیں۔ جنگلو نے اُس کی پیشانی پر چوم کر کہا۔ باجی
تھما ہے سر کی قسم۔ اُن اور استنادی صحیح کر رہے ہیں تھیں بہت بہت
مبارک ہو۔“

دعویٰ کے کانوں میں پتلے سائیں میں ہونی چھڑاں کی نظروں میں
سب کے چہرے دھندلانے لگے۔ اُس نے جیجی کو کہا۔ نواب صاحب!
آپ چپ ہیں؟ کیسے آپ نے میری قیمت سوالا لکھ ہی لگا دی ہے؟“
”بے شک اور یہ قیمت ہمارے سوا تھیں کوئی نہیں دے سکتا۔“
دعویٰ جلائی۔ آپ یہ قیمت مجھے نہیں دے رہے ہیں۔ آپ جھوٹے
ہیں سوالا لکھ دو یہ۔ آپ مجھے نہیں بلکہ مصطفیٰ خاں کی عزت آ کر دکر رہے
ہے ہیں۔ کیا یہ غلط ہے؟ بولے؟ ”رعبو کوشش حواس کھینچی اُس نے پھر
کرتیس الدین خاں کا گریبان پکڑ لیا۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کیسے لکھا
واقعہ آپ سوالا لکھ دو یہ فحش کر دے کہ ہے؟“

شمس الدین خاں نے رعبو سے گریبان پھڑکے اُس کا ہاتھ جھٹک
دیا۔ اگر ایسی گستاخی کوئی اور کرنا تو یہاں ابھی اُس کی لاش پھڑک رہی ہوتی لیکن
کیا کیریم خاں ہم جہیز ہیں۔ زندگی کے کڑے پڑے ہیں اور عورت پر ہاتھ اٹھانا
مردانگی کے خلاف ہے۔“

رعبو نے مختار و لغزت سے دفعہ لگا یا۔ خوب عورت پر ہاتھ
اٹھانا مردانگی کے خلاف ہے لیکن اپنے دوست کی امانت میں نقب لگانا
اور اُس کی تذلیل کرنا یمن مردانگی ہے۔ نواب صاحب! کان کھول کر سن
لیجیے۔ رعبو مصطفیٰ خاں کی ہر سچی ہے اب اُسے کوئی اور ہاتھ نہیں لگا سکتا۔
رعبو کے لیے جان دیے و نہایت آسان ہے جیسے آپ کے لیے پان کی
گلوری کھا کر کھوک دینا۔ لے جائیے اپنا سوالا لکھ دو یہ۔ مجھے اس کی کوئی
ضرورت نہیں ہے۔ مصطفیٰ خاں فادہ امت بھی ہوں تو اُن کی محنت میرے لیے
کائنات سے زیادہ قیمتی ہے اور یہ بھی نہیں لیجیے۔ اگر میں آج اٹھا دوں تو وہ
سب لگ

کی خدمت میں دے دیں گے، یہ اسی لائق ہے۔

کی خدمت میں دے دیں گے، یہ اسی لائق ہے۔“

دعوتِ لہدیٰ خوست سے کہیں خاں کی کلائی میں دانت کا ڈوبے۔

کہیں خاں نے گھبرا کر گفتِ طبع کی۔ رنجِ پھل کر خورشید پگڑی اور اس سے پہلے کہ کہیں خاں یا کوئی اور اس پر ہاتھ ڈالنا، وہ لپکے کھلی ہوئی کھڑکی سے بیچے کو گھسی۔ سردی خاتمِ آفتاد شجاع علی خاں اور جنگجو کی

سبے پناہ جینوں سے لپڑا عقدہ دل گیا۔ ایک منہ بگاڑ بڑا ہو گیا شمس الدین
 حاس صورت حال بگڑتی دیکھ کر کھٹے سے اتر کریم خان آگیا میوا و
 واصل اس کے دہیں بائیں تلواریں بند دین تانے پوتے ساتھ تھے۔ گل
 میں پیچ بکھارا اور افزائش گی مونی تھی۔ طوائفیں اور ان کے گل بیٹھے مومے
 شونہیں سب دواں جمع تھے۔ شمس الدین کو دیکھتے ہی مجمع کافی کی طرح چھٹ
 گیا شمس الدین خان سے ٹھٹھے پر سوار ہو کر نکل جانا چاہا مگر اسی وقت شہر
 کا کڑوا لڑخا خان دس بارہ برقی امازون کے ساتھ ڈھیر اچکا لڑاکا راہ
 مسدود ہو گئی شمس الدین اور زنا خان میں بہت دھننی تھی۔ اس نے شمس الدین

”مہم لڑنا ہے، حکم کی تعمیل کی جائے“ فرزیر چلایا یہ ابھی اسی وقت
 شمس الدین خان کو کہا۔ سارے مامنے پیش کر رہے تھے شہر میں کوئی بدحاشی
 نہیں دیکھ سکتا۔ یہ نواب اپنی ریاست میں جو چاہے کرے، میں کچھ دخل
 نہیں کر سکتا۔ اسے ہمارے قانون پر چلنا لگانا۔“

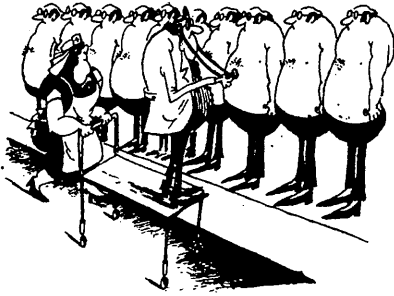
”مصور کیا لو اب کو ہتھیار دی لگائی جائے؟“ کوتوال نے ڈرتے ڈرتے پچھا۔
 فرزیر نے انکے اگلے غور کیا پھر لڑا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔
 نواب کو لہو دم آئے چلنا ہے۔ ان آگودہ دے گئے تو ہتھیار دی لگا کر لانا۔ اب
 جاؤ۔ سلام۔“

خاں سے پوچھا تو نواب صاحب اکیلا معاصر ہے؟ شمس الدین نے جواب دینا چاہا مگر اچانک مجمع سے قتل گیل خاں اٹھا۔ سرودی خاں اور بیگم صاحبہاں لادنی ہوئی آئیں۔ انھوں نے کزنوال کے گھوڑے کے بائیں سر دیوں میں کمریم خاں نے فتنہ انگیزی کا ارادہ کیا لیکن شمس الدین خاں نے اسے روک دیا۔ دلی کار بزنٹ ولیم فریزر، شمس الدین خاں کے باپ کا گلدوست تھا شمس الدین خاں اسے چمکتا تھا۔ اس لیے اسے امینان تھا کہ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کزنوال معاملے کی نزاکت بھانپ گیا تاہم اس نے چاہیوں سے کہا کہ شمس الدین خاں کو جان دیا جائے۔ سپاہیوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ مگر اٹھا کر مکان میں لے جانی چاہی تھی۔ اس کا بدن خون میں لبت پت تھا اور بیچ

مجم پڑتی جا رہی تھی کہ نوزال کے حکم سے فی الصلوٰۃ حکم حسن اللہ خاں کو بلایا گیا یہ حکم حسن اللہ نے اگرچہ جوکی حالت دیکھی تو گھبرا کر کہا کہ مریض کی حالت نازک ہے میرے بیٹے سے غور بڑی مقدار میں ضائع ہو چکا ہے۔ فاس ہے کہ ایک دو دلیپوں کو بھی خبر پہنچا ہے۔ بہر حال کوشش کرنے ہیں۔

مردی خان پہ بکوش ہو گئی تھی۔ سارا غم کہ ہم بنا ہوا تھا۔ جس کس کو فطرتی جھکا ہوا آہنا۔ دیکھتے دیکھتے برادری کے تمام مرد و زن جمع ہو گئے۔ ہر ایک کی زبان پر شمس الدین خاں کا نام تھا۔ بحسن الحسن اللہ کی تمام تدبیریں لگانا لگیں۔ دیکھو کہ بکوش نہیں آیا اس کے پہرے پر موت کی زد یں پھیل رہی تھی۔ سانس انتہائی کست تھی جیسے وہ بس تھوڑی دیر کی صاف ہو کر نوزال کے بھی بکوش اڑے ہوئے تھے۔ پہلے اُس کا لڑا ہوا تھا کہ شمس الدین خاں سے وہ تھی نبھائے اور کسی دیکسی طرح یہ قصہ بین وضع دیکھنے کے بعد جو کی حالت دیکھ کر اُسے عبور اولیم فرزند کے جنگ جانا پڑا۔ رات کے تین بجے ہے تھے۔ وہ فرزند نے خبر مولد ہاتھ نوزال کے پیہرے دار

202



آئندہ قسم سے پلچھے بغیر دل نہیں آگے گا، ہم کوشش کرے گا کہ بات سوا لاکھ روپے ہی پر مل جائے اور تھاری عزت بھی ہے۔ عزت کے سامنے روپے کچھ نہیں بڑا، ٹھیک؟

شمس الدین خاں نے مومن نگا ہوں سے فریور کو دیکھا ہے ہم آپ کا بہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔

”کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں“ فریور نے منہ کرکے اطمینان رکھو جب تک ہم زندہ رہے کوئی مختار بال بیک نہیں کر سکتا۔ ”میں تمہیں بھلاؤ اس احسان کا بدلہ چکانا ہوگا۔ چکاؤ گے؟“

شمس الدین خاں نے خیال کیا کہ شاید فریور اپنی عیاشی کے لیے کچھ طلب کرے گا، جو عین فریور کی بہت بڑی کمزوری تھی چنانچہ شمس الدین خاں نے وعدہ کر لیا۔

شہقند کی ماں بیمار تھیں۔ اسے ان کی عیادت کے لیے ایک ایکی مہاں گیر آباد چار پڑا تھا۔ جاتے ہوئے وہ عباس علی خاں نے تاب سے لے گیا تھا کہ راجو کو جو خبر دینا آج ہم نہیں آسکیں گے۔ وہ انتظار نہ کر سکیں عباس اپنے شغل میں لگم ہو گیا۔ اسے پیغام پہنچا تا یا دریا۔ وہاں گیر آباد پہنچ کر شہقند کو معلوم ہوا کہ والدہ کی طبیعت بہتر ہے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ دن بھر کا تھکا مہانہ تھا، بستر پر لیٹ کر غافل ہو گیا۔ رات گئے اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کا کام بیسے میں شرالہ تھا اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے ایک بھانک خواب دیکھا تھا۔ خواب میں وہ اور راجو اگر سین کی باولی کے قریب کھڑے تھے۔ نہایت مذہب منظر تھا۔ طرف تاریکی چھاری تھی۔ بیکار راجو کا ہاتھ جھسلا اور وہ گہری باولی میں جا گری۔ شہقند نے اسے جانے کے لیے باولی میں کودنا یا لیکن کسی نامعلوم ہستی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ راجو دوڑتے ہوئے چلائی۔ شہقند! مجھے پائیے شہقند! مجھے پائیے، لیکن شہقند کچھ بھی نہیں کر سکا۔ چند لمحوں بعد راجو کی چھین بدھم پڑ گئی۔ یہ خواب دیکھ کر شہقند بے چین ہو گیا۔ طرح طرح کے پشیمان کن خیال دل میں آنے لگے۔ آفراس سے راز دیکھا اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو

اس نے آہستگی سے کہا۔ چچا! میں احساس نہیں تھا کہ معاملہ یہ صورت اختیار کر لے گا۔ ہم نے اس طوائف کی ماں کو سوا لاکھ روپے نقد ادا کیا ہے لیکن وہاں گیر آباد کے رئیس مصطفیٰ خاں نے نہ معلوم اس پر کیا جادو کیا تھا۔ اس نے ہماری ذہن ذلیل کی بھر خود بخود کھڑکی سے دو گئی۔ اب جیسا آپ فرمائیں ہم کریں گے۔

فریور نے بول منہ سے لگا کر دو گھونٹ پیے پھر چھوڑتے ہوئے بولا۔
”تم سوا لاکھ روپے ایک روٹی پر بچھاؤ کرنا ہے بہت خوب۔ ریاست کے فریور کی کمانی بول ٹٹانے کے لیے ہے؟ افسوس تھا ریاست زندہ ہوتا تو انھیں ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ٹھیک ہے، ہم جانتا ہے کہ تم رئیس نواب لوگ ریڈی کی بفر زندہ نہیں رہ سکتا لیکن سوا لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ تم بھی طرح جانتا ہے کہ ریاست میں تمہارے دو چھوٹے بھائیوں کا حصہ بھی ہے تم کس حق کے تحت ان کی جائیداد چاؤ ڈی میں لٹا تا ہے؟ بولو، جواب دو؟“

”بولو، جواب دو؟“ فریور کا تکیہ کلام تھیں۔ شمس الدین خاں کو خبر تھی کہ جب فریور نصیحت میں ہوتا ہے تو بولو، جواب دو کی تکرار کرے لگتا ہے۔ اگر کوئی جواب نہ دے تو اس کا پارہ اور پھڑھڑاتا ہے لہذا کچھ نہ کچھ کنا فریور کی حق کو فریور نے وہ بات کہی تھی جو دھری جائے نہ اٹھائی جائے۔ حقیقت یہی تھی کہ شمس الدین خاں دولوں ریاستوں پر تاحاضی تھا جب کہ باپ کی وصیت کی رفسے ریاست لوارا اس کے سونے میں بھائیوں کو ملنی چاہیے تھی۔ دول بھائی بالغ ہوئے۔ تک اپنی ریاست طلب نہیں کر سکتے تھے۔ شمس الدین خاں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر گل چڑے اڑانے میں مصروف تھا۔ فریور گھر کا بھیدی تھا۔ اس سے شمس الدین خاں کی یہ عیاشیاں چھپی ہوئی تھیں۔ گھر کا بھیدی ہونے کے علاوہ وہ اپنے بھتیجے کی ناؤ نوش کی مغللوں میں بھی ایک بے تکلف دوست کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔ اس بنا پر شمس الدین خاں کو اطمینان تھا کہ کتیل بھٹے کو لالہ مجھے ڈو کا ہے کہ جب سے فریور کی کار پر بیٹھ بن کر آیا تھا شمس الدین خاں اور کھل کھلنے لگا تھا۔ فریور اس کی نکتوں سے شغل پریش کرنا تھا لیکن تاکہ؟ راجو کا معاملہ اور سوا لاکھ چار دلی میں پچھلے پنچے کی زبان پر پھیلنے والا واقعہ تھا، اسے دبانے اور کھٹکے کے حکام کو مدینہ کرنا فریور کے لیے مشکل تھا۔ شمس الدین خاں گدن جھکا لے کھڑا تھا، مگر فریور کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ اسے پسے پیدا ہو گیا۔ اس نے خواب کی بول ایک طرف چھینک دی اور آگے بڑھ کر شمس الدین خاں کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ دیکھو شمس الدین خاں! ہم تمہارا دشمن نہیں دوست ہے۔ ہم نہیں جانتا کہ تم کسی آفت میں چھنس جاؤ۔ اب تم دلی میں امت کرکھو فوراً اپنی ریاست کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ ہم صبح چاؤ ڈی خود جانے گا اور اس طوائف کے رشتے داروں کو سمجھا کر معاملہ رفع و دفع کروائے گا لیکن

کچھ دیر چل تدری کی چہرماں کے باہمی کیا۔ وہ جاگ رہی تھیں اور تھناش
بتاں تھیں شیفقت نے ماں کے قدموں کو پسو دیا اور ناشتہ کیے بغیر باہر سے
ایک تازہ دم گھوڑا لیا اور گدی رفتار سے دلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ جوں جوں
وہ دلی کے نزدیک پہنچا، اس کی بے قرار سی بڑھتی گئی۔ وہ جیل تھا کہ آخر
ماجرہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اسے گھسیٹے لیے جا رہا ہے گھوڑے
کو پرکھ گئے تھے۔

وہ دن بڑے شہزید داخل ہوا۔ کاروباری سرگرمی اور جبل پسپا
معمول کے مطابق تھی۔ کوئی خاص بات دکھائی نہ دی۔ بازار میں تین چار
جاننے والے ملے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا اور کل گئے شیفقتہ کو ان
کے مسکرانے پر تعجب برا مگر وہ دُر کا نہیں۔ وہ مسدحہ عمار کے پاس پہنچنا
چاہتا تھا۔ بلا تائن جنت پہلے کوئے پادیں حاضری دیتے ہیں، اس کے
بعد کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہیں سے

علی الصبح چوں مردم بہ کار بار و نہ
بلا تائن محبت نہ کوئے یار و نہ

شیفقتہ ایک چور ہے پر پہنچا یہاں سے ایک راستہ شاہی محل کو،
دوسرا اوڑی کے عقب میں قبل مالوں کے قریب نکلتا تھا جسے گنمش تھی۔
ایک ایک اس نے سامنے سے عباس ملے کو آئے ہوئے دیکھا شیفقتہ کا دل بہت
زور سے دھڑکا، اس وقت اس علاقے میں عباس کا کیا کام؟ اس کی صورت
کے دیکھتی تھی کہ کوئی قیامت گر رہی ہے شیفقتہ ایک دم گھوڑے سے اترا۔
”عباس! عباس! خبر تو ہے؟ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

عباس کے ہونٹ تھر تھرائے۔ اس نے تڑبی مشکل سے اسے سنبھلے
کی کوشش کی چہر تھرائی ہوئی آواز میں ساری بات تہادی شیفقتہ کی۔
”انھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ رجمر گئی؟ زندگی کی سحرانی مہلہ شام میں مل
گئی؟ اب رات کا سبب بھی نہ ختم ہونے والا ستا ہے، تنہا ہے ہمارے
نامرادوں کے طویل سامنے ہیں عباس نے آدھی سے کہا شیفقتہ: تو قسمت
کو منظر ہے وہی ہوگا۔ آؤ، ایک نظر آجے دیکھا آئیں۔“

گلی میں مٹا تھا۔ بالاخانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ سردی
خانم کے مکان کے باہر ایک چارپائی پر مرزا خانی کو توال گردن جھکاے بیٹھا
تھا۔ تین چار سپاہی اٹھ لیے کھڑے تھے شیفقتہ کو دیکھ کر مرزا خانی اٹھا۔
”اچھا ہوا آپ آگئے۔ شاید اب اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔“

شیفقتہ کا کلیجہ منڈک گیا۔ اندر سے سردی خانم اور جھگڑے کو سنے
ہیں کرنے کی آوازیں کان میں آئیں شیفقتہ اپنے آپ کو سنبھال کے
مکان میں داخل ہوا۔ سامنے میں دالان میں سردی خانم چھاپیں کھا رہی
تھی۔ ہائے میں نے لالچ میں آکر اپنی مصمم بچی کو مار دیا۔ میں اس کی
قائل نہیں۔ گو! اچھے چھاپی ہوئے لنگا دوں گا کہ مرزا خانی میرے ہاتھ کچھ نہ

آیا۔ اسے بے غالی روگئی۔ یہ غوسہ دن بھر کو دیکھنا تھا۔ شیفقتہ کو کچھ کے
سردی خانم پیک کے آئی اور اس سے چٹ کے کڑی طرح رونے لگی شیفقتہ
کی انھوں سے بھی آجوباری تھی۔ سردی خانم کو دلایا اسے کہ وہ اس
کے ساتھ برصوں کے بیمار کی طرح سر ہٹا کر اوپر پہنچا۔ وہی کہ تھا،
اس کی پہلی اور آخری محنت تھی اسی جگہ علوہ آرائیاں کی تھیں۔ کر کے
ایک گوشے میں سرخ چادر اوڑھے کوئی سرور یا تھا شیفقتہ نے کیا پانے
تھا جس سے چادر کا کونا اٹھایا اور بھر کے چہرے پر نگاہ ڈالی اس کی آنکھیں
بند تھیں اور چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید تھا، سر پر شیاں بندھی
ہوئی تھیں اور سانس کے زبردست کابینہ پنہن تھا۔ بظاہر وہ ایک لاش تھی۔
شیفقتہ کی آنکھوں سے دو قطرے ڈھلک کر اس کے چہرے پر گرے۔ اسی
کا شعر ہے۔

طوفان روح لانے سے اے حشر ہمارو؟

دوا تک بھی بہت ہیں اگر کچھ اتر کریں

بالیں پر بیٹھ کر اس نے رجمو کا بے جان ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بیض
ٹوٹا چاہا کچھ فیض کی حرکت نہ ملی اس کا دل بیٹھنے لگا۔ ایک ایک رجمو نے
کر لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ دو اشکوں نے بہت جلد اتر دیا تھا۔
شیفقتہ نے جھک کر دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر لپٹا دیا۔ رجمو! رجمو! دیکھو
ہم آگئے ہیں۔ ہمیں دیکھو۔“

دو بڑی بڑی آنکھیں گھوم کر شیفقتہ کے چہرے پر جم گئیں۔ ان آنکھوں
میں غوشی کی ایک معمولی چمک نمودار ہوئی۔ ”آپ آگئے شیفقتہ؟ چٹا کیا۔ کہاں
چلے گئے تھے اپنی رجمو کو اہل چھوڑ کر؟ اب عہد کیسے کہیں نہ جائیں گے۔
میں نے آج تک آپ سے نہیں ملنا سنا سنا۔ ایک چپ چاپ بیٹھی ہوں جس
طرح بھی ہو سکے وہ چیز لادیں گے کیسے لادیں گے؟“

شیفقتہ نے کہا: تم پر ہماری جان بھی فلا ہے۔ رجمو! برو، کیا چاہیے؟
رجمو کی نگاہیں گھوم کر اپنی ماں کے چہرے پر جم گئیں۔ چند لمحوں کے
میں موت کا سکوت طاری ہوا۔ پھر اس نے کہا: پتی ہوئی کرو اور اس کا۔
”آپ اماں جان کو سوا لاکھ دینے لکھ دے دیجئے۔ انھیں مجھے سے اور آپ
کی آبرو سے زیادہ سوا لاکھ دے بیہ چوہین ہے۔ سردی خانم بچا کر کھا کر گری
اور بے برکشی ہو گئی۔“

شیفقتہ نے رجمو کے علاج میں کوئی دقیقہ فرو گزارتا نہیں کیا۔ شہر
اور بیرون شہر کے نامی اطباء، دوا اور اسکرینڈول بھی آئے لیکن رجمو کی
حالت روز بروز گت جلد ہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شمع اب بجھنے والی
ہے شیفقتہ کا نام وقت رجمو کے سر جانے لگتا تھا۔ کھا پانا، دوا، جنا سب
کچھ فراکش ہو چکا تھا۔ رجمو کی محنت پہلے ہی اس کے رگ پے میں زندگی
نہ کروڑ رہی تھی لیکن اب اس کے لیے پناہ اٹھانے شیفقتہ کو
سب تک

عشق اور جنس کے منزل میں داخل کر دیا تھا۔ فائدہ نئی زلیلا اور زوہرہ بیچ کر اُس نے اگلے ہی دن سوال لکھ دیہ میر سدی خانم کے قدموں میں رکھ دیا تھا لیکن میری خانم اب نام ان کا نہیں بھول چکی تھی۔ اُس کی جان ورجو میں اٹکی ہوئی تھی۔ اب وہ دن بھر مسئلہ پر مبنی رو کر دھامیں مارتی یا فیدوں اور غنا میں جن خیرات فقیر کو کرتی رہتی۔ اُسے کھانے پینے، پہننے اور دھننے کا ہر شے بھی نہ تھا۔ یہی حال رنجو کی بھوئی میں جنگل کا تھا۔ وہ دن بھر چھپ چھپ کر آنسو باتی۔ اُنسا و شجاعت علی خاں کی کر اس غم نے زہری کر دی تھی۔ وہ بہت ڈر رہی میں بھی ہوئی جا رہی تھی پر بے سہرہ بڑے رہتے۔ کوئی کوڑھ لکھ کر کہتا تو کوڑھ لگاتے، کوئی کھا نہ کھاتا دیتا تو کھا لینے ورنہ چپ رہتے۔ شیفقتہ رنجو کے پلنگ کی پتی سے لگا اُس کی صورت تکتا رہتا۔ بھلیوں اور بدوں سے آپس ہو کر وہ پریوں، فیول اور شائع کی طرف متوجہ ہوا مگر وہاں کیا دھار تھا کسی عمل کسی توجہ کسی نوعیت کسی دھلے سے روٹی ہوئی زندگی واپس نہیں آئی۔ بالورسی کی انتہا ہو گئی۔ اُسے اپنی زندگی سے بھی نفرت ہوئے گی۔ اُس کا دل مضبوط تھا۔ اسلاد کہ شب کو دم اور رنجو کو آہن بنا لیا اُنسا تھا لیکن رنجو کی حالت نے اُسے شیفقتہ کے مانند خود بخود کر دیا تھا۔ ہمارا بچہ بھی خزاں کا دور دورہ تھا۔ جدھر نظر جاتی دھل اڑتی دکھائی دیتی۔ جو بچہ سن گھٹوں میں۔ شکل ایک آدھار کروٹ بدلنے ورنہ ہمہ وقت اُس پر غشی طاری رہتی۔ اُس کی آواز بے حد صغیف ہو گئی تھی۔ کچھ سننے کے لیے کان اُس کے لمبوں کے قریب لے جانا ضروری تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ٹوکھ کرنا کا نا ہو گئے تھے لیکن چہرہ جرت انجک۔ طوط پر روشن اور تڑنا زہ تھا۔ بچہ شکل سے چلیں کا غرق صحن میں پکیا جاتا کبھی کبھی وہ بھی تھے کے ذہین کل جانا۔ کوئی دوا کا اگر نہ ہوتی تھی۔ حکیم جن اللہ خاں نے آخری ترمیم اگر دیکھا تو علیحدگی میں شیفقتہ سے کہا۔ مریضہ کا بچہ مشکل ہے۔ ذقن کا آفری درجہ بھی آفری درجے میں پہنچ چکا ہے۔

اُس رات زمین سے آسمان تک جیسا تک سکوت چھا ہوا تھا۔ پھیلے پہر یکا یک شیفقتہ غنوغی سے چونکا۔ رنجو کی سانس زور زور سے چل رہی تھی شیفقتہ نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ رنجو نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ ایک ناقابل فراموش دل دھڑکنے والی مسکراہٹ اُس کے خشک لبوں پر نمودار ہوئی۔ شیفقتہ نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رنجو! اب کیا حال ہے؟ سوچاؤ۔ کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟

رنجو نے دالانہ انداز سے شیفقتہ کی طرف دیکھا اور وہاں لہجے میں بولی نہ شیفقتہ! اُس کا حال کیا ہو چھتے ہو جس کی اُمید نصرت ہو چکی ہے مگر نصرت کا نشانہ کیا ہے۔ میں گرد گرداں ہوں میرے مرنے پر خاک اڑنی دکھائی نہیں دیتی؟ لٹے ہوئے پیش کی تصویر ایسی ہی ہوتی ہے کیا زمانہ تھا، میری زلفیں آپ کے ثنائوں پر بکھری رہتی تھیں لیکن اب یہی زلفیں

بلائے جاں ہیں میری نمنا ہے کہ جب دم نکلے تو آپ اسی طرح میری بالیں پر ہوں اور میں آپ کو کھیتی رہوں۔ اسی حالت میں آنکھیں موند جائیں اسی طرح جان نکلے گی نہیں بلکہ جہاں آجائے گی اور پھر آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ رنجو زندگی کا کچھ لطف آ رہا؟ شیفقتہ کا دل دھڑکھڑانے لگا۔ اُس نے بس سے اُدھر دھڑکیا۔ میری خانم کچھ فاصلے پر سو رہی تھی۔ جنگل غلی منزل پر بھی، وہ بھی سو رہی ہوگی۔ وغیرہ رنجو کے بدن پر غصہ پھرتی چھوٹی اُس نے لرزتی آنکھوں سے شیفقتہ کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا جیسے اُس کے نشانے کا سہارا لینا چاہتی ہو پھر ڈوبتی آواز میں بلبل شیفقتہ! میں رخصت ہو رہی ہوں میرے سبب نصرت رخصت کر دیکھو گا اور دیکھو میری اماں اور بہن کا خیال رکھیے گا، اب آپ کے سوا دنیا میں ان کا کوئی نہیں ہے۔

رنجو کا ہاتھ تیری طرح کپکپاتا لگا۔ سانس ایک تیز زور زور سے چل پھر آنکھیں چوڑھ گئیں اور ناک کا پائنا پھر گنا شیفقتہ کی چیخ آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

شمس الدین خاں کو رنجو کے معاملہ میں دلچسپی سے بہت مایوسی ہوئی۔ فریزر نے دیرینہ آرام کا خیال بھی نہیں کیا۔ شمس الدین خاں کے دل میں اُس کے خلاف گراہ بکھری گئی۔ تاہم کچھ عرصے بعد جب فریزر فرزند پلورہ جھکر آ یا تو نواب نے رواجی انداز میں معمول کے مطابق اس کیلئے ناؤ نوش کی مٹھلیں برپا کیں۔ فریزر کوئی پہل مریض میں آیا تھا۔ نواب شمس الدین خاں اور اُس کے بھائی فریزر کو کچھ جانتے تھے لیکن اسی چانے اُس رات شمس الدین خاں کی جولانہ جہاں گروہ بچم کے ساتھ کیا گیا۔ سنیے۔ جہاں گروہ بچم جو بھائی حسین و بھائی ابراہیم اور اپنے بھائیوں کی طرح فریزر کو کچھ جانتی تھی فریزر اور جہاں گروہ بچم کی طرف میں خاصا فرق تھا۔ فریزر اور جھکر کی مرحد سے شکل کر چھاپے کی طرف فہم بڑھا رہا تھا، جہاں گروہ بچم نورانی سے جوان کی جانب پکڑ رہی تھی شمس الدین خاں کے گھر انے میں سخت پردہ ہوتا تھا۔ عورتیں ناخوس کے سامنے نہیں آتی قہد لیکن دیکھ کر فریزر ایک ٹوڑا افسر تھا وہ دوسرے نواب احمد بخش تھے اُس کے دو تازہ مرام تھے۔ احمد بخش کی موت کے بعد شمس الدین کے ساتھ شراب کی مٹھلیں میں شریک ہونے لگا۔

اس رات فریزر پلورہ جھکر میں ایسی ہی مٹھلی میں ہوئی تھی۔ جیسے جیسے رات بیکینی گئی۔ فریزر کا نشہ بڑھ گیا۔ ہم بالہ اور ہم ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ آخر میں صرف میزان اور دھانہ رہ گئے شمس الدین خاں نے دیکھا کہ فریزر صاحب بالکل بے قابو ہو چکے ہیں اُس نے انھیں آرام کرنے کا مشورہ دیا اور خود نہانے حصے میں چلا گیا۔ فریزر تنہا رہ گیا۔ یکایک اُسے جہاں گروہ بچم کا خیال آ یا۔ زمانہ غلی سرا کی جانب خاموشی طاری تھی۔ وہ اپنے

کر آیا دو پتا سر سے اُتار اور شمس الدین خاں کے برہنہ پر ڈال دیا۔ بیٹا اب کیا کرے؟ انھیں صبح صبح سلامت نکل جانے دو۔ آئینہ بہاں مت آنے دینا۔ ایک تہہ میرے کفن سے ان کی جان بخش دو۔ اگر فریزر صاحب مالے گئے تو یہاں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ انگریز بڑے خائن کو تو جتن کھن کھن کر دیں گے۔

بات شمس الدین خاں کی سمجھ میں آگئی۔ اُس نے ماں کا دو پتا اٹھا کر اُس کے سر پر رکھا اور فریزر کو قتل کرنے سے باز آگیا۔

فریزر بڑی مشکل سے جان بچا کر فریزر پور چھوڑنے نکل بھاگا اور دلی پہنچے۔ دلی کا مایہ ہو گیا۔ دلی پہنچے اس نے شمس الدین خاں کے سوتیلے بھائی امین الدین اور ضیاء الدین کو راکھ یا کھنڈار سونپا دیا۔ دونوں ریاستوں پر قبضہ جانے بیٹھا ہے۔ تم اگر اپنے حق کا مطالبہ کرو تو جس تختہ راستہ دینے کو تیار ہو۔ اس وقت موقع اچھا ہے، کلکتے کا گورنر جنرل سر جارجس ملکاٹ میرا دوست ہے۔ دلوں اپیل کرو۔ میں سفارشی خط لے دیتا ہوں۔ کام بن جائے گا۔ اتفاق سے یہ گفتگو خبر بیگ نامی ایک شخص نے سُن لی۔ اس شخص کو شمس الدین خاں نے اپنے بھائی کے ہاں اسی مقصد کے لیے کھوا بھانجا کر وہ کئی سوئیاں لیتا ہے۔ خبر بیگ نے اس بخت و پز کو خبر فرما شمس الدین خاں کو پہنچا دی۔

شمس الدین کا سوتیلہ بھائی امین الدین کلکتے پہنچا۔ اُس نے معاملاتِ حکام بالا کے گوشہ گوشہ پر فریزر نے سر جارجس ملکاٹ کے نام ایک خط بھی لکھ دیا تھا۔ نتیجتاً فیصلہ امین الدین خاں کے حق میں ہو گیا۔ حکم دیا گیا کہ ریاست لودھان شمس الدین خاں سے لے کر اُس کے چھ بھائیوں کو دی جائے۔

اس فیصلے کی خبر شمس الدین خاں کو پہنچی۔ وہ اپنے مصائبِ رحمت دستِ بخشن پر پہنچا تھا۔ اُس نے ایک ماہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اُس کا چہرہ آگ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر بے چینی سے شے لگا، ایک صاحب نے کہا۔ حضور! اُس مردِ بندگانِ اولاد فریزر نے بڑا ظلم ڈھاکھلے ہے۔ کسی کی آبرو اُس کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ اُسے کتے کی موت نہ مارا تو کچھ نہ کیا۔

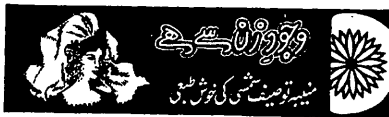
دوسرے نے غصہ دیا۔ اُسے مارا کیا مشکل ہے۔ نواب صاحب کا اشارہ چاہیے۔ مٹوئ میں چوٹ پٹ کیا جا سکتا ہے۔ شمس الدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیم خاں دہلی پہنچے۔ کیا حضور! کس سوچ میں ہیں؟ کھانا کیں ٹھنڈا کر رہے ہیں؟ ہم جہاں نثاروں کے ہوتے ہوئے آپ کو کس بات کا غم ہے؟ اگر دشمن سے آزار پہنچانے تو یہ خدام اُن کی خاطر کمر لگائے۔ شمس الدین خاں نے گھور کر کیم خاں کو دیکھا۔ شرمکام پرست یوں ہی باتیں بناتے ہیں۔

کر سے نکلا اور لو لکھڑا نا ہوا محل سر کی طرف بڑھا۔ دو ایک پہرے ملاں نے اُسے اُدھر جاتے دیکھا اور نوٹے دُستے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک ہی گھونکی نے انھیں پرے بٹھا دیا۔ فریزر کو محل کے اندر گھسنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بائیں ہاتھ کو پہلا کر وہ جہاں گئے گا تھا۔ وہ جہاں گئے سہری پر سو رہی تھی۔ ایک لوٹری بٹانی پر پنا پیلنگ بچھلے چڑی تھی۔ فریزر کھلے دروازے سے ایک ماں اندر داخل ہو گیا۔ شمس کی تدمر روشنی پھیل ہوئی تھی۔ فریزر کی آہٹ سے لوٹری کی آکھٹھل اُس نے نہ جانے فریزر کو کھوت سمجھا یا پریت ایک ہلناک بچہ ماری اور دروازے سے نکل بھاگ۔ لوٹری کی بجے سے جہاں گئے کی آنکھیں کھل گئی۔ فریزر اُس کی مسہری کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ خوف سے جہاں گئے کی گھٹکی بندھ گئی۔ چار فریزر آپ؟ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

آج میں سوئے گا، تمھارے کر سے میں تمھارے ساتھ۔ فریزر نے لو لکھڑا کر کہا۔

لیکن اُسے مزید کچھ کینے کی صلت نہیں ملی۔ دُعا سے ایک زوردار ہاتھ اُس کی گدڑی پر بڑا فریزر نے نہ کر دیکھا شمس الدین خاں شعلہ آگ لانا ہوا تھا۔ فریزر پہلے زوردار بچھا کھڑا نہ ہو کر لڑا۔ نتیجتاً گتھ آدی ہے۔ ہم اس بزمِ بزمی کا مزہ کیکھانے کا؟ اُس نے جب میں ہاتھ ڈال کر تمہیں کال لیا شمس الدین خاں نے اُس کے منہ پر گھونسا مارا۔ فریزر اُلٹ کر گرا۔ اُس کی ناک سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ جوبلی میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ نوکر چاکر غلام، خدمت گار، سپاہی سب اپنے اپنے ہتھیار لے کر آگئے۔ اُن کا مرثیہ کیم خاں آگے آگے تھا۔ اُس نے آتے ہی ظلم سے فریزر کا کام تمام کرنا چاہا لیکن شمس الدین کی ماں نے اپنی تسمہ سے کر لے۔ رو کا شمس الدین خاں غیظ و غضب کی بجائے انصاف بنا ہوا تھا۔ فریزر کا نشانہ ہر نوکر کو اُس نے اوٹ پٹا۔ آگ اور آواز انگریزی میں ایسے کلمات کے جیسے وہ اپنے آپ لے ہیں نہ ہو۔ اسی طریقے سے جہاں بچ سکتی تھی بھاگ فریزر نے دُعا کے محل سے شمس الدین خاں کی مدد کر کے ایک بڑا احسان کیا تھا لیکن احسان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شمس الدین خاں اُسے اپنی بہن بڑا ہاتھ ڈالنے کی چھوٹ دے دیتا، شمس الدین خاں کی غیرت و محبت کے لیے یہ بڑا نثار یاد تھا۔ اس نے لاکھ کر کیم خاں سے کہا۔ اس مردِ کوا بھی میرے سامنے جنم دہل کرورد میں تمھارے داؤل کا؟

کیم خاں نے دوبارہ ظلم بندگان اور فریزر کی طرف بڑھا۔ فریزر دُعا کے بارے سے تھوکر کا نپ دیا تھا۔ شمس الدین کی لڑھی ماں فریزر کی حیثیت اور تنہ سے خوب آگاہ تھی۔ اُسے خوف تھا کہ اگر یہ شمس الدین یا کیم خاں کے ہاتھوں اس جوبلی میں قتل ہو گیا تو انگریز محفل جوبلی پر ہل چلا دیں گے اور ایک ایک زلزلہ پہنچے تو کھو میں بلوائیں گے۔ اُس نے ایک



عش الدین خاں ٹٹلے ٹٹلے ٹگ گیا۔ بہتر ہے۔ ابھی تھوڑی سی
جان نثاری کی تلقین کھلی جاتی ہے جاو اور دلی پہنچ کر فریڈ کو ہم کیم
کر دو۔ اپنے ساتھ آنا بیبا اور دل کو بھی لے جاو یر خاں آداب
باجکر رخصت ہو گیا۔ اس نے اسی وقت نیز فدا راہ دیاں تیار کیں،
آنا بیبا اور دل کو ہمراہ لیا اور دلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

کیرم خاں! کیا تم کو مساجد کے دروازوں پر ہوا وہ گھوٹلے
پراور کیا میسرابندی پسپور تھا۔ دلی میں کیرم خاں نے ایک بندوق کے کر
اُس کے نال چھوٹی کرائی تاکہ بندوق آسانی سے چھپائی جاسکے۔ یہ دونوں مزید
دو ماہ تک فریڈ کے تعاقب میں رہے مکن وہ بھی حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ اُسے
دلائل شمس الدین خاں کے چچا زاد بھائی فتح اللہ بیگ نے خبردار کر دیا تھا کہ
نواب تھا کہ خون کا چایا ہو رہا ہے، اُس کے آدھی عمر سے پیچھے لگ
ہوئے ہیں۔ مفتی اللہ بیگ آٹھ شمس الدین خاں میں ایک معمولی بات پر مذاق
مذاق میں علوت ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نچا دکھانے کی
کوشش میں رہتے تھے۔

سب رنگ

دلی دلاڑے سے اندر داخل ہوا وہ سیدھا دیا گنج میں شمس الدین خاں کے پاس پہنچا۔ اس دوران دہلی کا قیام کبھی کسی میں نہ تھا۔ کیرم خاں نے گھوڑا مضبوطی سے باندھا اور کستانے کے لیے چارپائی پر لپیٹ گیا۔ تھوڑی دیر سوئے کے بعد وہ بیکار آٹھا شمس الدین خاں کی طرف سے آئے ہوئے تمام خطوط اُس نے جلا ڈالے اور اگلے روز نے پانی کے حوض میں پھینک دیے۔

ایک بار شمس الدین خاں سے مل کر باہر نکلا۔ اسی وقت کیرم خاں کے ایک رشتے دار نے شمس الدین خاں کو مشورہ دیا کہ حضور! اسے فوراً مروا دیجئے۔ بیچ ذات کا آدمی ہے ایسا بڑا نکل کلاں کسی کے سامنے زبان کھول دے اس کا زہر دینا احتیاط کے خلاف ہے۔ شمس الدین خاں سوچ میں پڑ گیا کیا انبیائے نبیؑ نے بات باہر سے سن لی۔ انہیں پس زب نے پکار کر کہنا کہ انبیاءِ اجماعی باہر نکلا ہے، اُس سے کہو کہ دلا میری ایک بات سن جائے۔

انبیاءِ نبیؑ نے حاضر دماغی سے کام لے کر کہنے لگا کہ آواز میں جواب دیا حضور

ابھی آنا تھا۔ دلاؤ غنی ہاں دلاؤ غریب

بھی تھا۔ فریزر کی لاکش دیکھتے ہی وہ اُس پر گرا اور پہلے اختیار چمچ پڑا۔ ہائے
 ہائے شمس الدین خاں نے نہ چھوڑا۔ میں پہلے ہی کٹنا تھا کہ کیم خاں آپ کو
 مارنے کے لیے فرزند لید سے آیا ہوا ہے۔ آپ اکیلے دیکھ نہ چھریں۔ یہ کہیں
 آپ نے میری بات نہ مانی، آخر اپنی جان دی۔

جان لارنس نے یہ بات سن لی یہ اُس زمانے میں پانی پت کا عہد تھا
 خٹا فریزر سے اس کی گہری دوستی تھی۔ دوست کے قتل کی خبر ملتے ہی وہ گھوڑے
 پر سوار ہو کر دلی پہنچنے والا پہلا انگریز تھا۔ اُس کے علاوہ فریزر کا جینیسی خانی
 سیس فریزر اور ٹاس مشکاف دونوں بڑے افسر بھی وہاں موجود تھے۔ لارنس
 اُن دونوں کو ساتھ لے کر شمس الدین خاں کے چاندنی چوک والے مکان پہنچا۔
 شمس الدین خاں جب بھی دلی آتا، اسی مکان میں ٹھہرتا۔ انگریز پینچے تو
 ایک قوی بیکل سیاہ فام ریلوے دروازے پر کھڑا تھا۔ لارنس نے کوک کر
 پوچھا: تو کون ہے؟

اُس نے بے غرضی سے جواب دیا: سپاہی ہوں۔
 کیا نام ہے؟
 کیم خاں۔
 دلی کب آیا؟
 کوئی دس دن ہوئے۔
 کیوں آیا تھا؟
 ملازم صاحب نے ایک ضروری کام سے بھیجا تھا۔

کیم خاں نے سرسوال کا جواب دلیری اور اطمینان سے بدل لارنس
 مشکاف اور سیس کے دلوں سے شک و دودھ ہو گیا۔ وہ ماہیں جانے کا ارادہ
 کر کے گئے۔ اتنے ہیں ایک انگریز سپاہی چند دوسری آدمیوں اور ایک ستھے کو
 اپنے ساتھ لیے ہوئے وہاں آیا۔ سپاہی کے ہاتھ میں کیم خاں کی بندوق تھی۔
 یہ بندوق کیم خاں ایک کنوئیں میں چھپک آ یا تھا۔ بعد میں کنوئیں سے پانی
 نکالتے ہوئے کسی شخص کا لٹا کر گیا۔ اُس نے سفوں سے لہر لٹا کر لیا۔ لوٹے
 کے ساتھ بندوق بھی محل آئی۔ لارنس بندوق کا معائنہ کرنے لگا۔ اُسی وقت
 مکان کے اندر سے گھوڑے کی ہنہانٹ سنا دی۔ لارنس اپنے ساتھ دو
 سمیت مکان میں گھس گیا۔ انھوں نے گھوڑا دیکھا۔ رات بھر کے سفر سے گھوڑے
 کی حالت خستہ اور تڑپتی تھی۔ وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ لارنس نے اُس کے
 سم دیکھے۔ نعل اُلٹے گئے ہونے لگے۔ باہر نکل کر اُس نے سپاہیوں کو اشارہ
 کیا۔ سپاہیوں نے کیم خاں کی مشکیں باندھ لیں۔ مکان کی تلاش کی گئی۔ سیس
 فریزر کو پانی کے ایک ڈول میں کاغذ کے چند پرزے ملے۔ اُن کی سبب سبھی
 دھل چکے تھے۔

کیسیا دیوار سے عورت روشن ہو گئے پرزے چڑھ گئے غازی
 زبان میں یہ یمنون لکھا تھا: تم خوب جانتے ہو میں نے تعین دلی کی عرض

سے بھیجا ہے۔ میں اب بار کیم خاں کو میرے لیے کٹے خرباز کس نے فریادی
 ہے۔ اگر اب کب کٹے نہ فرمے گئے ہوں تو لاؤ توقف پر کام انجام دو۔ انگریز
 کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کنوئیں کی خرید کا مطلب ولیم فریزر کا
 قتل ہے۔ کیم خاں سے پہلے پوچھ گچھ ہوئی تھی۔ اُس نے جرم کا اقبال نہیں کیا۔ آخر
 اُس پہلے پناہ نشہ دیا گیا مگر ایسا معلوم ہوا تھا، وہ گوشت پوست کا نہیں
 لڑا دکھانا ہوا ہے۔

تھیک اگر انگریزوں نے اپنا بیو کا سراغ لگانے کی کوشش کی یا نیامبر
 کی جان ضیق میں تھی، ایک طرف شمس الدین خاں کے آدمی اُسے ٹھکانے لگانے
 کی کوشش تھے۔ دوسری طرف انگریز جاسوس اُس کے ناک میں تھے۔ وہ مہینوں
 جنگوں اور بائلس میں بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا رہا۔

انگریزوں کی نظر شمس الدین خاں پر بھی تھی لیکن اُس پر ہاتھ ڈالنا
 بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے تدبیر و سیاست کی ضرورت تھی۔ انھوں
 نے مانا ہونا بنا شراوع کر دیا۔

ولیم فریزر کا قتل معمول بات نہیں تھی۔ اُس کے مارے جانے سے
 بہت سے لوگوں کو خوشی ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں کو سخت حد پہنچا
 تھا۔ فریزر کو دارا و عمل کے اعتبار سے اچھا آدمی نہیں تھا۔ اُس کی عیاشی اور
 بیٹینی کی بہت سی کتاباں مشہور تھیں حکومت کے عیب اور زعم میں وہ کسی
 کی عزت پر ہاتھ ڈالنے میں بچکا ہٹ یا حیا غصہ نہیں کرتا تھا۔ مخصوصاً
 جب اُس پر شراب اثر کرتی تو اپنے بیگانے کو بھی بخوبی جاتا لیکن
 وہ ایک بہت بڑا انگریز افسر تھا اور انگریزوں کے لیے یہ ساٹھ بھول
 جانا آسان نہیں تھا۔

کیم خاں کی گرفتاری کے بعد عام طور پر پیشہ فوری ہو گیا کہ فریزر
 کے قتل میں شمس الدین خاں کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ مشکاف سیس فریزر اور لارنس
 نے مکلفات کے حکام سے اجازت لے کر شمس الدین خاں کو فرزند لید پر جھک پھینکا
 بھجوا کر دلی تشریف لائے۔ اُس مقدمے کے سلسلے میں ججس چند مرزا بہت
 طلب ہیں۔ شمس الدین خاں دلی جانے کے لیے تیار ہوا۔ تمام خاندان
 نے کہا کہ یہ آپ کا غضب کرتے ہیں۔ شبیر کی کچھاریں منہ ڈالنا کہاں
 کی دانشمندی ہے۔

شمس الدین خاں نے کان نہ دھرا۔ مجھے دھرننا ملاقی نہیں ہے۔
 ابھی دلی کے بادشاہ زندہ و سلامت ہیں۔ انگریزوں کی مجال نہیں کہ مجھے ہاتھ
 بھی لگائیں۔ نہ جانے سے اُن کا شہد اور قوی ہو جائے گا اس لیے میرا
 بے غرضی سے جانا ضروری ہے۔

لواب احمد کش کے زمانے کا ایک وفادار سا بڈنی سوار آگے آ یا اور
 ہاتھ باندھ کر لولا۔ حضور آپ انگریز کی فطرت سے واقف نہیں ہیں۔ یہاں
 سب تک

بھیس بدل لیجیے۔ یہ سائٹنی سرکس سے ادھر دم لینے والی نہیں ہے بمبائی کرے یا ندھیہ اور نکل چلیے۔
شمس الدین خاں نے بوڑھے دنا دار کو جھک کر دیا۔ تھکان معاملات میں دخل دینے کی تجاوت کیسے ہوئی؟ کیا تو جانتا نہیں کہ ہم تیری طرح کوئی گھس گھدے نہیں ہیں۔ لارڈ لیک ہمارے عزم والد کے قدوں میں بٹھنا تھا اور اٹھیں بھائی بھائی کتنے اس کا سہہ سوکھنا تھا۔ کون ہے جو نواب احمد بخش کے بیٹے پر ماتھ ڈالے گا؟“

شمس الدین خاں نے دس سواری اپنے ساتھ لیے اور پائل میں دہلی روانہ ہو گیا۔ شہر کے فریب پہنچ کے اس نے ایک سواری آگے بھجور لیا۔ ایجنٹ اور انگریز حکام موقع پر پہنچے۔ کرنل سکر سے نواب کی گمری دوستی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا: نواب صاحب! ہتھیار ہمارے حوالے کر دیجیے اور ایجنٹ صاحب ہمارے چہرہ سار کیجیے، یہ آپ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں گے۔“
شمس الدین خاں نے اپنی تلوار اس کے حوالے کر دی۔ اسی وقت جبرٹ نے سامنے آکر کہا: سرکار کے حکم سے آپ گرفتار کیے جاتے ہیں۔ اب اپنے آپ کو قیدی تصور کیجیے۔“

شمس الدین خاں نے دبی زبان سے احتجاج کیا لیکن بے سود۔ شمس الدین خاں کی انھیں ٹھیکیں عوزیوں اور گروں کے مشورے یاد آئے مگر وقت بیکل چکا تھا، پہنچ کھٹنے کی سب راہیں بند تھیں موت سانسے آگئی تھی۔

آنیامو کو بریل میں اطلاع مل کہ شمس الدین گرفتار ہو گیا ہے۔ نئی نئی جگہ چھپنے اور رہنے مارے پھرنے سے وہ سخت عاجز آچکا تھا۔ اس نے فوراً اپنے بھائی کو دہلی روانہ کیا۔ اس کے بھائی نے دہلی پہنچ کے فرنگیوں کو یقین دلا یا کہ اگر آنیامو کی حفاظت کا یقین دلا یا جائے تو وہ سارا حالات بتانے کے لیے تیار ہے۔ فرنگیوں نے حفاظت کا وعدہ کیا۔ چنانچہ آنیامو سلطانی گواہ بن گیا۔ اس دوران شمس الدین کے آدمیوں نے آنیامو کو قتل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آنیامو کا بیان ہونے ہی کو مرخان کو پھانسی دے دی گئی اور شمس الدین خاں کے لیے بھی پھانسی کا حکم ہو گیا۔ کبھی یہ روزانے کے باہر اس کے لیے خاص طور پر سولی گودھائی گئی پھر نو سو فوجیں کے پرے میں اسے جیل سے نکال کر سولی دینے کے لیے لے جایا گیا۔ شمس الدین خاں نے پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر سبز لباس پہنا لیکن انگریزوں نے وہ لباس اتار دیا یا اس نے سفید کپڑے پہن لیے۔ جب وہ پھانسی کے لیے جا رہا تھا تو راستے میں اس نے ایک گھڑے کی دکان پر کھڑے دیکھے۔ ایک انگریز افسر پائل کی ساتھ تھا شمس الدین نے اس سے کہا کہ ہلا جی چاہتا ہے کبیر دکھائیں۔“

افسر نے پائل کی کرائی اور کبیر میکہ کے سامنے رکھ دیے۔ پائل حسپی تو شمس الدین کیسے رکھا جا رہا تھا اور جھکے باہر چھپک رہا تھا۔ تختے پر چھلکے نے آکر چاہا کہ اس کے گلے میں چند ڈالے لیکن شمس الدین نے اسے پرے ہٹا دیا اور چند خود گلے میں ڈالا۔ پھانسی پر لٹکنے کے بعد اس کی لاش قدم شریف میں دفن کی گئی۔ ریاست انگریزوں نے ضبط کر لی۔



رجو کی موت نے شہر بقیہ کے لیے سہے سے حواس بھی زائل کر دیے۔ حسن رذا اس کا جنازہ اٹھا، بولوں معلم ہونا تھا جیسے دل کی ساری آبادی آند آئی ہے۔ اسے جتنی نظام الدین اولیا میں جگہ ملی اس کی موت نے شہر بقیہ کو لرزایا کر دیا تھا۔ وہ شب و روز قریب ان میں پڑا رہتا۔ قبر پر بیت کے مجمل چڑھتا اور چرخ روشن کرتا۔ ایک بار اس نے قبر پر سبز ریشمی غلاف بھی چڑھایا اس کے غم میں اسے کپڑے بدلنے کا ہوش بھی نہ رہا۔ داؤدھی موٹھیں بے نما تھا بڑھ گئی تھیں۔ دوست احباب اور کتنے دار و ستاد سماعت کیے کہ اسے قریب ان سے واپس مٹیلا لٹا کر کپڑے بدلانے نہ ملتا۔ لیکن حقیقتہً موقع باکرہ ہو رہی پہنچ جانا، روضہ پر نہ اس کی یہ حالت ہوئی کہ وہ کسی کی صورت پر چپاتا، دیکھی سے رونما۔ رجو کی قبر کے پاس چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ شمس الدین قریب ان کی حالت دیکھ کر کوئی پہچان نہ پاتا کہ یہ جہاں غیر آباد کے نواب مصطفیٰ خاں شہید ہیں۔ کپڑے نہ ملنا ڈاؤدھی روضی ہوئی، ننگے سر ننگے پاؤں جیم چول میں آنا ہوا وہ گروں جھکا کے دل کے کوجن میں دیوانہ وار پھرنا پھر کئی میل پیدل چل کر رجو کی قبر پر جانا۔ اس کے تلواروں میں چھالے پڑ چکے کوئی محنت سے پاس چٹکار کچھ کھلا دینا تو رکھا لیا۔ ایک نذرہ غالب پائل میں بٹھکے میں جا رہے تھے، ایک مکہ انھوں نے غل غپا ڈالنا۔ رک کے دیکھا تو لوٹ کے بلے ایک دیوانے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ غالب نے دیوانے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فوراً پائل کی کرائی اور آواز دی: مصطفیٰ خاں! ادھر آؤ، ہماری بات سنو۔“

شہید نے غلط انداز نگاہ سے غالب کی طرف دیکھا، مسکرا ہوا اور اس کے چل دیا۔

اس کے عوزیوں نے بار بار مکان میں لاکیر یوں میں زنجیریں ڈال دیں اور کہے میں دیکر دیا لیکن نہ چلے کیسے زنجیریں ٹوٹ جاتی تھیں اور شہید آزاد ہو کر پھر رجو کی قبر پہنچ جاتا تھا۔ سزاؤں اس کی ہی حالت رہی۔



[illegible]

أَسْرَىٰ أَعْلَىٰ أَدْمُ كَا قِمَّةُ جَوَادِنَا خَوَابُ دِيكَهَاتَهَا

ظاہر نہیں ہوتا تھا بلکہ ان میں دیرانی نظر آتی تھی نہ پھرتی تھی، نہ چمک۔ اس کی آنکھیں اس کے نیلات کا سراغیں دیتی تھیں۔ گنگنا کرتے وقت ان میں ایک سیاٹ بن دکھائی دیتا تھا۔ بالیں بھی عام بالوں کے مقابلے میں کم ٹھیکتی تھیں۔ ڈو۔ کے دونوں ہاتھ لمبے تھے اور انگلیاں کناؤں سے دے گھوٹی ہن تھیں۔ ہاتھ ملائے ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط تھے تھے۔ ڈاکٹر کا لباس جانب نظر نہیں ہوتا تھا۔ غور سے دیکھے بغیر، اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا پسینے ہوئے ہے، پکڑے عموماً اگر سیاہی مائل ہوتے تھے ان پر وہ کالی مائی باندھنا تھا۔ اس لباس کی وجہ سے اس کے جھنری چہرے کے تکیے نقوش اور زرد ہو جاتے تھے، زردی مائل آنکھوں کی نگر و جی نمایاں ہوجاتی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک ہمارا آدمی محسوس ہوتا تھا۔

ایک ماہ نفسیات کی حیثیت سے اس کی شہرت دودھور
پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پیشہ اس نے اتفاقاً اختیار کیا تھا۔ اس مذہب کے
عالم میں اسے چار لڑکھا۔ اس کی ڈاکٹری جنگ عظیم کے زمانے میں
شرح عرفی تھی۔ چلے اس نے متعدد اسپتالوں میں تربیت حاصل کی پھر
انہی خدمات فوجی حکام کو پیش کر دیں۔ کچھ عرصے بعد اسے فرانس بھیج
دیا گیا۔ فرانس میں وہ طبی خدمات انجام دینا ملا۔ یہیں اسے اپنی ایک انوکھی
سنگ

ڈاکٹر آؤلین نے گھڑی دیکھی پھر بچے میں سسٹنٹ باقی تھے۔ اس کا مریض لارڈ مائٹ ڈوئگو ابھی تک نہیں پہنچ سکا۔ ڈاکٹر کونست جبرت ہوئی۔ لارڈ فنت کا بہت باہنہ تھا اور اسے اپنی اس خوبی پر ناز بھی تھا۔ اس خوبی کے علاوہ اس کی فزیت بلان قابل رشک تھی۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والی معمولی باتیں تو بے رنگ مانتی تھیں۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ فزیت کی پابندی ایک خراجِ تعظیم ہے۔ یہ خراجِ تحسین آپ کسی ذہین شخص کو اس کی ذہانت پر ادا کر لے ہیں نیز فزیت کی پابندی ایک انتہا ہے، ایک طرز ہے جو کسی احمق کی حماقت پر کیا جاتا ہے۔ لارڈ نے ڈاکٹر سے ساڑھے پانچ بجے کا وقت لیا تھا۔

ڈاکٹر کی شکل و شباہت میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دہلا پتلا، لمبا، تنگ کندھے، قد نسبی قدر جھکا ہوا بال زیادہ تر سفید اور باریک چہرہ لمبوتر، مضبوطی اور نفوذ کیلئے۔ ڈاکٹر کی عمر پچاس سے زیادہ تھی لیکن وہ سن رسیدہ معلوم نہ لانا تھا۔ اس کی زردی مائل لمبی آنکھوں میں تنکوں کے آثار تھے۔ اس کے پاس زیادہ تر بیٹھے سے چند چلتا تھا کہ اس کی پکیاں بہت کم گھومتی ہیں اور بنیت وقت خاطر کے ہرے پر بھی رہتی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے کوئی جذبہ



ترجمہ ✦ نعیم جہانگیر
حق کا دھوکہ قارئین کے لیے
ایک لمحہ کے حاصر کے گمان ہے

طاری ہوئے لگتی جیسے ہلکے پہلی چھوڑ زمین کو تڑا تڑا کر دیتی ہے۔
ڈاکٹر اپنی یہ صلاحیت برٹھا مارا۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے کام
میں مہارت حاصل ہو گئی۔ وہ اپنی نرم گوئی سے مضمحل کرنے والی
آواز سے زردی مائل فاکوشن نگاہوں سے اپنے لیے ہاتھ
ماٹھوں پر چھپ چھپانے سے مرعوبین کا اضطراب دور کر سکتا تھا، اُن
کے داغ و دل سے باوریاں کھینچ سکتا تھا کبھی بھی تو وہ اپنے مرعوبین
کا علاج ایک مجسمے کی طرح کو دیتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک خاموش
انسان کو گروائی عطا کر دی تھی، یہ شخص ایک م کے دھمکے کے ساتھ
زمین میں تفریبا دفن ہو گیا تھا، جب اسے نکالا گیا تو اس کی گویائی
ختم ہو چکی تھی، اسی طرح ایک ہرانی مادے نے ایک شخص کے بازو

سلامت کا اندازہ ہوا۔ وہ اپنے مضبوط ٹھنڈے ہاتھوں سے کچھ قسم
کے درد بخش چھو کر مٹا دیتا تھا اور بے خوابی کے مرعوبین اس کی نرم گفتگو
سن کر سو جاتے تھے۔ ڈاکٹر ایک نرم گفتگو آدھی تھا۔ اس کے لیے
میں ایک طرح کی موسیقی تھی، لنگی تھی۔ اس ٹھنکی سے سامعین کے لیے
لوری کا کام کیا، ڈاکٹر مرعوبین سے کہتا تھا: دیکھیے آپ کو آرام کرنا
چاہیے، پریشان نہیں ہونا چاہیے، سو جانا چاہیے، اس کے مرعوبین آرام
کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ سکون کی خواب آدر کیفیت اُن کی پڑیا گیا
کا فز کو دیتی تھی۔ لوگ کسی ایسے شخص کی طرح مطمئن ہو جاتے تھے جو
کسی بڑے مجمع میں نہایت وقت سے ایک خالی نشست حاصل
کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ مرعوبین کے تنکے ہوئے پتھروں پر نیند

سب نگ

کوشش کی تھی۔ اس کے تنگ و تاریک مطب میں بے شمار ریفین آتے تھے۔ وہ انسانی کردار و ذہنی پیچیدگیوں کے متعلق عجیب و غریب انکشافات کرتے، کبھی خوش مزاجی اور آواگ سے، کبھی غصے اور نفرت سے مغلوب ہو کر اور کبھی غماظ انداز میں مثل لے پڑتے۔ یہ انکشافات سُننا ڈاکٹر کا معمول ہو گیا تھا، اب اُسے ان پر حیرت نہیں ہوتی تھی اور ناقابل یقین باتیں سن کر کوئی صدمہ بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مرد و ست جھوٹ لڑتے ہیں گو بارہ کی فطرت ہی جھوٹ بولتا ہے۔ ڈاکٹر جانا تھا کہ یہ لوگ اپنی ذہنی صلاحیت کتنی بے دردی سے حماقتوں پر صرف کرتے ہیں۔ اُسے اکثر لوگوں کے بارے میں نہایت خراب اور بدترین معلومات حاصل ہوتی تھیں لیکن اُس کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ ضعف بن کر لوگوں کے اعمال کا احتساب کرے۔ ریفین اُسے اعتماد میں لے کر جو باتیں بتاتے تھے، انہیں سُننے سُننے ڈاکٹر کے بال سفید ہونے لگے تھے، اُس کے چہرے پر بڑھا پا چلا تھا۔ اُس کی منسی نصحت ہو گئی تھی البتہ جب وہ داغ کو سکون پہنچانے کے لیے کوئی ناول پڑھتا تو اکثر اُس کے مرتلوں پر سکراہٹ منورار ہو جاتی۔ کیا ایک ناول نگار کبھی یہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے بارے میں جو کچھ لکھ رہا ہے وہ الگ واقعی ایسے تھے؟ کاش ناول نگاروں کو یہ معلوم ہونا کہ اُن کے کردار کتنے چھپے و اور غیر متوقع ہوتے ہیں اور اُن کی رد وحوں میں کیسے کیسے تضاد ہیں اور اُن کے ذہنوں میں کس قدر خوف ناک الارے پروکش پاس ہے۔

ڈاکٹر اپنی زندگی میں اُن گنت محب و غریب ذہنی ریفین سے مل چکا تھا مگر لاڈلاؤنٹ ڈرگجر کے مرض کی نوعیت سب سے انوکھی تھی۔ لاڈلے کا ایک نماز اور لائق ترین شخص تھا۔ اُس نے چالیس سال سے کوئٹہ و ذریعہ خارجہ کے مرتبے تک ترقی حاصل کر لی تھی۔ وہ تین سال سے ملک کا ذریعہ خارجہ تھا۔ اُس کی بایں سال تذکرہ گیارہ سے دیگی جاتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ قدامت پسند پارٹی کا سب سے قابل سیاست دان ہے۔ لاڈلے خود بھی یہی سمجھتا تھا لیکن اُسے اپنی موجودہ حیثیت میں مزید ترقی کی امید نہیں تھی۔ وہ ذریعہ نظام کے عہد سے تنگ بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی اُسے معلوم تھا کہ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد اُس کی جگہ دارالامرا کا نمبر اُرد ہو جائے گا، اس طرح دارالعوام میں اُس کی نشست بہ قرار نہیں رہ سکے گی۔ اُس جمہوری دور میں اعلیٰ حکمتان کا ذریعہ اعظم دارالعوام کے بجائے دارالاسلام سے منتخب ہونا محال تھا۔ تاہم لاڈلے کے لیے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ وہ قدامت پسند پارٹی کے دور اقتدار میں

بیکار کر دیے تھے، ڈاکٹر نے اپنے معجزانہ علاج سے اُس کے بازو متحرک کر دیے۔ ڈاکٹر کو ایک معالج کی حیثیت سے بعض حیرت انگیز صلاحیتیں حاصل ہو چکی تھیں اُن کا کوئی منطقی جواز نہیں تھا، ان صلاحیتوں پر خود اُسے بھی حیرت ہوتی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر کو اپنے آپ پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ وہ خود اعتمادی کا احساس قائم رکھنے میں عموماً ناکام رہتا تھا۔ جب بھی کسی معاملے میں اُسے معجزانہ کامیابی حاصل ہوتی، وہ تعجب زدہ رہ جاتا۔ بے یقینی میں ڈوبے ہوئے ناظرین ہر ہو کر بول اُٹھتے، ڈاکٹر کو کوئی حقیقی روحانی قوت حاصل ہو گئی ہے، وہ ان ہونے کا کام دے لیتے ہیں مگر اُن کی وضاحت نہیں کر پاتے۔ جنگ عظیم ختم ہو گئی تو ڈاکٹر دینا چلا گیا۔ یہاں بھی اُس نے پیمائش جاری رکھی۔ اُس کے بعد کچھ مدت وہ ذریعہ میں رہا پھر مستعد لندن آ گیا۔ لندن اُس کی فنی مہارت اور شہرت کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ اب لندن میں اُسے پندرہ سال ہو چکے تھے ریفینوں میں اُس کی حیرت انگیز کامیابیوں کا زبردست چرچا تھا، اُس کی فیس بہت زیادہ تھی پھر بھی ریفینوں کا نانا بندھا رہتا تھا۔ اُس کے پاس آنا وقت نہیں تھا کہ وہ سارے ریفینوں کو دیکھ سکے۔ اُس کے علاج کے نتائج غیر معمولی ہوتے تھے۔ اکثر ریفینوں کو اُس نے خود کشی سے بچا یا تھا اور اکثر کو پاگل خانے جانے سے نجات دلائی تھی۔ اُس نے ایسے دیکھی ریفینوں کو اسودگی سے مالامال کیا تھا جو پشیمانوں اور بقیوں سے بھر پور زندگی کا عذاب جھیل رہے تھے۔ اُس نے بہت سی ازدواجی ناخوش گریاں مرثرت میں بدل دی تھیں بعض ریفینوں کے ذہن سے اُس نے غیر فطری خواہشیں اکھاڑ چھین لی تھیں۔ وہ مجاہدانوں کے لیے ایک مہمان میمان تھا مگر کبھی اُسے یہ شبہ ہونا کہ وہ ایک عطائی معالج ہے۔ ایک بات اُس کی توت پر داشت سے باہر تھی وہ ایک ایسی صلاحیت کا مالک ہو گیا تھا جس کی کوئی عقلی توجہ نہیں لیکن تھی ریفینوں کے یقین اور اعتماد سے وہ پریشان ہو کر رہ جاتا اور دیانت داری سے سوچنا کہ اس کا اہل نہیں ہے۔ بعض اوقات کام کرتے کرتے اُس پر شدید بھکن طاری ہوتی تھی اُس نے بار بار سوچا کہ اب اُسے یہ پیشہ ترک کر دینا چاہیے۔ اُس کے پاس خلیفہ دولت جمع ہو چکی تھی۔ باقی زندگی وہ پیشہ وکارام سے گزار سکتا تھا۔ یونگ اور فرویڈ وغیرہ کے نظریات اُسے مطمئن نہیں کرتے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ نظریات بے بنیاد ہیں ان کے تار و پود بکھر چکے ہیں۔ اُس کے باوجود ان نظریات کی روشنی میں علاج کرنا اُس کے لیے مفید ثابت ہوا تھا۔ مگر کشتہ پندہ برسوں میں اُس نے نہایت باریک بینی سے انسانی فطرت پڑھنے کی

وزیر خارجہ کے عہدے پر پسندور فائز تھے۔

لاڈ میں کئی اصلاحی مصیبت تھیں۔ وہ زمین بھی خف،
عنتی بھی۔ اس نے کوہ ارض کے دور دراز حصوں کی سیاحت کی تھی۔
وہ وہاں کے متعدد زبانیں روانی سے بول سکتا تھا۔ جوانی کے آغاز میں
اُس نے بین الاقوامی تعلقات اور امور خارجہ میں مہارت حاصل کر
لی تھی۔ وہ قابل ذکر ملکوں کے معاشی و سیاسی حالات سے باخبر
رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ حوصلہ مند کی دور بینی اور اُسے کی جنگی
اُس کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ ایک بے حد عمدہ مقرر تھا۔ عام
جلسوں اور دارالعلوم میں اُس کی تقریریں نہایت جامع صاف ستھری
اور ذہانت سے بھر پور ہوتی تھیں۔ مباحثوں میں اُس کی حاضر ہوا بی
ضرب المثل تھی۔ اُس کی شخصیت کا مجموعی تاثر قابل رشک تھا، دراز
قد حسین و جلیل اور ذہین و فطین۔ کچھ دنوں سے اُس کے بال اڑنے
لگے تھے اور نیم فرہی کی طرف مائل تھیں لیکن اس گنج اور فرہی نے
اُس کی شخصیت کو رگوں کے لیے مزید خوش مزید بالغ نظر نادی تھی۔
نوجوانی میں وہ ایک اچھا کھلاڑی تھا اور اس کھیل پر بونی ورتی میں
کشتیاں کھیتا تھا۔ خصوصاً ایک اچھے نشانے باز کی حیثیت سے اُس
کی شہرت پورے انگلستان میں پھیل چکی تھی۔ چوبیس سال کی عمر
میں اُس نے ایک اچھا سالہ لڑکی سے شادی کی۔ لڑکی کا باپ
ایک نواب تھا اور ان امریکہ کے ایک دولت مند خاندان کی تنہا
وارث تھی۔ اس طرح معاشرے میں لاڈ کی بیوی کو عزت اور دولت
دونوں نعمتیں مل گئیں۔ اُس بیوی سے لاڈ کے دو بیٹے تھے کئی بہن
مک لاڈ اور اُس کی بیوی میں ناجاتی رہی۔ دونوں خفیہ طور پر ایک
دوسرے سے الگ رہے لیکن لوگوں کی نگاہ میں اُن کی گھر میں زندگی
نرخش گوارہی اُن کی ظاہری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ
دونوں گھر سے باہر کسی اور رابطہ میں ملوث نہیں پائے گئے۔ اُن کے
ازدواجی تعلقات کے متعلق بے سرو پا افواہیں کبھی نہ پھیل سکیں۔ لاڈ
کو عزت و جاہ کی بہت طبع تھی اور اُس کے لیے وہ نندہ بہ محنت کا عادی
تھا نیز اُس کے دل و دماغ وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ وہ کسی
اسی نوعیت پر باعاشی میں بھی نہیں پڑتا تھا جن سے مصیبت فرائض میں
عمل واقع ہو۔ مختصراً اُس میں یہ ظاہر وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو
کامیابی اور مقبولیت کے لیے ضروری ہیں مگر دوسری طرف اُس کا
باطن عجیب اور خامیوں سے بھرا ہوا تھا، وہ خوف ناک حد تک ایک
شعبہ باز آدمی تھا۔ غالباً یہ اُس کی خاندانی خوبی تھی۔ اُس کا
باپ ایک شریف وکیل کا بیٹا تھا۔ وکیل صاحب و کالت کے علاوہ
شراب کی بھی چھانٹتے تھے لہذا اُن کے بیٹے کو زیادہ معزز بننے

اور غیر ضروری اہمیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ لاڈ لاڈ
ڈرہنگو کے باپ کو لاڈ شپ کا اعزاز و مہمانوی شہنشاہ چارلس دوم
نے دیا تھا۔ یہ اعزاز رکھنے والے لوگ نفرت پرستانہ سوسائٹی ہنگلیٹان
کے معزز ترین خاندانوں سے وابستہ تھے۔ لیکن لاڈ لاڈ لاڈ ڈرہنگو
کو اپنے معزز خاندان میں پیدا ہونے کا شدید احساس تھا۔
جیسے ایک نو دولتیتہ کو اپنی دولت کا احساس ہوتا ہے۔ لاڈ دوٹرل
پر اپنے خاندانی تفاخر کا اثر ڈالنے کے لیے کوئی موقع ضائع نہیں
ہونے دیتا تھا۔ اُس میں خوش اخلاقی بہت تھی لیکن اُس کا مظاہرہ
وہ صرف اپنے ہم زبنا افراد کے سامنے کرتا تھا۔ جو لوگ سماجی حیثیت
میں اُس سے کم تر ہوتے اُن کے ساتھ وہ مرد و مہری اور بد اخلاقی
برتا۔ ملازموں کے حق میں اُس کی طبیعت نہایت سخت گیر تھی۔
وہ بات بات پر اپنے بیکریٹوں کی بے عزتی کر دیتا تھا۔ اُس
کے ماتحت اُس سے بڑی طرح خوف زدہ رہتے تھے، اُن کے دلوں
میں اُس کے لیے انتہائی نفرت بھری ہوئی تھی۔ لاڈ اس شخصیت سے
باخبر تھا کہ وہ اپنے معاہدین سے زیادہ بھوت یا اور ذہین ہے۔
لہذا یہ بات جتانے کا غار کرنے میں اُسے قطعی جھجک نہیں ہوتی تھی۔
غور و فکر میں اُس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ انسانی کمزوریوں اور ناہمواریوں
کے لیے اُس کے دل میں کوئی مروت نہ تھی۔ غیر شعوری طور پر اُسے
ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ وہ حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔
لوگوں سے اُسے بہت چڑھتی ہوئی اس کے فیصلوں پر اُسے زنی اور
بجٹیں کریں۔ وہ ایک علاحدہ جگہ کا خود غرض آدمی تھا اُس کی خود
غرضی کی گہرائی ناپائی نہیں جاسکتی تھی۔ اُس کی کوئی خدمت کی مہاتی تو
وہ مٹون نہ ہوتا بلکہ یہ سمجھتا کہ تہجے کے اعتبار سے وہ اس کا مستحق ہے۔
وہ کسی کا شرمندہ احسان نہیں تھا اُس کے ذہن میں یہ بات کبھی بار
نہ پاس تھی کہ اُسے بھی دوسروں کی خدمت کرنی چاہیے کیونکہ وزارت
کی ذمہ داری اُسے دوسروں کی خدمت ہی کے لیے سونپی گئی ہے۔
شخصیت کی ان کمزوریوں نے بہت سے لوگوں کو اُس کا دشمن بنا دیا
تھا۔ دشمنوں کو اُس سے اور اُسے دشمنوں سے نفرت تھی۔ اُس کے
حلقے میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے وہ اپنی مسربانی
ہمدادی یا معاونت کا مستحق سمجھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے دوست نہ
ہونے کے برابر تھے۔ وہ اپنے لیڈروں کی نظر میں بھی معتبر نہیں تھا
لیڈر اُس کی فداکاری پر شبہ میں مبتلا تھے۔ وہ غرور اور بدخلقی کے
باعث اپنی سیاسی جماعت میں بھی نامقبول تھا مگر اُس کی ذہانت
اُس کی مہارت اُس کی حب الوطنی اور معاملات پر اُس کی گرفت
بہت سخت تھی اُس کے ساتھی کارکن اُسے برداشت کرنے پر مجبور تھے

موتنا سزاہ دیو قناعت آدمی تھا، اس کے بال سفیدی کی طرف مائل تھے، مگر ذرا اس طرح تنی ہوئی تھی جیسے وہ کوئی بہت معزز شخص ہو۔ اس کا چہرہ بھرا ہوا تھا، نفوس تنیکہ اور عذاب نظر تھے، آنکھوں سے رحمت جھلک رہی تھی، اسے دیکھ کر ڈاکٹر کو اٹھارہاں صدی کے بولن بادشاہ یاد آئے۔ لگے۔ یکایک لارڈ کی آواز ابھری۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عزم ڈاکٹر اولین سے ملاقات کرنا اتنا مشکل ہے جتنا بڑا پیر کے در پر عظم سے ملاقات کرنا۔ ڈاکٹر صاحب! میں ایک انتہائی مصروف آدمی ہوں۔

”کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گے؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ اس کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ لارڈ کے الفاظ سے ذرا بھی متاثر ہوا ہو۔ وہ اپنی کرسی پر معمول کے مطابق بیٹھا رہا۔ لارڈ اب تک کھڑا تھا اس کی ہمہ گیر بڑھ گئی تھی۔ اس نے نہایت دشورت لہجے میں کہا: جناب! میرا خیال ہے میں آپ کو بنا دھول کے میں برطانوی سلطنت کا وزیر خارجہ ہوں۔“

ڈاکٹر نے اپنا ہلدو ہرایا: کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گے؟“ لارڈ کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سر پر پاؤں رکھ کے بھاگنے والا ہو لیکن چند لمحوں بعد وہ خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ایک لمبا جھٹکھولا، قلم نکھالا اور لیٹن کی طرف دیکھ کر بغیر دریافت کیا: ”آپ کی عمر کیا ہوگی؟“

”ہائیس سال۔“

”کیا آپ شادی شدہ ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”شادی کب ہوئی تھی؟“

”اٹھارہ سال پہلے۔“

”اولاد؟“ ڈاکٹر نے مختصر اُلچھا۔

”دو بیٹے ہیں۔“ لارڈ کے جوابات میں تیزی تھی۔

ڈاکٹر نے قلم رکھا، جڑ بند کیا پھر کرسی کی کپشت سے ایک کر اپنے مزین کونو سے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کے بغیر نہایت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے لارڈ سے پوچھا: آپ میرے پاس کیسے تشریف لائے؟“

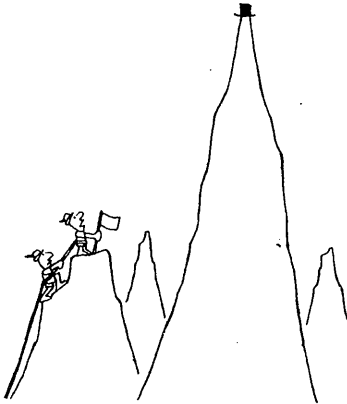
”میں نے آپ کی تعریف سنی تھی۔ لیڈی کیننٹ آپ کی رفیقہ رہی ہیں انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کا علاج اُن کے لیے خاصا سودمند ثابت ہوا۔“

ڈاکٹر نے کوئی جواب پیش نہ کیا، بلکہ باندھ کے مریض کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں ہر قسم کے تاثر سے عاری تھیں جیسے وہ مریض کو سب گنگ

ایک بات اور انھیں اس پر آمادہ کرتی تھی۔ بسا اوقات لارڈ کی شخصیت میں ساحرانہ انداز پھیل جاتا تھا۔ جب اسے ایسے لوگوں کا ساتھ ملتا، جنہیں وہ اپنے برابر کا سمجھتا یا جنہیں سمجھ کرنا چاہتا تو اس کی شخصیت شادمانی، حاضر جوابی، نکتہ چینی اور سحر انگیزی کی مثال ہوجاتی ایسا عمریا بیرونی سفیروں یا معزز خواتین کی صحبت میں ہوتا تھا۔ اس کی دگر میں دبی غموں گرو کشن کرنے لگتا جو معروف لارڈ چٹرنفلڈ کی دگر میں دوڑتا تھا۔ وہ اگر کوئی واقعہ بیان کرتا تو انداز بیان فطری، حقیقی اور معقول ہوتا، سامعین انتہائی لطف اندوز ہوتے۔ یہ شخص اس کی علمی صنعت، عام معلومات اور خوش ذوقی کا لوہا مان کر اٹھتا۔ لوگوں کو یہ احساس ہونے لگتا کہ آج انھیں دنیا کے ایک بزرگ شخص کی صحبت میں آئی تھی۔ یہ بات اُن کے ذہن سے غور ہوجاتی کہ کل ہی تو اس بہترین شخص نے اُن کی تحقیر کی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دوسری ہی جمع اس شخص کا طعنے اُٹاتا انھیں قتل تک کر سکتا ہے۔

لارڈ نے ایک رفیق کی حیثیت سے ڈاکٹر اولین سے رابطہ قائم کیا تو اس پر بالوسی و ناگامی کا غلبہ تھا۔ اس کے ایک یکہ بڑی نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا کہ عزت مآب لارڈ ماؤنٹ ڈرنو جو آپ سے مشورہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ انھیں بے حد مرتبت ہوگی، اگر آپ کل صبح دس بجے اُن سے ملاقات کے لیے اُن کی اقامت کاہ تشریف لے آئیں، ڈاکٹر نے جواباً کہا کہ وہ لارڈ کی اقامت گاہ پہنچنے سے پہلے ہے لیکن اسے مصروف کو ایک دن کے وقفے کے بعد اپنے مطلب میں پانچ بجے شام کا وقت دینے پر مرتب ہوگی، سیکرٹری نے پیغام لے لیا اور تھوڑی دیر بعد اسے مطلع کیا کہ عزت مآب لارڈ ماؤنٹ ڈرنو کو احوال ہے کہ آپ انھیں اُن کی قیام گاہ آکر دیکھیں اس رحمت کے لیے آپ جو معاوضہ چاہیں مطلب کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ وہ مریضوں کو صرف اپنے مطلب میں دیکھتا ہے اگر لارڈ اس کے مطلب آئے پر آمادہ نہیں تو وہ معذرت خواہ ہے کیونکہ اس طرح وہ اُن کی طرف مناسب توجہ نہیں دے سکے گا۔ چندہ منٹ بعد لارڈ کے دفتر سے یہ پیغام ملا کہ وہ پرسوں تو نہیں البتہ کل تمام پانچ بجے مطلب پہنچ جانے گا۔

لارڈ مطلب پہنچ گیا۔ وہ دروازے سے آگے نہیں بڑھا، وہیں کھڑے کھڑے ڈاکٹر کو سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں تحقیر و تنبیہ تھی۔ ڈاکٹر نے ایک نظر میں اندازہ کر لیا کہ لارڈ نہایت برہم ہے اور بہت گھور کر اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی زبان اور چہلیاں ساکت تھیں۔ ڈاکٹر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک



دیکھ ہی نہ رہا ہو۔ آفرودہ لولا میں کوئی معجزانہ علاج کرنے سے ناظر ہوں۔ ”اُس کی آنکھوں کے کنارے تہتم سے ہوئے لیکن یہ کوئی واضح بہتر نہیں تھا۔ اگر میں کوئی معجزہ پیش کر دوں تو ڈاکٹروں کا رائل کالج اُسے تسلیم نہیں کرے گا۔“

لارڈ کا معائنہ روتے تبدیل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر کو اُس کی گفتگو میں موانعت اور مٹھاس محسوس ہونے لگی۔ ڈاکٹر اڈلین، آپ اس معاملے میں نہایت معروف حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ایک دُنیا آپ کے معجزانہ علاج کی عقیدت مند ہے۔“

”لیکن آپ علاج کے لیے میرے ہی پاس کیوں آئے ہیں؟“ لارڈ خاموش ہو گیا جیسے اس سوال کا جواب دینا اُس کے لیے مشکل ہو۔ ڈاکٹر انتظار کرتا رہا۔ آخر خاصی کوشش کے بعد لارڈ نے زبان کھولی۔ ”میں خدا کے فضل سے مکمل تھمت مند ہوں میرے ذاتی معالج ڈاکٹر گسٹس اکثر بے اثر معائنہ کرتے ہیں۔ معمول کے مطابق چند روز پہلے بھی انھوں نے مجھے دیکھا تھا۔ اُن کے نزدیک میں صحت کے اعتبار سے ایک تیس سالہ نوجوان کے مانند ہوں۔ مجھے سخت محنت کی عادت ہے۔ محنت سے مجھے تھکن کبھی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اپنا کام انجام دینے میں لطف آتا ہے۔ میں تمہا کو نوشی شاد و نادر ہی کرتا ہوں۔ شراب کے معاملے میں بھی اعتدال میری عادت ہے۔ میری زندگی ورزش، نظم و ضبط اور پابندی اوقات سے عبارت ہے۔ جسی لحاظ سے مجھ میں کوئی نقص نہیں ہے۔ پوری طرح صحت مند ہوں۔ ان حالات میں یہ واقعی ایک طفلانہ حرکت ہے کہ میں آپ سے مشورہ لینے چلا آیا مگر ڈاکٹر! میں یہاں آنے کے لیے مجبور تھا۔“ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اب اُسے لارڈ کی مدد کرنی چاہیے۔ چاہا آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں آپ کیادکر سکتا ہوں۔ بہر حال کوشش کر دوں گا۔“

”میرے فرائض کی نوعیت آپ کو معلوم ہے۔ لارڈ کے چہرے پر مزاحمتی سی پیدا ہوئی۔ جو امور مجھے انجام دینے پڑتے ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ میرے فیصلوں سے پورے ملک کی فلاح پر اثر پڑ سکتا ہے۔ نیز اُن سے دُنیا بھر کا امن متاثر ہو سکتا ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ میرے فیصلوں میں توازن ہو اور میرے دل و دماغ میں الجھنیں نہ ہوں۔ ملک و قوم کے لیے میری افادیت مسلم ہے۔ اس لحاظ سے اپنا ذہنی انتشار رفع کرنا بھی میرے منصبی فرائض میں شامل ہے۔“

ڈاکٹر نے ایک بار بھی اُس کے چہرے سے دکھا نہیں مٹائی اور ایک تجربہ کار معالج کی حیثیت سے اُس نے بہت کچھ دیکھ لیا۔ لارڈ کے گفتگو پر شکوہ تھے اور انداز بیان ناقص آہستہ چہرہ بھی ڈاکٹر

نے وہ پریشانی بھانپ لی جسے لارڈ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا: ”وزیر محترم! آپ کو یہاں آنے کی زحمت دینے کا ایک سبب تھا۔ تجربے نے مجھے یہ سکھا دیا ہے کہ ڈاکٹر کے مطلب کا تارک ماحول نکل کر بات کرنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ مریض جس ماحول سے ہمیشہ ناگزیر رہا ہو، اُس کے مقابلے میں یہاں زیادہ آسانی سے بات کر سکتا ہے۔“

لارڈ نے غلطی سے کہا: ”واقعی اُن مطلب کا ماحول بہت تارک اور نرم ہے۔ یہ کہہ کے وہ خاموش ہو گیا۔ وہ ایک ذہین و دغدہ آلود شخص تھا۔ تھوڑے فیصلے کرنے میں اُسے مارت مائل تھی مگر اس وقت وہ بہت ہلکا سا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے اُس نے اپنے ہونٹوں پر سکرالینٹ سجھا رکھی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھیں اندر دنی کر رہی۔ ابتلا کی نمازی کر رہی تھیں۔ وہ عجیب غیر فطری بے دلی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اڈلین! مسئلہ بے حد معمولی ہے۔ اس کے لیے مجھے آپ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے یہ خدشہ بھی نہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ اپنا قیمتی وقت اُن عمارتوں میں ضائع نہ کیجیے۔“

”بہا اوقات بعض معمول باتیں بھی نہایت اہم ہوتی ہیں۔ اُن سے ذہنی بے توازن کا اظہار ہوتا ہے۔ میں معمول سے معمولی بات نظر انداز کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ بے تکلفی سے سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کی آواز قریب سے دھیمی جی لیکن اُس کا لہجہ حتمی تھا۔ اُس کے انداز گفتگو سے مریض کو آسودگی محسوس ہوتی تھی۔ آخر لارڈ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ سستی تکلف کے بغیر سب کچھ کہہ دے گا۔ کچھ عرصے سے میں نہایت پریشان کن خواب دیکھنے میں مبتلا ہوں۔ میرا خیال ہے اُن خوابوں پر توجہ دینا حماقت ہے لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اُن کے لواحقین میرے اعصاب

بھجی ہوئے کے رکھ دیے ہیں ؟
 • کیا اپنا کوئی خواب آپ مجھ سے بیان کر سکتے ہیں ؟
 لارڈ بے پروائی غائب کرنے کے لیے مسکرایا مگر اس کی
 مسکراہٹ غم انگیز تھی۔ خواب اتنے پُر حقائق ہیں کہ ان کے
 ذکر سے مجھے الجھن ہر دی ہے۔
 ”تو نہ کیجیے۔ اطمینان سے کیجیے۔“

• لارڈ کو گویا ہوا۔ پہلا خواب میں نے ایک ماہ قبل دیکھا تھا۔
 میں نے دیکھا کہ میں کوئٹہ یا ماڈس کی ایک سرکاری ضیافت میں
 شریک ہوں۔ بادشاہ اور ملکہ کی شرکت بھی متوقع تھی لہذا ان کا اپنے
 اعداؤں کے تحفے سنبھالنا سچا ہے۔ ہوسٹے تھے۔ میں نے بھی اپنا
 رکن اور شاندار لگا رکھا تھا۔ کورٹ وغیرہ لگانے کے کرے میں میری
 ملاقات ایک بہتہ دشمن سے ہوئی۔ اس کا نام اودن گری فیتھ ہے۔
 وہ ویلر کے علاقے سے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تھا۔ اتنی اہم
 اور مخصوص تقریب میں ایسے کم حیثیت شخص کو دیکھ کر مجھے حسرت
 حیرت ہوئی۔ میں نے خود سے کہا، اگر میرا نوں نے اسے بھی بیان
 مدعو کیا ہے تو دیکھیے اب کس کس سے ملاقات ہوتی ہے ؟ وہ مجھے
 عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ
 نہیں دی اور راستہ کاٹ کر بیڑھیاں لے کر ناپا ہوا اوپر چلا گیا۔
 میرا خیال ہے آپ وہاں کبھی نہیں گئے ہوں گے ؟
 ”جی ہاں کبھی نہیں گیا۔“

• ”وہ ایسی جگہ ہے جہاں آپ کبھی جانا پسند کریں۔
 اس کی بیڑھیاں سفید رنگ کے سر سے بنائی گئی ہیں۔ بیڑھیوں کے
 اوپر میزبان اپنی اہلیہ میمت مہالوں کے استقبال کے لیے موجود
 تھیں۔ پہلے اس سے مصافحہ کیا پھر اس کی اہلیہ کی طرف ہاتھ
 بڑھایا۔ عجیب عورت تھی وہ اس نے مجھے حیرت سے گھورتے
 ہوئے ایک ہنسنے لگا تھا۔ میں نے قطعاً توجہ نہیں دی۔ وہ نہایت
 بوجھل اور غیر تربیت یافتہ خاتون تھیں۔ ان کے اطوار ان کے
 اُچھا اور گوارا اسلاف کی یادنازہ کر رہے تھے۔ اسی تماش کی ایک
 عورت کو شاہ چارلس دوم نے ڈیڑھ بنا دیا تھا۔ ایک بات اور
 واضح کر دوں۔ کوئٹہ یا ماڈس کے استقبالیہ کرے نہایت شاندار طور
 پر آراستہ ہیں۔ میں مہالوں کے درمیان سے گزرتا رہا کسی سے میں
 مصافحہ کرتا، کسی کو محض سر ملا کر سلام کا جواب دیتا۔ مختصر میری نظر
 جڑی سے بغیر ہر پڑی۔ وہ آسٹریا کے آرج ڈوک سے گونگنٹو تھا۔
 میرے لیے سفارتی آداب کے مطابق اس سے چند باتیں کرنا ضروری
 تھا چنانچہ میں نے اس کے سامنے پہنچ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف

بڑھایا۔ بیسے اس عمل پر آرج ڈوک کے منہ سے ایک پُر شور مقدمہ نکلا۔
 مجھے بہت ہلکا محسوس ہوئی۔ میں نے اسے متانت کے ساتھ سر
 سے ہیرتیک دیکھا مگر وہ اور زیادہ متعجب لگنے لگا۔ میں نے طنز و
 تفسیر کے حربے سے اس کی گوشالی کا ارادہ کیا مگر ایک منٹ نہیں
 مہالوں کو فائز محسوس کرانے لگے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ اور ملکہ کی سواری
 آج ہی ہے۔ میں آرج ڈوک کی طرف ہیٹھ کر کے ایک قدم آگے
 بڑھا۔ دیعتہ مجھے اپنے لباس میں کوئی کمی محسوس ہوئی۔ میں نے غور
 سے دیکھا تو مجھے سخت شرمندہ ہونا پڑا۔ میں اتفاق سے بڑے
 پانچوں کی پٹیوں، پنٹا بھول گیا تھا۔ میں گہرے سرخ موزوں کے ساتھ
 ایک مختصر پارٹیشی اندرونی پٹے ہوئے تھخہ میزبان کی اہلیہ اور
 ڈوک کے تھنوں کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ میں آپ سے بیان
 نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہوئی اور وہ لمحات میرے لیے کتنے
 سنگین تھے۔ میرا لڑا جسم نہایت سے عرق آلود ہو رہا تھا۔ میں شدید
 ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے کچھ محسوس نہ رہا پھر جب میں پیش
 آیا تو سر تاپا ہوا تھنڈے لینے میں شرا لیا تھا۔ اس کے بعد میری
 آنکھ کھل گئی۔ یہ جان کر میں نے مسکوکہ سانس لی کہ یہ سب کچھ ایک
 خواب تھا۔“

• اس طرح کے خواب کوئی غیر معمولی حیثیت نہیں رکھتے۔
 ڈاکٹر نے کہا۔

• ”مجھے اتفاق ہے۔ لارڈ بولا۔ لیکن دوسرے دن ایک عجیب
 واقعہ رونما ہوا۔ میں دارالعوام کی لابی میں کھڑا تھا۔ ویلر کے علاقے کا
 رکن گری فیتھ آہستہ رسی کے ساتھ میرے نزدیک سے گزرا۔ اس نے
 جان بوجھ کر میری ٹانگوں پر نظر ڈالی پھر مجھ سے نگاہیں ملا کر ہنسنے لگا۔
 انداز میں مجھے دیکھا۔ میں کمال یقین سے کہتا ہوں کہ اس نے مجھے
 آنکھ بھی ماری لہذا فوراً یہ مشککہ خیال میرے ذہن میں آکر گری
 فیتھ نے گزرتے رات دعوت میں شرکت کی تھی اور وہاں مجھے مشککہ
 نیز حالت میں دیکھا تھا اسی لیے اب میرا ذوق اُڑا رہا ہے لیکن
 مجھے معلوم تھا کہ یہ ناممکن ہے رات کا معاملہ تو عرض ایک خواب تھا۔
 میں نے سرد مہری سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ میرے پاس سے
 گزر گیا۔ گزرتے وقت بھی وہ کھسپائی نہیں رہا تھا۔ لارڈ نے
 جب سے وہاں نکال کے متھیلیاں صاف کیں۔ وہ اپنی منظر پر
 کیفیت مخفی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کی نظریں اس کے
 چہرے پر پکڑ ہو جی رہیں۔

• لارڈ نے کہا۔ اب دوسری رات کا خواب سنیے۔ یہ خواب
 پہلی رات کے خواب سے زیادہ احمقانہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں

باد رکھئے! کپڑے کا ناپ میسٹر



۱۰ مہی میسٹر = سینٹی میٹر، ۱۰۰ سینٹی میٹر = ۱ میسٹر
 ۱ میسٹر = ۱ گز، ۱۶ گز = ۳۳ فٹ، ۳۳ فٹ = ۱۰ میسٹر
 چونکہ ایک میسٹر ایک گز کے مقابلے میں ۱۰ فیصد بڑا ہے اس لئے ایک میسٹر کپڑے کی قیمت بھی ایک گز کی قیمت کے مقابلے میں ۱۰ فیصد زیادہ ہوگی۔

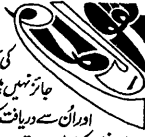
ناپ تول کا عالمی نظام برائے سہولت اور آرام

جاری کردہ: محکمہ آؤڈن و پیائش - وزارت صنعت - حکومت پاکستان
 ۳۸ - ایف - ۸/۲ - ناظم الدین روڈ - اسلام آباد

دارالعلوم میں بیٹھا ہوں۔ وہاں امور خارجہ کے مسائل پر اجتماعی مشورت ہو رہی تھی اس مشورت پر نہ صرف ملک بھر کی بلکہ تمام دنیا کی نگاہیں مرکوز تھیں۔ حکومت اپنی خارجی حکمت عملی میں کچھ تبدیلی چاہتی تھی۔ اس تبدیلی کے دور رس اثرات مرتب ہونے تھے یہ ایک تاریخی موقع تھا۔ دارالعلوم کا ایوان کچھ بھرا ہوا تھا۔ بیڑنی مکوں کے سفر بھی موجود تھے اور برطانوی عوام کی بھی ایک بڑی تعداد کاروائی سننے آگئی تھی۔ گیلریاں سامعین سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اچانک حکم ملا کہ میں اجتماع کی سب سے اہم تقریر کروں۔ میں نے اپنی تقریر نہایت غور و فکر کے بعد تیار کی تھی۔ ڈاکٹر اکملین، آپ جانتے ہوں گے، دنیا میں اہم شخصیات کے دشمن بہت ہوتے ہیں چنانچہ اجتماع میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو مجھ سے حسد رکھتے ہیں میں نے نہایت نرم عری میں اپنی مستعدی و ذہانت اور مسلسل محنت سے ایک خاص مقام حاصل کیا ہے۔ بشیر افراد اس مقام سے غرور کرنے پر تانا عت کر لیتے ہیں مگر میں پنا حاصل کیا ہوا تھا کہ ہونا پسند نہیں کرتا لہذا میں نے نرم و میم کر لیا تھا کہ میری تقریر نہ صرف موقع کے اعتبار سے اہم ہوگی بلکہ اسے میرے حریفوں کے لیے نازیبا نہایت حیرت کا درجہ بھی حاصل ہوگا۔ مجھے اس احساس سے بے حد ترش ہو رہی تھی کہ آج ساری دنیا میرے ہونوں پر متعلق ہو کر رہ جائے گی۔ میں ایک شان سے کھڑا ہوا۔ آپ کو بھی بالعمینت میں جانے کا موقع ملا ہے؟ اگر ملا ہے تو آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ لوگ تقریروں کے دوران کس طرح سرگوشیاں کرتے ہیں اور کاغذات سرسرتے ہیں لیکن یقین کیجیے میں کھڑا ہوا تو وہاں قبر جیسی خاموشی طاری ہوگئی۔ میں نے تقریر کا آغاز کیا۔ اچانک میری نگاہ پستہ گرد گری فٹھ پر پڑی۔ اس نے نہایت گستاخانہ انداز میں منہ سے زبان نکال کر مجھ پر ایڑا ڈاکٹر اکملین! ممکن ہے کہ آپ نے وہ گا انا ہو کر کھٹیا اور پست لوگوں میں گایا جا رہے اس کا عنوان ہے۔ مسائل دو افراد کے لیے بنی ہے، اگر کوئی چند برسوں میں یہ کام بہت مقبول ہوا ہے میں تقریر چھوڑ کے یہی گا ناگائے لگا۔ آپ سمجھتے ہیں یہ حرکت کیوں کی تھی؟ گری فٹھ کو محض یہ خیالنے کے لیے کہیں اس سے کس بُری طرح منتظر ہوں۔ میں نے گا نا شروع کیا تو سامعین سخت حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ مخالفت بیچوں سے داد و تحسین کا شور بلند ہوا میں نے ہاتھ اٹھا کر انھیں خاموش کیا اور گانے کے ابتدائی بول ختم کر کے دو مابین بول شروع کیے۔ یہ بول نہایت سکوت سے سننے گئے۔ تعریفوں کی آواز نہیں آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ گانا بہتر طریقے

سے نہیں گایا جا رہا ہے میں پریشان ہونے لگا۔ میری آواز پلاٹ مار اور ٹریل تھی۔ میں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے مناسب داد دیں۔ میں نے انتہائی بول شروع کیے۔ بالعمینت کے تمام ارکان ہنسنے لگے۔ ان کے ہنسنے جھلکی کی آگ کی طرح سارے ایوان میں پھیل گئے۔ سفر گیلریاں میں بیٹھے ہوئے مرتزبن ہنسنے لگے۔ ہنسنے پر فز و کش خواہش اجاری نہایت بے ادبوں کے سب بڑی طرح ہنس رہے تھے۔ صرف وہ وزیر ہنسنے کی طرح ساکت و صامت تھے جن کی نشستیں میری پشت پر تھیں۔ میں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا پھر اپنی عاقبت کی عینگی مجھ پر واضح ہوگئی۔ میں سامے زبانی کے سامنے ایک اہل حق کی محبت سے کھڑا تھا۔ اس مصیبت اور پریشانی کے عالم میں بس نے بادل ناخوستہ یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے استغفانے دینا چاہیے اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں بستر پر پنا حاصل کیا

دار کا شاہانہ انداز گفتگو مفقود ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر لرزدی تھی۔ ہمیں کم لرزش اور حواس میں بے ترتیبی تھی۔ اس نے بہت مشکل سے حواس پر قابو پایا اور لپکھاتے ہوئے بستم کی ایک بکر مانی ڈاکٹر اکملین! یہ پورا معاملہ انتہائی عاقبت آمیز تھا میں بھی اس سے غلط ہو رہا اور اسے تقریباً بھول گیا۔ دوسرے دن سہ پہر کو میں بہت اطمینان سے بار لکھتا گیا۔ میرا موڈ بہت خوش گوار تھا۔ وہاں ایک خشک اوسلے رنگ بستم ہو رہی تھی مگر مجھے مجبوراً بیٹھا پڑا بحث سننے کے بجائے میں نے کچھ دستاویزیں پڑھیں۔ ان دستاویزوں کو میری توجہ کی ضرورت تھی۔ پڑھتے وقت کسی سبب سے مجھے اوپر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اوپر گری فٹھ لپک رہا تھا۔ اس کی آواز اور شکل و شناخت میرے لیے سخت ناگوار تھی۔ لوگ توجہ سے اس کا بیان سن رہے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کہے گا جو توجہ کے قابل ہوگی۔ میں نے گردن جھکا کر کاغذات پر نظر ملانے کی کوشش کی۔ مگر گری فٹھ نے یہ گانا گایا۔ سائل دو افراد کے لیے بنی ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ سے میرا منہ کڑا رہا تھا۔ میں نے پریشانی سے اپنے دونوں کدے اچکائے۔ یہ بہت بڑی جرأت تھی کہ وہ ملانے کا ایک معمولی رکن مجھے امانت آمیز نظروں سے دیکھے۔ یہ اتفاق بھی عجیب تھا کہ گری فٹھ نے وہی گانا گایا جو میں خواب میں گایا تھا۔ میں نے سر جھٹک کے دوبارہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پڑھنے لگا مگر اب سب



عہاسی غلیفہ منصوبہ دوسری شادی کا ارادہ رکھتا تھا اس کی پہلی بیوی نے اس سے کہا کہ ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں ہیں۔ غلیفہ نے اس کی تسلی کے لیے انا کا ابو غلیفہ کو بلوایا اور اس نے دریافت کیا "مسلمان کے لیے کتنی بیویاں جائز ہیں؟" امام نے کہا "چار" غلیفہ کی پہلی بیوی قریب ہی پرے کے کچھ میٹھی میٹھی غلیفہ نے اس کی طرف کچھ کے بلند آواز میں کہا "حضرت ابو غلیفہ کے رسلے کی؟" امام ابو غلیفہ فوراً بولے "مگر غلیفہ منصوبہ کے لیے ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں ہیں۔" غلیفہ نے دریافت کیا "یا ابا کا کیوں؟" امام نے کہا "تم نے جس انداز سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا ہے اور جس لیے میں گفتگو کی ہے، اس سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ تم اس کے ساتھ عدل نہیں کرتے لہذا تمہارا حکم یہ ہے کہ تم اسی پر قناعت کرو۔"

کافذات کا ایک حرف بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میری طبیعت متشعل تھی، کیا میرے پہلے اور دوسرے دونوں غلوہوں سے کوئی فتنہ کی مطابقت محض اتفاقی تھی؟ یا وہ بھی بعینہ وہی خواب کچھ رہا تھا جو مجھے نظر آ رہا ہے۔ مجھے سوچنے سوچنے میں مل رہا تھا۔ مجھے ہیوچ اچھا نہ معلوم ہوئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ اس موضوع پر اپنی توجہ صرف نہیں کروں گا، مطلب پر خاموشی طاری ہوگئی۔ لاڈ متفکر نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ ٹھہرے اس نے کہا "لوگوں کے اکثر خواب عموماً بڑا ارکن ہوتے ہیں۔ میری بیوی کو بھی خواب دکھائی دیتے تھے۔ وہ مجھے جزئیات کے ساتھ اپنے خواب سناتی تھی۔ میں پاگل سا ہونے لگا تھا۔"

ڈاکٹر نے ہلکے سے ہنسنے سے متہم سے کہا "لیکن مجھے آپ کے خواب سن کر کوئی ہزار سی نہیں ہوئی۔" "اب میں آپ کو اپنا تیسرا خواب سنا تا ہوں۔" لاڈ نے کہا۔ "میں نے دوسرے خواب کے کچھ دنوں بعد دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں لائٹ ہاؤس کے مشرب خانے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد سے میں نے کبھی بھی مشرب خانے کا ٹھکانہ نہیں کیا اور اب تو کسی عام مشرب خانے میں جلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر بھی وہ جگہ اور وہ ملک مجھے جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ میں نے مشرب خانے میں جا کر یہ محسوس کیا جیسے وہ جگہ گھر ہو۔ میں اس کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کمرہ شاید پرائیویٹ روم یا سلیٹن بار کمانڈا تھا۔ وہاں ایک بڑا آتش دان روشن تھا۔ ایک طرف چڑنے کی ایک بڑی آرام گاہ تھی جی ڈورس طرف ایک صوفہ تھا اور پورے کمرے کی لمبائی کے ساتھ ساتھ مشرب کا کاؤنٹر بنایا ہوا تھا۔ اوپر ایک کھڑکی سی تھی، اس سے لوگ سارے مشرب خانے کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ وہ دروازے کے پاس منگ بڑ کی ایک گول میز تھی، میز کے بازوؤں میں دو آرام گاہیں رکھی تھیں۔ پیلچر کی رات تھی اس لیے نہ نامشتیں بھری ہوئی تھیں۔ کمرہ بے حد روشن تھا مگر فضا میں دھوئیں کے مرغولے تیر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ میں دوشیوں یا عام شہریوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھا میرے سر پر ٹوپی تھی اور گون میں ایک رومال بندھا تھا۔ زیادہ تر لوگ نشتے میں دھت تھے ان کی صحبت مجھے بھی سرور پہنچا رہی تھی۔"

"شاید وہاں گراموفون یا ریڈیو بج رہا تھا اور آتش دان کے مین سامنے دو عورتیں ایک چڑناج کا مظاہرہ کر رہی تھیں ان کے چاروں طرف تماشا بینوں کا مجمع تھا۔ وہ تہنہ لگا رہے تھے تعریفیں

کر رہے تھے اور خود بھی گالے پھرتے۔ میں بھی یہ نہ مانا دیکھنے کچھ قریب گیا۔ پہلو سے کسی آدمی نے مجھ سے کہا "بل! تھوڑی سی پی۔ پی۔ میز پر گلاس رکھے تھے، ان میں گبرے رنگ کے مشرب بھی ہوئی تھی وہ مشرب خانہ بالائے برائون ایل کمانڈا ہے۔ اس شخص نے مجھے ایک گلاس پیش کیا میں نے ایک چپٹی لی، اس لیے کہ وہاں اجنبی نہ لگوں۔ سناچنے والیوں میں سے ایک عورت تھرتھرتے تھرتھرتے رنگ گئی اس نے بڑھ کر میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور اٹھلا کے بولی کہ یہ میری مشرب ہے۔ میں نے جواب دیا، میں بہت فخر مند ہوں مگر چونکہ یہ مشرب مجھے اس آدمی نے پیش کیا تھا اس لیے میں یہ سمجھا تھا کہ یہ اس کی ہوگی بھی اتنی فراخ دلی سے مجھے دے رہا ہے۔" ناامید منتی ہوئی بولی اچھا چلو تھی پی۔ پی۔ مشرب بھی پی۔ پی۔ لوار میرے ساتھ دھس بھی کر دیا۔ آؤ۔ یہ کہنے ہی اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا میں احتجاج تک نہ کر سکا چونکہ وہ دونوں دھس کرنے لگے اور یہ تک دھس کرنے لپے۔ دھس کے بعد میں نے دیکھا کہ میں ایک آرام گاہ پر بیٹھا ہوں۔ وہ عورت میری آنکھوں میں ہے ہم دونوں ایک گلاس سے باری باری چسکیاں لے رہے تھے۔ ڈاکٹر آئین: میں ایک بات واضح کروں جنسی معاملات نے میری زندگی میں کبھی زیادہ اہمیت اختیار نہیں کی۔ میں نے نوعری میں شادی کر لی تھی میں ایک باہر تہ باہر تہ زوجان تھا۔ ایسے لہجہ اور آوازوں کے لیے ہی بات پسند نہ بھی جاتی ہے کہ وہ شادی کر لیں۔ میں خود بھی بے راہ روی میں پڑنے کے بلکہ جنسی بندے پر بر وقت فاراں بانیا چاہتا تھا۔ شادی کے بعد میرے پاس دو بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلے تو مجھے ان کی پیدائش سے شرت ہوئی، میں انھیں خاصا وقت دینے لگا پھر میں نے یہ معاملہ تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ رفتہ رفتہ میری مصروفیت بڑھتی گئی پھیلی گئی۔ میں اب تک کہ مجھے جنسی تھکاتے کی نہ غلط رہی نہ تھو۔ جو زندگی میں

گزار دیا تھا، اس میں منبہ طور پر آلودہ ہونا، ہزاروں رسواؤں کو دعوت دینا تھا۔ کسی سیاست دان کے اعمال نامے میں غلطیوں کے نام نہ ہوں تو لوگ اسے بہت اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خود مجھے ایسا آدمی سخت نا پسند ہے جو مردوں کے سچ میں اپنی زندگی تباہ کر لے۔ ایسے لوگوں سے میں شدید نفرت کرتا ہوں۔ میر جھوٹا ہے، دکر شراب خانے کا تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ رفاہ میری آغوش میں تھی۔ وہ نہ خوب صورت تھی، نہ زرخیز، نہ خم سن۔ اسے کچھ ٹھیک ایک چھٹی موٹی ناسخہ کسنا چاہیے۔ اس نے اپنی زلفیگی سے مجھے حیران کر رکھا تھا۔ وہ بار بار میرے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پورمت کر دیتی تھی اس کے منہ سے شراب کی ہلکے سے علاوہ کچھ اور بھی آ رہی تھی، اس کے دانت بھی مڑے ہوئے تھے۔ مجھے اس کی اس محبت سے نفرت ہو رہی تھی۔ پھر بھی معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا، میں اسے جی جان سے چار کر رہا تھا، اس پر فدا ہوا چار رہا تھا۔ اسی عالم میں اپنا تک میں نے ایک آواز سنی۔ بہت عرصہ بہت صبح۔ چار سے بیٹھے، خوب لطف آ تھا۔ وہ گری فختہ کی آواز تھی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، وہ گری فختہ یہ تھا جس نے کوشش کی کہ اچھل کر کرسی سے نکل جائے لیکن اس خوف ناک عورت نے اپنی گرفت اور مضبوطی کر لی۔ اس نے مجھے نکلنے نہیں دیا۔ کہنے لگی۔ اوندھ اس کی طرف توجہ نہ دو۔ وہ ہاں کا پڑا انا آئے والا ہے۔ عجیب آدمی ہے، ہر شخص کا معاملہ سمجھنے لگتا ہے۔ گری فختہ نے فوراً عورت سے کہا ہاں ہاں ہاں تم اپنا کام جاری رکھو، مجھے نورم سے مطلب ہے۔ عورت بڑا سامنہ بنانے کو رہی۔ میں سخت پریشان تھا کہ گری فختہ نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا ہے۔ اس نے مجھے پیار سے کہے کہ ہر غائب کیا تھا، یہ بات بھی میرے لیے اختتام کا باعث تھی میں نے ایک ایسی عورت کو ایک طرف دھکیلا اور اٹھ کر گری فختہ کا مقابلہ کرنے لگا۔ میری زبان پر یہ الفاظ تھے کہ میں تجھے نہیں جانتا، نہ مجھے یہ جاننے کی خواہش ہے کہ تم کون ہو۔ گری فختہ نے جواب دیا کہ میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں پیارے بیٹے، یہ راستہ تو یہ ہے کہ تم اپنی زلفی راقس لے لو یا اس عورت سے بولا لطف آ تھا۔ بڑے بڑے ایک بول رکھی تھی۔ میں نے بول اٹھا ہی اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے ماری پھر اپنا جسم میں نے اس طرح جھٹکا کہ میری آنکھ کھل گئی۔

ڈاکٹر اولین نے دیکھا میری جڑ۔ اس نے محبت کے خواب نا قابل فہم نہیں ہوتے۔ یہ ایک فطری انتقام ہے جو آدمی ان لوگوں سے لیتا ہے جن سے کھلم کھلا نہیں لو سکتا۔

”جہاں یہ خواب تھا نہایت طفلانہ اور خرم ناک۔ مجھے آپ کا

میں سنا نا چاہیے تھا لیکن سنا نا پڑا کہوں کہ اس خواب کے دوسرے دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سنیے۔ اس روز مجھے کچھ عجلت تھی۔ میں تیزی سے پارلیمنٹ کی لائبریری میں داخل ہوا۔ وہاں کرسی پر بیٹھتے وقت میں ایک بات نہیں دیکھ سکا۔ گری فختہ ایک قریبی کرسی پر پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی موجودگی مجھے اس وقت مدد ہوئی جب ایک تیسرے شخص کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ شخص گری فختہ سے کہہ رہا تھا کہ گری فختہ! آج تم بہت پریشان اور اداس نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟ گری فختہ نے جواب دیا، میرے سر میں شدید دھبے۔ ایسا عرصہ ہو رہا ہے جیسے کسی نے میرے سر پر بول توڑ دی ہو۔ ہزاروں کا پو پو بھال اور زرد ہوا تھا۔ گری فختہ کا جلد میں رکھے لیکن ہو گیا کہ میرا خواب صبح تھا۔ گری فختہ کو بھی وہی چیز نظر آ رہی تھی جو میں دیکھ رہا تھا اور میری طرح اسے بھی اپنے خواب یاد تھے۔

”اسے ایک اتفاق کسنا چاہیے، ڈاکٹر نے کہا۔

لاڈ ڈاکٹر کا تھوڑی سی آن سنی کر کے بولا۔ گری فختہ بول کا ذکر کرتے وقت اپنے دوست کے بجائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شکارت اور ناراضی بھی تھی۔

ڈاکٹر نے دیانت کیا۔ بار بار صرف ایک شخص آپ کے خوابوں کا ذکر نہیں ہوتا ہے؟ آپ کے پاس اس امر کوئی حراز ہے؟

”میرے پاس کوئی حراز نہیں ہے۔“

ڈاکٹر نے فوراً عرصہ کر لیا کہ اس کا مریض بھڑبھڑا رہا ہے۔ اس نے پینیل سے بلاناگ پیسہ پوچھنا چاہا۔ یہی کبیر کبیر اس کے اکثر مریض بے حد طویل وقفے کے بعد راہ راست پر آ کے سچے بولتے تھے۔ یہ بات انھیں بہت دیر میں محسوس ہوتی تھی کہ جب تک وہ سچ نہیں بولیں گے، ڈاکٹر ان کے علاج سے فائدہ نہ پا گا۔ ڈاکٹر نے لاڈ کو کہہ دیا۔ یہ خواب آپ نے کوئی تین مہینے پہلے دیکھا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ نے کوئی خواب دیکھا؟

”جی ہاں دیکھا۔ کوئی رات خواب کے بغیر نہیں گزرتی۔“

”اور ہر خواب میں گری فختہ ہی نظر آتا ہے؟“

”جی ہاں۔ یہ حقیقت ہے۔“

ڈاکٹر نے بلا ٹانگ پیسہ پر کچھ اور کہیں بنائیں۔ اس کی خواہش تھی کہ لاڈ کے احسانات پر کمرے کی خاموشی، خامی اور جسمی روشنی کا مکمل اثر پڑے۔

لاڈ نے اپنے آپ کو کرسی پر بغیر باگ لایا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے متصادم نہ ہو سکیں۔ ڈاکٹر اولین! میرا کچھ علاج کیجیے فرد کیجیے۔ میں ان پر بتاؤں تو سنگ آپ کا سب بنگ



ہوں۔ اگر یہ خواب مجھے اسی طرح نظر آتے رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اب تو مجھے ہند کے تھوڑے وقت ہونے لگے ہیں۔ میں تین راتوں سے مسلسل جاگ رہا ہوں۔ بچہ کرکچر نہ کچھ پڑھنا رہتا ہوں، تینہ طاری ہونے لگتی ہے تو کٹ پٹن کر ٹیلے لگتا ہوں۔ اتنا ٹھنڈا ہوں اتنا ٹھنڈا ہوں کہ میری ٹانگیں تھک جاتی ہیں لیکن ڈاکٹر مجھے ہند کی ضرورت ہے۔ مجھے ہند آتی چاہیے تینہ۔ اپنے منصبی فرائض انجام دینے کے لیے مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنے حواس و افعال پر مکمل قابو ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے آرام چاہیے لیکن آرام نصیب نہیں ہوتا۔ میں جیسے ہی سوتا ہوں خواب شروع ہو جاتے ہیں اور خوابوں میں وہ ہمیشہ ہوتا ہے وہ دلیل پسند نہ کر سکتا۔ وہ بلذائقہ آڑا ہوتا ہے مجھ سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ کہہ لے اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک شیطانی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ یہ ایک ہیما نہ اذیت ہے ایک مسلسل غلاب ہے ایک کڑی سزا ہے جو میں جھگڑتا رہا ہوں ڈاکٹر آؤں، میں جیسا خواب میں دکھائی دیتا ہوں یقین کیجئے، ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میرے کردار کا اندازہ خوابوں سے لگنا نا انصافی ہوگی کہ آپ کسی بھی شخص سے میرے بارے میں معلوم کر لیں، ہر شخص ہی کہے گا کہ میں ایک دیانت دار راستہ باز اور نفیس انسان ہوں۔ عوامی سطح پر باجی لوگ میرے کردار پر کھلی نہیں اٹھی سکتے یہی کوئی آرزو ہے تو صرف یہ کہ ملک تو ملک نمایاں خدمت انجام دیتا ہوں اور ملک تو ملک کی عظمت بے غدار کھوں۔ میرے پاس دولت بھی ہے سزا بھی۔ میں بہت سے کم حیثیت لوگوں کے مانند حرم و طبع کا غلام نہیں ہوں لہذا میرے کردار میں سستی آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ نا ممکن بات ہے۔ میں دعو کرتا ہوں کہ کسی اعزاز یا کسی ذاتی مفاد کی ہوس مجھے کل فراموش انجام دینے سے گراہ نہیں کر سکتی بال برابر بھی گراہ نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا موجودہ مقام پالنے کے لیے سب کچھ قربان کر دیا ہے سب کچھ لٹا دیا ہے۔ میرا نصب العین عظمت حاصل کرنا ہے اور عظمت میری دسترس سے دور نہیں مگر اب میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ میں ویسی عیاش قابل نفرت بزدل اور درندہ صفت مخلوق نہیں ہوں جیسی وہ پسند نہ مجھے دیکھتا ہے۔ ابھی میں نے آپ کو صرف تین خواب سناے ہیں اب یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ مزید خوابوں میں کسی آدمی نے مجھے عجیب عجیب حالتوں میں لٹھڑا ہوا دیکھا ہے۔ وہ حالتیں وضاحت بھی ہیں، خوف ناک بھی اور خرم ناک بھی میری میان پرچی بن جاتی تو یہ باتیں بیان نہ کرتا مگر وہ شخص یہ تمام خرم ناک باتیں یاد رکھتا ہے اس کی آنکھوں میں ہوشیاری ہوتی ہے، اس سے میں شرمندہ اور مغلوب ہو کر رہ جاتا ہوں۔ اکثر میں نے سوچا کہ اس

سے گفتگو کروں پھر خیال آیا کہ یہ کوشش فصول ہوگی۔ اس نے مجھے انتہائی ذلیل کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایسے کام کوئی بھی باعزت انسان نہیں کر سکتا۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ معاشرے کے خارج کر دیے جاتے ہیں اور اکثر انھیں سزا بھی ہو جاتی ہے۔ گری فٹن نے مری زبان سے فحش کلمات کہہ سنے ہیں۔ اس نے مجھے ایک نو مضاعف میسج حالات میں دیکھا ہے، دوسرے باغیانہ سرگرمیوں میں بھی ملوث پایا ہے۔ وہ مجھ سے شدید نفرت کرتا ہے اور اب تو اپنی زہریلے شیطانی مسکراہٹ سے نفرت کا اظہار بھی کرنے لگا ہے۔ ڈاکٹر آؤں اگر آپ نے میرے لیے کچھ نہ کیا تو یقین کیجئے، یا تو میں اپنی جان لے لوں گا یا اسے مار ڈالوں گا۔

ڈاکٹر نے مزید پوچھا کہ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو اسے جان سے نہ مارتا۔ آپ کو تو معلوم ہے اس تک میں کسی بھی ہم جنس کو مارنے کے نتائج کتنے عبرت ناک ہوتے ہیں۔
 ” نتائج سے اگر آپ کی مراد پچاسی ہے تو مطمئن رہیے، مجھے پچاسی نہیں ہوگی کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکے گا اسے میں نے مارا ہے۔ میرے خوابوں نے مجھے جان لینے کا ایک محفوظ طریقہ سکھا دیا ہے۔ میں نے خواب میں اس کے سر پر بوتل ماری تھی تو وہ حقیقتہً سر درد میں مبتلا ہو گیا تھا۔ گویا جو کچھ اُسے خواب میں دکھائی دیتا ہے اس کے اثرات اس کے جسم پر بدیاری کے بعد بھی قائم رہتے ہیں۔ اب کے میں اُسے بوتل میں ماروں گا۔ میں خواب میں خنجر یا سپتیل کے کڑواؤں کا اور موقع ملنے ہی اُسے سوز کی طرح ذبح کروں گا یا گولی سے گتے کی موت ماروں گا یا اس کا دل چھید دوں گا پھر مجھے اس شیطانی غلاب سے ہمیشہ کے لیے

نجات مل جائے گی۔“

”ابھی آپ نے سنا دینے کی بات کہی تھی۔ بھلا گری فحہ ہی آپ کو مراد دیا کیوں چنا ہے؟“
 ”مجھے علم نہیں۔“ لاڈ نے نظر چرا کے کہا۔
 ڈاکٹر کو اس کا جواب جھوٹ معلوم ہوا۔ اس نے پوچھا: آپ نے کبھی اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟“
 ”بھئی نہیں۔“

لاڈ کا جسم بے حرکت تھا لیکن ڈاکٹر نے عموں کی بات کہی نہیں سکتے وقت اس کے جسم سے خوف کی ایک لہر گزر گئی ہے۔
 ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ اس کے حملے ایک مغرور آدمی بیٹھا ہے اور یہ تاثر ہے کہ اسے ڈاکٹر اچھا ہے سوالات میرے لیے جھک کر باعث ہیں ساتھ ہی وہ مغرور شخص سمجھنے میں چنسا ہوا ایک خوف زدہ جانور بھی معلوم ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے جھک کے اپنی آنکھوں کی پوری قوت لاڈ کی آنکھوں پر صرف کر دی۔ جناب! کیا آپ کو اپنے جواب پر پختہ یقین ہے؟“

”پختہ یقین ہے۔ آپ شاید یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہم دونوں کے راستے قطعاً مختلف ہیں۔ میں یہ بات دوبارہ نہیں کہنا چاہتا کہ میں نابالغ بھائی کا ایک غیر معمولی در پر ہوں گری فحہ لبر پائی کی ایک گم نام ممبر ہے۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی معاشرتی تعلق نہیں۔ وہ ایک نہایت ادنا گھرنے کا شخص ہے اسے اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے کہ میں پالیسیٹ کے اہلکاروں میں جاؤں تو اس سے ملاقات کو ناپسند کروں۔ سیاسی اعتبار سے ہی ہمارے مناصب بہت دور اور بہت بعید ہیں۔ ہمارے مابین کوئی مشترک انداز ہے نہ ہو وہ نہیں ہے۔“
 ”دیکھ جناب! ڈاکٹر نے کہا۔ جب تک آپ مجھے برائے سچ نہیں بتائیں گے، میں آپ کے لیے کوئی علاج تجویز نہیں کر سکوں گا۔“

لاڈ کی آنکھوں اوپر چڑھ گئیں۔ یہ اس امر کا مادی نہیں ہوں کہ کوئی شخص ہیلو میں اشتہار سمجھے، اس کی آواز میں غصہ تھا۔
 ”جاکر ڈاکٹر! اگر میرے ساتھ آپ یہ رویہ اختیار کریں گے تو آپ کا مزید وقت لینا میرے لیے اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ براؤن ممبر سیکرٹری کو اپنی فیس سے آگاہ کر دیجیے۔ وہ جلد از جلد چیک بھیجے گا انتظام کرنے کا۔“

ڈاکٹر کے چہرے سے ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے لاڈ کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ متعلق مزاجی ہے اس کی آنکھوں میں دھکتا رہا۔ کیا آپ سے کوئی ایسا عمل مرزد ہوا ہے جسے گری فحہ اپنا نقصان تصور کرتا ہو؟“ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

ڈاکٹر کے بجائے کوئی اور ہوتا تو سوچتا کہ لاڈ پاگل ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر برسوں سے روح کے زخمیوں کا علاج کر رہا تھا۔ وسیع تجربے سے اسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ بعض دفعہ ایک مقلد اور ایک نمونے کے درمیان حد فاصل کھینچنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ بسا اوقات وہ اشخاص جو بظاہر ذہنی نرم و صحت مند نظر آتے ہیں جو تصورات سے خالی دکھائی دیتے ہیں عام زندگی میں اپنے متعلقین کو خوش رکھتے ہیں اور اپنے منصبی فرائض بخوبی انجام دیتے ہیں انھیں اعتماد میں لیا جائے ان کا نقاب اُتار دیا جائے تو وہ خوف ناک نہ ہوتے بے نوازی کا شکار ملیں گے ان کے ذہنی تصرفات اور فحش کائنات میں بے انتہا وسعت نظر آئے گی انھیں مضبوط الحواس کہنا غلط نہ ہوگا۔ انھیں پاگل خانے بھیج دیا جائے تو پاگل خانہ ناکافی معلوم ہوگا لیکن لاڈ کا معاملہ ڈاکٹر کے لیے عجیب و غریب تھا کہ کسی معمول شخص کو بعض اعصاب بھیج دینے والے عوامل کی بنیاد پر پاگل کیسے قرار دے دیا جائے۔ ڈاکٹر نے اب تک جتنے امراض دیکھے تھے، لاڈ کا مرض ان سے کئی گنا عجیب و غریب نظر آتا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ علاج کے جو طریقے اس نے گزشتہ مریضین کے لیے استعمال کیے تھے، وہ لاڈ کے لیے کارگر نہ ثابت ہوں گے یا نہیں۔ اس نے لاڈ سے کہا: عزم! کیا آپ نے کسی اور نفسیاتی معالج سے مشورہ لیا ہے؟“
 ”نفسیاتی معالج سے تو نہیں! اپنے خاندانی معالج ڈاکٹر آگسٹس سے مشورہ لیا تھا لیکن ان سے میں صرف یہ کہا تھا کہ مجھے بڑے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ کام کی زیادتی کے باعث میرا دماغ متعطل ہے۔ لہذا مجھے آرام کے لیے سمندری سفر پر چلا ہوا چاہیے۔ یہ ایک بیوقوفی کی بات تھی۔ سمندری سفر کیلئے مجھے وزارت چھوٹی پڑتی اور موجودہ دور میں وزارت چھوڑنے کا میں تصور تک نہیں کر سکتا۔ آج کل بین الاقوامی حالات مسلسل ترقی کی ضرورت ہے۔ میں حکومت کے لیے ناگزیر رہا ہوں۔ ملک کے مستقبل کا انحصار میرے عملی اقدامات پر ہے۔ ڈاکٹر آگسٹس نے مجھے سکون کی دوائیں دی تھیں، میں نے وہ کھا ہیں مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ امیوں نے ٹانگ بھی دیے تھے۔ وہ سکون کی دواؤں سے زیادہ بے سود نکلے۔ مجھے تو وہ بڑھا باکل بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔“
 ”آپ کو اپنے خوابوں میں ایک ہی شخص نظر آتا ہے گری فحہ کیا مجھے آپ اس کا کوئی سبب بتا سکتے ہیں؟“
 ”آپ یہ سوال دوبارہ کر رہے ہیں۔ میں اس کا جواب نہ

کنواروں کے لیے



ایک شخص کی بیوی نے
ٹیلی فون پر اس سے کہا: ”ڈیرا اگر تم میرا ناؤ تو گھر
واپس آتے ہوئے پیس لیتو اور اس میں رگ سکتے ہو؟“
میں وہاں رات کے کھانے پر کم سے ملنا چاہتی ہوں“

ٹی وی ٹھیک کرنے والے سے بڑی قانون نے کہا: ”بھئی اب ٹی وی
بالک صحیح کام کر رہا ہے۔ دراصل ہماری ٹیلیکس آپس میں بدل گئی تھیں۔“

”کیا آپ کے پاس ڈور ہیں ہے؟“ پتلے شوہر نے پوچھا۔
”جی ہاں۔ لیکن اسے میری بیوی نے کہیں چھپا کر رکھ دیا ہے۔“
دوسرے شوہر نے کہا۔

ایک صاحب ناشتہ کی میز پر اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اُن کی
بیوی نے جلد بھنے انداز میں کہا: ”یہ تھا کہ ساتھ بڑی مشکل ہے تم ہمیشہ
اپنی چھوٹی سی دنیا میں گم رہتے ہو۔ دیکھو یہ شرقی اور وسطی بحران، مشرقی بعید
کے مسائل، افریقہ کے جنگاں، یورپ کی اقتصادی مشکلات، چین کی اندرونی
حالت، جنوبی ایشیا میں سیاسی تبدیلی۔ جب دیکھو اپنی اسی چھوٹی سی دنیا میں
گم، بونہد؟“

”ہر صبح میری بیوی اور کافی ایک ساتھ کھولنا شروع
کر دیتے ہیں“

محمد عبدالغنی احمد آبادی کا کہنا ہے: ”جہاں تک“

مجھے آئے بعد سے پریشان کن سوالات کرنے لگا۔ میں نے محل
کا ثبوت دیا لیکن ایک موقع پر آئے اچھی طرح ڈانٹ بلا دی۔
میں نے کہا کہ صاحب زادے، تم بھی تو آموز ہو لو گے ہو؟ ڈاکٹر ڈائیلن
وہ اسی برتاؤ کا متعلق تھا۔ مجھے اس سے شروع سے تلمی نبض ہے۔
اس کا موافق انداز گفتگو اس کی رشتہ منوئے کتے جیسی آواز
اس کی ذلت آئیز میری حرکت پر جینیں ہمیشہ میرے لیے چڑچڑاہٹ
اور نفرت کا سبب بنتی تھیں۔ وہ جب بھی لوٹا، نہایت غم ساری
سے لوٹتا نہایت تذبذب سے لوٹتا، گویا لوٹنا اس کے لیے ایک آگ
ہو لیکن کسی اندرونی جذبے کے تحت وہ اپنے خیالات ظاہر کرنے
پر مجبور تھا۔ اکثر وہ انتہائی عجیب اور بے معنی باتیں کہہ جاتا۔ ماں
مجھے اعتراض ہے کہ کبھی بھی اس کی تقریر سے ایک ذہین مقرر کی
صلاحیت بھی بھٹکتی تھی لیکن یاد ہے کہ کبھی بھی ہمیشہ نہیں۔ اپنی
پادری والوں پر اس کا بڑا اثر تھا۔ وہ اس کی مستعدی اور معلومات
سے بڑے متاثر ہوتے تھے۔ ہوا کر لی مجھے تو اس کی کردی جذباتیت
سے اذیت ہونے لگتی تھی۔ آپ جانتے ہیں سیاسی بحثوں میں

لاڈل جھگ گیا۔ کچھ دیر تک وہ نظریں ہٹا کے الگ دیکھتا
رہا لیکن شاید فکٹر کی نگاہوں میں کوئی قوت پوشیدہ تھی۔ لاڈل دوبارہ
اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے زندے ہوئے لیے میں
کہا: ”وہ نہایت ذلیل اور دوسرے دلچسپ کا آدمی ہے۔“
”ان الفاظ میں تو آپ اس کا تعارف کر رہی تھیں میں کوئی
اور بات بنا رہے؟“

لاڈل نے سرد آہ بھری جیسے وہ شکست کھا گیا ہو۔
ڈاکٹر نے اندازہ لگا لیا کہ اب وہ اصل بات کہنے والا ہے،
مزید محنت نہیں کرے گا۔ ڈاکٹر نظریں جھکا کے پھر ملائی گئی۔
الٹی سیدھی کیلین کھینچنے لگا۔ ”دو یا تین منٹ تک سکوت طاری رہا،
آخر لاڈل نے زبان کھولی۔“ فکٹر: ”میں جانتا ہوں آپ کو ہر بات
بتا دوں جس سے آپ کچھ استفادہ کر سکیں۔ ابتدا میں یہ باتیں میں
نے نہیں بتائی تھیں کیونکہ انھیں میں غیر اہم سمجھتا تھا۔ بہر حال سنیے
گری فٹھ نے نرسنگہ انتخابات میں کسی طرح ایک نشست حاصل کر لی
پھر اس نے فوراً اپنی ذلیل حرکتیں شروع کر دیں۔ اس کا باپ ایک
معمولی کان کن تھا۔ گری فٹھ کو بھی بچپن میں ہی کام کرنا پڑا ہے۔
اس کے بعد وہ لاڈل کے اسکول میں بچہ بھی رہا پھر اخبار نویس
بن بیٹھا۔ وہ ایک ناپختہ دانش ور ہے۔ اپنے دانش ور اگر انھیں
دانش ور کہہ لیا جائے محنت کش طبقے میں جبری تعلیم کے فضل رکند
ہوتے ہیں۔ ان افراد کا علم ناکافی ہوتا ہے۔ ان کے پاس کچھ اُلٹے
سیدھے خیالات اور ناقابل عمل منصوبے ہوتے ہیں۔ گری فٹھ جس
سے ایک مریل دلا پٹلا اور ناقار زدہ آدمی نظر آتا ہے۔ مشکل مشابہت
سے بھی نہایت ذلیل معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے آج کل ایوان کے ارکان
لباس کی طرف سے بے توقیری کہیں برت لے رہے ہیں مگر یقین کیجیے
گری فٹھ سب سے حقیر سب سے کم لباس پہنتا ہے۔ اس کا کالر
بیل سے چپکٹ ہوتا ہے۔ اس کی ٹائی بھی درست بندھی ہوئی
نہیں ہوتی۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ یہ لگتا ہے جیسے وہ ایک جینے سے
نما یا بھی نہ ہو اس کے ہاتھ ہر وقت گندے رہتے ہیں۔ لیبر پارٹی کے
اگلی نشستوں پر بیٹھنے والے دو بائیں ممبر کچھ لائق معلوم ہوتے ہیں
ان کے سوا ایک بھی ممبر کوئی اجمیت نہیں رکھتا۔ اندھوں کی سلطنت
میں کانے کو بادشاہی مل گئی ہے اس کی بھی ایک وجہ ہے۔
گری فٹھ کو سائے ظاہر کرنے کا تصور اب بہت سلیقہ ہے۔ وہ مختلف موضوعات
پر بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسے کچھ سطحی معلومات بھی ہیں۔
لیبر پارٹی اسی کو تقریر کے لیے کھڑا کرتی ہے۔ ایک دن کا واقعہ
تھیے۔ اس نے امور خارجہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا پھر

جذباتیت کی اکثر ضرورت ہوتی ہے اور اس پر داد بھی ملتی ہے لیکن جناب! جذباتیت کی بھرمار سے کیا حاصل؟ ایک سیاست دان اپنے نصیب العین میں قوم کے لیے کچھ اغراض و مقاصد متعین کرنا ہے۔ تو میں اغراض و مقاصد ہی سے زیرِ نگین رکھی جاتی ہیں۔ سیاست دان خوب صورت الفاظ اور نشان و ارعاروں سے اپنے دعوؤں کو مکشوف کرتا ہے کہ وہ کتنے مشکل مراحل سے گزرنا ہوا علیٰ کوئی مفاد کے کام انجام دے لیا ہے مگر کوئی فتنہ جیسے لوگ ایک زبورت غلطی کا ارتکاب کرنے ہیں۔ ان کے بابائے میں خوب صورت الفاظ اور نشان و ارعاروں کی محض ظاہری صورت استعمال ہوتی ہے۔ وہ خود کو نالیپس یعنی آئینہ کاٹ کر غلطی میں مار دیتی کیسی پتی بائیں ڈھرانے ہیں جو صرف دانش ورانہ باتوں پہلے کہہ چکے ہیں اور جنھیں سن سُن کے ہم تیز لڑ چکے ہیں۔ وہی مہمِ حرمتِ انسانی برلائی و دنیو وغیرہ۔ آپ اس بیکار کلواس سے باخبر ہوں گے، جب یہ مصیبت قحطی گری فتنہ کی باتوں سے اس کی زور و حمایت کے لوگ دو متناظر ہوتے ہیں۔ ہمارے قدامت پرست یا قادی کے بعض لوگ بھی بسا اوقات پتھر میں آجیانے لگتے ہیں۔ یہ سب باتوں میں سنی نہیں کہ جب لبرل یا پانی افتدائیں آئے گی تو کوئی نظم و نسق اعلیٰ منصب پر فائز کیا جائے گا۔ یہی سنی ہیں آجیا کر شاہِ اراکینِ خارجہ ایسی کے پروکری جانے لگے۔ یہ بات بظاہر مضحکہ خیز تھی مگر ایسا ہوجانا ناممکن بھی نہ تھا۔ ایک دن گری فتنہ نے ایران میں خارجہ مسائل پر بحث جھڑپ دی تھی وہ بحث اختتام تک پہنچائی تھی اس نے ایک گفتگو تقریری سے منع بھی تھا۔ میں نے اُسے آڑ سے ہاتھوں لیا اور اس کی تقریر کے پرچے اُڑا کر رکھ دیے ہیں۔ اُس کے دلائل کی خامیاں گنوا لیں اور اس کی علمی ذالامی برکاری میں لگا میں۔ اُس کا خوب خوب دلائل اُٹایا اور اُس کی سب سے زیادہ تباہ کن چیز مضحکہ ہے۔ میں اس دن کیا نہ کچھ مضمون تھا۔ میری تقریر سے ایران کے تقریباً تمام اُن کے غلط فہم ہوئے۔ فقہ لگا ہے تھے۔ ان کے متعین نے میرے جوش میں اور اساتذہ کرام یا نتیجہ ظاہر ہے میں گری فتنہ پر سبقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ حزب اختلاف کے ممبران کا تہجد مٹھتے تھے لیکن ان میں سے بھی ایک آدھ متعین میں ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ پھر پانچویں میں کبھی اٹنا بیزوف کسی کو نہ بنایا گیا ہوگا جتنا میں نے گری فتنہ کو بنایا۔ وہ اپنی شست میں چس لگا اور سکر کے بجائے گیلہ میں نے اُس کا رنگ سفید ہونے دیکھا پھر فوراً اس نے شرم سے اپنا چہرہ نقیبیلوں میں چھپا لیا۔ میں تقریر ختم کر کے اپنی نشست پر بیٹھا

مزید تاخیر ناممکن تھی۔ ڈاکٹر چاہتا تھا کہ لارڈ کو کوئی ایسا دم اٹھانے پر مجبور کر دیا جائے جو اس کے بے جا خوف و غور کے منافی ہو۔ ڈاکٹر اب تک بعض مشوروں سے اس کا علاج کر رہا تھا۔ کئی بار اس نے یہ بات محسوس کی تھی کہ لارڈ اس کے مشوروں پر شک میں مبتلا ہے۔ آخر ڈاکٹر نے اسے گری ہنڈ سلائے اور ترغیب دینے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی نرم و جیہی اور شیریں آواز سے لارڈ کے اعصاب کا علاج شروع کر دیا۔ وہ ایک جلد بار بار ڈھلکا لارڈ کچھ بند کیے خاموش لیٹا رہتا۔ اس کی سانس معمول پر رہتی، رنگ چمکے تھا اور دل تپش سے آزاد ہو جاتے۔

مال کار ایک روز تو یہی عمل کے دوران ڈاکٹر نے اسے ترغیب دی کہ آپ گری فٹھ کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ شرمندہ ہیں آپ نے اس کی ذات کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آپ مزید یہ کہیں گے کہ آپ ہر سنگ تدبیر سے اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کریں۔ ان الفاظ نے لارڈ کو کچرا دیا۔ جیسے کسی نے پھر لوہو طاقت سے اس کے منہ پر گھونسا مار دیا۔ وہ فوراً ڈاکٹر کے سر پر حمل سے بچھا چھڑا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں آگ برسنے لگیں۔ وہ مختلف بجے لگا لگا ایسی باتیں اکثر مریضوں سے سن چکا تھا۔ بعض اوقات اس نے نہایت پارسا اور مٹا زخا میں سے فحش فحش گالیاں سنی تھیں پھر بھی لارڈ کی تلخ کلامی نے اسے ہر بات میں ڈال دیا۔ لارڈ کو ڈاکٹر کا ہاتھ میں اس گندی ہالی کے کیڑے ویلز کے ذیل ہاتھ سے معافی مانگ لوں؟ ایسا کرنے سے پہلے میں خودکشی نہ کر لوں گا؟“

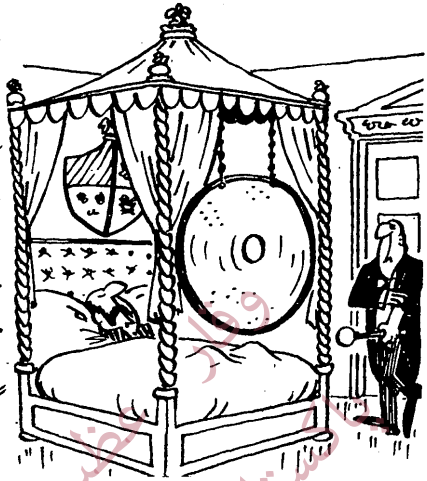
”صرف اسی طریقے سے آپ کا ذہنی توازن بحال ہو سکتا ہے۔“ لارڈ کا چہرہ لال ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں خول سے باہر نکل پڑیں گی۔ اس کے منہ سے جھانک نکل رہا تھا لیکن ڈاکٹر اسے سکون اور صبر و تحمل سے دیکھتا رہا۔ وہ طوفان گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر طوفان گزر گیا۔ کئی ہفتوں کے عذاب شکستہ مریض پر تھکن طاری ہو گئی اور وہ ہنسٹ ہو گیا۔ ڈاکٹر نے دقتی سے کہا: آپ بیٹھ جائیے۔“

لارڈ خوف زدہ سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آہ آہ وہ کراہا۔ ڈاکٹر ایلو ماخ چھٹا جا رہا ہے۔ میری مدد کیجیے میں اس ایک منٹ آرام کر لوں پھر یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ دونوں پانچ منٹ تک بالکل خاموش بیٹھے۔ لارڈ کو اس کی کیفیات سے ایک فروغ اور دھشت زدہ شخص بنادیا تھا مگر طبیعت اس کی شرافت بھی موجود تھی۔ اپنے مشتعل حواس پر قابو

سے جملت نمل۔ لارڈ ماؤنٹ ڈرنگھم یہ سیاست کی فصول کا رسی کا دوسرا فنکار ہیں۔ جدید سیاست میں ان لوگوں کی ذمے داریاں جان لیوا ثابت ہوتی ہیں جو ان سے تمام غریب و آزار ہستے ہیں۔ ان کے متونی کی مدد ترقی حاصلیتوں سے حب الوطنی، دور اندیشی اور ترقی و محنت کا ذکر تھا۔ نیز وزیر تعلیم کے نقطہ نظر کے مطابق نئے وزیر خراج کے مسئلے میں قیاس آرائیاں کی گئی تھیں۔

ڈاکٹر اگرچہ ذاتی طور پر لارڈ کرسچنسن کو ناگیا تھا تاہم اس بات پر اسے بے اطمینانی تھی کہ وہ اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ شاید اس سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے لارڈ کے ذاتی معالج سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ اس کے موصی بہت ہو گئے۔ وہ ایک ہائپر لنسان تھا۔ اسے جب بھی کوئی ناگامی ہوتی، وہ اپنے پیشے سے نفرت کرنے لگتا۔ اس نے بے پروائی سے اخبار کے صفحات پلٹے۔ ایک جگہ وہ پھر چونک پڑا۔ یہ بہت مختصر خبر تھی کہ پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی اچانک موت ہو گئی تھی۔ گزشتہ سہ ماہیہ کرکٹ کے رکن اوڈون گری فٹھ اپنے فلیٹ اسٹریٹ کے مکان میں اچانک جا کر مر گئے۔ انھیں چیرنگ کراس کے اسپتال لے جایا گیا مگر وہ راتے ہی اس فوٹ ہو گئے۔ ان کی موت طبعی تھائی گئی ہے پھر بھی موت کے اسباب کے متعلق تحقیقات کی جائے گی۔

ڈاکٹر نے سوچا کیا یہ ممکن ہے کہ لارڈ نے اپنی موت سے قبل خواب میں کسی دھار دار غریب پاپتول سے اپنے دشمن کو ختم کر دیا ہو اور اس کا دشمن اپنے ان دیکھے زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا ہو؟ یہ بھی ممکن ہے کہ جب لارڈ نے دنیا میں ازیت سے بے نجات پلانے کے لیے موت کے ذریعہ راہ قرار اختیار کی تو اس کے دشمن گری فٹھ نے دوسری دنیا میں اسے مذاب دینے کے لیے خود بھی موت کا چولا بن لیا ہو؟ سوچتے سوچتے ڈاکٹر کو خیال آیا یہ عضو ایک اتفاقی ہے کہ لارڈ اور اس کا دشمن ایک ہی دن موت کا شکار ہو کر دنیا سے چلے گئے۔ اس نے گھنٹی بجائی "مسٹر ملٹن سے کوئی مجھے افسوس ہے، میری طبیعت ٹھیک نہیں آج میں انھیں وقت دے دے سکوں گا، اس کا جسم کانپ رہا تھا جیسے وہ لڑنے کا مر رہا ہو۔"



سکتا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ ایک عجیب بات ہوگی شاید اسے اپنے غلوں میں تبت کی مسیح اور دھرمی مل سکے۔ اس نے اپنے کندھے سے زود سے جھٹک لیے اور سوچا "سیاست دانوں نے گزشتہ پچیس برس میں دنیا کو کس بے حالی اور انتشار کا شکار بنا دیا ہے ان میں کئی ذہنی مریض ہیں گئے۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ ملازم حاضر ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا "دیکھو اگر لارڈ ماؤنٹ ڈرنگھم آئیں تو کہہ دیا، مجھے سوا چھ بجے دوسرے مریض کو دیکھنا تھا اس لیے آج انھیں نہ دیکھ سکوں گا۔ کیا شام کا اخبار آگیا ہے؟"

دیکھ کر دیکھنا ہوں جناب!

تو کرا اخبار سے کر ملا گیا۔ پہلے ہی صفحہ پر شہر سرنی کے ساتھ ایک خبر تھی۔ ڈاکٹر حیرت پرانا "ذریعہ خارج کی اندوہ ناک موت" ڈاکٹر کو جیسے کسی نے سکون کی بلندی سے ایک متلاطم سمندر میں دھکیل دیا۔ سخت صدر ہینپٹا لیکن کو فی خاص حیرت میں ہوئی۔ وہ کئی بار سوچ چکا تھا کہ ایسی ذہنی حالت میں لارڈ خودکشی بھی کر سکتا ہے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ "برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ ماؤنٹ ڈرنگھم ریل کے متفار میں ایک ٹرنب اسٹیشن پر پھڑپھڑے تھے۔ جیسے ہی گاڑی آئی لوگوں نے انھیں پھری پر گرتے دیکھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انھیں شاید بے ہوشی کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسی عالم میں پھری پر گر پڑے۔ لارڈ ماؤنٹ ڈرنگھم چند ہفتوں سے کام کی زبان کی باعث ذہنی طور پر سلسل پریشان نظر آ رہے تھے انھیں آرام کی سخت ضرورت تھی مگر بین الاقوامی حالات کی بنا پر انھیں مصروفیات

